NOVEMBER 2011
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
عید نمبر
www.paksociety.com

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں، غزلیں

مستقل سلسلے

نومبر 2011
جلد 26 شمارہ 3
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: ۲ اے ۲ بی ڈی ای ۶ ڈی ایچ اے سی ایچ ایس سوسائٹی کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaamonthly@yahoo.com, info@khawateendigest.com

رضیہ جمیل

پہلی بات شعاع

شعاع کا نومبر کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
یہ شمارہ جب آپ کو ملے گا تب آپ عیدالاضحیٰ کی تیاریوں میں مگن ہوں گی۔ قارئین کو ہماری جانب سے دلی عید مبارک۔

عیدالاضحیٰ کو اس لحاظ سے اہمیت حاصل ہے کہ یہ قربانی کے ایک عظیم واقعے کی یاد میں منائی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت و اطاعت کی اعلا و ارفع مثال ہے۔

عیدالاضحیٰ کا مقصد درحقیقت اللہ کی راہ میں اپنی عزیز شے قربان کرنے اور اس کی مخلوق کے لیے ایثار و محبت کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ آج کے دور میں نمود و نمائش کا جذبہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اصل مقصد کہیں پیچھے رہ جاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے اس مذہبی تہوار کو دولت کی نمائش کا ذریعہ نہ بنائیں بلکہ اس کی اصل روح کے ساتھ منائیں۔

خلوص نیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے قربانی کریں اور اس موقع پر ان لوگوں کو بھی یاد رکھیں جو یہ خوشیاں حاصل کرنے کی استطاعت سے محروم ہیں۔

ہماری دعا ہے کہ عید کا یہ خوشیوں بھرا تہوار آپ کے لیے مسرت و شادمانی کے ان گنت پیغام لے کر آئے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- فائزہ افتخار کا مکمل ناول "مان جاؤ"،
- شیریں ملک کا مکمل ناول "میری زندگی ہے تو"،
- سائرہ عارف، نزہت شبانہ حیدر اور سلویٰ علی بٹ کے ناولٹ،
- حمیرا کلیم، حوا بی بی، ثمینہ عظمت علی، صباحت کرن، ام ثمامہ اور عائشہ خان کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کے سلسلے وار ناول،
- نمکین عید میٹھے لمحات، عیدالاضحیٰ کے موقع پر قارئین سے خصوصی سروے،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ "دستک"
- عدنان شاہ ٹیپو اور حاجرہ عدنان کا "بندھن"،
- "بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا" آمنہ زریں کا تبصرہ،
- شاعری سچ بولتی ہے، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

آپ کی رائے، آپ کی تعریف و تنقید ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ شعاع کا "عید نمبر" آپ کو کیسا لگا؛ ہمیں خط لکھنا یا ای میل کرنا نہ بھولیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

حوصلہ دے فکر کو اور بارشِ فیضان کر
ہے ثناء تیری بہت مشکل اسے آسان کر

رفتہ رفتہ کھول مجھ پر رازہائے جسم و جاں
دھیرے دھیرے مجھ پہ ظاہر تُو مری پہچان کر

زیست کے تپتے ہوئے صحرا میں ہوں اس سے نکال
میرے سر پر بیکراں رحمت کی چادر تان کر

کفر آلود فضاء میں سانس لینا محال ہے
پھر سے اس گم گردہ رہ کو صاحبِ ایمان کر

ختم ہو جائے بساطِ خاک کا سب شور و شر
بے سکونی کو عطا پھر حسنِ اطمینان کر!

خیمۂ شب سے یہی آواز آئی ہے صبیح
حمد لکھ اور اس طرح بخشش کا کچھ سامان کر

صبیح رحمانی

نعت رسول مقبول

جب نظر کے سامنے روضے کا منظر آئے گا
خود بخود میری زباں پر ذکرِ سرورؐ آئے گا

دیکھنا ہے سایۂ احمدؐ تو دیکھو عرش پر
آسماں کا سایا آخر کیوں زمیں پر آئے گا

مجھ کو نسبت ہے محمدؐ سے نہیں دنیا کا خوف
مجھ سے ٹکرائی تو گردش کو بھی چکر آئے گا

تیرگی کو کاٹ دے گی جنبشِ نوکِ قلم
روشنی کے ہاتھ میں کرنوں کا خنجر آئے گا

میں ہوں مداحِ نبیؐ ممکن نہیں مجھ کو زوال
دیکھنا کس اوج پہ میرا مقدر آئے گا

جس کے دل میں آئے گا کوکب محمدؐ کا خیال
بخت کی تاریکیوں میں مثلِ خاور آئے گا

کوکب مظہر خان

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

عیدالاضحیٰ کابیان

ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بیان کیا جو عبدالرحمان بن ازہر کے غلام تھے' وہ عیدالاضحیٰ کے دن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھ موجود تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پہلے نماز پڑھائی پھر خطبہ سنایا پھر کہنے لگے۔

"لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ان دونوں عیدوں (عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ) کے دنوں میں روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے کیونکہ عیدالفطر تو وہ دن ہے' جب لوگ (رمضان کے روزے) رکھ کر روزہ کھولتے ہیں اور عیدالاضحیٰ کا دن تمہارا قربانی کھانے کا دن ہے۔"

ابوعبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا اس کے بعد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ساتھ عید میں شریک ہوا' اتفاق سے اس دن جمعہ تھا۔ انہوں نے بھی پہلے عید کی نماز پڑھائی پھر خطبہ سنایا اور کہنے لگے۔

"لوگو! آج دو عیدیں ایک دن میں جمع ہوئی ہیں اب جن کے گاؤں مدینہ کے اطراف بلندی پر واقع ہیں' ان کو اختیار ہے خواہ جمعہ کی نماز کے لیے مدینہ میں ٹھہرے رہیں' خواہ چلے جائیں۔ (کیونکہ عید کے دن جمعہ معاف ہے) میں نے اجازت دی۔"

(بخاری شریف)

کس عمر کے جانور قربانی میں جائز

سیدنا جابر بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ و سلم نے فرمایا۔

"قربانی میں مت ذبح کرو مگر مسنہ (جو ایک برس کا ہو کر دوسرے میں لگا ہو یعنی دوندا) البتہ جب تمہیں ایسا جانور نہ ملے تو دنبہ کا جذعہ قربان کرو (جو چھ مہینہ کا ہو کر ساتویں میں لگا ہو۔)"

(صحیح مسلم)

قربانی کرنے والے کابیان

ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہ کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا "جس کے پاس ذبح کرنے کے لیے جانور ہو اور ذی الحجہ کا چاند آجائے تو اپنے بال اور ناخن نہ کاٹے جب تک قربانی نہ کرلے۔" (یعنی دس دن)

(صحیح مسلم)

ذبح کے وقت کابیان

سیدنا جندب بن سفیان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نبی صلی اللہ علیہ و سلم کے ساتھ عیدالاضحیٰ میں شریک ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے ابھی کچھ بھی نہ کیا تھا سوائے اس کے کہ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے (عید کی) نماز پڑھائی۔ نماز سے فارغ ہوئے' سلام پھیرا کہ اچانک آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے قربانی کی بکری دیکھی کہ وہ نماز سے پہلے ذبح کی جاچکی ہے۔

چنانچہ آپ صلی اللہ و سلم نے فرمایا کہ "جس نے قربانی نماز عید سے پہلے کرلی تو اس قربانی کی جگہ دوسری قربانی کرے اور جس نے قربانی نہیں کی تو وہ اللہ کے نام کے ساتھ قربانی ذبح کردے۔"

(صحیح مسلم)

نماز سے پہلے قربانی

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا کہ

"سب سے پہلے جو کام ہم اس دن کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ (عید کی) نماز پڑھتے پھر (گھر کو) لوٹ کر قربانی کرتے ہیں تو جو کوئی ایسا کرے' وہ ہمارے طریقہ پر چلا اور جو (نماز سے پہلے) ذبح کرے تو وہ گوشت ہے جس کو اس نے اپنے گھر والوں کے لیے تیار کیا (اور وہ) قربانی نہ ہوگی۔"

سیدنا ابو بردہ بن نیار نے ذبح کرلیا تھا' بولے! "میرے پاس (ایک برس سے کم کا) ایک جذعہ ہے جو مسنہ (ایک برس سے زیادہ عمر کے دوندے) سے بہتر ہے۔"

آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا کہ "تو اس کو ذبح کرلے اور تیرے بعد کسی کو جائز نہیں ہے۔"

(صحیح مسلم)

ذبح کا طریقہ

سیدنا انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے دو مینڈھوں کی قربانی کی جو سفید اور سیاہ سینگ دار تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے ان دونوں کو اپنے ہاتھوں سے ذبح کیا اور میں نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے کاٹتے وقت ان کی گردنوں پر اپنا پاؤں رکھا اور آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے کاٹتے وقت بسم اللہ واللہ اکبر کہا۔"

(صحیح مسلم)

قربانی کابیان

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے ایک سینگ دار مینڈھا لانے کا حکم دیا جو سیاہی میں چلتا ہو اور سیاہی میں بیٹھتا ہو اور سیاہی میں دیکھتا ہو (یعنی پاؤں اور پیٹ اور آنکھوں کے گرد سیاہ ہو) پھر ایک ایسا مینڈھا قربانی کے لیے لایا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔

"اے عائشہ! چھری لا۔" پھر فرمایا کہ "اس کو پتھر سے تیز کرلے۔" میں نے تیز کردی۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے چھری لی اور مینڈھے کو پکڑا' اس کو لٹایا پھر اس کو ذبح کیا پھر فرمایا۔

"بسم اللہ' اے اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کی طرف سے اور محمد (صلی اللہ علیہ و سلم کی) کی آل کی طرف سے اور محمد (صلی اللہ علیہ و سلم) کی امت کی طرف سے اس کو قبول کر۔" پھر اس کی قربانی کی۔

(صحیح مسلم)

قربانی کے گوشت کابیان

عبداللہ بن ابوبکر' سیدنا عبداللہ بن واقد رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے قربانیوں کا گوشت تین دن کے بعد کھانے سے منع فرمایا ہے۔

عبداللہ بن ابوبکر کہتے ہیں' میں نے یہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بیان کیا تو انہوں نے کہا کہ عبداللہ نے سچ کہا۔

میں نے ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے سنا' وہ کہتی تھیں کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم کے عہد میں دیہات کے چند لوگ عیدالاضحیٰ میں شریک ہونے کو آئے (اور وہ محتاج لوگ تھے) تو آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا کہ قربانی کا گوشت تین دن کے موافق رکھ لو اور باقی خیرات کردو (تاکہ یہ محتاج بھوکے نہ رہیں اور ان کو بھی کھانے کو گوشت ملے۔)

اس کے بعد لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ و سلم! لوگ اپنی قربانیوں سے مشکیں بناتے تھے (ان کی کھالوں کی) اور ان میں چربی پگھلاتے تھے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا۔ "اب کیا ہوا؟"

لوگوں نے عرض کیا کہ "آپ صلی اللہ علیہ و سلم نے قربانیوں کا گوشت تین دن کے بعد کھانے سے منع فرمایا" (اور اس سے نکلا کہ قربانی کا کوئی جزو تین دن سے زیادہ نہ رکھنا چاہیے)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”میں نے تمہیں ان محتاجوں کی وجہ سے منع کیا تھا جو اس وقت آگئے تھے۔ اب کھاؤ اور رکھ چھوڑو اور صدقہ دو۔“
(صحیح مسلم)

غیر اللہ کے نام پر قربانی

ابو الطفیل عامر بن واثلہ کہتے ہیں کہ میں سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے پاس بیٹھا تھا کہ اتنے میں ایک شخص آیا اور کہنے لگا کہ ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! آپ کو چھپا کر کیا بتلاتے تھے؟“

یہ سن کر سیدنا علی رضی اللہ عنہ غصہ ہوئے اور کہنے لگے۔ ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے کوئی ایسی چیز نہیں بتلائی' جو لوگوں سے چھپائی ہو مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے چار باتیں فرمائیں۔“

وہ شخص بولا ”اے امیر المومنین ! وہ کیا ہیں؟“

سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے کہا ”نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ اس شخص پر لعنت کرے جو اپنے باپ پر لعنت کرے اور اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے جو اللہ کے سوا اور کسی کے لیے ذبح کرے اور اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے جو کسی بدعتی کو جگہ دے اور اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے جو زمین کے نشان کو بدل دے۔“
(صحیح مسلم)

خطبہ حجتہ الوداع

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے (دسویں ذی الحجہ کو منیٰ میں) فرمایا۔

”دیکھو زمانہ گھوم کر اسی حالت پر آگیا جیسا اس دن تھا' جس دن اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین بنائے تھے۔ سال بارہ مہینے کا ہوتا ہے ان مہینوں میں چار مہینے حرمت والے ہیں۔ تین تو پے در پے ہیں ذیلقعد' ذی الحجہ' محرم اور ایک مضر کا رجب جو جمادی الآخر اور شعبان کے درمیان ہوتا ہے۔ بتلاؤ یہ مہینہ کون سا ہے۔“

ہم نے کہا ”اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو رہے اتنا کہ ہم سمجھے کہ شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے کا کوئی اور نام رکھیں گے۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”یہ ذی الحجہ کا مہینہ ہے۔“

ہم نے کہا۔ ”بیشک ذی الحجہ کا مہینہ ہے۔“

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا۔ ”یہ شہر کون سا شہر ہے؟“

ہم نے کہا اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے ہیں۔

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے اتنا کہ ہم نے سمجھا شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس شہر کا کوئی اور نام رکھیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا یہ مکہ کا شہر نہیں ہے؟“

ہم نے کہا۔ ”بے شک یہ مکہ شہر ہے۔“ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا ”کون سا دن ہے؟“

ہم نے کہا ”اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم خوب جانتے ہیں۔“

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش رہے۔ ہم سمجھے شاید آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس دن کا کوئی اور نام رکھیں گے' پھر فرمایا۔

”کیا یہ یوم النحر نہیں ہے؟“

”ہم نے کہا ”بے شک یوم النحر ہے۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”تو یہ سمجھ لو تمہاری جانیں تمہارے مال و اسباب' عزت آبروئیں سب ایک کی دوسرے پر حرام ہیں جیسے اس دن کی حرمت ہے' اس شہر میں' اس مہینے میں اور تم عنقریب اپنے پروردگار کو ملنے والے ہو' وہ تم سے تمہارے اعمال کی پرسش کرے گا۔ دیکھو سن لو!

قرآن شریف کی آیات کا احترام کیجیے

میرے بعد ایک دوسرے کی گردنیں کاٹ کر (آپس میں لڑ کر) گمراہ نہ ہو جانا' دیکھو جو لوگ یہاں موجود ہیں وہ میری اس حدیث کی خبر ان لوگوں کو کردیں جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ کبھی ایسا ہو گا جس کو خبر پہنچائی جائے گی' وہ پہنچانے والے سے جس نے مجھ سے سنی ہے' زیادہ اس کو یاد رکھے گا۔“

ابن سیرین جب اس حدیث کو بیان کرتے تو کہتے' نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا۔

”اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔“

”دیکھو خبردار ! میں نے اللہ کا حکم پہنچا دیا ہے۔ یقیناً ”میں نے اللہ کا حکم پہنچا دیا ہے۔“
(بخاری شریف)

عید گاہ میں قربانی کرنے کا بیان

ہم سے محمد بن ابی بکر مقدمی نے بیان کیا۔ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ وہیں نحر کرتے تھے جہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نحر کرتے تھے (یعنی عید گاہ میں)
(بخاری شریف)

دوسرے شخص کی قربانی اس کی اجازت سے کرنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے کہا ”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرف میں میرے پاس تشریف لائے۔ میں رو رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”کیا ہوا ! کیا تجھ کو حیض آگیا؟“

میں نے کہا۔ ”جی ہاں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”یہ تو آدم علیہ السلام کی بیٹیوں کے لیے اللہ نے لکھ دیا۔ تو وہ سارے کام کر جو حاجی کرتے ہیں۔ فقط خانہ کعبہ کا طواف نہ کر۔“ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کی طرف سے ایک گائے کی قربانی کی۔“
(بخاری شریف)

حضرت سارہ کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

”سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کبھی جھوٹ نہیں بولا مگر تین دفعہ (بولا) ان میں سے دو جھوٹ اللہ کے لیے تھے۔ ایک تو ان کا یہ قول کہ میں بیمار ہوں اور دوسرا یہ کہ ان بتوں کو بڑے بت نے توڑا ہو گا' تیسرا حضرت سارہ علیہ السلام کے بارے میں تھا۔

اس کا قصہ یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام ایک ظالم بادشاہ کے ملک میں پہنچے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی حضرت سارہ بھی تھیں۔ وہ بڑی خوبصورت تھیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ ”اس ظالم بادشاہ کو اگر معلوم ہو گا کہ تو میری بیوی ہے تو تجھے مجھ سے چھین لے گا۔ اس لیے اگر وہ پوچھے تو یہ کہنا کہ میں اس شخص کی بہن ہوں اور تو اسلام کے رشتہ سے میری بہن ہے (یہ بھی کچھ جھوٹ نہ تھا) اس لیے کہ ساری دنیا میں آج میرے اور تیرے سوا کوئی مسلمان معلوم نہیں ہوتا۔“

اس ظالم بادشاہ کے کارندے اس کے پاس گئے اور بیان کیا کہ تیرے ملک میں ایک ایسی عورت آئی ہے' جو

تیرے سوا کسی کے لائق نہیں ہے" اس نے حضرت سارہ کو بلا بھیجا۔ وہ گئیں اور سیدنا ابراہیم نماز کے لیے کھڑے ہوئے (اللہ سے دعا کرنے لگے اس کے شر سے بچنے کے لیے) جب حضرت سارہ اس ظالم کے پاس پہنچیں تو اس نے بے اختیار اپنا ہاتھ ان کی طرف دراز کیا لیکن فوراً" اس کا ہاتھ سوکھ گیا۔

وہ بولا "تو اللہ سے دعا کر کہ میرا ہاتھ کھل جائے، میں تجھے نہیں ستاؤں گا۔"

انہوں نے دعا کی۔ اس مردود نے پھر ہاتھ دراز کیا پھر پہلے سے بڑھ کر سوکھ گیا۔ اس نے دعا کے لیے کہا تو انہوں نے دعا کی پھر اس مردود نے دست درازی کی پھر پہلی دفعہ سے بڑھ کر سوکھ گیا۔

تب وہ بولا "اللہ سے دعا کر کہ میرا ہاتھ کھل جائے، اللہ کی قسم! اب میں تجھ کو نہ ستاؤں گا۔" حضرت سارہ نے پھر دعا کی، اس کا ہاتھ کھل گیا۔ تب اس نے اس شخص کو بلایا جو حضرت سارہ کو لے کر آیا تھا اور اس سے بولا کہ "تو میرے پاس شیطانی کو لے کر آیا، یہ انسان نہیں ہے۔ اس کو میرے ملک سے باہر نکال دے اور ایک لونڈی ہاجرہ اس کے حوالے کر دے۔"

حضرت سارہ، ہاجرہ کو لے کر لوٹ آئیں جب سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کہا "کیا ہوا؟"

سارہ نے کہا "بس سب خیریت رہی۔ اللہ تعالیٰ نے اس بدکار کا ہاتھ مجھ سے روک دیا اور ایک لونڈی بھی دی۔"

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ "پھر یہی لونڈی یعنی ہاجرہ تمہاری ماں ہے۔"
(صحیح مسلم)

حضرت موسیٰ کا بیان

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام بڑے حیادار مرد تھے، ان کو کبھی کسی نے برہنہ نہیں دیکھا تھا۔ آخر بنی اسرائیل کہنے لگے کہ ان کو فتق (یا دخائے) کی بیماری ہے۔ ایک بار انہوں نے کسی پانی پر غسل کیا اور اپنا کپڑا پتھر پر رکھا تو وہ بھاگتا ہوا چلا اور سیدنا موسیٰ علیہ السلام اپنا عصا لیے اس کے پیچھے چلے، اس کو مارتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔ "اے پتھر! میرا کپڑا دے۔" یہاں تک کہ وہ پتھر بنی اسرائیل کے لوگ جہاں جمع تھے، وہاں جا رکا۔

اسی کے متعلق یہ آیت اتری کہ "اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح مت ہو جنہوں نے موسیٰ کو ستایا (ان پر تہمت لگائی) پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اس بات سے پاک کیا جو لوگوں نے کہی تھی اور وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک عزت والے تھے۔"

دو آدمیوں کا کھانا تین کو کافی

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا "دو آدمیوں کا کھانا تین کو کافی ہو جاتا ہے اور تین کا چار کو۔"
(صحیح مسلم)

مومن کے کھانے کا بیان

سیدنا جابر اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

"مومن ایک آنت میں کھاتا ہے اور کافر سات آنتوں میں۔"

عدنان شاہ ٹیپو اور حاجرہ عدنان

شاہین رشید

شادی ایک مقدس اور خوب صورت رشتہ ہے اور یہ "بندھن" اس وقت اور بھی زیادہ خوب صورت ہو جاتا ہے جب اللہ اس جوڑے کو اولاد کی نعمت سے نوازتا ہے۔

عدنان شاہ ٹیپو اور حاجرہ کی شادی دسمبر 2009ء میں ہوئی اور 22 ستمبر 2011 کو اللہ تعالیٰ نے انہیں دو پیاری بیٹیوں سے نوازا۔

"کیسے ہیں آپ دونوں؟ اور آپ کو بیٹیوں کی پیدائش مبارک ہو۔"

"ہم ٹھیک ٹھاک ہیں اور بہت شکریہ مبارک باد دینے کا۔"

"کیا نام رکھے ہیں اور کس پہ گئی ہیں آپ کی بیٹیاں؟"

"روشنی اور خوشی اور یہ دونوں نام عدنان نے اپنی پسند سے رکھے ہیں اور کس پر گئی ہیں ہماری بیٹیاں تو آپ آکر دیکھیں اور پھر آپ بتائیں کہ کس پر گئی ہیں۔"

"کیسی لگ رہی ہے یہ نئی تبدیلی؟"

"جی بہت اچھی ... لگتا ہے کہ جیسے میں مکمل ہو گئی ہوں۔ بہت پیاری ہیں ہماری بیٹیاں۔"

"مشکل تو ہو رہی ہو گی دونوں کو ایک ساتھ پالنے کی؟"

"ارے نہیں..... میں کوئی اکیلی تھوڑی ہوں۔ میری فیملی ہے، عدنان کی فیملی ہے۔ میری تو باری ہی نہیں آتی اٹھانے کی۔ سب اتنا پیار دے رہے ہیں۔"

"شعاع ڈائجسٹ کے لیے ہم تمہارا اور عدنان کا انٹرویو پہلی مرتبہ کر رہے ہیں۔ اس لیے یہ بتاؤ کہ دونوں کی ملاقات کیسے ہوئی، جبکہ تم پٹھان ہو اور عدنان خالصتاً" پنجابی اور وہ بھی فیصل آباد کے رہنے والے ہ؟"

"بڑے بزرگ کہتے ہیں کہ جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں ہم بھی سنتے تھے مگر سنی ان سنی کر دیتے تھے۔ لیکن جب میرا اور عدنان کا رشتہ طے ہوا تو یقین ہو گیا کہ واقعی جوڑے آسمانوں پہ بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں ملا ہی دیتا ہے۔

ہوا یہ کہ میں اپنی امی کے ساتھ زمزمہ پارک میں صبح کے وقت واک کرنے جایا کرتی تھی اور وہاں عدنان بھی واک کرنے آتے تھے، امی کے ساتھ ہیلو ہائے رہتی تھی۔ امی اور یہ ایک ٹریک پہ واک کرتے تھے اور میں دوسرے پہ انہوں نے مجھے بھی یقیناً" دیکھا ہو گا۔ مگر ہماری کبھی بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ پھر ایک دن انہوں نے میری امی سے میرے بارے میں بات کی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ آپ کی بیٹی نے یقیناً" میرے ڈرامے دیکھے ہوں گے۔ امی نے جب مجھ سے بات کی تو میں نے بتایا کہ ہاں دیکھے تو ہیں مگر زیادہ نہیں پھر میری بھی ان سے ہیلو ہائے شروع ہو گئی۔"

"اظہار محبت کیا یا ڈائریکٹ بات کی؟"

"انہوں نے امی کے ذریعے ساری بات کی اور امی کی رضامندی دیکھ کر پھر انہوں نے اپنی والدہ سے بات کی اور والدہ کو ہمارے گھر رشتے کے لیے بھیجا۔ دونوں خاندانوں کی رضامندی سے رشتہ ہوا اور اگست 2009ء میں ہمارا نکاح ہوا اور 6 دسمبر 2009ء کو رخصتی۔"

"عدنان..... آپ بتائیں سب کچھ ایسے ہی ہوا تھا؟"

"جی بالکل ایسا ہی ہوا۔ ہماری کوئی لو میرج نہیں ہے۔ دونوں کے گھر والوں نے ایک دوسرے کو پرکھا دیکھا، پھر فیصلہ ہو گیا، بس میں نے گھر والوں سے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ کیونکہ ان کی امی سے میری ہیلو ہائے تھی اور جب میں حاجرہ کو دیکھتا تھا تو مجھے اس کی سادگی بہت پسند آتی تھی۔"

"حاجرہ..... عدنان کہہ رہے ہیں کہ آپ کی سادگی انہیں بہت پسند آئی۔ شادی کے بعد کیا صورت حال ہے؟"

"شادی کے بعد بھی یہ مجھے سادگی میں ہی دیکھنا پسند کرتے ہیں۔ بس ان کی خواہش ہوتی ہے کہ میں لپ اسٹک لگالوں اور کاجل اور بہت صاف ستھری رہوں۔ ان کو میک اپ بالکل پسند نہیں ہے اور نہ ہی میک اپ زدہ لڑکیاں۔"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی؟ کیا کیا رسمیں ہوئیں؟"

"ہماری شادی بہت سادگی سے ہوئی۔ عدنان کو سادگی زیادہ پسند ہے۔ اگست میں انتہائی سادگی کے ساتھ نکاح ہوا..... پھر عدنان اپنے کام کے سلسلے میں انڈیا چلے گئے..... دو مہینے بعد جب یہ واپس آئے تو ہماری شادی ہو گئی۔ رسم تو صرف مہندی کی ہوئی اور دوسرے دن رخصتی، بس....."

"عدنان! آپ کیوں اتنے سادگی پسند ہیں..... شادی کی رسمیں تو ہوئی نہیں ویسے تو آپ دونوں گھرانوں کی ثقافت میں فرق ہو گا؟"

"میں اگر اس فیلڈ میں ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میری اپنی زندگی بھی ایسی ہی ہو گی۔ بس قدرتی بات ہے کہ مجھے ہر چیز میں سادگی اچھی لگتی ہے۔ جہاں تک ثقافت کی بات ہے تو ہم سب پاکستانی ہیں۔ یہ بھی کراچی میں رہیں اور میں بھی زیادہ کراچی میں رہا۔ کوئی فرق نہیں ہے ہماری ثقافت میں۔"

"حاجرہ! تم رخصت ہو کر فیصل آباد گئیں..... کیسا لگا فیصل آباد اور کیا سوچیں تھیں تمہاری؟"

"ہماری شادی کراچی میں ہی ہوئی۔ عدنان کے گھر والے یہاں کراچی ہی آ گئے تھے۔ شادی کے بعد میرا فیصل آباد جانا ہوا..... بہت اچھا لگا مجھے..... اور شادی کے وقت میری بھی وہی سوچیں تھیں جو کہ ایک لڑکی کی ہوتی ہیں۔ گھر والوں کو چھوڑنا والدین، بہن بھائی جن کے ساتھ بچپن گزرا، انہیں چھوڑنا ایک مشکل کام ہے مگر ایسا تو ہر لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ شادی کے بعد ہی لڑکی کی اصل زندگی شروع ہوتی ہے۔"

"آج کل جو ملک کے حالات ہیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے آپ کی کامیاب شادی ایک مثال ہے۔ کبھی پنجابی پٹھان کی وجہ سے آپس میں کوئی تکرار کوئی لڑائی وغیرہ ہوئی..... اور رشتے کے وقت کوئی پرابلمز ہوئیں؟"

عدنان نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں جو آج کل ملک کے حالات ہیں اس لحاظ سے تو یہ کام مشکل تھا مگر میں آپ کو بتاؤں کہ لوگ برے نہیں ہیں انہیں برا بنا دیا گیا ہے۔ نہ مجھے اور نہ ہی حاجرہ کے گھر والوں کو اس رشتے پر کسی قسم کا کوئی اعتراض ہوا نہ شادی کے بعد ہماری تکرار زبان کی بنیاد پر ہوئی۔ ہماری زندگی ماشاءاللہ بہت اچھی گزر رہی ہے اور انشاءاللہ ہمیشہ اچھی گزرے گی۔ اگر ہم مسلمان ہیں تو سوچیں کہ حضورؐ کے زمانے میں شادی کے ذریعے ہی ثقافتوں کا تبادلہ ہوا کرتا تھا۔"

"عدنان! آپ کے سسرال والوں سے تعلقات کیسے ہیں؟ عموماً" داماد اپنا رعب ضرور قائم رکھتے ہیں؟"

"ارے نہیں..... میں نے کوئی داماد والا رعب نہیں رکھا ہوا۔ میرے اپنے سسرال والوں سے بہت اچھے تعلقات ہیں اور میری فیملی تو زیادہ تر فیصل آباد میں رہتی ہے تو یہاں مجھے اپنے سسرال والوں سے بہت پیار ملتا ہے۔ یہاں میں اپنی ساس کی بہت تعریف کروں گا کیونکہ وہ مجھے بالکل سگی ماں جیسا پیار دیتی

ہیں۔"

"آپ نے کہا کہ فیملی زیادہ تر فیصل آباد میں رہتی ہے۔ تو کچھ بتایئے اپنی فیملی کے بارے میں؟"

"ضرور میں فیصل آباد کا رہنے والا ہوں۔ وہیں پیدا ہوا اور اسی شہر میں اپنی تعلیم مکمل کی۔ میں نے ایم اے جرنلزم پنجابی زبان میں کیا ہے۔ ہم چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ بہن بھائیوں میں میرا نمبر تیسرا ہے۔ میرے والد کا نام سید غضنفر علی شاہ ہے اور والدہ کا نام جمیلہ بیگم ہے۔"

"حاجرہ کی کیا بات آپ کو بری لگتی ہے..... اور کون سی بات بہت اچھی لگتی ہے؟"

"حاجرہ کی یہ بات مجھے بہت بری لگتی ہے کہ جب یہ غصے میں ہوتی ہے تو کھانا پینا چھوڑ دیتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ بھئی کھانے کا اس میں کیا قصور ہے۔ کم سے کم کھانا تو نہ چھوڑا کرو..... اور باقی تو سب ہی عادتیں اچھی ہیں۔"

"اوہو..... تو کیا غصے کی تیز ہیں؟"

"جی بالکل..... حاجرہ کا غصہ تیز ہے اور میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی اس عادت کو ختم کردے۔ یہ غصے سے صرف اپنے آپ کو نقصان پہنچاتی ہے اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ یہ غصے میں کھانا پینا چھوڑ دیتی ہے۔ ویسے غصہ ٹھنڈا بھی جلدی ہو جاتا ہے۔"

"اور اپنے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ حاجرہ! تم بتاؤ ان کے بارے میں؟"

(ہنستے ہوئے) "مجھے بھی غصہ بہت آتا ہے۔" عدنان نے کہا۔

"نہیں، میں آپ کو بتاتی ہوں..... یہ اپنے پورے خاندان میں بہت صبر والے اور بہت سلجھے ہوئے انسان کی حیثیت سے مشہور ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ میں نے بھی انہیں کبھی بہت زیادہ غصے میں نہیں دیکھا۔ اچھے خاصے ٹھنڈے مزاج ہیں۔ اور پھر وہ مرد ہی کیا کہ جس کو غصہ نہ آئے۔"

"میں نے عدنان سے تمہارے میکے والوں کے بارے میں پوچھا۔ تم بھی بتاؤ اپنے سسرال کے بارے میں تم نے ساس کو کیسا پایا..... کیونکہ بچاری ساس کے لیے تو بہت سی کہانیاں مشہور ہوتی ہیں۔"

"جی ہاں..... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ لیکن سچ پوچھیں تو میری ساس اور میری نندیں بہت ہی اچھی ہیں۔ یہ تو پیار محبت کے رشتے ہیں اور پیار سے پیار ہوتا ہے۔ اگر ہم اچھے ہیں تو دوسرا بھی اچھا ہوگا اور اگر دوسرا اچھا ہے تو ہم بھی اچھے ہوں گے۔"

"حاجرہ! تم کتنے بہن بھائی ہو۔ کچھ اپنے بارے میں بتاؤ؟"

"جی..... میرے پانچ بھائی اور ہم چار بہنیں ہیں اور میرا نمبر آخری ہے۔ جسے عام زبان میں کھرچن بھی کہتے ہیں۔ میرا تعلق مردان سے ہے اور بنیادی طور پر میں ایک فزیو تھراپسٹ ہوں اور شادی سے پہلے جاب کرتی تھی۔"

"عدنان کافی عرصے سے شوبز سے وابستہ ہیں۔ رشتہ طے کرتے وقت کوئی خوف تھا یا مشہور بندے سے شادی کرنے کی خوشی تھی؟"

"چونکہ یہ کافی عرصے سے شوبز سے وابستہ ہیں اور ان کے بارے میں کبھی کوئی بات بھی نہیں سنی تو اس لیے کوئی خوف بھی محسوس نہیں ہوا اور جہاں تک مشہور بندے سے شادی کی خوشی کی بات ہے تو میں نے ان کی شہرت سے متاثر ہو کر شادی نہیں کی۔ صرف اور صرف ان کی شرافت اور خاندانی بیک گراؤنڈ دیکھ کر شادی کی۔"

"آپ دونوں ایک ساتھ نکلتے ہیں تو ظاہر ہے کہ لوگوں کی توجہ عدنان پر ہی ہوتی ہو گی اس وقت کیا احساسات ہوتے ہیں تمہارے؟"

"مجھے ان کے ساتھ جانا اور لوگوں کا ان سے محبت سے ملنا بہت اچھا لگتا ہے۔ شہرت اور عزت سب کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ ہمیں رب کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ جب لوگ ان کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے بہت اچھا بھی لگتا ہے اور خوشی بھی ہوتی ہے۔"

"شادی کی کوئی یادگار بات؟"

"بہت ساری ہیں۔ مگر ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ شادی کے پانچویں دن انہوں نے مجھے ناشتہ بنا کر دیا تھا اور یہ چائے بہت اچھی بناتے ہیں اور ــــ اچھا خاصا پکا بھی لیتے ہیں اور سیب تو آج تک خود کاٹ کر کھلاتے ہیں۔"

"گڈ..... عدنان آپ بتائیں حاجرہ سگھڑ ہیں یا صرف آپ ہی سگھڑ ہیں؟"

"حاجرہ بہت سگھڑ ہو گئی ہے۔ شادی سے پہلے اسے پکانا نہیں آتا تھا۔ شاید اپنی تعلیمی مصروفیات کی وجہ سے لیکن اب تو بہت اچھا پکا لیتی ہے۔ ماشاء اللہ کام میں سگھڑ ہو گئی ہے۔ اصل میں سگھڑ شوہر ملا ہے تو اس نے بھی سگھڑ ہونا ہی تھا۔" (قہقہہ)

"آپ نے سولہ سال کراچی میں تقریباً" اکیلے زندگی گزاری۔ بیگم کے آنے سے آزادی تو ختم ہو گئی ہوگی؟"

"شادی تو بہت خوب صورت بندھن ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ شادی کے بعد انسان خصوصاً" مرد کی بہت سی بری عادتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ جیسے دیر سے گھر آنا، رات گئے دوستوں کے ساتھ محفل جمانا، گھومنا پھرنا یہ سب ختم ہو جاتا ہے۔ اس میں ڈسپلن آجاتا ہے۔ وہ اپنے گھر کو ترجیح دیتا ہے۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ پابندی آزادی سے کہیں بہتر ہے۔"

"حاجرہ کے سگھڑپن کی بات کر رہے تھے تو یہ بتائیں کہ یہ ایک ہاؤس وائف کی طرح آپ کی خدمت کرتی ہیں؟"

"جی بالکل کرتی ہیں۔ آپ یقین کریں کہ پہلے جب میں اکیلا ہوتا تھا تو اپنے سارے کام خود کرتا تھا مگر ان کے آجانے سے میں بہت آرام طلب ہو گیا ہوں۔ حاجرہ نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ میرے سارے کام یہ کر دیتی ہیں۔ مجھے پتا بھی نہیں ہوتا اور ہر چیز ریڈی ہوتی ہے۔"

"اب تو خیر سے آپ دونوں ماں باپ بن گئے ہیں لیکن کیا کبھی آپ کا دل چاہا کہ حاجرہ آپ کے ساتھ فیلڈ میں ہوں؟ جس طرح آج کل رواج چل پڑا ہے کہ میاں بیوی دونوں ہی ایک فیلڈ میں ہوتے ہیں؟"

"اس فیلڈ کے لیے تو میں نے کبھی نہیں سوچا اور نہ ہی میرا خیال ہے کہ حاجرہ چاہے گی وہ شوبز میں آئے۔ ہاں وہ ایک فزیو تھراپسٹ ہے۔ زندگی میں کبھی اس کا جاب کرنے کو دل چاہے تو پھر وہ اپنی فیلڈ کی جاب کرے گی۔"

"حاجرہ! اب تو آپ مصروف ہو گئی ہیں اب تو یقیناً" عدنان آپ کے ساتھ گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے ہوں گے۔ کیا پہلے بھی بٹاتے تھے؟"

"جی بالکل..... ہاتھ بٹاتے ہیں اور جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے بتایا کہ انہوں نے کافی عرصہ اکیلے زندگی گزاری ہے تو انہیں ماشاء اللہ سب کام کرنے آتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔"

"تم ان کے ڈرامے شوق سے دیکھتی ہو؟"

"شادی سے پہلے تو ایک آدھ ڈرامہ ہی دیکھا تھا کیونکہ ڈرامے دیکھنے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا۔ پھر جب شادی ہوئی تو ان کے ساتھ بیٹھ کر دیکھ لیتی تھی۔ اب جب سے ماشاء اللہ روشنی اور خوشی آئی ہیں ٹی وی دیکھنے کا تو بالکل بھی ٹائم نہیں ملتا اور نہ ہی کہیں آنے جانے کا۔"

"اور کچھ کہنا چاہو گی؟"

"بس یہی کہ میں اپنی لائف سے بہت خوش ہوں اور خدا کرے ہماری زندگی ایسے ہی خوشگوار گزرتی رہے اور لوگ ہماری مثالیں دیں۔ میں بہت خوش قسمت ہوں کہ مجھے عدنان جیسا شوہر ملا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے انٹرویو کا اختتام کیا۔

ماڈل	ثناء
فوٹو	موسیٰ رضا
میک اپ	روز بیوٹی پارلر

عیدالاضحیٰ کی پُرمسرت ساعتیں قریب قریب ہیں۔
یوں تو عید سے قبل ہی عید کے لیے خوب ساری تیاری کرلی جاتی ہے مگر پھر بھی خواتین کا بیشتر وقت کچن کی نذر ہوجاتا ہے۔ انواع اقسام کے پکوان اور مہمانوں کی آمدورفت انہیں خاصا مصروف رکھتی ہے۔
قربانی کی مصروفیات کے باوجود زرق برق کپڑے، چوڑیاں، مہندی، عیدی اور دعوتوں سے ہی عید کے لمحات رنگین ہوتے ہیں۔
ہمیشہ کی طرح اس سال بھی ہم نے نمکین عید اپنی قارئین کے ساتھ منانے کا اہتمام کیا ہے۔ عیدالاضحیٰ پر سروے کے سوالات یہ ہیں۔
1 - آپ کو سب سے زیادہ لطف کون سی عید پر آتا ہے۔ عیدالفطر یا عیدالاضحیٰ؟
2 - عیدالاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے حوالے سے پیش آنے والا کوئی دلچسپ واقعہ؟
3 - اس عیدالاضحیٰ پر کون سی ڈش خاص طور پر بنانے کا ارادہ ہے۔ اس ڈش کی ترکیب لکھیے۔

نمکین عید، میٹھے لمحات

ادارہ

منزہ اکرم...... کراچی

بالکل ٹھیک کہا آپ نے کہ کسی بھی خوشی، عید اور تہوار کے موقع پر خواتین کا زیادہ وقت کچن میں ہی گزرتا ہے۔
1۔ مجھے تو دونوں عیدوں پر ہی بہت مزا آتا ہے۔ عیدالفطر پر رمضان المبارک کی برکتوں اور رحمتوں کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ گھر کی تفصیلی صفائی کرنا اور اس کے ساتھ شاپنگ کرنا، تحفے تحائف کا تبادلہ کرنا، چاند رات کو چوڑیاں پہننا اور مہندی لگانا۔
اس سب سلسلے سے تھکن تو ہوجاتی ہے مگر بھی عید کا اپنا مزا ہے اور پھر عید کے دن اپنے بڑوں سے عیدی لینا اور بچوں کو عیدی دینا۔ اس کے برعکس عیدالاضحیٰ پر زیادہ مصروفیت ہوتی ہے۔ قربانی کرنا گوشت تقسیم کرنا۔
مجھے عیدالاضحیٰ پر بھی اتنا ہی مزا آتا ہے جتنا کہ عیدالفطر پر۔ مجھے کوکنگ کا بہت شوق ہے۔ میں پورے سال کے شعاع اور خواتین ڈھونڈ کر ان میں سے گوشت کی اچھی اچھی ڈشز کی ترکیبیں جمع کرلیتی ہوں پھر ان کو پکا کر سب گھر والوں سے خوب تعریف سمیٹتی ہوں اس لیے مجموعی طور پر میں کہہ سکتی ہوں کہ مجھے دونوں عیدوں پر بہت مزا آتا ہے۔
2۔ یادگار تو بہت سی عیدیں ہیں مگر قربانی کے حوالے سے کوئی دلچسپ واقعہ میرے ذہن میں نہیں آرہا جو میں آپ سے شیئر کروں۔ ویسے یادگار تو یہ عید بھی بن سکتی ہے۔ اگر اس کے سروے میں میرا نام بھی شامل ہوجائے۔
3۔ تیسرے سوال کا جواب بہت ایمانداری سے دے رہی ہوں، مجھے واقعی اپنے گھر والوں کے لیے پکا کر بہت اچھا لگتا ہے۔ میرے گھر والے میری بنائی ہوئی ڈشز بہت انجوائے کرتے ہیں بلکہ ہمارے ملنے جلنے والوں میں بھی میری ڈشز بہت مقبول ہیں۔ سب کو میرے ہاتھ کا ذائقہ بہت پسند ہے۔
میرے ایک بھائی دبئی میں ہوتے ہیں، وہ تو سب سے بڑے فین ہیں میری کوکنگ کے۔ قورمہ، اچار گوشت، پلاؤ، بریانی عیدالاضحیٰ پر سب گھرانوں میں تقریباً" یہی روایتی کھانے پکتے ہیں جو کہ میں بھی بناتی

ہوں مگر اس بار میرا ارادہ چپلی کباب اور سیخ کباب بنانے کا بھی ہے۔ یوں تو تقریباً" سب ہی خواتین کو ان کی ترکیبیں آتی ہوں گی پھر بھی میں چپلی کباب بنانے کی ترکیب لکھ رہی ہوں۔ ضرور ٹرائی کیجیے گا اور تعریف پایئے گا۔

چپلی کباب

اجزا:

قیمہ	1 کلو
نمک	حسب ذائقہ
بھنا ہوا زیرہ	1 چائے کا چمچہ
کٹی ہوئی لال مرچ	دو چائے کے چمچے
انار دانہ	1 چائے کا چمچہ
ادرک لہسن کا پیسٹ	1 چائے کا چمچہ
انڈے	2 عدد
پیاز	2 عدد درمیانی
ٹماٹر	2 عدد درمیانے
دھنیا ثابت	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا پسا ہوا	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچ	حسب پسند
ہرا دھنیا	1 گٹھی
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب:

آدھا قیمہ ایک کپ پانی ڈال کر ابال لیں، پھر پانی خشک ہوجائے تو اسے باقی قیمے میں ملا کر بہت باریک پیس لیں۔ پھر تمام مسالے اس میں شامل کردیں۔ بڑے بڑے کباب بنا کر توے پر یا فرائنگ پین میں تل لیں۔

آخر میں سب کے لیے دعا کہ اللہ کرے یہ عید اور آئندہ آنے والی تمام عیدیں کُل مسلمانوں کے لیے خوشی اور مسرت لے کر آئیں (آمین)

طاہرہ یا سمین انصاری..... فیصل آباد

آپ نے بالکل بجا فرمایا' عید کے موقع پر خواتین کا زیادہ کیا سارا وقت کچن کی نذر ہی ہو جاتا ہے شادی سے پہلے تو ڈنڈی مار لیتے تھے اور ماما کچن کا سارا کام کرتی تھیں مگر اب شادی ہو گئی ہے اور ہم ایک بھرے پرے سسرال کی بہوہیں تو کچن کی ساری ذمہ داری ہم پر ہی ہے۔

1۔ زیادہ مزا کس عید پر آتا ہے یہ سوچنے والی بات ہے۔ بہت سوچا اور یہ نتیجہ سامنے آیا کہ زیادہ مزا عید الفطر پر آتا ہے کیونکہ عید الفطر پر گھومنے پھرنے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ عید الاضحیٰ پر تو کام ختم ہوتے ہی نظر نہیں آتے۔ قربانی کا گوشت بانٹنا اور انواع و اقسام کی ڈشز بنانا تو گھومنے پھرنے کا ٹائم بہت کم ہوتا ہے۔

2۔ عید الاضحیٰ کے حوالے سے ایک واقعہ ہماری یادداشت میں آج تک محفوظ ہے۔ ایک بار پاپا عید سے تین ماہ پہلے دو بکرے لے کے آئے۔ دونوں جڑواں بھائی تھے۔ وہ بکرے ہمیں بہت پیارے لگتے تھے۔ ہم انہیں خود اپنے ہاتھوں سے چارہ کھلاتے پانی پلاتے گویا ان بکروں میں ہماری جان تھی۔ جب انہیں کوئی کچھ کہتا تو ہم ان سے لڑ پڑتے۔ بکروں میں ہماری جان تھی۔ ان کے نام ہم نے پومی اور ٹونی رکھے۔

جب انہیں قربان کرنے کا دن آیا تو ہم بہت روئے' تڑپے اِس وقت بچے تھے' قربانی کے مفہوم کا بالکل اندازہ نہیں تھا۔ پاپا قصائی کو لینے گئے تو ہم نے اپنے پومی اور ٹونی کو اپنے کمرے میں چھپا دیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ پاپا آئے اور ہم سے بکروں کے بارے میں دریافت کیا ہم نے پاپا کو بالکل نہ بتایا، مگر بکروں نے میں میں کر کے خود ہی اپنے ہونے کا اعلان کر دیا تو پاپا مسکرا دیے اور انہیں باہر لے آئے اور ہماری آنکھوں کے سامنے انہیں قربان کر دیا۔ ہم بہت روئے تڑپے اور ہمیں کافی دن بخار رہا۔ آج یہ واقعہ یاد کرتے ہیں تو ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی ہے اور آنکھوں میں آنسو بھی۔

3۔ عید الاضحیٰ پر تو بہت ساری ڈشز بنتی ہیں۔ بھنا گوشت' کٹاکٹ' نمکین گوشت' لیکن میرے ہزبینڈ کو کڑاہی گوشت بہت پسند ہے اور میں ہر عید پر یہ ڈش ضرور بناتی ہوں اور سب سے داد وصول کرتی ہوں۔ قارئین کے لیے اس ڈش کی ترکیب حاضر ہے۔

کڑاہی گوشت

اشیاء :

گوشت — ایک کلو (بغیر چکنائی کی چھوٹی بوٹیاں)
گھی — ایک پیالی
پیاز — تین عدد بڑی
ٹماٹر — 5 عدد بڑے سائز کے
پسا ہوا گرم مسالا — ڈیڑھ چمچ
سرخ مرچ پسی ہوئی — دو چمچ
نمک — ڈیڑھ چمچ
ادرک — دو تین انچ کا ٹکڑا
زیرہ ثابت — ایک چمچ
دار چینی — ایک درمیانہ ٹکڑا

ترکیب :

گھی اور پسے ہوئے گرم مسالے کے علاوہ سب چیزوں کو دیگچی میں ڈال دیں یعنی گوشت کو دھو کر پیاز کو کاٹ کے اور ادرک کو پیس کر شامل کر دیں ٹماٹر کے قتلے' زیرہ اور دار چینی نمک مرچ اور تین پیالی پانی ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں ڈھکنا اچھی طرح بند کر دیں تاکہ بھاپ نہ نکل سکے۔ جب پانی خشک ہو جائے اور گوشت گل جائے تو گھی ڈال کر خوب بھون لیں۔ جب مسالا گھی چھوڑ دے تو اتار کر پسا ہوا گرم مسالا چھڑک دیں۔ لیجیے مزیدار کڑاہی گوشت تیار ہے۔ عید پر اپنے گھر والوں کو کھلائیں اور خوب داد وصول کریں اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

میری طرف سے تمام قارئین کو دلی عید مبارک۔

فرخ فاطمہ..... اوکاڑہ

1۔ عید یا کسی بھی خوشی کے موقع پر خواتین کا بیشتر وقت کچن میں صرف ہوتا ہے، لیکن ہم تو ابھی خواتین میں شمار نہیں ہوتے۔ (اہم' میرا مطلب ہے نو عمر لڑکیوں میں شمار ہوتے ہیں)۔ لہٰذا یہ کچن کی ڈیوٹی امی حضور کے سپرد اور میرے عیش ہی عیش۔ کم از کم چھوٹی عید اور بڑی عید پر تو برابر انجوائے کرتی ہوں۔ (اب آپ یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ میں پھوہڑ ہوں۔ الحمد اللہ مجھے تمام کوکنگ آتی ہے)

2۔ عید الاضحیٰ پر پیش آنے والا کوئی دلچسپ واقعہ

ارے بھئی یاد آکے ہی نہیں دے رہا کوئی واقعہ.....
ہاں' ہاں آرہا ہے' آرہا ہے یاد (ابھی راستے میں ہے)
ہاں یاد آگیا (شکر ہے)

ہوا کچھ یوں کہ آج سے دس برس قبل جب بابدولت پانچ سال کے تھے' ہم بقرعید والے دن صبح صبح تیار ہو کر کسٹرڈ کی پلیٹ ہاتھ میں تھامے ہمسایوں کے گھر دینے جا رہے تھے۔ بکرے دروازے کے پاس ہی بندھے ہوئے تھے۔ جب ہم گیٹ عبور کرنے لگے تو ہماری سبز فراک کو گھاس سمجھتے ہوئے بکرے صاحب عین ہمارے آگے آگئے اور ہمارا ہاتھ ان کے سینگ سے الجھ گیا۔

کسٹرڈ ہماری نئی نکور فراک پر گر گیا۔ ہمیں اتنا غصہ آیا کہ ہم نے بکرے کو دو چار لاتیں رسید کر دیں۔ ہمارا کزن اسد الرحمٰن بہت شرارتی ہے۔ جونہی اس نے یہ منظر دیکھا تو ہمیں ڈرانے لگا۔

فرخ! تم نے قربانی کے بکرے کو مارا ہے' اب اللہ تمہیں مارے گا اور ہم معصوم ناداں سارا دن دل ہی دل میں رو کر اللہ سے دعائیں مانگتے رہے کہ وہ ہمیں نہ مارے۔ سارا دن گھر والے حیران ہوتے رہے کہ اس کو کیا ہوا ہے؟ شکل پہ مسلسل بارہ بجے ہوئے ہیں۔
وہ مشکل وقت تو گزر ہی گیا' لیکن اب ہمیں وہ وقت یاد کر کے بہت ہنسی آتی ہے۔

3۔ بھئی عید والے دن تو کوکنگ کا شعبہ ماما جانی کا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس عید پر تو میرا کوئی بھی ڈش ٹرائی کرنے کا موڈ نہیں ہے۔ ان شاء اللہ جب بھی بنا اپنے پیارے شعاع کی پیاری قارئین کے لیے ضرور لکھیں گے۔

ثمینہ اکرم..... بہار کالونی لیاری

1۔ عید الفطر کی اہمیت اپنی جگہ..... مگر عید الاضحیٰ پر تو کچن کی رونق دیکھنے والی ہوتی ہے۔ اس لیے مجھے عید الاضحیٰ زیادہ اچھی لگتی ہے۔ وہ لوگ جو پورے سال کچن میں جھانکتے تک نہیں۔ وہ بھی کچھ نہ کچھ پکانے کے لیے سرگرم نظر آتے ہیں ——— معیز' اکرم ہر سال اپنے ہاتھ سے سیخ بوٹی ضرور بناتے ہیں اور اب تو ایکسپرٹ ہو چکے ہیں اسود' مومن بھی ان کی ہیلپ کرتے ہیں۔

اس عید پر بے شک خواتین کے لیے کچن کا کام سو گنا بڑھ جاتا ہے۔ پورا دن گوشت صاف کرنا' دھو کر پیکٹ بنا کر فریز کرنا' پھر گوشت کے حصے بنانا اور مختلف جگہ تقسیم کرنا۔ چونکہ ہمارے ہاں سب آپس میں خود ہی اپنی اپنی گائے' بکرے مل جل کر ذبح کر لیتے ہیں اس لیے قصائی کی ٹینشن سے آزاد رہتے ہیں۔

میرے بچے تو عید الفطر کے ''فوراً'' بعد سے عید الاضحیٰ کا انتظار کرنا شروع کر دیتے ہیں اس لیے مجھے یہ عید زیادہ اچھی بھی لگتی ہے ——— ویسے بھی ہر گلی محلے میں قربانی کے جانوروں کی وجہ سے بہت رونق میلہ لگا رہتا ہے۔

جب بھی گلی میں قربانی کا کوئی جانور آئے بچوں کی خوشی دیدنی ہوتی ہے۔

2۔ عید الاضحیٰ کے حوالے سے یہ واقعہ غالباً'' بابا (سسر مرحوم) کی زندگی کی آخری عید کا احوال ہے۔ بابا کافی عرصہ سے بیمار تھے اور بیماری اور علاج معالجے کی وجہ سے اس سال قربانی کا بکرا نہیں آسکا تھا۔ یہاں

تک کہ چاند رات آگئی میرے بچے اپنا بکرا نہ آنے پر اداس تھے۔ چاند رات کو وہ مایوس ہو کر سو گئے کہ صبح تو عید ہے مگر ہمارا بکرا نہیں آیا۔ مگر وہ لوگ جب عید کی صبح سو کر اٹھے تو دروازے پر بلیک کلر کا بڑا خوب صورت سا بکرا بندھا تھا۔ یقین جانیں ان معصوم چہروں کی چمک اور خوشی آج بھی بھلائے نہیں بھولتی ہوائیوں کہ بابا سے ان کی یہ اداسی دیکھی نہ گئی اور انہوں نے جھٹ سے اپنا صندوق کھولا اور ودود کو بلا کر بکرا لانے کے لیے رقم دے دی۔ کافی رات گزر چکی تھی اور جب ودود بکرا لائے تو کسی کو خبر نہ ہوئی اور یوں عید کی صبح بچے قربانی کا بکرا دیکھ کر خوشی و حیرت سے گنگ رہ گئے اور یوں قربانی کے حوالے سے یہ عید ہم سب کے لیے یادگار ٹھہری۔

3۔ اپنے پیاروں کو اپنے ہاتھ سے کوئی خاص چیز پکا کر کھلانے اور داد وصول کرنے میں ایک الگ ہی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ہر گھر کی طرح ہمارے گھر میں بھی گوشت سے بننے والی تقریباً ساری ڈشز بنتی ہیں۔ اس معاملے میں ہمیں بہت سلیقہ مند ہوں...... آہم...... میں عید والے روز ہی گوشت کے مختلف پیکٹس بنا کر مارکر سے ان پر نام لکھ کر رکھ دیتی ہوں (فریزر میں) تاکہ جب بھی جو ڈش بنانی ہو وہ پیکٹ نکال لیا۔ اس طرح بہت سہولت اور آسانی رہتی ہے۔ عیدالاضحیٰ پر میں نہاری، نلی نہاری، پائے، حلیم، دھواں گوشت، کوفتے، کھڑے مسالے کا قیمہ ــــــ فرائی گوشت، شامی کباب، چپلی کباب اور خاص طور پر کچے قیمہ کے اسٹک کباب ضرور بناتی ہوں مگر یہ سب ڈشز ایک ساتھ نہیں بلکہ ایک ایک کر کے الگ الگ دن تاکہ بچے سب چیزوں کو انجوائے کر سکیں۔ مگر زیادہ دن گوشت کو فریز نہ کریں اس سے اس کا ذائقہ خراب ہو جاتا ہے۔

ہر سال ہمارے گھر اسٹک کباب (مٹھی کباب) ضرور بنتے ہیں اور اسی کی ترکیب میں یہاں لکھ رہی ہوں۔ تو آپ اس عید پر اسٹک کباب بنائیں اور اپنے گھر والوں سے داد وصول کریں۔

اسٹک کباب / مٹھی کباب

اجزا:

کچا قیمہ	باریک 1 کلو
(مشین سے دو مرتبہ نکال لیں)	
کٹی مرچ	حسب ذائقہ
کٹا ثابت دھنیا	4 کھانے کے چمچے
کٹا سفید زیرہ	2 کھانے کے چمچے
گرم مسالا (پسا)	2 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
ہرا دھنیا + ہرا پودینا (باریک کاٹ لیں)	ایک گڈی
ہری مرچ	(باریک کاٹ لیں) 6 عدد
لہسن ادرک کا پیسٹ	4 کھانے کے چمچے
کارن فلور	2 بڑے چمچے

ترکیب:

سب سے پہلے باریک قیمہ (پہلے گوشت دھو کر قیمہ بنوالیں) خشک ہونا ضروری ہے بڑے برتن میں لے کر کارن فلور کے علاوہ تمام اجزاء اس میں ملا کر 2 گھنٹے کے لیے فریج میں رکھ دیں۔ اب میرینیٹ کیا ہوا قیمہ نکالیں۔ (اسٹک آپ کو باآسانی بازار میں مل جائیں گی) اس میں کارن فلور ملالیں ہاتھ کی ہتھیلی پانی سے گیلی کریں، اس پر تھوڑا سا قیمہ رکھیں درمیان میں اسٹک رکھ کر ہاتھ کی مدد سے لمبائی میں کباب بنالیں اور کڑھائی میں تیل گرم کرلیں اور تین چار کباب بنائیں اور فوراً کڑھائی میں ڈال کر ڈیپ فرائی کرلیں فوراً ہی سرو کردیں (بنا کر رکھیں مت)

اگر آپ اسٹک کے بغیر بنانا چاہتے ہیں تو اپنی ہتھیلی پر قیمہ رکھ کر مٹھی میں دبائیں اور لمبے لمبے مٹھی کباب بنا کر فرائی کرلیں۔

سرکہ والی پیاز اور رائتہ چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔ اگر پسند کریں تو نان بھی ساتھ دے سکتے ہیں ورنہ بغیر روٹی کے بہت مزا دیتے ہیں۔

اب آپ کے لیے عیدالاضحیٰ کی بہترین ٹپ، عیدالاضحیٰ پر ہم گوشت تو فریز کر دیتے ہیں مگر ڈھیر ساری ہڈیاں بچ جاتی ہیں۔ خاص طور پر ان کے ہاں جن کے گھر بڑے جانور کی قربانی ہوتی ہے۔ گوشت تو بانٹ دیا جاتا ہے مگر ہڈیاں سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے ٹھکانے لگائیں۔ آپ سب ہڈیوں کو ایک بڑے پتیلے میں پانی، نمک، ہلدی، ثابت لہسن، ادرک، پیاز اور تھوڑا ثابت گرم مسالا ڈال کر چولہے پر چڑھا دیں۔ آہستہ آہستہ پکنے دیں۔ جب پانی آدھا رہ جائے تو ہڈیاں نکال کر پھینک دیں اور بچ جانے والی یخنی کو محفوظ کرلیں۔

چاول میں یا سالن میں ڈالیں گی تو کھانے کا مزا دوبالا ہو جائے گا۔

فریدہ سہیل...... اقبال ٹاؤن لاہور

1۔ پہلا سوال پڑھ کر دل کو جواب کے لیے ٹٹولا تو پہلا جواب یہی آیا کہ دونوں عیدیں ہی مسلم امّہ کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک سے بڑھ کر ایک خوب صورت تحفہ ہیں۔ پھر دل کو دوبارہ مجبور کیا کہ نہیں بھئی ایک بتاؤ تو جواب عیدالفطر کے حق میں آیا......

کچن کی مصروفیات تو دونوں عیدوں میں خوب ہوتی ہیں۔ عیدالفطر پر اگر چکن کی شامت آئی ہوتی ہے تو عیدالاضحیٰ پر بچارے بکرے پر تجربات کیے جاتے ہیں۔ اور پھر چاند رات، چوڑیاں اور گہنے...... بس تو پھر کیا ہی کہنے!

2۔ عیدالاضحیٰ کے سلسلے میں جو یادگار واقعہ آپ سے شیئر کرنے جا رہی ہوں وہ میری شادی کے بعد پہلی عیدالاضحیٰ کا ہے۔ ہماری شادی عیدالفطر کے چند دن بعد ہوئی تھی یوں اس عید تک میں ''نئی نویلی'' ہی تھی۔

ہمارے گھر کے ساتھ ہی میرے ماموں سسر کا گھر ہے اور درمیان میں رستہ بھی ہے۔ ماموں امریکہ میں ہوتے ہیں۔ ہماری شادی کے سلسلے میں فیملی کے ساتھ پاکستان آئے تو پھر عیدالاضحیٰ کے بعد ہی گئے۔ عید آئی تو خالہ ساس بھی اپنی بیٹی کے ساتھ آگئیں تو ہم تین فیملیز نے اکٹھے عید منائی۔ چار بکرے خریدنے اور پھر ان کی ''مہمانداری'' اور رکھوالی سے سین بھی خوب رہے۔ عید کے دن نماز عید کے بعد، ماموں جی نے مزیدار کلیجی پکانے کے مقابلے کا اعلان کر دیا اور اپنے قریبی دوستوں کو بھی مدعو کرلیا۔ جیسے ہی کلیجی کٹ کر آئی ہم سب خواتین اپنی اپنی تراکیب سے کلیجی پکانے پر جُت گئیں اور بالآخر اپنی اپنی ٹرے تیار کر کے ڈرائنگ روم میں بھجوا دیں۔ سب مرد حضرات نے میری والی ٹرے کے حق میں فیصلہ دیا حالانکہ ٹریز کے بارے میں نہیں بتایا گیا تھا کہ کونسی کس کی ہے۔ یوں نہ صرف میں نے یہ مقابلہ جیت لیا بلکہ ہزار کا کڑکتا نوٹ بھی انعام میں پایا۔

ناشتے کے بعد جب بکروں کے گوشت کی ''سپلائی'' شروع ہوئی تو ہر ٹونگ میں ''بکرا'' نام ہی حذف ہو گیا اور سب خواتین کچھ یوں گفتگو فرما رہی تھیں۔

یہ براؤن پائے میرے ہیں اور کالے باجی کے

میرا تو بس اٹھارہ کلو گوشت نکلا ہے

ارے یہ سری تو بھائی جان کی ہے

میں تو اپنی کھال ''شوکت خانم'' میں ہی بھجواؤں گی وغیرہ وغیرہ۔ ہم ینگ پارٹی نے خوب انجوائے کیا ان جملوں کو، لیکن مزے کی بات ہمارے بلند و بانگ قہقہوں کے باوجود امیوں نے نہ صرف اپنا شغل جاری رکھا بلکہ کئی ''رشتہ داروں'' کے گوشت بھی پیک کیے۔

3۔ میں نے بچپن سے عیدالاضحیٰ کے موقع پر اپنی امی جان (مرحومہ) کو ''سر کے والا گوشت'' پکاتے ہوئے دیکھا ہے۔ شادی کے بعد یہ میں نے اپنے گھر (یعنی اپنی سسرال) میں بھی پکایا اور خوب داد پائی اور اب یہ ہمارے گھر میں بھی لازمی پکتا ہے۔ بہت ہی آسان ہے اور بے حد لذیذ بنتا ہے۔ آزمائش شرط ہے۔

ترکیب حاضر خدمت ہے۔

سرکے والا گوشت

اشیاء :

گوشت	دو کلو (خوب صاف کرلیں)
زیرہ	ایک چائے کا چمچ
آئل	1/2 کپ
ہری مرچیں	12 سے 15 عدد
ثابت گول لال مرچیں	12 سے 15 عدد
سرکہ	6 بڑے چمچ
چاٹ مسالا	حسب ذائقہ
نمک	حسب ذائقہ
لیموں	دو عدد

ترکیب :

آئل میں زیرہ ہلکا سا فرائی کریں۔ خوشبو آنے لگے تو گوشت ڈال دیں اور فرائی کریں۔ اب اس میں باریک کٹی ہری مرچیں اور ثابت لال مرچیں ڈال دیں اور پریشر ککر بند کرکے دم پر رکھ دیں۔ یہ گوشت اپنا پانی چھوڑے گا اور اسی میں گل جائے گا لہٰذا اس میں آپ خود ذرا سا پانی بھی نہ ڈالیں۔ جب گوشت اچھی طرح گل جائے تو سرکہ شامل کرکے مزید بھونیں۔ نمک مرچ شامل کرکے ڈش میں نکال لیں۔ چاٹ مسالا چھڑک کر لیموں کی قاشوں کے ساتھ سرو کریں۔ خود بھی کھائیں۔ دوسروں کو بھی کھلائیں سب انگلیاں چاٹتے رہ جائیں گے۔

آسیہ صدیق ابڑو...... تعلقہ گمبٹ

واقعی ہر خاتون کا زیادہ تر وقت کچن میں ہی گزرتا ہے عید ہو یا کوئی بھی تہوار ہو۔ ہمیں تو دونوں عیدوں پہ بڑا مزا آتا ہے مصروفیت اپنی جگہ مگر ملنا ملانا بھی تو عیدوں پر ہی ہوتا ہے نا۔

2۔ دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ہم عید والے دن ہی قربانی کرتے ہیں تو ہوا کچھ یوں کہ قصائی صاحب نے 3 بجے کا ٹائم دیا تھا اور ہم نے سوچا تھا کہ گوشت 5 بجے تک آجائے گا تو اسی گوشت سے ہم اپنے مہمانوں کی (جو کہ امی والے بھی ہوتے ہیں اور سسرال والے بھی) تواضع کریں گے۔

مگر قصائی صاحب کا کچھ اتا پتا نہیں ہے۔ ہم انتظار کرتے کرتے دوسری چیزوں سے تواضع کرچکے ہوتے ہیں اور 6 بجے قصائی صاحب آتا ہے اور گوشت آتے آتے 9 بج جاتے ہیں۔ ہم کام سے نڈھال تو اضع بھی کرتے ہیں اور گوشت بھی بانٹنے کے لیے بناتے ہیں جو کہ قصائی نے بڑے بڑے بوٹیوں کی صورت میں دیا تھا۔ سب ہنستے ہیں اور مل جل کر کام کرتے ہیں اور رات کے 11 بج جاتے ہیں اور عید کا دن تمام ہو جاتا ہے۔ دوسرے دن ہم سسرال جاتے ہیں جو کہ قریب ہی ہے۔

3۔ اس دفعہ میں کوفتے بناؤں گی جو کہ سب کو بنانے آتے ہیں۔

مجھ سے میرے شوہر بہت پیار کرتے ہیں۔ جو بھی پکاتی ہوں مزے لے لے کر کھاتے ہیں اور بچوں کو بھی میرا بنایا ہوا ہر کھانا پسند ہے میں بھی بڑے پیار اور محنت سے کھانا بناتی ہوں جو کہ اکثر پسند کرلیا جاتا ہے۔ نہیں بھی اچھا پکاتی تو بھی پیار کرنے والے لوگ شوق سے کھالیتے ہیں کوئی بھی کھانے میں کیڑا نہیں نکالتا۔

آپ کے پرچوں میں جو آسان سی تراکیب ہوں گی بس وہ بناؤں گی۔ مجھ سے زیادہ سگھڑ خواتین موجود ہیں' ان کی ترکیبیں پڑھ پڑھ کے سیکھ لوں گی' پھر پیار سے بناؤں گی تو انشاءاللہ اچھی بنیں گی۔

مسرت الطاف احمد...... کراچی

1۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ دونوں عیدوں کی اپنی اپنی جگہ ایک خاص اہمیت ہے۔ اگر دیکھا جائے عیدالاضحیٰ اپنی مثال آپ ہے بچپن میں تو عیدالفطر کا مزا ہی الگ تھا۔ دوستوں سے ملنا ملانا' عیدی لینا اور اپنی ساری عیدی کو کھانے پینے میں خرچ کرنے میں جو مزا آتا تھا' اب وہ نہیں رہا۔ اب تو پائیس سال کی عمر میں ہی لوگوں نے عیدی دینا ہی چھوڑ دیا ہے اور رہا ملنا ملانا تو صرف خاندان کے لوگوں تک ہی محدود ہو کر رہ گیا ہے اور رہی دوستوں کی بات تو وہ صرف ایس ایم ایس اور کال تک ہی رہ گئی ہے۔

جب کہ عیدالاضحیٰ کی خاص بات یہ ہے کہ یہ بڑوں کی عید ہوتی ہے۔ عید آنے سے پہلے ہی قربانی کے جانوروں کی دیکھ بھال اور ان کے ساتھ وقت گزارنے میں جو مزا آتا ہے اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔ قربانی کے بعد امی اور بہنوں کے ساتھ مل کر تمام خاندان والوں' رشتہ داروں' پڑوسیوں اور غریبوں میں گوشت تقسیم کرتے ہیں۔ گوشت تقسیم کرنے کے بعد اپنے حصے کے گوشت سے فیملی کے ساتھ باربی کیو کا پروگرام ارینج کرتے ہیں اور عیدالاضحیٰ کے موقع پر گوشت کے نئی نئی ریسپی بنا کر گھر والوں کے تعریفیں وصول کرتے ہیں۔ عیدالاضحیٰ میں گھر میں رہتے ہوئے بھی اس عید کو بھرپور طریقے سے انجوائے کرتے ہیں۔

2۔ عیدالاضحیٰ کے موقع پر کئی دلچسپ واقعات ہیں جو میرے ذہن میں آرہے ہیں لیکن جو واقعہ میں بیان کررہی ہوں میں اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔

پچھلی عید پر ابو جو قربانی کی گائے ہماری ہی خواہش کے مطابق عید سے ایک ہفتہ پہلے لے کر آئے' اس کی وجہ سے ہماری جو شامت آئی' میں کبھی نہیں بھول سکتی' کیونکہ گائے کو آئے ابھی دو دن ہی گزرے تھے کہ اس کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی۔ اس نے کھانا پینا ہی چھوڑ دیا۔ ہر وقت سر جھکا ہی رہتا' ہم سب گھر والے بہت پریشان ہوگئے اور خاص طور پر ابو۔

ابو نے ہمیں خاص طور پر جتایا کہ تم لوگوں کی ضد کی وجہ سے ہی مجھے ایک ہفتہ پہلے لانا پڑا۔ گائے کی یہ کیفیت تین دن تک رہی تو ابو نے صاف کہہ دیا کہ اسے کل ہی ذبح کردوں گا۔ یہ سن کر ہمارے ہوش ہی اڑ گئے۔ ہم سب اللہ سے دعائیں مانگنے لگے اور شکر ہے کہ اللہ نے ہماری سن لی اور اگلے دن ہی ہمارے کزن اسامہ نے ہمیں یہ خوشخبری دی کہ گائے نے کھانا پینا شروع کردیا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی طبیعت سنبھلنے لگی۔ اس کے بعد سب گھر والوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ منظر ابھی تک بھول نہیں پاتی۔

3۔ میرے ہاتھوں کے بنے کھانوں کی تعریف تو کبھی کبھار ہی ہوتی ہے کیونکہ میں کھانا ہی کبھی کبھار بناتی ہوں کیونکہ ابو کو تو صرف امی کے ہاتھ کے بنے کھانے ہی پسند ہیں' خاص طور پر بریانی۔ دل تو بہت کرتا ہے کہ میں بھی بناؤں اور داد وصول کروں لیکن یہ گولڈن چانس کبھی کبھی ہی ملتا ہے البتہ میں چائنیز کھانے اور میٹھا بہت اچھا بناتی ہوں' اس لیے جب بھی ابو کا چائنیز کھانے کا موڈ ہوتا ہے تو مجھ سے فرمائشیں ضرور کرتے ہیں تو میں بہت شوق سے اور دل لگا کر بناتی ہوں۔

جب سب تعریف کرتے ہیں تو دلی خوشی محسوس ہوتی ہے خیر اس بار میں نے بھی ٹھان لی ہے کہ سب گھر والوں کو بہاری بوٹی بریانی بنا کر ہی کھلاؤں گی جس کی ترکیب یہ ہے۔

بہاری بوٹی بریانی

اجزا :

گوشت کی چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کریں' چاٹ مسالا' ہلدی' گرم مسالا' نمک' کالی مرچ' کٹی ہوئی لال مرچ' ادرک لہسن کا پیسٹ' لال مرچ' پپیتا پسا ہوا' دہی ایک کپ' تیل' چاول ایک کلو' دھنیا پودینہ' ہری مرچ' لیموں' ٹماٹر اور دھوئیں کے لیے کوئلہ۔ (مقدار میں نہیں لکھ رہی حسب ضرورت ڈال دیں)

ترکیب :

گوشت کو ایک باؤل میں ڈال دیں' پھر تھوڑا سا پپیتا پسا ہوا ڈال دیں۔ چاٹ مسالا' گرم مسالا' لال مرچ' کٹی ہوئی لال مرچ' ہلدی کالی مرچ' ادرک لہسن کا پیسٹ' نمک حسب ضرورت اور دہی ایک کپ ڈال کر خوب اچھی طرح مکس کردیں۔ تقریباً" ایک یا دو گھنٹے تک رکھ دیں۔ پھر ایک برتن میں تیل ڈال کر اس میں مسالا لگے گوشت کو ڈال دیں۔ تھوڑا سا بھون لیں پھر اس

میں آدھی پیالی پانی شامل کر کے درمیانی آنچ پر پکنے دیں۔ جب گوشت گل جائیں اور مصالحہ تیل چھوڑ دے تو سالن تیار ہے۔

ایک برتن میں پانی ڈال کر اس میں ایک چائے کا چمچہ تیل، کھانے کا ایک چمچہ نمک اور ذرا سا سرکہ (اس سے چاول کھڑے رہتے ہیں) اور ثابت گرم مسالا ڈال کر ابال آنے پر چاول شامل کر دیں۔ پھر ایک دیگچی میں پہلے چاول پھر سالن اس کے بعد لیموں، ٹماٹر، دھنیا، پودینہ اور ہری مرچ ڈال دیں۔ بعد میں چاول شامل کریں۔ دم دینے کے بعد چاول کے اوپر تھوڑا سا تیل ڈال کر کوئلہ پھر اس کی دھونی دیں لیجیے زبردست بہاری بوٹی بریانی تیار ہے سب کو کھلائیں اور تعریفیں وصول کریں۔

نشاط احسان .... کراچی

1 - ویسے تو دونوں عیدوں کا اپنا ایک الگ لطف ہے تاہم ہمیں ذاتی طور پر عید الفطر پر زیادہ لطف آتا ہے، کیونکہ ہمیں نمکین کھانوں کی نسبت میٹھی ڈشز زیادہ پسند ہیں۔ عید الفطر تو ہے ہی میٹھی عید، سو ہمیں اس کی چاشنی میں ڈوبی ہوئی ساعتیں زیادہ بھاتی ہیں۔ عید الاضحیٰ پر لطف اٹھانے سے زیادہ فرض نبھانے پر توجہ رہتی ہے۔ گوشت سنبھالنے اور پھر اس کی تقسیم کے مراحل اتنا تھکا دیتے ہیں کہ اس وقت کھانے پینے کی خواہش دم ہی توڑ دیتی ہے اور تھکن، بس نیند سے دوستی پر مائل کرتی ہے لیکن مصروفیت اور پھیلے ہوئے کام نیند سے دشمنی کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

2 - ہائے! یہ کیا پوچھ لیا۔ اس سوال نے تو گردش ایام کا رخ پیچھے کی طرف موڑنے پر مجبور کر دیا ہے، کیونکہ یہ قصہ ہے ان دِنوں کا، جب ہم بدولت بچپن کی حدود میں اچھل کود کر رہے تھے۔ ہمارے گھر میں قربانی کا جانور آچکا تھا۔ ہم ٹھہرے بچپن سے ہی فطرتاً" مہمان نواز..... ہمارا بس نہیں چل رہا تھا کہ ہم بکرے کی کیا کیا خاطر مدارت کر دیں۔ بسکٹ ہمیں نہایت مرغوب ہیں، سو ہم نے سوچا کیوں نہ بکرے کو بھی اپنا من پسند کھاجا پیش کیا جائے۔ ہم نے بسکٹ ہتھیلی پر رکھا اور اپنا ہاتھ بکرے کی طرف بڑھا دیا۔ بکرے نے ہمیں اپنے سر پر بٹھا لیا، مگر پھر زمین پر پٹخ دیا۔ ہم معصوم چاروں شانے چت زمین پر پڑے نم آنکھوں سے بکرے کو دیکھنے لگے اور ہمارے بہتے ہوئے آنسو بکرے سے شکوہ کر رہے تھے کہ

"ہم تو تمہیں بے زبان جانور سمجھے تھے، مگر تم تو انسانوں کی طرح نکلے۔ جس نے تمہارے ساتھ مہربانی کی ہم نے اسی پر وار کر ڈالا۔"

3 - عید الاضحیٰ پر گوشت سے تیار کردہ تقریباً" ہر ڈش ہی بنائی جاتی ہے، لہٰذا زبان نمکین ذائقوں سے اس قدر آشنا رہتی ہے کہ پھر وہ ایک شیریں لمس کو ترسنے لگتی ہے، مگر جی! ہم تو مہمان نواز ہیں نا..... تو ہم اپنے مہمانوں کو کیسے ترسا سکتے ہیں، ایک میٹھی میٹھی ڈش حاضر ہے۔

بیکڈ شاہی ٹکڑے

اجزا :

ڈبل روٹی کے سلائس — آٹھ عدد
دودھ — آدھا لیٹر
شکر — ڈیڑھ پیالی
تازہ کریم — ایک پیکٹ
کھویا یا فلاقند — ایک پیالی
الائچی (دانے نکال کر پیس لیں) — چار عدد
بادام، پستے (چھلکا اتار کر باریک کاٹ لیں) — آدھی پیالی
پسا ہوا کھوپرا — آدھی پیالی
گھی یا تیل — حسب ضرورت

(نوٹ : فلاقند لیں تو پھر شکر صرف ایک پیالی لیں۔)

ترکیب :

ڈبل روٹی کے سلائس کو چار ٹکڑوں میں کاٹ لیں اور انہیں سنہرا ہونے تک تل لیں۔ دودھ ابال کر اس میں پسے ہوئے الائچی دانے ڈال کر تھوڑا گاڑھا ہونے

دیں، پھر شکر اور کھویا (یا فلاقند) شامل کر کے تھوڑی دیر مزید پکائیں۔

اسٹیل کی ٹرے لے کر اس میں سلائس پھیلا کر رکھ دیں۔ ان پر دودھ ڈال کر پستہ، بادام چھڑک کر پہلے سے گرم کیے ہوئے اوون میں رکھ دیں۔ اوون کا درجہ حرارت 180 سینٹی گریڈ ہونا چاہیے۔ دس منٹ بیک کر کے نکال لیں۔ ٹھنڈا ہونے پر کسی ڈش میں نکال لیں، پھر پسے ہوئے کھوپرے اور کریم سے سجاوٹ کر کے پیش کریں اور اگر مہمان تعریف نہ کریں تو ان کا سر پھاڑ دیں۔

ثمرہ رشید..... کراچی

1۔ ویسے تو دونوں ہی عیدیں بہت اچھی ہوتی ہیں لیکن مجھے عید قرباں بہت پسند ہے۔ ویسے تو یہ سنت ابراہیمی علیہ السلام ہے، لیکن اگر دیکھا جائے تو اللہ نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے پسندیدہ کاموں کو رہتی دنیا تک زندہ کر دیا جیسے گلہ بانی، چرواہے، وغیرہ وغیرہ اسی طرح عید قرباں میں ہم جانوروں کی پہلے دیکھ بھال کرتے ہیں، چرواہے کی طرح نہلاتے ہیں اور پھر جب ان سے انسیت ہو جاتی ہے تو ہم اسے اللہ کی خوشنودی کے لیے اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بے مثال قربانی کو یاد کرتے ہیں۔

2۔ ہم ہر سال اپنے گھر کے باہر ٹینٹ لگاتے ہیں تقریباً" پورے محلے کی گائیں اسی ٹینٹ میں بندھتی ہیں، یعنی وہ منظر بالکل باڑے کی عکاسی کرتا ہے اور اس میں جانوروں کا ہر طرح سے خیال رکھا جاتا ہے۔ پورا محلہ ان کی خدمتوں میں مصروف رہتا ہے۔ سخت سردیوں کی رات تھی، ہم سب اپنے باڑے میں آگ جلا کر سکائی کر رہے تھے تاکہ جانور بھی گرم رہیں اور ہم بھی۔ تب ہی غیر متوقع طور پر بارش شروع ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا منظر بدل گیا، سارے لڑکے دوڑے کیونکہ اب ٹینٹ سے پانی ٹپکنے لگا اور آگ بجھ گئی۔ جانور گیلے ہونے لگے، سارے لڑکے اپنی فکر چھوڑ کر جانوروں کو بچانے میں لگ گئے، کوئی پلاسٹک لایا ٹینٹ پر بچھانے کے لیے تو کوئی بوریاں لایا گائے پر ڈالنے کے لیے۔ زمین پر جو پانی جمع ہو گیا تھا کچھ لڑکے اس کو نکالنے میں مصروف ہو گئے اور پھر وہاں بُرادہ ڈالا تاکہ جانوروں کو خشک جگہ ملے اور پھر مٹی کی بوری لے کر ہم نے ٹینٹ کے باہر چھوٹی منڈیریں بنائیں تاکہ پانی دوبارہ اندر نہ آسکے اِس طرح ہم نے جانوروں کو بچایا۔ اور رات بھر ہم نے جانوروں کے ساتھ گزاری آگ جلا کر ان کی سکائی کی۔ وہ رات ہم کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتے۔

چٹ پٹے کباب

اجزاء:

قیمہ آدھا کلو
نمک آدھا چائے کا چمچہ
لال مرچ ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچ چار عدد
لہسن ادرک ایک چائے کا چمچہ
زیرہ (بھنا ہوا) آدھا چائے کا چمچہ
دھنیا (پسا ہوا) آدھا چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا آدھا چائے کا چمچہ
ہرا دھنیا آدھی گڈی
بریڈ کرمز چار کھانے کے چمچے
آئل آدھا کپ

ترکیب :

پہلے قیمہ کو ابال لیں۔ ابالنے کے بعد اس میں نمک سے لے کر بریڈ کرمز تک سارے اجزاء شامل کر لیں اور پھر ان سب کو ایک ساتھ چوپ کر لیں۔ پھر ایک چھوٹی پیاز براؤن کر کے اس میں شامل کر لیں۔ پھر ان کی ٹکیہ بنا لیں یا سیخ کباب کی طرح بنا کر اس کو فرائی کر لیں۔ پھر آخر میں ان کباب کو کوئلہ سے دھونی دے دیں۔ مزے دار کباب تیار ہیں۔

شاہین رشید

ثمینہ ہمایوں سعید

"کیسی ہیں آپ ماشاء اللہ آج کل آپ کی پروڈکشن میں کافی ڈرامے دیکھ رہے ہیں اور ہمایوں سعید صاحب کے بھی..... آپ دونوں نے الگ الگ پروڈکشن ہاؤس کیوں بنائے ہوئے ہیں؟"

"میں ٹھیک ہوں اور یہ ضروری نہیں کہ میاں بیوی ایک ساتھ کام کریں' ہاں ایک جیسا کام کریں یہ اور بات ہے..... درحقیقت یہ پہلے فیلڈ میں آئے۔ اداکاری بھی شروع کی اور کچھ عرصے کے بعد پروڈکشن میں بھی آگئے عبداللہ کادوانی کے ساتھ۔ میں کچھ عرصے کے بعد آئی۔ ان کا پروڈکشن ہاؤس 7 th SKY کہلاتا ہے اور میرا Six Sigma کہلاتا ہے۔"

"کتنے ڈرامے آن ایئر آچکے ہیں آپ کے پروڈکشن ہاؤس سے' اور کون کون سے ہٹ گئے؟"

"تقریباً" پندرہ سولہ تو آن ایئر آہی چکے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے پروڈکشن ہاؤس سے بننے والے سارے ہی ڈرامے بہت مقبول ہوتے ہیں۔ آج کل ـــ آپ "محمود آباد کی ملکائیں" دیکھ رہی ہیں۔ بہت ہٹ جارہا ہے اور جن کو بہت زیادہ پذیرائی ملی ہے ان میں "اجازت' سانس' ڈیڈی' او میری امو' ٹیلی فلم بھاگ آمنہ بھاگ" بہت مقبول ہوئے اور اب "کاش میں تیری بیٹی نہ ہوتی" بھی ناظرین بہت شوق سے دیکھ رہے ہیں۔"

"اداکاری کا شوق نہیں ہوا آپ کو؟"

"نہیں' مجھے اداکاری کا بالکل بھی شوق نہیں ہے۔ کئی مرتبہ پروڈیوسرز' ڈائریکٹرز نے مجھے اپنے ڈراموں میں کام کرنے کی نہ صرف آفرز دیں بلکہ فورس بھی کیا۔ مگر میرا تو بالکل بھی اس طرف رجحان نہیں ہے اور سچی بات تو یہ کہ ہمایوں بھی پسند نہیں کریں گے میرا اسکرین پہ کام کرنا۔"

"یہ کیا بات ہوئی کہ وہ خود کریں اور آپ کو اجازت نہ دیں؟"

"وہ اجازت دیں نہ دیں..... میں خود بھی پسند نہیں کرتی۔"

"گھرداری بھی کرتی ہیں اور فیلڈ میں رہ کر بھی کام کرتی ہیں۔ تھکن تو ہو جاتی ہوگی؟"

"تھکتی نہیں..... لیکن مجھے کام کرنا اور تھکنا اچھا لگتا ہے۔ میں بچپن سے ہی محنت کرنے کی عادی ہوں۔ اس لیے یہ کام مجھے مشکل نہیں لگتا۔ بلکہ میں انجوائے کرتی ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ گھرداری بھی متاثر نہیں ہوتی۔"

"بحیثیت ایک پروڈیوسر کے آپ کو کن کن دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے؟"

"کافی ساری دشواریاں ہیں۔ جیسے کسی فنکار سے ڈیٹ نہ مل رہی ہو یا کوئی فنکار بیمار ہو جائے' لوکیشنز اچھی نہ مل رہی ہوں اور خاص طور پر جب کوئی سیریل آن ایئر ہو اور ایسے میں کوئی فنکار بیمار ہو جائے تو پھر بہت مشکل ہوتی ہے۔"

"کہانیوں کے لیے بھی دشواری ہوتی ہوگی؟"

"ظاہر ہے۔ اگر ہمارے پاس کوئی اچھی اسٹوری ہوتی ہے تو ہم ڈائریکٹر کو بتا دیتے ہیں اور رائٹرز خود بھی اسٹوری دے دیتے ہیں۔"

"کہتے ہیں کہ کوئی ضرورت مند اگر خود سے کچھ مانگ لے تو سامنے والا اس کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اسی طرح اگر کوئی رائٹر خود سے کہے کہ یہ میرا ناول ہے یا اسٹوری ہے تو پروڈیوسر اور ڈائریکٹر اس کو اہمیت نہیں دیتے' ایسا ہے کیا؟"

"اگر کوئی رائٹر خود ـــ چل کر ہمارے پاس آتا ہے تو ایسا نہیں ہے کہ ہم ان کو اہمیت نہیں دیتے۔ اگر اسٹوری اچھی ہوتی ہے تو ہم ضرور اس پر کام کرتے ہیں۔"

"کوئی بھی کام ہو' وقت کی پابندی بہت ضروری ہوتی ہے اور جو لوگ وقت کی پابندی نہیں کرتے ان کے ساتھ آپ کا رویہ کیا ہوتا ہے؟"

"میرا رویہ کسی کے ساتھ برا نہیں ہوتا۔ اول تو لوگ وقت کی پابندی کا خیال رکھتے ہیں اور جو نہیں رکھ پاتے ان کی بھی کوئی نہ کوئی مجبوری ہوتی ہے۔ تو میں غصہ نہیں کرتی بلکہ سامنے والے کی مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"فیوچر میں کوئی فلم بنانے کا ارادہ ہے' یا ڈائریکشن کی طرف آپ کا رجحان ہے؟"

"ابھی اس کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ارادے تو انسان کے بہت سے ہوتے ہیں لیکن ان کو وقت سے پہلے آشکار کر دینا مناسب نہیں لگتا اور ڈائریکشن کی طرف آنے کا کوئی ارادہ فی الحال تو نہیں ہے کیونکہ اس کے لیے تجربہ کار ہونا بہت ضروری ہے اور میرے پاس کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"کھانا پینا آپ کا روٹین کے ساتھ چلتا ہے یا جب موقع ملا' کھانا کھالیا جب دل چاہا ناشتہ کر لیا؟"

"میں تو صبح اٹھتی ہی دیر سے ہوں۔ تقریباً" ساڑھے بارہ ایک بجے میری صبح ہوتی ہے۔ تو پھر ہلکا پھلکا ناشتہ کر کے آفس آجاتی ہوں اور پھر چار بجے یا پانچ بجے کے قریب لنچ کرتی ہوں۔"

"چلیں تو پھر آپ کام کریں پھر ہم بعد میں بات کریں گے۔"

اسد ملک

"کیسے ہیں؟"

"الحمدللہ بالکل ٹھیک ٹھاک۔"

"کیا مصروفیات ہیں؟ شوبز کے علاوہ؟"

"کوئی خاص نہیں شوبز کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی اور مل جائے تو پھر گھر میں رہنے کو ترجیح دیتا ہوں اور گھر میں رہ کر ٹی وی دیکھتا ہوں یا پھر مطالعہ کرتا ہوں۔"

"اچھا مطالعہ کرنے کا شوق ہے۔ کس قسم کی کتابیں آپ کو پسند ہیں؟"

"میں نے زندگی میں بہت سی کتابیں پڑھی ہیں مگر جو سکون اور اطمینان قرآن پاک پڑھ کر ملتا ہے کسی کتاب میں نہیں ملتا..... اور قرآن پاک پڑھنے کی لگن ایک شخص کو تلاوت کرتے دیکھ کر ہوئی۔"

"پھر تو نماز روزے کے بھی پابند ہوں گے آپ؟"

"الحمدللہ نماز بھی باقاعدگی سے پڑھتا ہوں' اگر بہت زیادہ کام کی وجہ سے نہ پڑھ سکوں تو پھر قضاء نماز پڑھ لیتا ہوں۔ مگر ایسا نہیں کرتا کہ چلو قضاء ہو گئی تو کوئی بات نہیں۔"

"گڈ..... اللہ تعالیٰ آپ کو اور نیک بنائے۔ اس تبدیلی کے بعد شوبز میں کام کرنا کیسا لگتا ہے؟"

"بالکل ویسا ہی جیسا پہلے لگتا تھا۔ کیونکہ یہ تو ایک طرح سے ہماری جاب ہے۔ یہ کوئی برا کام نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں اپنے کام سے 'میرا نام ہے۔ اللہ نے شہرت دی ہے۔ عزت دی ہے۔"

"آج کل جو ڈرامے پیش کیے جا رہے ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

"اب تو بہت سارے چینلز آجانے سے ہمارے ملک میں کافی کام ہو رہا ہے ہر موضوع پر ڈرامے بن رہے ہیں..... یہ اچھی بات ہے..... اور کافی نئے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز آگئے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اپنی ذمہ داریاں بہت احسن طریقے سے انجام دے رہے ہیں۔"

"کیا اب بھی ڈراموں پر پہلے کی طرح محنت کی جاتی ہے؟"

"میرا نہیں خیال کہ ایسا ہے۔ وہ پہلے والی محنت نہیں رہی ہے۔ نہ ریہرسل نہ اسکرپٹ نہ محنت..... اگرچہ کام اچھا ہو رہا ہے لیکن اگر ریہرسل پر توجہ دے دی جائے تو ڈرامہ اور بھی زیادہ اچھا بن جائے۔ آج کل زیادہ سے زیادہ کام کے چکر میں ڈرامہ کی کوالٹی پہ فرق پڑا ہے۔"

"جس وقت آپ اس فیلڈ میں آئے اس فیلڈ کو آمدنی کا اچھا ذریعہ نہیں سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی گھر والے پسند کرتے تھے۔ آپ کے ساتھ کیسا سلوک ہوا؟"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ جب میں اس فیلڈ میں آیا تو بے شک گھر والوں نے میری حوصلہ افزائی نہیں کی لیکن حوصلہ شکنی بھی نہیں کی۔ کبھی مجھے یہ نہیں کہا کہ تم نے غلط فیلڈ کا انتخاب کیا ہے۔ والد صاحب تو میرے کام کی تعریف بھی کرتے تھے۔"

"پہلے لوگ اس فیلڈ میں شوقیہ آتے تھے اب ضرورتاً آتے ہیں۔ آپ اتفاق کریں گے اس بات پر؟"

"ہاں جی..... اب اس فیلڈ میں کافی پیسہ آگیا ہے اور میں بھی شوقیہ نہیں آیا بلکہ اتفاقاً آیا ہوں۔ عابد علی صاحب جن سے میری ہیلو ہائے تھی جب اپنا ڈرامہ سیریل "دشت" بنانے لگے تو انہوں نے مجھے اداکاری کی پیشکش کی جس پر میں نے انہیں کہا کہ مجھے شوق نہیں ہے اداکاری کا..... تو انہوں نے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں میں سکھا دوں گا۔ کیونکہ مجھے تم میں فنکارانہ صلاحیتیں نظر آتی ہیں۔ بس اتفاق دیکھیں کہ "دشت" کی کامیابی کے بعد آفرز کا سلسلہ شروع ہو گیا اور..... آج آپ کے سامنے ہوں۔"

"اللہ کرے اسی طرح کامیابیاں سمیٹتے رہیں ان شاءاللہ پھر بات کریں گے۔"

☼ ☼ ☼

سید فصیح الدین سہروردی

"کیسے ہیں..... ماشاءاللہ آپ کی آواز اتنی خوب صورت ہے کہ جہاں کہیں آپ کی حمد و نعت آ رہی

ہو تو ہر بندہ فوراً متوجہ ہو جاتا ہے۔"

"بہت شکریہ۔ محبت اور خلوص ہے آپ کا۔"

"کتنے سال ہو گئے آپ کو حمد و نعت پڑھتے ہوئے؟"

"ماشاءاللہ کافی سال ہو گئے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں تقریباً 5 سال کا تھا تب سے نعت خوانی کر رہا ہوں۔"

"یوں تو آپ کی خوب صورت آواز نے آپ کو شہرت کے مقام تک پہنچایا لیکن آپ کی منقبت "میں تو پنجتن کا غلام ہوں" نے بھی آپ کو عروج عطا کیا 'کیا ایسا ہے؟"

"بالکل ایسا ہے۔ میں سولہ سترہ سال سے اسے پڑھ رہا ہوں اور اس کی مقبولیت میں ذرہ برابر بھی فرق نہیں آیا بلکہ یہ منقبت تو میری پہچان بن گئی ہے۔"

"اس کے شاعر کون ہیں؟"

"اس کے شاعر یوسف قمر ہیں اور انہوں نے یہ منقبت 1956ء میں لکھی تھی اور میں نے اسے 1994ء میں پہلی مرتبہ پڑھا اور پھر یہی منقبت میری پہچان بن گئی۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں جہاں کہیں، جس ملک میں بھی جاؤں پہلے اس منقبت کی فرمائش آتی ہے۔"

"آپ نے دوسرے ممالک جانے کی بات کی تو اب تک کتنے ممالک میں جا کر اپنی آواز کا جادو جگا چکے ہیں؟"

"تقریباً 25' 30 ممالک میں جا چکا ہوں اور جہاں جہاں گیا ہوں، مجھے ماشاءاللہ بہت عزت ملی ہے۔"

"سب سے زیادہ کس شاعر کا کلام پڑھتے ہیں؟"

"میں اپنے والد سید محمد ریاض الدین سہروردی کا کلام پڑھتا ہوں اور میں آج جو کچھ بھی ہوں اپنے والد کی بدولت ہوں جنہوں نے میری صلاحیتوں کو پرکھا اور مجھے حمد و نعت پڑھنے کی طرف راغب کیا۔"

"کبھی والد صاحب نے کہا کہ تم میرے کلام کی ادائیگی ٹھیک طرح سے نہیں کرتے؟"

"نہیں نہیں ایسا انہوں نے کبھی نہیں کہا۔ بلکہ وہ تو یہ کہا کرتے تھے کہ میرے کلام کو بہترین انداز میں پڑھنے کا حق میرے بیٹے نے ادا کیا ہے۔ وہ بہت خوش ہوتے تھے جب میں ان کا کلام پڑھتا تھا۔"

"آج کل حمد و نعت کو میوزک کے ساتھ پڑھنے کا بہت زیادہ رواج چل پڑا ہے۔ آپ نے کبھی میوزک کا استعمال نہیں کیا۔ کیوں؟"

"اس لیے کہ میں میوزک کے ساتھ اللہ رسولؐ کا کلام پڑھنا اچھا نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک یہ پاک کلام کے تقدس کو پامال کرنے کے مترادف ہے۔ سب کی اپنی اپنی سوچ ہے اور میری سوچ یہی ہے کہ حمد و نعت کو میوزک کے بغیر پڑھنا چاہیے۔"

"آپ کے والد سے آپ کو آواز ملی۔ پڑھنے کا انداز ملا کیا آپ نے اس ورثے کو دوسروں تک منتقل کیا؟"

"بالکل جی' الحمدللہ' اللہ تعالیٰ نے اولاد کی نعمت سے نوازا ہوا ہے۔ میرے بیٹے سید محمد زین العابدین سہروردی کو اللہ تعالیٰ نے خوب صورت آواز سے نوازا ہے اور وہ ماشاءاللہ بہت اچھے انداز میں نعت گوئی کرتا ہے اور آپ کے میگزین کے توسط سے یہ بھی بتاؤں کہ

وہ بھی میرے ساتھ کئی ممالک میں جا کر نعت خوانی کر چکا ہے اور اس کی آواز میں سی ڈیز بھی آچکی ہیں۔"

"بہت خوب..... ہمارے یہاں اچھے نعت خوانوں کی بہت کمی ہے یقیناً "سید محمد زین العابدین ایک اچھا اضافہ ثابت ہوں گے اور خیر سے کتنے بچے ہیں آپ کے؟"

"ایک ہی بیٹا ہے سید محمد زین العابدین اور تین بیٹیاں ہیں۔ ان کی آوازیں بھی بہت خوب صورت ہیں اور وہ بھی نعت خوانی کرتی ہیں۔ میری ایک بیٹی تو حافظ قرآن بھی ہے۔"

"آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔ خاص طور پر رمضان المبارک، ذی الحج اور عید میلاد النبیؐ کے مہینوں میں۔ تو آپ اپنی فیملی کو تو وقت نہیں دے پاتے ہوں گے؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں مگر ان مہینوں کے علاوہ بھی میری بہت مصروفیات ہوتی ہیں۔ پھر آئے دن ملک سے باہر بھی جانا پڑتا ہے۔ تو واقعی میں اپنی فیملی کو اتنا وقت نہیں دے پاتا جتنا کہ مجھے دینا چاہیے، لیکن کیا کروں کہ یہ میری مجبوری ہے؟"

"گھر والے ناراض ہوتے ہیں کیا؟"

"نہیں ہرگز نہیں..... وہ میری مجبوریوں کو سمجھتے ہیں اور خاص طور پر جس شخصیت کو سمجھنا چاہیے وہ بخوبی میری مجبوریوں سے واقف ہے اور وہ میری بیوی ہے..... اس نے زندگی میں میرا بہت ساتھ دیا ہے۔"

"کوئی خاص بات جو آپ کہنا چاہیں؟"

"جی بالکل..... میں گھر سے بہت غیر حاضر رہتا ہوں تو میری بیوی نے نہ صرف گھر کو اچھے طریقے سے چلایا بلکہ بچوں کی پرورش بھی اتنے اچھے انداز میں کی کہ آج میرے چاروں بچے نہایت اچھے، پڑھائی میں عمدہ اور ادب و تہذیب میں اپنی مثال آپ ہیں۔"

"بڑی بات ہے۔ ان شاء اللہ آپ سے پھر گفتگو رہے گی۔"

شاعری سچ بولتی ہے

سدرہ حنیف

جن احساسات و کیفیات کو زبان سے ادا نہیں کیا جا سکتا، انہیں بہ زبانِ شاعری بیان کیا جاتا ہے۔

اردو ادب ہو یا فارسی، ہمارے مفکر پاکستان، عظیم دانشور علامہ اقبالؒ اس میں کامل مہارت رکھتے ہیں۔ کیا خوب فرماتے ہیں۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرتِ جبرائیل
اگر ہو عشق سے محکم تو صورِ اسرافیل

اپنی دُنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سِرِّ آدم ہے، ضمیرِ کن فکاں ہے زندگی

کلاسک شاعری میں بہادر شاہ ظفر کا نام اپنی مثال آپ ہے۔ رنگون میں قید ہونے کے باوجود انہوں نے نہایت مسحور کن شاعری کی ہے۔ اس غزل میں انہوں نے اپنی بے بسی کا حال لکھا ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے، میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

میں نہیں ہوں نغمۂ جاں فزا، مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے ہی روگ کی ہوں صدا، میں جلے دل کی پکار ہوں

میرا رنگ روپ بگڑ گیا، میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا، میں اسی کی فصلِ بہار ہوں

احمد فراز ایک ایسے شاعر ہیں جنہیں عہد ساز کہا جا سکتا ہے۔ ان کی اس غزل کے اشعار اکثر نوکِ زبان پہ رہتے ہیں۔

ہوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تو
کہاں گیا ہے میرے شہر کے مسافر تو

میں جانتا ہوں کہ دُنیا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں ــــ بظاہر تو

میری مثال کہ اک نخلِ خشک صحرا ہوں
تیرا خیال کہ شاخِ چمن کا طائر تو

فراز تُو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تو

افتخار عارف کی دلفریب شاعری میں سے چند اشعار۔

ہجر کی دُھوپ میں چھاؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
آنسو بھی تو ماؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں کچھ کر نہیں پاتے لیکن
پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

عشق کی اذیتوں کو شبنم شکیل یوں لکھتی ہیں۔

ہاتھ نہ آئی دُنیا بھی اور عشق میں بھی گمنام رہے
سوچ کے اب شرمندہ ہیں کیوں دونوں میں ناکام رہے

آج کا دن بھی بے مصرف سی سوچوں ہی میں بیت گیا
آج کے دن بھی یونہی پڑے پھر گھر کے سارے کام رہے

فیض احمد فیض کی ایک نہایت پُراثر نظم کا یہ حصہ مجھے بہت پسند ہے۔

؎ اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے
دل کے رخسار پہ اس وقت تیری یاد نے ہات
یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن آبھی گئی وصل کی رات

ادھورے پیار کی اذیت امجد اسلام امجد کی
اس نظم میں کیا خوب نظر آتی ہے۔

؎ لائنیں کٹتی رہیں لفظ بدلنے کے سبب
کوئی تحریر، مسلسل نہیں ہونے پائی
حاصلِ عمر یہی چند ادھورے خاکے
کوئی تصویر مکمل نہیں ہونے پائی

اور پھر محبت کی ساری خوبصورتیوں کو اس نظم
میں جیسے ن۔م راشد نے سمو کر رکھ دیا ہے۔

مثالِ خورشید و ماہ و انجم میری محبت جواں رہے گی
عروسِ فطرت کے حسین شاداب کی طرح جاوداں رہے گی
شاخِ امید بن کے ہر وقت روح پر ضوفشاں رہے گی
شگفتہ و شادماں کرے گی، شگفتہ و شادماں رہے گی
میری محبت جواں رہے گی۔۔۔!

ایک نامعلوم شاعر نے بھی کیا خوب کہا ہے۔

تیری خوشبو
مجھ میں ایسے
جیسے تِل میں تیل
مجھ سے لپٹی
کوئی تو دیکھے
تیرے عشق کی بیل

اب کچھ متفرق اشعار۔

وہ جس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر سفر کیا تُو نے منزلوں کا
تیری گلی سے نجانے کیوں، آج سر جھکائے گزر گیا وہ
(ناصر کاظمی)

؎ کیسی چلی ہے اب کے ہوا تیرے شہر میں
بندے بھی ہو گئے ہیں خدا تیرے شہر میں
(خاطر غزنوی)

؎ ان سے امیدِ ملاقات کے بعد اے محمود
مدتوں تک نہ خود اپنے آپ سے ملاقات ہوئی
(محمود سعیدی)

؎ میں دُور بہت دُور پہنچ جاتا ہوں تابؔ
رُخ سوچ کا دھارا جو بدلتا ہے سرِ شام

؎ گئی رُتوں میں حسن ہمارا بس ایک ہی تو یہ مشغلہ ہے
کسی کے چہرے کو صبح لکھنا، کسی کی زلفوں کو شام لکھنا
(حسن رضوی)

؎ حالِ دل اس کو سُنا کر ہے بہت خوش کوثر
لیکن اب سوچ ذرا کیا تیری اوقات رہی
(کوثر نیازی)

؎ خالد میں بات بات پہ کہتا تھا جس کو جان
وہ شخص آخرش مجھے بے جان کر گیا
(خالد شریف)

؎ مل گیا مٹی میں جب افضل تو یہ صدا آئی
گر گئی دیوار اور سایہ اکیلا ہو گیا
(افضل منہاس)

؎ جس سے بات بھی کرنی مشکل وہ بھی اس محفل میں ہے
مصحف کیسا لطف رہے گا اس کو شعر سنانے میں
(مصحف اقبال توصیفی)

آخر میں اپنا تعارف کرواتی چلوں۔ میرا نام
سدرہ حنیف ہے۔ بی۔اے کی اسٹوڈنٹ ہوں۔
میرا تعلق ضلع نارووال کے شہر شکرگڑھ سے ہے۔
شعر و شاعری سے بہت لگاؤ ہے۔ خود بھی لکھنے
سے خاصا شغف ہے۔ میری ایک نظم "کیا ہے پیار
پتھر سے" ۔ اور ایک غزل "بہت اُداس ہوں
میں" شائع ہو چکی ہیں۔ اب اپنے دو اشعار
کے ساتھ اجازت چاہتی ہوں۔

؎ یاد ہی تیری عبادت ہو گئی ہے
مجھے تجھ سے عقیدت ہو گئی ہے

آمنہ ریاض

ستارۂ شام

دین محمد مٹی سے محبت کرنے والا جفاکش مرد ہے۔ دھرتی کو اپنے خون جگر سے سونا اگلنے کے قابل بنانا اس کا پیشہ ہے۔ اس کی پوری زندگی محنت سے عبارت ہے، جو وہ اپنے چھ مربع زمین پر صرف کرتا ہے۔ شادی کو آٹھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اپنے چھوٹے سے گھر میں وہ بیوی زہرہ اور ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ زہرہ چھ مردہ بچوں کو جنم دے کر ایک مرتبہ پھر امید سے ہے۔ دین محمد کا رواں رواں اولاد کی خوش خبری پانے کے لیے مجسم دعا بن چکا ہے۔ اس کی دعائیں مستجاب ٹھہرتی ہیں اور اس کے یہاں ایک خوب صورت بچی جنم لیتی ہے۔ اسے وہ اپنی "جنت" کے نام سے مخاطب کرتا ہے۔

جلال الدین کے روز و شب نوکری کی چکی میں پستے گزر رہے ہیں۔ اس نوکری کے دوران اسے آرام کرنے کا موقع بھی کم ملتا ہے۔ اچھے مستقبل کا خواب اسے متحرک رکھتا ہے۔ تنہائی میں کسی کی محبت کا جگنو اس کی دنیا آباد رکھتا ہے۔ ہر دم "اس" کی یادیں اسے بے چین رکھتی ہیں۔ دن بھر کا تھکا ہارا وہ آرام کرنے لیٹا ہے تو پولیس اسٹیشن سے اطلاع ملتی ہے کہ جنت بی بی ان کی حراست میں ہے، جس کا دعوا ہے کہ اس نے اپنے شوہر کا قتل کیا ہے۔ جلال الدین اپنے وکیل دوست مسعود کے ساتھ بھاگم بھاگ پولیس اسٹیشن پہنچتا ہے اور ثبوت دکھاتا ہے کہ جنت شیزوفرینیا کی مریض ہے، جس کی شادی ابھی ہوئی تک نہیں۔ جنت کی حالت جلال الدین کو اعصابی تھکن کا شکار کرنے لگتی ہے۔ جسے اس نے نوکروں کے سہارے علیحدہ گھر میں رکھ چھوڑا ہے۔

ثمینہ 14 سال بعد اپنی بیٹی ماوی کے ساتھ آئرلینڈ سے پاکستان آئی ہیں تو انہیں توقیر صاحب کے بتائے گئے بنگلے کو تلاشنے میں بہت وقت لگتا ہے۔ وہ فیض کے دوست توقیر صاحب کے توسط سے دانیال کی انیکسی میں ٹھہرتی ہیں۔ ثروت دانیال ملنسار اور محبتی خاتون ہیں۔ ولی، ولید اور انیبا ان کے بچے ہیں۔ ماوی کی پہلی ملاقات میں انیبا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

شبیہہ العباس طبیعتاً "سخت گیر اور غصہ ور نوجوان ہے، جسے صنف نازک کا غیر ضروری ہنسنا بھی ناگوار گزرتا ہے۔ وہ

پھپھی زاد تنوی سے منسوب ہے۔ تنوی اس کی تند خو طبیعت سے سخت نالاں ہے۔ شبیہہ' تنوی کو کالج چھوڑنے آتا ہے تو سہیلیاں عبیر اور نمرہ تنوی کے سر ہو جاتی ہیں۔ یہ جان کر کہ شبیہہ' تنوی کا منگیتر ہے' وہ اس کی قسمت پر رشک کرتی ہیں۔ تنوی دونوں سے گزارش کرتی ہے کہ عروش کو اس بات کا علم نہ ہو۔

شبیہہ العباس' ثروت دانیال کی اولاد ہے' جسے انہیں دانیال حسن سے شادی سے پہلے چھوڑنا پڑا۔ بچپن کی محرومی نے اسے بدمزاج اور غصیلا بنا دیا۔ وہ انیبا اور ولید سے بہت ترشی سے پیش آتا ہے۔ وہ ان سے بحیثیت بہن بھائی قلبی تعلقات محسوس نہیں کرتا۔ انیبا اس کی محرومی دل سے محسوس کرتی ہے۔ انیبا پر بری نظر ڈالنے پر وہ جے ڈی کے دوست سعدی کو پیٹ ڈالتا ہے۔ صرف جے ڈی اس کی کیفیات سمجھتا ہے۔

بیمار پڑنے پر بیگم دانیال' ثمینہ کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتی ہیں تو ثمینہ ان کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتیں۔ انہیں بیگم دانیال کو دیکھ کر لگتا ہے کہ وہ پہلے ان سے مل چکی ہیں۔

بچوں کی لڑائی میں جنت کو چوٹ لگتی ہے تو دین محمد اپنی بہن زبیدہ کے بیٹے فاروق کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ ساتھ ہی زبیدہ بہن اور رفیق بھائی سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔ زہرہ اس کی جنت سے طوفانی محبت سے خوف زدہ ہے۔ دین محمد' زہرہ کو باور کرواتا ہے کہ وہ جنت کو بیاہ کر دوسرے گھر نہیں بھیجے گا۔ بلکہ اس کے شوہر کو گھر داماد بنائے گا۔

اتفاقاً" ماوی کا ٹکراؤ شبیہہ سے ہوتا ہے۔ جس سے ماوی کا پیر زخمی ہو جاتا ہے۔ اپنی غلطی کے باوجود جھنجلاہٹ میں شبیہہ ماوی کو بری طرح سے ڈانٹتا ہے تو ماوی اس کی طبیعت صاف کر دیتی ہے۔ ثمینہ سے وہ اس واقعے کا ذکر نہیں کرتی۔ ثمینہ کا روڈ ایکسیڈنٹ ہوتا ہے تو جے ڈی عین موقع پر ان کی بہت مدد کرتا ہے۔ ماوی اور فیضان اس پر جے ڈی کے مشکور ہیں' لیکن وہ اپنا پتا دیے بغیر چلا جاتا ہے۔ جس پر ثمینہ کو بہت افسوس ہوتا ہے۔ اتفاقاً" ان کی جے ڈی سے دوبارہ ملاقات ہوتی ہے۔ ثمینہ اسے گھر بلاتی ہیں۔ ثمینہ' ثروت کو بتاتی ہیں کہ ان کے شوہر رجب کا بے دردی سے قتل ہوا تھا اور یہ بات ماوی کے علم میں نہیں ہے۔ یہ جان کر انہیں رنج ہوتا ہے۔ شبیہہ کو جے ڈی کا اپنی ماں اور ثمینہ سے گفتگو کرنا پسند نہیں' جس پر وہ جے ڈی کو تنبیہہ بھی کرتا ہے۔

انیبا دل ہی دل میں فیضان کو چاہتی ہے۔ ثروت کے پہلے شوہر سے نسبت کے باعث دانیال صاحب ثمینہ کی فیملی کو پسند نہیں کرتے... ماوی' ان کی دلچسپی بھانپ لیتی ہے اور فیضان' ماما سے رائے لینے کی کوشش کرتی ہے تو فیضان اسے جھڑک دیتے ہیں۔ بھائیوں پر بار نہ پڑے اس لیے ثمینہ' ماوی کو پاکستان میں مزید پڑھنے کی اجازت دے دیتی ہیں۔ عبیر' نمرہ اور تنوی کو عروش کی غیر اخلاقی اور جرائم پیشہ سرگرمیوں کے متعلق بتاتی ہے تو نمرہ ناراض ہو جاتی ہے۔ عبیر کو اپنی جلد بازی پر افسوس ہوتا ہے' وہ عروش کے متعلق ثبوت اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔

زہرہ کی اچانک موت کو محض جنت کے کہنے پر دین محمد' بہن زبیدہ کے سر ڈالتا ہے تو سب برادری والے بھی حق دق رہ جاتے ہیں۔ دین محمد کی ماں پڑوسن کے کہنے پر جنت کو پیر صاحب کے پاس لے کر جاتی ہے تو جنت یہ بات بڑھا چڑھا کر دین محمد کو بتاتی ہے۔ وہ ماں کو بہن زبیدہ کے یہاں ہمیشہ کے لیے بھیجنے کا فیصلہ سناتا ہے تو ماں رو' رو کر اسے اس فیصلے سے باز رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ بہت مشکل سے دین محمد راضی ہو پاتا ہے۔ دین محمد کے رویے سے جنت کے اندر پنپنے والی منفی شخصیت قد آور ہو رہی ہے۔

دین محمد کی بہن زبیدہ کا بیٹا فاروق گاؤں میں آتا ہے تو جنت اسے پسند کرنے لگتی ہے۔ وہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتی ہے' لیکن فاروق اسے دھتکار دیتا ہے اور اس کے باپ سے ہتک آمیز انداز میں شکایت کرتا ہے۔

دین محمد' جنت کو اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کو مارتے دیکھ لیتا ہے۔ اسے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ اس نے جنت کی تربیت میں کوتاہی کی ہے۔

ثروت' دانیال حسن کے ہر وقت کے شک سے تنگ آ کر میکے چلی جاتی ہیں۔ انیبا اور ولید کو اپنے والدین کے درمیان کھنچاؤ کا کچھ کچھ اندازہ ہے۔ دانیال حسن' ثروت کو فون کر کے علیحدگی کی بات کرتے ہیں۔ ثروت کی طبیعت خراب ہو گئی اور انہیں اسپتال میں داخل ہونا پڑا۔

ثمینہ' ماوی کے سامنے ماضی کے اوراق پلٹتی ہیں۔ وہ اسے بتاتی ہیں کہ جلال اور شبیہہ العباس' ماوی کے رشتے دار ہیں اور ... ماوی کے باپ' رجب کو جنت بی بی نے قتل کیا تھا۔ ثمینہ' ماوی پر زور دیتی ہیں کہ وہ حویلی جا کر جنت بی بی سے انتقام لے۔

(اب آگے پڑھیے)

17
سترہویں قسط

ماوی کے لیے ثمینہ کا جملہ نہ صرف غیر متوقع بلکہ حیران کن بھی تھا۔ اس کی مسلسل کھانسی سے اکھڑی ہوئی سانس چند منٹ میں سنبھلی تب اس نے سر اٹھا کر بغور ثمینہ کو دیکھا۔ وہ اسے پانی پلا کر اور اس کی پیٹھ سہلا کر واپس اپنی کرسی پر بیٹھ رہی تھیں۔

ان کی آنکھوں پر ابھی تک نظر کا چشمہ لگا ہوا تھا اور تاثرات اتنے نارمل تھے جیسے چند منٹ پہلے ان کے منہ سے کوئی عجیب و غریب بات ہی نہ نکلی ہو۔ ماوی کو لحظہ بھر کے لیے شک گزرا آیا کہ انہوں نے کوئی بات کی بھی تھی یا نہیں۔

"ممی!..." وہ انہیں پکار بیٹھی۔ اخبار اٹھائے ہوئے ثمینہ نے اسے پل بھر کے لیے نظر اٹھا کر دیکھا۔ "آپ نے ابھی جو کہا تھا وہ دوبارہ کہیں۔"

"تاکہ تمہیں ایک بار پھر کھانسی کا دورہ پڑ جائے؟" ثمینہ نے اخبار کھولتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ ماوی کچھ بول نہیں سکی اس کے دل و دماغ پر عجب کیفیت وارد ہو رہی تھی جسے لفظوں میں بیان کرنا مشکل تھا۔ وہ بے یقین تھی حیران تھی اور تھوڑی سی ناگواری بھی محسوس ہو رہی تھی۔ آخر کیا سوچ کر اس کی ماں نے ایسا مطالبہ کیا تھا۔

"ممی! دیٹس ناٹ فنی۔" بالآخر اس نے کہا۔

"ہاں... بالکل ٹھیک... اس میں فنی تو کچھ بھی نہیں ہے۔" ثمینہ ابھی بھی پرسکون تھیں۔

"ممی!..." بیزار ہوتی وہ اپنا سر ہاتھوں میں گرا کر بیٹھ گئی۔

"دیکھو ماوی!" ثمینہ نے اخبار ایک طرف رکھ کر اپنا رخ اس کی جانب موڑا "میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں نے اس وقت کے لیے بہت انتظار کیا ہے۔ برسوں سے کہیں دل کے کونے میں یہ خواہش چھپی ہوئی تھی کہ مجھے رجب کے قاتل کو سزا دلوانی ہے اور اس کا اب صرف ایک ہی راستہ ہے کہ تم حویلی جاؤ اور رجب کے قاتل کے خلاف ثبوت لے کر آؤ۔" ثمینہ کا لہجہ منت بھرا تھا۔

"جی ہاں... اور وہاں تو جیسے کوئی پلیٹ میں رکھ کر مجھے ثبوت پکڑا دے گا۔" ماوی بدکی۔

"نہیں... یہ اتنا آسان نہیں ہو گا۔ تمہیں وہاں چھان بین کرنا پڑے گی اور بلاشبہ مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑے گا لیکن تمہیں یہ کام کرنا ہے ماوی!"

"ویٹ اے منٹ۔" معاً" ماوی کو کچھ خیال آیا تھا۔ "میں وہاں کس کے خلاف ثبوت ڈھونڈنے جاؤں؟ جبکہ بابا کا قتل نہیں ہوا تھا' آپ نے کل خود بتایا کہ انہیں سردی لگ گئی اور اسی وجہ سے ان کی ڈیتھ ہوئی تھی۔"

"ہاں... پہلے پہل... دراصل میں یہی سمجھتی رہی تھی۔ مجھے خود حقیقت کا علم کچھ عرصہ بعد ہوا۔"

"کیا مطلب؟" ماوی کا لہجہ الجھن آمیز تھا۔

"مطلب..." ثمینہ کے لہجے میں دکھ گھل مل گیا۔ "تمہارے بابا کے بعد میری ذہنی حالت بہت خراب تھی۔ بیوگی کا دکھ ہر اس عورت کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے جو اپنے شوہر سے بے تحاشا محبت کرتی ہو۔ لیکن میرے مسائل زیادہ تھے میرے ساتھ تم تھیں اور کوئی میرے آگے پیچھے نہیں تھا۔ فیضان اور فیاض بھائی سے سالوں

سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ مجھے یہ بھی فکر ستاتی کہ تمہیں لے کر میں کہاں جاؤں گی کیونکہ میں جانتی تھی جلد یا بدیر مجھے حویلی سے نکال ہی دیا جائے گا۔

اپنی طرف سے تو جنت بی بی نے یہ بھی احسان ہی کیا تھا کہ مجھے عدت پوری ہونے تک حویلی میں رہنے دیا لیکن عدت ختم ہوتے ہی مجھے حویلی سے دفع ہونے کا حکم مل گیا۔ مستقیم نے..... تمہارے سوتیلے چچا نے مجھ پر احسان کیا وہ کہیں سے فیاض بھائی کو ڈھونڈ لائے۔ گو کہ میں حویلی سے نکلنا نہیں چاہتی تھی لیکن اب میرے پاس وہاں قیام کا کوئی جواز بھی نہیں تھا..... اس لیے میں نے چپ چاپ اپنا مختصر سامان سمیٹا اور فیاض بھائی کے ساتھ چل دی لیکن اس سے کچھ دیر پہلے جنت بی بی نے ہمیں حویلی کے کسی کمرے میں بلوایا اور کچھ عدالتی کاغذات فیاض بھائی کے سامنے رکھ دیے۔ بقول اس کے یہ کاغذات رجب کی وصیت تھی جس کے مطابق انہوں نے اپنے حصے کی جائیداد جنت بی بی کی سرپرستی میں دے دی تھی اور اسے جائیداد کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا تھا اور وہ ساری جائیداد — رجب کی اکلوتی بیٹی کو یعنی تمہیں اٹھارہ سال کی عمر میں پہنچنے کے بعد منتقل ہونا تھی۔

جنت بی بی نے فیاض بھائی سے کہا کہ وہ جہاں مرضی لے جا کر ان کاغذات کی جانچ پڑتال کروا سکتے ہیں، لیکن اس وقت فیاض بھائی اپنی کچھ مشکلات میں گرفتار تھے اور ان کے مالی حالات بھی کچھ ایسے مضبوط نہ تھے کہ وہ جنت بی بی جیسی با اثر عورت کے خلاف کچھ کر پاتے سو وہ خاموشی سے اس کی بات مان گئے۔ میری ذہنی حالت اس وقت ایسی ہرگز نہ تھی کہ کسی بات پر غور کر پاتی ورنہ میں بڑے آرام سے یہ سوال اٹھا سکتی تھی کہ جس جائیداد کے حصول کے لیے رجب اتنے مہینوں سے اس عورت کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور جو بالآخر انہیں مل رہی تھی وہ اسی عورت کو اپنی بیٹی کا سرپرست کیسے مقرر کر سکتے ہیں۔

بہرحال میں فیاض بھائی کے ساتھ آ گئی۔ بھائی اور بھابھی کی دلجوئی نے میری بڑی ڈھارس بندھائی تھی میری ذہنی حالت نارمل ہونے لگی۔

تبھی ایک روز جنت بی بی مجھ سے ملنے چلی آئی۔ وہ اپنے ساتھ بے تحاشا تحفے لائی تھی۔ میں اس کے رویے سے حیران تھی شاید پہلی اور آخری بار اس روز اس نے تمہیں پیار کیا اور میری خیریت بڑی محبت سے دریافت کی میں اس کے رویے پہ حیران تھی تب جنت بی بی نے بھابھی سے کہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے ہمیں تنہا چھوڑ دیں — وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی۔ بھابھی خوشی خوشی کمرے سے چلی گئیں لیکن مجھے سراسیمگی نے گھیر لیا۔

میں جنت بی بی سے مرعوب رہتی تھی اور اس کی موجودگی میں میرے دل پر عجیب ناقابل فہم سی ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا بھابھی جاتے ہوئے تمہیں بھی ساتھ لے گئی تھیں۔ میں مرعوب انداز میں سر جھکائے بیٹھی تھی اور میرے ہاتھ باقاعدہ لرز رہے تھے اور.....“

بات کرتے کرتے ثمینہ کی آواز بتدریج کم ہوتی گئی تھی یہاں تک کہ وہ اس منظر میں کھو گئیں جب جنت بی بی بڑے پُرتمکنت انداز میں ان کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی اور ثمینہ کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

جنت بی بی نے چند منٹ ان کے جھکے ہوئے سر کو دیکھنے کے بعد خاموشی کو توڑ دیا تھا۔

”یہاں کب تک رہو گی؟“

”جی؟“ ثمینہ نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر جنت کو دیکھا تھا وہ عورت ہمیشہ ثمینہ کو خود سے بلند تر نظر آتی تھی۔

”میرا مطلب ہے تمہارا بھائی تمہیں کب تک اپنے ساتھ رکھے گا؟ بھائیوں کے لیے جلد یا بدیر ایسی بہنیں جن کے شوہر مر چکے ہوں یا انہیں چھوڑ چکے ہوں، بوجھ بن جاتی ہیں۔ تمہارا غریب مسکین سا بھائی کب تک تمہارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھے گا؟“ اس کی خوب صورت آواز ثمینہ پر حقائق کے کوڑے برسا رہی تھی۔ ”عورت کا اصلی گھر تو اس کے شوہر کا گھر ہی ہوتا ہے۔ شوہر جیسا بھی ہو اپاہج، بیوقوف، غریب لیکن جو تحفظ

عورت کو شوہر کے گھر میں ملتا ہے وہ اور کہیں نہیں مل سکتا۔“

ثمینہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا آخر وہ اس پر کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھی۔

”دیکھو ثمینہ! مجھے گھما پھرا کر بات کرنا نہیں آتی۔ میں خود چل کر تمہارے پاس آئی ہوں تو تمہیں میری قدر کرنا چاہیے اور میرا احترام کرنا چاہیے کیونکہ میں ان لوگوں میں سے تو نہیں ہوں جو خود معمولی لوگوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ میری شان کے خلاف ہے لیکن میں نے اگر اپنی شان اور عادت کے برخلاف کوئی کام کیا ہے تو تمہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ اہم معاملہ ہی ہو گا۔

”میں چاہتی ہوں ثمینہ! تم میرے بڑے بیٹے سے شادی کر لو۔“

جنت نے بالآخر بلی تھیلے سے باہر نکال ہی دی تھی۔

ثمینہ ششدر سی اس کا چہرہ دیکھ رہی تھیں۔

”مجھے اپنے بیٹے کی دیکھ بھال کے لیے ایک عورت کی ضرورت ہے۔ اب یہ عورت اس کی بیوی ہو تو اس سے اچھی بات اور کیا ہو گی اور تم بلاشبہ ایک بہترین خدمت گزار ثابت ہو سکتی ہو۔ پھر اس شادی سے تمہیں بھی بہت فوائد حاصل ہوں گے۔ تمہیں اپنے غریب بھائی کے کندھوں پر بوجھ بن کر پڑے رہنے کے بجائے حویلی میں جا کر رہنے کا موقع ملے گا جس کا تمہیں شوق ہے۔ تمہیں اس سے کہیں زیادہ عزت اور احترام ملے گا جتنا تم رجب کی بیوی بن کر حاصل کر رہی تھیں اور سب سے بڑی بات تمہاری بیٹی اپنوں کے درمیان رہے گی، اسے ماموں کے ٹکڑوں پر نہیں پلنا پڑے گا۔“

”لیکن آپ کا بیٹا پاگل ہے۔“ معاً ثمینہ کے منہ سے نکلا۔ جنت بی بی کے چہرے پر واضح ناگواری دکھائی دی۔ اسے ثمینہ کا جملہ بری طرح چبھا تھا۔

”تو تمہارا کیا خیال ہے میرا بیٹا پاگل نہ ہوتا تو کیا میں تم جیسی بیوہ عورت سے اس کی شادی کرنے کے متعلق سوچتی..... ہرگز نہیں..... اسے کوئی بھی بہترین لڑکی مل سکتی تھی۔“ جنت بی بی نے نخوت سے سر جھٹک کر کہا تھا۔

”آپ کس طرح کی باتیں کر رہی ہیں۔ میں نے سنا ہے مخبوط الحواس انسان کا تو نکاح بھی جائز نہیں ہوتا۔“

”تم اس جھنجھٹ میں نہ پڑو تو اچھا ہو گا..... مذہب کی تم سے زیادہ سمجھ ہے مجھے۔ نکاح کے لیے ہامی بھرو۔ ہم کسی مفتی سے فتویٰ لے لیں گے۔“ جنت بی بی کا انداز ہنوز تھا۔

ثمینہ اس کا چہرہ دیکھتی رہ گئیں کیا تھی یہ عورت؟ اسے سمجھنا، اس کے متعلق کوئی گمان پالنا نہایت بیوقوفی تھی۔

ٹھیک تھا کہ ثمینہ کو حویلی میں جا کر رہنے کا شوق تھا لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب شروع شروع میں انہیں وہاں عزت ملتی تھی اور پچھلے کچھ سال انہوں نے حویلی میں جو تذلیل سہتے گزارے تھے اس کے بعد وہاں جانے کا تصور بھی محال تھا کجا کہ ایسا شرمناک معاہدہ۔

انہوں نے گہری سانس بھر کر سر جھٹکا۔

”آپ یہاں سے چلی جائیں..... میرے لیے رجب کی یادیں ہی کافی ہیں۔“

”شاباش..... تم ہمیشہ میری توقعات پر پوری اترتی ہو ثمینہ! اور مجھے تم سے اسی بیوقوفانہ جواب کی توقع تھی۔“ جنت نے تمسخرانہ انداز میں کہا۔

”یہ ساری افسانوی باتیں ہوتی ہیں۔ کسی مرے ہوئے انسان کی یادوں کے سہارے زندگی گزارنے کی خواہش ایسی ہے جیسے انسان ساری زندگی ٹوٹے ہوئے گھڑے سے پانی پینے کی آس لگا کر بیٹھا رہے۔“

”ایک پاگل آدمی بھی میرے لیے ٹوٹے ہوئے گھڑے سے زیادہ کچھ ثابت نہیں ہو گا۔“ ثمینہ نے درشتی سے

کہا تھا۔

"لیکن اس پاگل آدمی کی وجہ سے تمہیں اور تمہاری بیٹی کو تحفظ ملے گا۔" جنت نے تیز لہجے میں کہا تھا۔

"میں اور میری بیٹی میرے بھائی کے گھر میں بھی محفوظ رہیں گے۔"

"تم..... تم کس قدر احمق ہو۔" جنت بی بی بری طرح سلگ اٹھی لیکن فوراً ہی اس نے اپنے لہجے کی تیزی پر قابو پا لیا۔ "سمجھنے کی کوشش کرو ثمینہ! میرے بیٹے سے شادی کر کے تم نقصان میں ہرگز نہ رہو گی۔ صرف رجب کے حصے کی جائیداد ہی تمہاری بیٹی کو نہیں ملے گی میں اپنے بڑے بیٹے کا حصہ بھی تمہاری بیٹی کے نام لگا دوں گی۔"

"اور میں یہ سمجھ نہیں پا رہی کہ آخر آپ مجھے اتنے لالچ کیوں دے رہی ہیں؟" ثمینہ الجھیں۔

"رجب کا حصہ تو ماوی کو اٹھارہ سال کی عمر میں مل ہی جانا ہے اچھا ہو گا آپ اپنے بیٹے کے لیے کسی اور کو ڈھونڈ لیں۔"

"خیر اس غلط فہمی میں تو تم ہرگز نہ رہنا کہ رجب کا حصہ تمہاری بیٹی کو اتنی آسانی سے ملے گا۔"

"کیا مطلب؟"

"مجھے کیا بیوقوف سمجھ رکھا ہے ثمینہ بیگم!" جنت بی بی نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"تمہیں لگتا ہے رجب نے اگر مجھ سے کہا تھا کہ ماوی کے اٹھارہ سال کا ہونے پر میں جائیداد اس کے نام منتقل کر دوں تو میں ایسا کروں گی؟ نہیں میں ایسا ہرگز نہیں کروں گی۔ اول تو ایسی کوئی بات رجب نے کہی ہی نہیں تھی اور اگر کہی بھی ہوتی تو میں ہرگز اس کی بات نہ مانتی..... دوسری بات یہ کہ میں نے تمہارے بھائی سے جھوٹ بولا تھا وہ بھی صرف اس لیے تا کہ مجھے کچھ ٹائم مل جائے اور رجب کی جائیداد میں اپنے نام کروا سکوں۔"

اس کے اس قدر اطمینان سے کہنے پر ثمینہ ششدر سی رہ گئی تھیں۔

"کیوں کیا آپ نے ایسا؟" بڑی دیر بعد ثمینہ کے لبوں سے نکلا تھا۔

"بڑا احمقانہ سوال ہے یہ لیکن اس کا جواب بھی میں دے دیتی ہوں ظاہر ہے مجھے رجب سے زیادہ اپنی اولاد عزیز ہے اور میں نہیں چاہتی کہ میرے مرحوم شوہر کی جائیداد کے اس طرح سے بٹوارے ہوں۔ تبھی میں نے تم لوگوں سے جھوٹ بولا اور اس عرصہ میں جائیداد اپنے نام کروالی۔ مناسب وقت آنے پر میں ساری جائیداد اپنی اولاد میں بانٹ دوں گی..... تمہارے پاس اب صرف یہی آپشن ہے کہ میری بیٹے سے شادی کر کے واپس حویلی آجاؤ اور اپنی بیٹی کا مستقبل محفوظ کرلو۔"

"آپ میری سوچ سے بڑھ کر گھٹیا ثابت ہو رہی ہیں.....؟" ثمینہ نے یکدم نفرت سے کہا تھا۔ جنت کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"زبان سنبھال کر بات کرو۔"

"کیوں سنبھالوں میں..... میری بچی کا حق مار کر آپ اپنی اولاد کا پیٹ بھرنا چاہتی ہیں اور پھر یہ بھی چاہتی ہیں کہ میں کوئی سخت لفظ استعمال نہ کروں؟"

"تمہاری، میرے سامنے کوئی اوقات نہیں ہے اس لیے اپنی زبان سنبھالو۔" جنت بی بی کے لیے اپنے غصے پر قابو پانا مشکل ہو گیا تھا۔

"اور اسی بے وقعت عورت سے آپ اپنے پاگل بیٹے کی شادی کی خواہش لے کر آئی ہیں۔" ثمینہ زہر لہجے میں بولیں۔

"کس قدر دوغلی ہیں آپ۔"

"صحیح کہہ رہی ہو تم..... تمہاری تو اتنی بھی اوقات نہیں کہ میں اپنے پاگل بیٹے کے لیے تمہیں منتخب کروں۔ پتا

نہیں میں نے تمہیں تمہاری حیثیت سے زیادہ نوازنے کا کیسے سوچ لیا۔" جنت بی بی نے نخوت سے کہا تھا۔

"نوازنے والی آپ کون ہوتی ہیں؟ نوازنا تو اللہ ہے اور کچھ لوگ آپ جیسے ہوتے ہیں جو اللہ کی نوازشوں کو بھی اپنا حق سمجھ کر وصولتے ہیں اور اپنا اصل منصب بھول کر زمین پر خدا بن بیٹھتے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے گا، اللہ اگر نوازتا ہے تو اس کی پکڑ بھی اتنی ہی مضبوط ہے۔ وہ آپ کو منہ کے بل ضرور گرائے گا۔"

"بکواس بند کرو اپنی۔"

"جا ہی رہی ہیں تو ایک آخری بات سنتی جائیں..... بے شک میرا بھائی غریب ہے لیکن میں اس پر بوجھ ہرگز نہیں ہوں اور میں رجب کی جائیداد کو ضرور حاصل کر کے رہوں گی۔"

"اس کے متعلق تو سوچنا بھی نہیں۔" جنت بیگم نے اس بار بے حد استہزائیہ انداز میں کہا تھا۔

"جائیداد میں سے حصہ تو اب تمہیں مر کر بھی نہیں ملے گا۔ خصوصاً اس صورت حال میں جب کہ تم میرے بیٹے کو انکار کر کے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار چکی ہو..... اور جائیداد کے حصول کے لیے کرو گی کیا؟ اپنے بھائیوں کو میرے مقابل کھڑا کرو گی؟ ضرور کھڑا کرو لیکن یہ ضرور یاد رکھنا کہ تمہارے بھائیوں کو مروانا میرے لیے ذرا بھی مشکل نہیں ہو گا۔ اگر میں تمہارے شوہر کو زہر دے کے مروا سکتی ہوں تو پھر میں کسی کو بھی مروا سکتی ہوں۔" اس نے جیسے ثمینہ کے پیروں سے زمین ہی کھینچ لی تھی۔

"رجب کے مرنے کے بعد تم اپنے بھائیوں کے سہارے جی رہی ہو۔ اگر بھائی بھی نہ رہے تو کس کے سہارے جیو گی..... کچھ بھی کرنے سے پہلے ذرا اس بات پہ غور کر لینا۔ رجب کو زہر دیتے ہوئے مجھے ذرا سا دکھ ہوا تھا کہ وہ میرے مرحوم شوہر کا بیٹا تھا لیکن تمہارے بھائیوں کو مرواتے ہوئے تو مجھے اتنا بھی دکھ نہیں ہو گا۔" وہ جاتے جاتے ذرا دیر کو رکی ثمینہ کے ہکا بکا چہرے پر ایک چھچھلتی نگاہ ڈالی اور باہر نکل گئی۔

ثمینہ کے پیروں تلے سے زمین کھینچ لینے کے بعد وہ سر سے آسمان کھینچ لینے کا ارادہ بھی ظاہر کر گئی تھی اور ثمینہ کو اپنا آسمان بچانا تھا۔ ہر قیمت پر.....

کمرے میں گہری خاموشی تھی۔

لگتا ہی نہیں تھا کہ وہاں دو نفوس موجود ہیں جالی دار دروازے سے ملگجا ابر آلود دن جھانک رہا تھا۔

ماوی قدرے سر جھکائے میز کی سطح کو گھور رہی تھی۔ اس کے تاثرات سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہے۔

البتہ ثمینہ کی نظریں ماوی پر جمی تھیں۔

"میں نے بڑی کوشش کی کہ فیاض بھائی میری بات مان کر جنت بی بی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے پر راضی ہو جائیں لیکن کسی کو میری بات کا یقین ہی نہیں آرہا تھا۔" ان کے لہجے میں تھکن اور دکھ تھا۔

"کیوں؟" ماوی نے متعجب ہو کر انہیں دیکھا۔

"میں نے بتایا ناں، تمہارے بابا کے انتقال کے بعد میری ذہنی حالت بگڑ سی گئی تھی۔ مجھے بے ہوشی کے دورے پڑتے اور کبھی کبھار اوٹ پٹانگ باتیں کرنے لگتی تھی۔ فیاض بھائی نے میرا علاج بھی کروایا تب میں اپنے دکھ سے سنبھلی اور جب سنبھل چکی تو جنت بی بی اپنے جرم کا اعتراف کر کے چلتی بنی۔ فیاض بھائی نے میری باتوں کو میری گزشتہ ذہنی حالت پہ محمول کیا اور میری کسی بھی بات کو سچ ماننے سے انکار کر دیا۔ پھر کچھ عرصہ بعد ہم سب دبئی شفٹ ہو گئے۔ جنت بی بی، وہ حویلی اور اس حویلی سے جڑی ہوئی تلخ یادیں یہیں رہ گئیں۔ فیاض بھائی، بھابھی، ان کا خاندان اور کچھ میری شعوری کوششوں کا عمل دخل بھی تھا کہ میں اس بات کو بھولنے لگی پھر میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ میں دل پہ پتھر رکھ کے اس بات کو بھول جاؤں..... یا شاید میں بھولی نہیں تھی بس دل پہ

پتھر رکھ لیا تھا کہ جنت بی بی کو سزا دلوانے کے لیے میرے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہیں تھا۔ نہ ہی ابتدائی کچھ سالوں میں فیاض بھائی اور فیضان فائننشلی اتنے اسٹرونگ تھے کہ کورٹ کچہریوں کے چکر میں پڑنے کا رسک لیتے۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن میرا دل یہ نہیں مان رہا کہ بڑے ماما نے آپ کی بات کا یقین نہیں کیا۔" ماوی نے الجھ کر کہا تھا۔

"تمہیں بھی تو یقین نہیں آرہا۔" ثمینہ نے مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ماوی لحظہ بھر کے لیے چپ سی رہ گئی پھر اصرار بھرے لہجے میں بولی۔

"میرا معاملہ مختلف ہے۔ ایک بیحد عجیب و غریب قسم کا انکشاف آپ نے اچانک میرے سامنے لا کر رکھ دیا ہے اور اگر سچ کہوں تو بات یہ نہیں کہ مجھے آپ کی باتوں کا اعتبار نہیں ہے۔ مجھے آپ کی ہر بات پر یقین ہے ممی! لیکن آپ کی ڈیمانڈ میں پوری نہیں کر سکتی۔"

"کیا تمہیں اپنے بابا سے محبت نہیں ہے۔ تم نہیں چاہتی کہ ان کی قاتل کو سزا ملے؟"

"محبت ہے...... لیکن اس محبت کو ایکسپلائٹ تو نہ کریں۔" ماوی بری طرح چڑ گئی۔

"بابا نے جو اذیتیں برداشت کیں' آپ نے جو مصائب سہے وہ سب اپنی جگہ افسوسناک سہی لیکن میرا اس حویلی میں جانا بالکل ایسا ہی ہوگا جیسے میں خود کو موت کے منہ میں دھکیل دوں...... میں ڈرپوک یا بزدل نہیں ہوں لیکن خودکشی کے حق میں بھی نہیں ہوں...... جو عورت فیضان ماما اور بڑے ماموں کو مروانے کی دھمکی دے سکتی ہے آپ کا کیا خیال ہے مجھے زندہ اس حویلی سے واپس آنے دے گی؟"

"تم آرش نیشنل ہو ماوی! تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چند روز غائب رہو گی تو ایمبیسی حرکت میں آجائے گی...... پھر تمہارے دونوں ماموں بھی اس پوزیشن میں آچکے ہیں کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچنے دیں۔" ثمینہ نے کہا اور ماوی ہکا بکا سی انہیں دیکھتی رہ گئی۔

یہ اس کی ماں نہیں تھی یہ کوئی اور عورت تھی جو اسے خود موت کے منہ میں دھکیل رہی تھی۔

"ان سب باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ تب تک میں مر چکی ہوں گی۔" وہ کرسی دھکیل کر اٹھی اور تیز قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔

ثمینہ نے گہری سانس بھر کر کرسی کی پشت سے کمر لگالی۔ وہ جانتی تھیں ماوی کا ردعمل یہی ہوگا۔

کبھی ایسا ہوتا ہے ذہن بالکل بند سا ہو جاتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ناکارہ لگنے لگتی ہے۔ بالکل ایسے' جیسے تن تنہا انسان کی کشتی سمندر کی وسعتوں میں بھٹک رہی ہو اور پتوار بھی ہاتھ سے چھوٹ کر گہرے پانیوں میں جا سوئے ہوں۔

تو ماوی کی حالت بھی کچھ ایسی ہی ہو رہی تھی۔

بند بند سا ذہن' الجھی ہوئی سی سوچیں۔ وہ جھولے پر بیٹھی تھی۔ جھولا بالکل ساکت تھا۔ ماوی نے گرم شال اپنے گرد لپیٹ رکھی تھی اور اس کے ریشمی لیکن الجھے ہوئے بے ترتیب بال شانوں پر پڑے تھے۔

جس وقت ثمینہ جالی کا دروازہ دھکیل کر باہر نکلیں اسے وہاں بیٹھے تیس منٹ سے شاید کچھ زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے گردن موڑ کر لحظہ بھر کے لیے ثمینہ کی طرف دیکھا اور پھر رخ موڑ لیا۔ ثمینہ آہستگی سے اس کے ساتھ جھولے پر بیٹھ گئیں ہلکی سی آواز کے ساتھ جھولا لرزنے لگا۔

بے حد خاموشی کے ساتھ وہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھی لان کا جائزہ لیتی رہیں جہاں پچھلی رات کے طوفان نے بہت تباہی مچائی تھی۔ انیبا خدا معلوم کہاں تھی اور پتا نہیں لان کی حالت دیکھ کر اس کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی آسمان پر ابھی بھی بادل تھے۔ معاً تیز ہوا کے جھونکے کے ساتھ پھر بارش شروع ہو گئی اور ادھر یوکلپٹس کے چوڑے

پتوں پر تڑاتڑ برستی بارش کی آواز سنائی دینے لگی۔

"تو یہ سب طے شدہ تھا۔" ماوی نے دونوں کے درمیان حائل خاموشی کو توڑا تھا۔ "ہمارا پاکستان آنا' آپ کا ایک عرصہ تک پاکستان آنے کو ٹالتے رہنا اور پھر اچانک مان جانا' یہاں آکر ثروت آنٹی کے یہاں قیام کرنا اور پھر شبیہہ العباس اور جلال الدین سے ٹکرانا...... یہ ساری آپ کی پلاننگ تھی ممی! مجھے حویلی بھجوانے کے لیے؟"

"نہیں...... یہ میری پلاننگ نہیں تھی' یہ کاتب تقدیر کی پلاننگ ہے۔" ثمینہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"پہلے پہل میں واقعی پاکستان نہیں آنا چاہتی تھی کیونکہ میرے دل میں جنت بی بی کی طرف سے بہت خدشات تھے۔ لیکن پھر ایک روز مجھے خیال آیا کہ اتنا خوف کھانے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ بہرکیف وہ عورت ہے تو انسان ہی ناں۔ پھر میری حیثیت اب کسی بھی طرح اس ثمینہ کی حیثیت سے میل نہیں کھاتی جو کئی سال پہلے اس عورت کے مظالم و زیادتیاں سہتی رہی تھی تو میں نے پاکستان آنے کے لیے ہامی بھرلی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں ثروت یا شبیہہ العباس اور جلال سے ملاقات ہو جائے گی۔ لیکن باری باری ان سب لوگوں سے ملنے کے بعد مجھے احساس ہوا ان کا یوں میرے سامنے آنا بے مقصد ہرگز نہیں ہے۔ یہ تقدیر کا اشارہ ہے جسے ہمیں سمجھنا چاہیے۔ ان لوگوں کے ذریعے سے ہم تمہارے بابا کے قاتل کے خلاف ثبوت لا سکتے ہیں' اس عورت کو سزا دلوا سکتے ہیں میری بات مان لو ماوی...... تمہاری یہ چھوٹی سی فیور تمہارے بابا کی روح کو سکون دلا دے گی۔"

"یہ چھوٹی فیور نہیں ہے ممی! آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں کہ مجھے اس حویلی میں بھیج کر آپ میری زندگی کو خطرے میں ڈال رہی ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ فلموں ڈراموں میں اتنے سالوں کے بعد کسی کے قتل کے ثبوت اکٹھے کیے جا سکتے ہیں' حقیقی زندگی میں نہیں۔"

"تمہیں ثبوت تلاش کرنا ہوں گے۔ زندگی میں کوئی بھی چیز اتنی آسانی سے نہیں ملتی۔ اس حویلی میں کوئی نہ کوئی ایسا انسان ضرور ہے۔ جو جنت بی بی کے جرم کا گواہ ہے۔ میں جانتی ہوں مجھے اکثر خواب میں وہ چہرے دکھائی دیتے ہیں' لیکن میں انہیں پہچان نہیں پاتی...... تمہیں ان لوگوں کو ڈھونڈنا ہے ماوی! وہ تمہیں مل جائیں گے۔"

"ممی! یہ آپ مجھ سے کس طرح کی Hypothetical (فرضی) باتیں کر رہی ہیں۔" ماوی نے صدمے سے چور آواز میں کہا تھا۔

"یہ Hypothetical نہیں ہیں۔" ثمینہ نے گویا تھک کر کہا تھا۔

"میں جانتی ہوں جنت بی بی کے جرم کا ثبوت اسی حویلی میں ہے اور اس ثبوت کو حاصل کرنے کے لیے تمہیں وہاں جانا ہوگا۔"

"اس سے تو اچھا تھا' آپ مجھے بچپن میں موت کے کنویں میں بائیک ہی چلا لینے دیتیں۔ تبھی مر کھپ جاتی تو کم سے کم اب آپ کے ہاتھوں موت کے منہ میں دھکیلے جانے کا افسوس تو نہ ہوتا۔" اس نے جل کر کہا۔

"ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا ماوی! دیکھنا تمہارے سارے خدشات دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔" ثمینہ نے رسان سے کہا تھا۔

"کیا تم نہیں چاہتیں تمہارے بابا کے قاتل کو سزا ملے...... محبت نہیں ہے تمہیں ان سے؟" ثمینہ نے جذباتیت کا سہارا لینا چاہا۔

"محبت ہے...... لیکن' آپ اسے میری خود غرضی سمجھیں یا جو مرضی...... کئی سال پہلے خود سے جدا ہوئے باپ کے لیے میں اپنا آپ خطرے میں نہیں ڈال سکتی۔" ماوی نے جھجکتے ہوئے کہا تھا۔

"سب انسانوں کی طرح مجھے خود سے بہت محبت ہے ممی! اور جو راستہ آپ بتا رہی ہیں وہ تو سراسر خودکشی کی طرف جاتا ہے۔" اس کا انداز قطعی تھا۔ ثمینہ کے چہرے پر یکدم پژمردگی چھا گئی۔

"یعنی تمہارے ماں باپ جئیں یا مریں، تمہیں فرق نہیں پڑتا؟"
"ماں سے نہیں، صرف باپ سے۔" ماوی نے تیزی سے کہا تھا۔
"بابا زندہ ہوتے اور انہیں کوئی تکلیف پہنچاتا تو میرا ردعمل کچھ اور طرح کا ہوتا لیکن اس صورت حال میں، جب کہ انہیں مجھ سے بچھڑے کئی سال گزر چکے ہیں مجھے ان کی صرف وہ شکل یاد ہے۔ جو میں تصویروں میں دیکھتی ہوں، بلاشبہ ان کی محبت میرے خون میں شامل ہے لیکن یہ محبت اتنی شدید نہیں ہے ممی! کہ میں موت کے منہ میں کود جاؤں...... آپ کو میری خود غرضی پر غصہ آرہا ہے، میں جانتی ہوں...... لیکن میں خود غرض نہیں ہوں، یہ آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔ بس صرف اتنا ہے کہ میں اس بات کو بغیر جذباتیت کے دیکھ رہی ہوں۔ بابا کے برعکس کسی نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہوتی تو میں اسے اچھی طرح سمجھ لیتی کیونکہ بہرحال بابا سے زیادہ محبت مجھے آپ سے ہے......"
"ٹھیک ہے تو اپنے بابا کے لیے نہ سہی۔ میری خوشی کے لیے یہ کام کردو۔" ثمینہ نے کہا۔
"ممی......" ماوی بیزار سی ہوگئی۔ "آپ میری زندگی کا سب سے اہم سب سے خوب صورت اور قیمتی رشتہ ہیں۔ آپ کے لیے تو میں زندگی کی ہر خوشی سے دستبردار ہوسکتی ہوں حتیٰ کہ آپ اگر کہیں کہ میں شہروز کے بجائے کسی اور سے شادی کرلوں تو اس کے لیے بھی میں تیار ہوجاؤں گی کہ اس میں آپ کی رضا اور خوشی ہوگی لیکن میں وہ نہیں کرسکتی جو آپ کہہ رہی ہیں۔ میں حویلی نہیں جاؤں گی۔"
"ایک بات میں تمہیں بتاؤں ماوی! حویلی تو تمہیں جانا ہی پڑے گا، میں فیصلہ کرچکی ہوں کہ اب ہمیں، رجب کی قاتل کو اس کے انجام تک پہنچانا ہے اور شہروز سے شادی کو بھی فی الحال بھول جاؤ کیونکہ تمہاری شادی جلال سے ہوگی، میں اسے بتا چکی ہوں کہ تم اس میں انٹرسٹڈ ہو۔"
بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ ہتھوڑے کی پہلی ضرب شدید تھی یا دوسری، ماوی کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ وہ ہکابکا ثمینہ کے مطمئن چہرے کو دیکھ رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

"واٹ ربش..... ایسا کیوں کہا آپ نے جلال سے؟" چند منٹ بعد ماوی کے لبوں سے ٹھٹھرے ہوئے بے یقین الفاظ نکلے تھے۔
ثمینہ اسی طرح پرسکون بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں ابھرا تھا۔
"تم میری بات مان کر حویلی جانے پر رضامند ہوجاؤ میں تمہیں تمہارے سوال کا جواب دے دوں گی۔"
"پلیز ممی! میری برداشت سے زیادہ اونچی ڈیمانڈ کررہی ہیں آپ..... پہلے حویلی جانے کی ضد اور اب..... اب جلال سے شادی۔"
"جلال وہ ٹرمپ کارڈ ہے ماوی! جو صرف تم سے نکاح کے بعد ہمارے ہاتھ آسکتا ہے۔" ثمینہ اس کی پریشانی کی پروا کیے بغیر جیسے ایک ٹرانس کی کیفیت میں بول رہی تھیں۔
ماوی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں گرالیا۔ اس کے دماغ کی رگیں گویا جیسے پھٹنے کے قریب پہنچ چکی تھیں۔
"یہ ٹرمپ کارڈ اپنے مناسب وقت پر خود چلے گا..... لیکن اسے اپنے حق میں کرنے کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے نکاح..... میں نے جھوٹ بول کر جلال کو تمہارے حق میں قائل کیا ہے، وہ معصوم سا انسان ہے، بڑے آرام سے تمہاری محبت میں مبتلا ہوگیا..... لیکن تمہیں اس کے لیے پریشان ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ ہم جلال کو اپنے حق میں استعمال کریں گے۔ اس کے بعد تم اس سے خلع لے لینا اور شہروز سے شادی کرلینا، شہروز کو اس

بارے میں کچھ پتا بھی نہیں چلے گا، بلکہ کسی کو بھی کچھ پتا نہیں چلے گا، کیونکہ اس بارے میں تم کسی کو کچھ بتانا، نہ میں بتاؤں گی۔
میں جانتی ہوں یہ کام تمہارے لیے مشکل ہے، لیکن انسان ارادہ کرے تو دنیا کا کوئی کام ناممکن نہیں رہتا، مشکل بھلے ہی لگے۔ مجھے یقین ہے ماوی! تم یہ کام کرلوگی۔ میں نے تمہیں دبو یا ڈرپوک نہیں بنایا۔ لاشعوری طور پر میں نے تمہاری تربیت اس طرح کی کہ تم بہادر، حوصلہ مند بنو۔ ہر مشکل کے سامنے ڈٹ جاؤ۔ میری بات سے انکار کرکے مجھے مایوس مت کرو ماوی! رجب کے قاتل کو سزا دلوانا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے..... میں اس عورت کو اس کے انجام تک پہنچانا چاہتی ہوں..... اس حویلی میں جاؤگی تو تمہیں تمہارا حق ملے گا اور ثبوت بھی۔
اب تمہارے پاس دو ہی راستے ہیں، ایک تو یہ جو میری مرضی کے عین مطابق ہے، جلال سے نکاح کرو اور حویلی چلی جاؤ اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ میری بات سے انکار کرکے میری مری ہوئی شکل دیکھو..... میں سچ کہہ رہی ہوں ماوی! اگر تم نے انکار کیا تو میں خودکشی کرلوں گی۔ باپ کی تمہیں پروا نہیں ہے، ماں کے بغیر بھی مطمئن رہ لینا۔"
ثمینہ اطمینان سے کہتی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ماوی کے سر پر تو یکے بعد دیگرے ہتھوڑے برسے تھے۔ وہ منہ کھولے ماں کی باتیں سن رہی تھی۔
"تمہارا جو بھی فیصلہ ہو مجھے بتا دینا..... اور ہاں یہ بات ہم دونوں کے درمیان رہے تو اچھا ہے، بصورت دیگر خودکشی تو میں کرہی لوں گی۔"
ثمینہ کا لہجہ مستحکم تھا۔ انہوں نے ماوی سے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ اسے ان کا لہجہ ہی حیران کیے دے رہا تھا۔ حیرانی، پریشانی، تعجب، بے یقینی، صدمہ..... جیسا ہر لفظ اس کی کیفیت بیان کرنے کے لیے ناکافی ثابت ہورہا تھا۔
وہ ششدر سی ثمینہ کو جالی کے دروازے کے پیچھے غائب ہوتا دیکھتی رہی۔ اس کے سر میں مسلسل دھماکے ہورہے تھے۔
"Psychotic Disorder" اس کے کانوں میں پچھلی رات کے کہے ہوئے اپنے ہی الفاظ گونجنے لگے تھے، صرف یہ ہی نہیں مختلف آوازیں اس کے اردگرد پھیل گئی تھیں۔
"کسی انسان کے اردگرد موجود غیر متوازن رویے اس انسان کی سوچ میں گرہیں لگا دیتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ گرہیں نفسیاتی الجھنوں میں بدل جاتی ہیں۔" اسے یاد آیا جینٹ نے ایک بار کہا تھا۔
"وہ خاتون Psychosis کا شکار تھیں۔" اس نے کل کہا تھا۔
"نفسیاتی مریض کبھی اکیلا نہیں ہوتا، وہ اپنے اردگرد رہنے والے ہر انسان کو ایک مختلف نوعیت کا نفسیاتی الجھاؤ منتقل کررہا ہوتا ہے، یعنی ایک سے دس افراد متاثر ہوئے تو سمجھو معاشرے کے دس خاندان برباد ہوئے۔" ساہیوال میں سیمینار اٹینڈ کرنے کے بعد اس نے سلطانہ آنٹی کو کہتے سنا تھا۔
"ایک معمولی نفسیاتی الجھاؤ کا شکار انسان اپنے اردگرد رہنے والوں میں سے کسی فرد کو بہت شدید نفسیاتی الجھاؤ بھی منتقل کرسکتا ہے۔" یہ اس کی اپنی آواز تھی جو اس کے اردگرد چکرا رہی تھی۔
ماوی کے اردگرد آوازیں بڑھتی جارہی تھیں۔
اس کی ماں نے اسے خودکشی کی دھمکی دی تھی۔ وہ ہر طرح کے خطرے سے آگاہ ہونے کے باوجود اسے جان بوجھ کر موت کے منہ میں دھکیل رہی تھیں۔ اس نے کل جنت بی بی کو نفسیاتی مریضہ قرار دیا تھا، لیکن آج اسے احساس ہورہا تھا کہ اس کی ماں خود ایک نفسیاتی مریضہ بن چکی ہیں، یہ بات سوچنے میں عجیب لگ رہی تھی، لیکن

.... شاید حقیقت یہ ہی تھی۔

☼ ☼ ☼

ثروت کی طبیعت سنبھل چکی تھی اور وہ اسپتال سے ڈسچارج بھی ہو گئی تھیں، لیکن ڈاکٹر نے انہیں کچھ عرصہ کے لیے مکمل بیڈ ریسٹ کی تاکید کی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ سفر کرنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ انیبا نے سنا تو فوراً" ان کے سر ہو گئی۔

"ٹھیک ہے، پھر میں بھی آپ کے ساتھ یہیں رہوں گی۔"

"پاگل مت بنو انو! وہاں تمہارے بھائیوں اور ڈیڈی کو تمہاری ضرورت ہو گی۔" ثروت نے پیار سے کہا تھا۔

"ضرورت تو آپ کی بھی ہے.... پھر آپ کیوں نہیں چل رہیں ہمارے ساتھ؟"

"تمہارے سامنے ہی تو ڈاکٹر انصار نے کہا ہے کہ مجھے کچھ عرصہ سفر نہیں کرنا چاہیے۔"

"ڈاکٹر انصار نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی، انہوں نے صرف آپ کو بیڈ ریسٹ کی تاکید کی تھی۔" انیبا نے بالآخر بات کرنے کی ٹھان ہی لی تھی۔ "میں جانتی ہوں ممی! آپ کے اور ڈیڈی کے درمیان کوئی ایشو چل رہا ہے۔ اسی لیے آپ ہمارے ساتھ نہیں آ رہیں۔"

"نہیں انو! ایسی تو کوئی.... " ثروت نے سٹپٹا کر کہا۔

"پلیز ممی! اب کم سے کم آپ مجھ سے تو غلط بیانی نہ کریں۔ میں، ولید حتیٰ کہ ولی بھی جانتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے، لیکن آپ ہوں یا ڈیڈی.... دونوں میں سے کوئی اس ایشو پر بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔ ہم تینوں، آپ دونوں کے درمیان پنگ پانگ بالز کی طرح حرکت کر رہے ہیں، کبھی ادھر، کبھی ادھر، آخر ایسا کب تک چلے گا؟ اور ولید بتا رہا تھا آپ اور ڈیڈی میری شادی پلان کر رہے ہیں۔ پلیز ممی! میں ابھی شادی نہیں کروں گی، پہلے میری اسٹڈیز کمپلیٹ ہو جانے دیں، اس کے بعد شادی بھی ہو جائے گی۔" اس نے قطعیت سے کہا تھا۔

"یہ ضروری ہے انو۔" ثروت نے آہستگی سے کہا تھا۔

"تمہاری شادی ہو جائے تو ہمیں کوئی فیصلہ کرنے میں سہولت رہے گی۔"

"ممی! کیسا فیصلہ؟" صدمے سے اس کی آواز خود بخود دھیمی ہو گئی۔

"کیا آپ اور ڈیڈی سچ مچ علیحدگی کے متعلق سوچ رہے ہیں؟ آخر ایسے کون سے اختلاف ہیں آپ دونوں کے جنہیں سلجھایا نہیں جا سکتا؟" وہ جیسے رو دینے کو تھی۔

"دیکھو انو! جب دل پر بوجھ بڑھ جاتے ہیں نا، تب ہی ایک عورت اپنے اندر اتنا حوصلہ پیدا کر پاتی ہے کہ اپنا گھر توڑنے کے متعلق سوچے، خدا نہ کرے کہ تم پر کبھی ایسا وقت آئے۔"

"لیکن ممی!"

"ابھی کوئی سوال مت پوچھو انیبا! بعض اوقات انسان کوئی فیصلہ کر لیتا ہے، لیکن اس فیصلے کے حق میں دلائل نہیں دے سکتا، کچھ روز بعد یا ممکن ہے چند مہینوں کے بعد میں اپنے اندر اتنا حوصلہ محسوس کروں کہ تمہارے ہر سوال کا جواب دے سکوں، لیکن ابھی میرے اندر اتنی سکت نہیں ہے۔" ثروت کا انداز اس قدر بے چارگی لیے ہوئے تھا کہ وہ چاہ کر بھی پھر کچھ نہ کہہ سکی۔

☼ ☼ ☼

ماوی عجب کشمکش کا شکار تھی۔

گو کہ وہ بہت واضح انداز میں ثمینہ کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر چکی تھی اور سچی بات ہے اس کے دل و دماغ کو اس

فیصلے کی حمایت میں کوئی تامل بھی نہیں تھا۔ دقت تھی تو صرف ان کی دھمکی، ان کی جذباتی بلیک میلنگ کا طریقہ کار یعنی ان کی مستقل خاموشی۔

یہ ہی بات ماوی کے لیے اور بھی پریشانی کا باعث بنی ہوئی تھی۔ اس کی چھٹی حس اسے بار بار آگاہ کر رہی تھی کہ ماں کی بات ماننے کے نتیجے میں وہ خود کسی ایسی مشکل میں پھنس جائے گی، جس سے نکلنا پھر ساری زندگی آسان نہ ہو گا اور ان کی بات نہ ماننے کے نتیجے میں وہ اپنا کہا سچ کر دکھائیں گی۔ اگر وہ اپنی فطرت کے برعکس کوئی مطالبہ کر سکتی تھیں تو پھر وہ کچھ بھی کر گزریں گی۔

وہ سوچ سوچ کر تھک چکی تھی، لیکن کوئی حل ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ تب ایک ایک کر کے اس نے ان افراد کے نام سوچنا شروع کیے۔ جن سے وہ اس سلسلے میں مدد کی توقع کر سکتی تھی۔

فیضان ماما سے تو انیبا والے سلسلے کی وجہ سے اب تک ناراضی چل رہی تھی۔ بول چال تک بند تھی۔ اس لیے وہ تو اس لسٹ سے فوراً" ہی خارج ہو گئے۔ پھر اسے فیاض ماموں کا خیال آیا۔ اس نے سوچا ضروری نہیں کہ وہ ڈائریکٹ ان سے بات کرے، آخر وہ اشارتاً" بھی تو بات کر سکتی ہے اور چونکہ فیاض ماموں کا اس سارے معاملے سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور تھا، اس لیے یقیناً" ماموں سے بات کر کے ان پر ماں کی ذہنی حالت واضح ہو سکتی تھی

یہ ہی سوچ کر اس نے کال ملائی، لیکن آگے ایک نئی صورت حال اس کی منتظر تھی۔

"ثمینہ کو کیا پریشانی ہے ماوی؟" فیاض ماموں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"کوئی پریشانی نہیں ہے ماموں۔" ماوی کے تمام حواس یک دم چوکنے ہو گئے تھے۔ "کیوں؟ کیا ممی نے آپ سے کچھ کہا ہے؟"

نہیں.... کہا تو کچھ نہیں ہے۔" فیاض ماموں نے پرسوچ انداز میں کہا تھا۔ "ویسے بھی ثمینہ نے کب کوئی بات شیئر کی ہے۔ اس کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے، ہمیشہ میرے لیے اندازہ لگانا مشکل رہا ہے۔ بلکہ شاید ہمیشہ کا لفظ میں نے غلط جگہ استعمال کیا ہے، ثمینہ ہمیشہ سے ایسی نہیں تھی، لیکن رجب کے انتقال کے بعد اس کے مزاج میں کچھ عجیب سی تبدیلی پیدا ہونے لگی تھی۔

وہ پہروں خاموش رہتی تھی۔ میں اور تمہاری ممانی اسے بولنے پر آمادہ کرنے اور کئی کئی گھنٹوں بلکہ بعض اوقات تو کئی روز کے بعد وہ بات کرنے پر آمادہ ہوتی تھی۔ لیکن دل میں آئے خیالات اس نے کبھی کسی سے شیئر نہیں کیے۔ اور جو انسان اپنے دل کی باتیں یا خیالات اپنے قریبی لوگوں سے ڈسکس نہ کرتا ہو، اسے سمجھنا ہمیشہ مشکل ہوتا ہے۔

مجھے چند روز سے عجیب سے خواب آ رہے ہیں، جن میں ثمینہ پریشان دکھائی دیتی ہے۔ پرسوں میری اس سے فون پر بات ہوئی تھی، اس کی آواز سن کر بھی مجھے یہ ہی لگا کہ وہ کسی پریشانی کا شکار ہے، لیکن میرے پوچھنے پر حسب عادت وہ ٹال گئی۔ مجھے تم سے یہ کہنا تھا بیٹا! اپنی ماں کا بہت خیال رکھو، تمہارے لیے اس نے زندگی میں بہت کچھ سہا ہے، اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا۔"

انہوں نے ماوی کے کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ ماوی نے جیسے بددل ہو کر فون بند کر دیا۔ اسے یاد آیا فیاض ماما اس طرح کی باتیں کوئی پہلی بار نہیں کر رہے تھے، وہ اکثر اس طرح کی باتیں کرتے تھے، لیکن آج اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے سب کچھ بطور خاص اسے سنایا جا رہا ہو۔

وہ کچھ دیر بیٹھی سنتی رہی، پھر بے زار ہو کر باہر آ گئی۔

لان ویسے ہی جھاڑ جھنکاڑ حالت میں پڑا تھا۔ آج تو مطلع بھی صاف تھا۔ معاً" اسے خیال آیا کہ دو روز سے اس کی انیبا سے ملاقات بھی نہیں ہو سکی۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اور لان کی ابتر حالت پر غور کرتی انیبا کی

طرف آگئی، لیکن یہاں آکر شازیہ کی زبانی اس کی غیر موجودگی کا پتا چلا۔
"واپسی کب تک ہے؟"
"پتا نہیں بی بی! اس بارے میں تو مجھے کچھ بھی نہیں پتا، مالک لوگ ہیں جب دل کرے گا آجائیں گے۔" ماوی جوانیبا سے گپ شپ لگا کر اپنا ذہن بٹانا چاہ رہی تھی، یہاں سے بھی بددل ہو کر نکلی، پھر گیٹ سے ہی باہر آگئی۔
یوں ہی بے مقصد چہل قدمی کرتے ہوئے اسے خود بھی پتا نہیں چلا وہ کس سمت میں چل پڑی ہے۔ چونکی اس وقت، جب اس نے خود کو کسی بلڈنگ کے کمپاؤنڈ میں کھڑے پایا۔ وہ چونکہ اپنی سوچوں میں غلطاں تھی۔ اس لیے چند لمحے خالی خالی نظروں سے بلڈنگ کو دیکھتی رہی۔ معاً اس کے ذہن میں بجلی کا ایک کوندا سا لپکا۔
"ارے، جلال بھی تو یہیں رہتا ہے..... مجھے پہلے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا کہ مجھے جلال سے اس بارے میں بات کرنا چاہیے۔ ممی نے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ میں اس میں انٹرسٹڈ ہوں۔ ممکن ہے اسے ممی کی بات کا یقین ہی نہ آیا ہو اور وہ خود ہی انکار کردے۔"
اس خیال کا آنا تھا کہ وہ تیزی سے اندر کی طرف بڑھ گئی۔

☼ ☼ ☼

یہ محض اتفاق ہی تھا کہ جب ماوی نے ڈور بیل بجانے کے لیے ہاتھ اٹھایا، ٹھیک اسی وقت شبیہہ دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔
ماوی کو دیکھتے ہی اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔
"جی فرمائیے۔"
اس انداز پر ماوی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا۔ پسند تو وہ اسے پہلے بھی نہیں تھا، عجیب اکھڑ اور بدتمیز سا لگتا تھا۔ اس طرح بات کرنے پر اور بھی برا لگا۔
"فرمانا کیا ہے..... میں جلال سے ملنے آئی تھی۔"
"کیوں؟" شبیہہ نے بے ساختہ پوچھا، اب ماوی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔
"اس کیوں کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ جلال کے پرسنل سیکریٹری ہیں جو اپائنمنٹ لیے بغیر ملنے نہیں دیتے؟"
شبیہہ نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھا۔ ناپسندیدگی کی سند تو وہ اسے پہلی ملاقات میں ہی دے چکا تھا، لیکن دقت یہ تھی کہ فی الحال اس کی یہاں موجودگی شبیہہ کو بری طرح کھٹکی تھی۔
"اگر میں کہوں ہاں تو....." اس نے اپنی عادت کے برخلاف بات کو طول دیا تھا۔
"تو میں کہوں گی کہ میں جلال کی فرینڈ ہوں۔ آپ جا کر اس کو بتا دیں کہ میں آئی ہوں، میرا نہیں خیال کہ اس سے بھی زیادہ کسی پرسنل سیکریٹری کے کچھ اختیارات ہوتے ہیں۔" ماوی نے اچھی خاصی چوٹ کی تھی۔ شبیہہ تلملایا ضرور، لیکن پھر بھی ضبط کر گیا۔
"جلال گھر پہ نہیں ہے۔"
"ایں..... " ماوی پر اوس گر گئی۔
"کہاں گیا ہے؟ کب تک واپس آئے گا؟" اس نے بے قراری سے پوچھا اور اس کے انداز کو شبیہہ نے بطور خاص نوٹ کیا تھا۔
"ٹورنٹو گیا ہوا ہے۔ ایک مہینے سے پہلے واپسی ممکن نہیں..... آپ دوبارہ تشریف لانے کی زحمت نہ کیجیے گا۔" شبیہہ نے رکھائی سے جھوٹ بولا اور لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

"ٹورنٹو۔" ماوی نے زیر لب دہرایا، پھر تیزی سے اس کے پیچھے لپکی۔
"سنیے..... کیا مجھے جلال کا کوئی کانٹیکٹ نمبر مل سکتا ہے؟"
"ہرگز نہیں، کیونکہ جلال نے غیر ضروری لوگوں کو کانٹیکٹ نمبر دینے سے منع کر رکھا ہے۔" اس نے دل جلانے والے انداز میں کہا اور ماوی کو پیچ و تاب کھاتا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔
"جلال خود تو اتنا اچھا ہے، یہ فضول قسم کے رشتہ دار پتا نہیں کس غلطی کی سزا کے طور پر ملے ہیں اسے۔" ماوی نے پیر پٹخ کر سوچا تھا۔
ماوی بری طرح ذہنی تھکن کا شکار ہو چکی تھی۔ گو کہ وہ اتنی جلدی ہمت ہار دینے والوں میں سے نہیں تھی، لیکن مقابل اس کی ماں تھیں اور جن سے وہ بے تحاشا محبت کرتی تھی۔
محبت کس طرح انسان کے ارادوں کو ڈگمگا دیتی ہے اور کس طرح کمزور بنا دیتی ہے۔ اس کا احساس ماوی کو پہلی بار ہی ہوا تھا۔ اس نے ممی کو سمجھانے کی بھی کوششیں کر دیکھی تھیں، لیکن بے سود۔ ثمینہ نے اس معاملے میں ضد باندھ لی تھی اور اپنے مطالبے سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں تھیں۔
"حویلی جاؤ، اپنے حصے کی جائیداد کے ساتھ ساتھ ثبوت لے کر آؤ۔" ماوی نے کئی بار ان سے بحث کی، لیکن ثمینہ کی ایک ہی رٹ تھی۔
"ان دو کاموں کو انجام دینے کے لیے آخر جلال سے نکاح کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"
"تم میری بات ماننے کی یقین دہانی کرواؤ..... میں تمہیں سارا پلان سمجھا دوں گی۔"
اس نے اپنی ماں کو کبھی اتنا ضدی نہیں پایا تھا، جتنا وہ آج کل ہو رہی تھیں۔ تھک ہار کر اس نے شہروز سے بات کرنے کی ٹھانی۔
لیکن ایک عجیب بات ہوئی۔ شہروز کبھی اس سے اتنا خفا نہیں ہوتا تھا، نہ کبھی اس نے ماوی سے اتنے سخت لہجے میں بات کی تھی، مگر اس روز اس کا موڈ پہلے سے ہی کسی بات پر خراب تھا۔ رہی سہی کسر ماوی کی جلد بازی نے پوری کر دی۔
"چلو شہروز! شادی کر لیتے ہیں۔" اس نے چھوٹتے ہی کہا تھا۔
"ایں..... یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی؟" وہ حیران ہوا۔
"بس یوں ہی..... تم کہہ رہے تھے نا۔" اس نے عذر تراشا۔
"جب کہہ رہا تھا کاش اس وقت تم نے میری بات مان لی ہوتی۔ لیکن اس وقت تو تمہیں اپنے شوق، اپنے خواب عزیز تھے۔ شادی تمہیں ایک بوجھ کی طرح لگ رہی تھی اور مجھ سے منگنی اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت..... میں حیران ہوں ماوی! اتنے سالوں میں، میں تمہیں، تمہارے خیالات کو پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکا۔"
اس کا لہجہ کڑواہٹ لیے ہوئے تھا۔ ماوی ہکا بکا رہ گئی۔
"تمہیں ہوا کیا ہے شہروز! اس طرح کی باتیں کر رہے ہو؟"
"اب میرے سامنے بنو مت ماوی! پھوپھو نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"
"کیا بتا دیا ہے؟"
"یہ ہی کہ اسی شادی کو ٹالنے کے لیے تم نے پاکستان میں پڑھنے کا ارادہ کیا ہے۔"
"ہاں، میں نے پڑھنے کا ارادہ ضرور کیا ہے، لیکن شادی کو ٹالنے کے لیے ہرگز نہیں۔"
"اب تم کچھ بھی کہو، لیکن پھوپھو اس معاملے میں غلط بیانی کیوں کریں گی، میں تو تمہیں خود چند روز میں فون

کر کے کہنے والا تھا کہ میری طرف سے تم آزاد ہو اپنی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کے لیے۔"

"شہروز! میری بات تو سنو۔" لیکن شہروز فون بند کر چکا تھا اور ماوی جانتی تھی اب اسے فون کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ شہروز کو جلدی غصہ نہیں آتا تھا لیکن جب آتا تھا تو آسانی سے اترتا بھی نہیں تھا۔

ماوی کو اس کے اشتعال کے ٹھنڈے ہونے تک انتظار کرنا تھا اور اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے ہر چیز جان بوجھ کر اس کی مخالفت پر آمادہ ہو گئی ہو۔ ممی کے نفسیاتی الجھاؤ نے اس کے گرد ایسا جال بن دیا تھا کہ پوری کوشش کے باوجود وہ اس جال سے نکل نہیں پا رہی تھی۔

جس وقت وہ سر پکڑے لاؤنج کے صوفے پر بیٹھی تھی اسی وقت ثمینہ کمرے سے نکلیں۔

"کیا بات ہے ماوی! اس طرح کیوں بیٹھی ہو؟" پوچھنے کے انداز میں مکمل لاپروائی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو اور ان دونوں کے درمیان تعلقات کی فضا مثبت ہو۔

"میری ابھی شہروز سے بات ہوئی ہے۔ آپ نے اسے میرے بارے میں کیا کہا ہے؟"

"ڈونٹ وری مائی چائلڈ! ایسا کچھ نہیں کہا جسے بعد میں Cover نہ کیا جاسکے۔" ان کا اطمینان قابل دید تھا۔

"بعد میں؟" ماوی کا صدمے سے برا حال ہو گیا۔

"آپ کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہا ممی! آپ میری پوری زندگی تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔"

"میں تمہاری زندگی تباہ نہیں کر رہی سنوار رہی ہوں۔ جائیداد ملتے ہی تمہاری زندگی میں کتنی تبدیلیاں آئیں گی دیکھنا۔"

"لیکن ممی!"

"لیکن ویکن اب کچھ نہیں، مجھے ہاں یا نہ میں جواب چاہیے ماوی!"

"جواب میں آپ کو دے چکی ہوں۔ جو آپ چاہ رہی ہیں میں نہیں کر سکتی۔"

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" ثمینہ نے متحمل لہجے میں کہا اور واپس بیڈ روم میں چلی گئیں۔ ماوی مطمئن نہیں ہوئی تھی لیکن صوفے پر نیم دراز ہو کر سستانے لگی۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب سوچوں نے یلغار کر رکھی تھی اور اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اگلے تین، چار گھنٹوں میں وہ اپنی زندگی کا سب سے مشکل اور سب سے احمقانہ فیصلہ کرنے والی ہے۔

کچھ دیر بعد جب وہ بیڈ روم میں گئی تو ثمینہ بیڈ پر بے سدھ پڑی تھیں۔ سائیڈ ٹیبل پر نیند کی گولیوں کی ایک خالی شیشی پڑی تھی یہ ہائی پوٹینسی میڈیسن چند روز پہلے ثمینہ نے اسی سے منگوائی تھی اور اس وقت ماوی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ گولیاں کس مقصد کے لیے منگوائی جا رہی ہیں۔

صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوتے ہی ماوی کی سٹی گم ہو گئی۔ لیکن اس کا دل چاہا تھا وہ اپنا سر پیٹ لے۔ اور پھر... مرتا کیا نہیں کرتا کے مصداق اس نے ثمینہ کا مطالبہ ماننے کا فیصلہ کر لیا۔

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

☼

حوا بی بی

صاحب بکرا

"اجی سنتے ہو پپو کے ابا!"
انوری بیگم نے دروازے پر لٹکتے میلے کچیلے ٹاٹ کے پردے کو ہٹاتے ہوئے گلی میں جھانک کر اپنے شوہر کو پکارا۔
اسلم صاحب کچھ ہی فاصلے پر کھڑے محلّے کے ایک بزرگ سے سنجیدہ نوعیت کی بات چیت میں مصروف تھے۔ انوری بیگم کے پکارنے پر خفت کے مارے سرخ ہوگئے۔ بزرگ سے معذرت کرکے بیگم کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے پاس پہنچتے پہنچتے ماتھے کے بلوں میں کافی اضافہ ہوچکا تھا۔
"کیا مسئلہ ہے؟" وہ غرائے۔ انوری بیگم اپنی ہی ترنگ میں تھیں۔
"اس واری قربانی کے لیے تگڑا بکرا خریدیے گا خیر سے چالیس ہزار کی کمیٹی نکلی ہے۔ ذرا مہنگا ہی لیجیے گا۔ محلے والوں پر رعب پڑے گا اور آپ کی بھی برادری میں واہ واہ ہوجائے گی۔ خوب چھان پھٹک کر۔ لیجیے گا۔ اونچا لمبا، گھنے بالوں سے بھری گردن والا رج کے سوہنا بکرا ہی چاہیے۔ خیال رکھیے گا، چاروں ٹانگیں سالم اور نقص سے پاک ہوں اور خوب موٹا تازہ ہو۔ پچھلی عید کی طرح سوکھا سڑا، تیلی تیلی ٹانگوں والا مریل سا بکرا اٹھا کر مت لے آئیے گا کم پیسوں کے لالچ میں ہاں!"
اسلم صاحب غصے میں پہلو بدلنے لگے۔ آس پاس کے گھروں سے پردے کی اوٹ سے جھانکتی عورتیں بن گن لینے والے انداز میں اسی سمت تاک رہی تھیں۔

"یہ عورت اپنی جہالت کے مظاہرے سے باز نہیں آئے گی۔" اسلم صاحب شرمندہ ہوئے جارہے تھے جبکہ انوری بیگم اب بھی بنا رکے بولے جارہی تھیں۔
"دیکھا تھا آپ نے کیسا بیمار اور زمانے بھر کا ست الوجود بکرا تھا؟ کبھی جو حلق سے کوئی "میں میں" کی آواز نکالی ہو۔ حد تو یہ تھی کہ قربانی کے وقت بھی ذرا سا چیخنے کی توفیق نہ ہوئی۔ دنیا دکھاوے کو ہی ذرا سا چلا لیتا، آخر کو ذبح ہورہا تھا، کوئی معمولی بات تھی کیا۔ آپ کی باتوں میں اصل بات تو رہ ہی گئی۔ آپ بکرا منڈی جارہے ہیں تو ساتھ انچ ٹیپ بھی لے جائیے گا۔ تمام بکروں کی گردنیں اچھی طرح ناپ لیجیے گا۔ جس کی گردن سب سے لمبی ہو، اسی بکرے کو خریدیے گا۔ میں نے کسی سے سنا تھا کہ بکرے کی گردن جتنے انچ لمبی ہوگی، اتنا ہی کلو گوشت کی مقدار اس میں زیادہ ہوگی۔"
وہ تصور میں تگڑا سا بکرا سوچ کر جھومیں اور مزید کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے، مگر اسلم صاحب کی کراری آواز پر انہیں اپنا منہ بند کرنا پڑا۔
"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، سمجھ گیا تیری ساری نصیحتیں اور فضول کے مشورے، جاہل عورت! اپنی طرح عقل سے پیدل سمجھ رکھا ہے۔ ہونہہ! چل اندر چل۔ کبھی گھر کی بھی حالت درست کرلیا کر۔ سارا وقت دروازے کے آگے کھڑی غیبت کرنا اور دوسروں کی ٹوہ لینا۔ یہ ہی کام رہ گیا ہے تم عورتوں کا۔ دوزخ میں جاؤ گی سیدھی اپنی حرکتوں کی وجہ سے۔ تاکا جھانکی چھوڑ اور کچھ ہانڈی روٹی کی فکر کر۔ پپو آتا ہی ہوگا

اسکول سے۔"

انوری بیگم کے تو تلوے سے لگی اور سر پر بجھی۔ اس قدر عزت افزائی پر وہ جل بھن کر کباب ہو گئیں۔ شدید غصے کے عالم میں کچھ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ ہاتھ پر ہاتھ مارتی تمسخرانہ قہقہے لگاتی عورتوں کے ٹولے پر نظر پڑی۔ ان ہی میں دو مکان پرے رہتی چھنو بھی دانت نکوستی انہیں تلملاتا دیکھ کر حظ اٹھا رہی تھی۔

انوری بیگم کا خون از سر نو کھول اٹھا۔ کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور کر دو تین سخت جملوں سے نوازا۔ چھنو غڑاپ سے پردے کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔

انوری بیگم دروازے کو لات مارتی راستے میں آئی چیزوں کو ٹھوکر مارتی اندر کی طرف بڑھیں اور صحن میں بچھی چارپائی پر دھپ سے بیٹھ گئیں۔ انہیں رہ رہ کر اسلم صاحب پر غصہ آرہا تھا' حالانکہ اسلم صاحب نے کوئی پہلی مرتبہ انہیں یوں بری طرح نہیں جھڑکا تھا اور نہ ست سنائی تھیں۔ ایسی کئی جھڑکیاں صبح و شام اٹھتے بیٹھتے' سوتے جاگتے انوری بیگم کا نصیب بنتی رہتی تھیں' اپنی کم عقلی کے سبب۔

طیش دلانے والی بات یہ تھی کہ اسلم صاحب نے محلے کی ساری عورتوں کے سامنے انہیں نکو بنا دیا تھا۔ انہیں بے حد سبکی محسوس ہو رہی تھی۔

"عزت دو کوڑی کی کر کے رکھ دی۔ دشمنوں کے کلیجے میں ٹھنڈک اتار دی۔ میرا کلیجہ خاک کر دیا ساری محلے والیوں کے بیچوں بیچ میری لٹیا ہی ڈبو دی۔ میں کتنی شیخیاں مارا کرتی تھی' گھر میں اپنی حکمرانی اور سربراہی کے' لے کے سبھوں کے سامنے عزت پر پانی پھیر کر پونچھا ہی لگا گئے۔"

بے عزتی کے احساس کے مارے ان کے چہرے کے نقوش خوف ناک حد تک بگڑ گئے۔ باورچی خانے سے جھوٹے برتنوں کا ڈھیر اٹھا کر صحن میں پٹخنے کے ساتھ ساتھ بلند آواز میں بڑبڑائے جا رہی تھیں۔

"اور وہ چھنو' دل کرتا ہے کہ سارے دانت توڑ کر اسی فسادن کے پوپلے منہ میں گھسا دوں۔"

انہوں نے یوں دانت پیسے گویا چھنو کو کچا ہی چبا ڈالیں گی۔

"گھر کی حالت سدھار' ہانڈی چولہے کی فکر کر نیک بخت!" توپوں کا رخ ایک بار پھر اسلم صاحب کی طرف ہو گیا۔ انہوں نے کمر پر ہاتھ ٹکا کر اسلم صاحب کی نقل اتاری۔

"روز تو ان کی اماں مرحومہ مسمات رشیدن قبر سے تشریف لا کر سارے کام نمٹاتی ہیں نا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے' کبھی جو اپنی حیاتی میں بیٹے کو بیاہنے کے بعد ہاتھ پیر ہلائے ہوں۔ بس زبان ہی قینچی کی طرح تیز تیز چلائی۔ کولہو کا بیل سمجھ کر ہانکتی رہتی تھیں' جب تک زندہ رہیں' دن رات خدمتیں کروا کروا کر مجھے انجمن سے ریشم بنا ڈالا۔"

شادی سے قبل وہ خاصی صحت مند ہوا کرتی تھیں۔ کم عمری میں شادی ہو گئی' وہ بھی دگنی عمر کے شوہر سے۔ شوہر کا مزاج جلتے توے سا تھا۔ گڑیوں کی شادی رچانے کی عمر میں خود بیاہ دی گئیں۔ جوانی کی دہلیز پھلانگتے شوہر کو ان کا کھلکھلانا ناگوار گزرتا۔

کہتے ہیں عورت موم کی طرح ہوتی ہے' اس کو کسی بھی سانچے میں ڈھال دو' وہ ڈھل جاتی ہے' چنانچہ انوری بیگم بھی اسلم صاحب کی خواہش کے مطابق ظاہری طور پر اپنے آپ کو ڈھالتی گئیں مگر عقل کا کوئی کیا کرے' عقل مندی اور سمجھ داری کس سے مستعار لیتیں۔

اکھڑ مزاج شوہر کی ناز برداریاں اور خود ساختہ بیماریوں میں مبتلا بوڑھی ساس کی تیمار داری کرتی رہتیں' نہ دن کو دو گھڑی چین ملتا' نہ رات کو بھرپور نیند۔ رہی سہی کسر پپو کی زچگی کے دوران ہونے والی پیچیدگیوں نے پوری کر دی۔ وہ چند ہی برسوں میں سوکھ کر کانٹا ہو گئیں۔ بس موٹے نقوش والا بھاری سا چہرہ جوں کا توں سلامت تھا۔

"امی۔۔۔ امی۔۔۔" وہ ابھی برتن پٹخ کر سیدھی ہوئی ہی تھیں کہ پپو بیگ کندھے پر لٹکائے ہوئے کسی بے نتھے بیل کی طرح بھاگتا ہوا انوری بیگم سے آ ٹکرایا۔ ان کے پیٹ پر زور کی ضرب لگی۔ وہ درد سے دہری ہو گئیں۔

"امی! کیا ہوا؟ بتایئے نا امی! ابو نے مارا ہے؟" آٹھ سال کا دبلا پتلا' کمزور سا پپو معصومیت سے اپنی ماں کو جھنجوڑتا پوچھ رہا تھا' جو پیٹ پکڑے بیٹھی تھیں۔ اس کے سوال نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔ وہ اپنا درد بھول گئیں۔

"کھوتے سورا' نامراد!" انہوں نے بڑھ کر پپو کو دو ہتڑ جڑ دیے۔ "تیرا باپ جی جلانے کو کم ہے جو تو رہی سہی ہڈیاں پھونکنے' خون نچوڑنے آ دھمکا کم بخت۔ ہائے! ہڈی توڑ کر ہی رکھ دی' نگوڑ مارے۔" انہوں نے غصے میں ایک ٹھڈا پپو کی کمر پر رسید کر دیا۔

"تجھے بیل جیسے دیدے خدا نے چہرے پر سجانے کے لیے دیے ہیں۔ کبھی ان سے کام بھی لے لیا کر' چل دفع ہو۔"

پپو دو ہتڑ اور ایک ٹھڈا کھا کر روہانسا کھڑا تھا۔

انوری بیگم ہائے وائے کرتی اب برتن مانجھنے میں مصروف ہو گئی تھیں۔

✡ ✡ ✡

اسلم صاحب دو' تین بکرا منڈیوں میں دن بھر کی خجل خواری کے بعد ہی مطلوبہ بکرا ڈھونڈ پائے تھے۔ اونچے قد کاٹھ کا سیاہ بالوں سے بھری گردن والا سفید بکرا' انوری بیگم تو دیکھتے ہی جی جان سے فدا ہو گئیں۔ سارے دن کی کلفت اور بے زاری اڑنچھو ہو چکی تھی۔ اب وہ قدرے نہال دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ واری صدقے ہو جانے والی نظروں سے غرور سے گردن اکڑائے' خفا خفا سے بکرے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی رہیں۔ ایک آدھ بار وفور شوق سے بکرے کے نزدیک جا کر اس کی لمبی گردن پر ہاتھ پھیرنا چاہا' لیکن شاید بکرے کو نیا ماحول' نئے لوگ اور خصوصاً انوری بیگم پسند نہ آئی تھیں' اس نے خوب سینگوں سے تواضع کی۔ وہ خجالت سے دور ہٹ کر نظروں سے ہی پیار جتانے کا شوق پورا کیے گئیں۔

✡ ✡ ✡

رات بھر بکرے کی چیخ و پکار نے بار بار نیند میں خلل ڈالا تھا اور اب صبح تڑکے ہی اس نے میں میں کر کے گھر سر پر اٹھا لیا۔ انہیں اٹھنا ہی پڑا۔ وہ آنکھیں مسلتی صحن میں آئیں۔ بکرے کا رخ برآمدے کی سمت ہی تھا۔ انوری بیگم کو دیکھا تو یک دم "میں میں" بند کر دی۔

"نہ نہ میرا راجہ! کیا ہوا' بھوک لگی ہے' چارہ کھائے گا۔" وہ بکرے سے مخاطب ہو کر تسلے میں سوکھا چارہ اور بھوسا ملانے لگیں۔

"کیا کر رہی ہے نیک بخت! اتنی صبح سویرے کیسے اٹھ گئی آج؟ ورنہ مجھے تو آوازیں دیتے دیتے سورج سر پر پہنچ چکا ہوتا ہے۔ تھوڑا سا پانی بھی ملا اس میں۔"

انوری بیگم کے جلدی اٹھ جانے پر طنز کرتے ہوئے انہوں نے ہدایت بھی دے ڈالی۔

"لے کھا لے میرا راجہ!" وہ تسلہ بکرے کے نزدیک کھسکاتے ہوئے بولیں۔ خود قریب جاتے گھبرا رہی تھیں۔ کل کا واقعہ یاد تھا۔

"راجہ؟ یہ کون صاحب ہیں؟" اسلم صاحب چائے کی چسکی لیتے لیتے رک کر حیرانی سے بولے۔

"کوئی صاحب واب نہیں ہیں..... میں نے اس کا نام راجہ رکھا ہے۔ آپ بھی اسے راجہ ہی بلائیے گا ہاں۔"

انوری بیگم چہکتے ہوئے اسلم صاحب کے برابر میں چارپائی پر دھپ سے بیٹھیں۔ اسلم صاحب کے ساتھ ساتھ چائے بھی ہل کر رہ گئی۔ بس چھلکنے کی دیر تھی۔ وہ جلدی جلدی گھونٹ لینے لگے۔

"اچھا' اچھا ٹھیک ہے' جیسے تیری مرضی' تو اپنے راجے کو سنبھال' میں دکان پر چلا' پپو کو بھی جگا دے' اسکول کا وقت نکلا جا رہا ہے۔"

اسلم صاحب چائے کا کپ رکھ کر چپل گھسیٹتے ہوئے ڈیوڑھی سے نکل گئے۔ انوری بیگم حد درجہ

بدمزا ہوئیں۔ اسلم صاحب کی پشت دیکھتے ہوئے سر جھٹک کر "ہونہہ" کیا اور پھر محبت پاش نظروں سے راجہ کو چارہ کھاتے دیکھنے لگیں۔

☼ ☼ ☼

گھر میں بکرا کیا آیا تھا' انوری بیگم کے تو پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ تو گویا ہواؤں میں اڑ رہی تھیں۔ بات تھی بھی ہواؤں میں اڑنے والی۔ آخر یہ کوئی معمولی بات تھی کہ انوری بیگم "صاحب بکرا" تھیں اور بکرا بھی ایسا کہ محلے والیاں رشک و حسد سے جل بھل گئیں۔ تھا کوئی راجہ کا ہم پلہ محلے میں؟ وہ تو جتنا ناز کرتیں' کم تھا۔

وہ دن رات' بکرے کی خدمتوں میں لگی رہتیں۔ ہر آئے گئے کو بکرے کی اصل قیمت سے بڑھا چڑھا کر بیان کرتیں۔ بکرے کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملاتیں۔

عیدالاضحیٰ میں ایک ہفتہ ہی باقی تھا۔ انوری بیگم محلے کی چند پھاپھا کٹنی عورتوں کو اکٹھا کر کے بکرے کی دیدہ و نادیدہ خصوصیات کا زور و شور سے پرچار کرنے میں مصروف تھیں۔ عورتیں' انوری بیگم کی شیخیاں بگھارنے والی عادت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود ان کی ہاں میں ہاں ملانے میں بھرپور ساتھ دے رہی تھیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو انوری بیگم کے منہ پر ان کا جھوٹ مار کر چلتی بنتیں' مگر فی الحال انوری بیگم سے بنا کر رکھنے میں ہی عافیت تھی۔

"ارے انوری! بکرا تو سچ میں اس بار خاصا تگڑا اور خوب صورت ڈھونڈ کر لائے ہیں اسلم بھائی۔ اس پورے محلے میں کوئی ایک بھی تو اس کے جوڑ کا نہیں ہے۔" ایک پڑوسن نے انہیں مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

"مہنگا بھی تو اتنا ہے۔" دوسری پڑوسن نے پہلی والی کو ٹھوکا دیا۔

"ہاں' بھئی جمیلہ صحیح کہہ رہی ہے' اتنا اونچا لمبا تو محلے میں کسی کا بکرا نہیں۔" تیسری فربہ مائل پڑوسن نے بات آگے بڑھائی۔

انوری بیگم فخریہ انداز میں گردن اونچی کیے ان کے درمیان بیٹھی تھیں۔ جھٹ سے دل ہی دل میں بکرے کی بلائیں لیں اور نظر بد سے بچنے کی دعا دی۔

"ہمیں بھول مت جانا' حصہ ضرور بھجوا دینا۔" پہلی پڑوسن نے لگاوٹ سے کہا تھا۔

"ارے رقیہ! تو فکر ہی نہ کر' اس معاملے میں انوری بڑے دل والی ہے۔ دیکھنا سب سے عمدہ گوشت انوری کے ہاں سے ہی ملے گا۔" جمیلہ نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

"تو اور کیا' ارے بھئی یہ انوری ہے انوری' کوئی صفیہ تھوڑی ہے' کنجوس مکھی چوس' پچھلی عید پر یاد ہے صفیہ نے جو گوشت بھجوایا تھا۔" پڑوسن نے انوری بیگم کی غیرت جگانے کے لیے ان کی دشمن اول کا نام لیا۔ "نری ہڈیاں اور چھیچھڑے بھرے تھے تھیلی میں۔"

"مجھے تو ران کا گوشت ہی بھجوانا انوری!" جمیلہ نے فرمائش کی۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی دونوں عورتوں نے بھی جھٹ سے فرمائش داغ دی۔

"ضرور' ضرور' کیوں نہیں۔" انوری بیگم پھولے نہ سماتے ہوئے انہیں یقین دلانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

"چل! جلدی سے کھانا کھالے' پھر راجہ کو میدان تک سیر کروانے لے جا۔"

انوری بیگم پپو کے آگے کھانے کی پلیٹ رکھتے ہوئے بولیں۔

"مگر اماں! میں کیسے گھمانے پھرانے لے جاؤں' اگر کہیں راجہ رسی تڑوا کر بھاگ کھڑا ہوا تو۔"

پپو آنکھیں پھاڑے خوف زدہ لہجے میں بولا۔ راجہ نے ایک روز اس کو بھی زچ کیا تھا۔ سو' اب وہ اس سے پیار جتانے سے گریز ہی کرتا تھا۔

"پوری بات سنے بغیر ہی اپنے ابا کی طرح فتوے دینا شروع کر دینا۔"

انوری بیگم نے کس کر پپو کی پیٹھ پر ایک دھموکا جڑا۔ وہ بلبلا گیا۔

"بھاڑ میں جائے گا تیرے ساتھ کم بخت۔" انوری بیگم نے رشتہ کے ایک بھائی کا نام بتایا۔ پپو مسکین شکل بنائے پشت سہلاتے ہوئے روٹی کے لقمے توڑنے لگا۔

☼ ☼ ☼

اسلم صاحب صحن میں بید کی کرسی پر بیٹھے اخبار بینی میں مصروف تھے۔ سہ پہر کی سنہری دھوپ آنگن میں پھیلی ہوئی تھی۔ انوری بیگم ذوق و شوق سے راجہ کو نہلا رہی تھیں۔ اتنے دنوں میں ان کی خاطر داریوں نے راجہ کا دل انوری بیگم کی طرف سے صاف کر دیا تھا۔ وہ بھی اب اپنی مالکن سے قدرے خوش اور خاصا مانوس نظر آ رہا تھا۔

راجہ کے سفید جسم پر صابن مل مل کر وہ بلند آواز میں گانے کا شوق بھی پورا کر رہی تھیں۔ ان کی پاٹ دار آواز اسلم صاحب کے مطالعے میں خلل ڈال رہی تھی' مگر وہ "مصلحتاً" خاموش تھے۔ انوری بیگم جو تقدیر کے لکھے کو پورا کرنے ان کی زوجیت میں آ گئی تھیں' تھوڑی بے وقوف اور کم عقل تو تھیں' مگر دل کی سادہ اور صاف تھیں۔ زمانے کی مکاریوں' چلتر پن سے ناآشنا اور دوسروں کی باتوں میں جلد آ جانے والی۔

"راجہ میرا گھوڑی چڑھیا' راجہ میرا۔" گاتے گاتے انہوں نے مزید حلق پھاڑ کر تان لگائی۔

اسلم صاحب کرسی پر اچھل کر رہ گئے۔ خشمگیں نظروں سے بکرے کو رگڑ رگڑ کر صابن لگاتی' پانی بہاتی' گنگنانے میں مگن اپنی شریک حیات کو گھورا۔ کچھ سخت سست سنانے کو لب وا کیے' پھر کچھ سوچ کر ارادہ بدل گئے۔

راجہ اب نہا کر فارغ تھا۔ گیلے بدن کو جھٹکتے ہوئے وہ دھوپ سینکنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ انوری بیگم کا راگ بھی بند ہو گیا تھا۔ اسلم صاحب نے سکون کا سانس لیا اور مطالعے میں غرق ہو گئے۔

☼ ☼ ☼

آج چاند رات تھی۔ ہر سو بکروں کے ممیانے اور بیلوں کے ڈکرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ راجہ بھی سارا وقت مہندی سے رنگے بدن' کھروں میں بجتی جھانجھروں کی چھن چھن میں دولہا بنا پورے محلے میں گشت کرتا رہا تھا۔

عام دنوں کے مقابلے میں اسے چارہ بھی خوب سیر ہو کر کھانے کے لیے دیا گیا تھا' سو وہ مست اور مسرور تھا۔ اتنے ٹھاٹھ تو اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ساری عمر وہ ریوڑ میں رہا تھا' جہاں چارہ بھی چھینا جھپٹی کے بعد ملتا تھا۔ یہاں وہ ہر شے کا بلا شرکت غیرے مالک تھا' مگر اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اس کی سب سے بڑی خیر خواہ اور خیال رکھنے والی انوری بیگم کیوں اداس اور افسردہ ہے۔ زندگی میں پہلی بار شاید اسے اپنی بے زبانی کا قلق ستایا تھا۔

انوری بیگم رات کے دوسرے پہر تک بکرے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے' اس سے ہم کلام رہی تھیں اور وہ مزے سے بیٹھا جگالی کرتا رہا تھا۔

"کل تو مجھ سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے گا' میں جانتی ہوں تو بھی مجھ سے بچھڑتے ہوئے اتنا ہی غمگین ہے۔ خوش تو میں بھی نہیں' پر کیا کروں۔ دنیا کا دستور ہے اور مذہبی فریضہ بھی۔ میں خدا سے تیرے لیے دعا کروں گی؟ تیری قربانی کے بدلے' وہ تجھے جنت میں میرا پڑوسی بنا دے۔ ٹھیک ہے؟" وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

عید کی صبح بے حد خاموش اور اداس تھی۔ ہوا بھی ٹھہری ٹھہری اور افسردہ تھی۔ خلاف توقع انوری بیگم مسرور تھیں۔ صفیہ کو نیچا دکھانے کا موقع جو ہاتھ آیا تھا۔

راجہ کو چارہ وغیرہ دے کر شیر خرما پکا کر وہ اپنے کپڑے استری کر رہی تھیں۔ پپو' اسلم صاحب کے ہمراہ عید گاہ روانہ ہو چکا تھا۔

سب کاموں سے فراغت پا کر وہ صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر راجہ کا آخری دیدار کرنے لگیں۔ محلے کی مسجد

ان کے گھر سے چند فرلانگ ہی دور تھی۔ مسجد کے اسپیکر سے امام مسجد کی پراثر آواز فضا میں گونج رہی تھی۔

وہ بلاارادہ ہی وعظ سننے لگیں۔

"قربانی وہ عظیم فریضہ ہے، جو ہر صاحب استطاعت پر ہر سال ذی الحج کے مہینے میں فرض قرار دیا گیا ہے۔ ہر سال عیدالاضحیٰ کا دن ہمیں اس بے مثال تاریخ ساز اور عظیم واقعے کی یاد دلاتا ہے کہ جب ایک باپ نے اپنے رب کے حکم پر بیٹے کو قربانی کے لیے اس کی راہ میں پیش کر دیا تھا اور بیٹا برضا و رغبت قربان ہونے چلا تھا۔

خدا آپ سے کسی اونٹ، بیل یا بکرے کا مطالبہ نہیں کرتا، وہ تو محض آپ سے وہ بے مثال جذبہ مانگتا ہے جو اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرتے وقت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں تھا۔ اپنے رب کے حکم کی اس طرح تعمیل کہ کسی دنیاوی رشتہ یا غرض کی رتی بھر ملاوٹ بھی اس خالص جذبے کو گدلانہ کر سکے۔ نمودو نمائش سے پاک اور خالص رب کی راہ میں فنا ہو جانے کا جذبہ۔

ذرا دیکھیے! اپنے اردگرد نظر دوڑایے، خود اپنا تجزیہ کیجیے۔ آپ میں سے کتنے ہیں جو اس عظیم جذبے سے معمور ہو کر خالص خدا کے لیے قربانی کا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ ہمارے لیے اس فریضے کی ادائیگی محض ایک روایت یا دکھاوے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ دین کیا کہتا ہے، شریعت ہم سے کیا تقاضا کرتی ہے۔ ہم جانتے ہوئے بھی سمجھنا نہیں چاہتے۔ اللہ تعالیٰ نے قربانی کے گوشت کا اصل اور سب سے زیادہ حق دار ان لوگوں کو ٹھہرایا ہے۔ جو قربانی کی استطاعت رکھنا تو درکنار سارا سال پاؤ بھر گوشت بھی خرید کر کھانے کی اہلیت نہیں رکھتے، مگر ہمیں تو خدا کے مقابلے میں دنیاداری کا خوف زیادہ ستاتا ہے۔

گوشت کی تقسیم کے مرحلے میں ہم دینی احکامات بھول کر دنیوی فوائد کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو اشخاص بلحاظ دنیاوی مال و دولت ہم سے کم تر ہوتے ہیں، انہیں سب سے کم اور گوشت کا ادنیٰ حصہ نصیب ہوگا، یعنی وہ سب سے کم حقدار!

خدارا! قربانی کی اصل روح کو پہچانیے۔ جانور ضائع مت کیجیے۔ نمودونمائش اور بے جا اصراف سے ہٹ کر اپنی عبادتوں اور ریاضتوں کو خالص بنائیے۔ رب کے حکم کے مطابق اپنے آس پاس، قرب و جوار میں ایسے لوگوں کو تلاش کیجیے جو حق دار ہیں، مگر خوددار بھی۔ جو نہ جھولی پھیلاتے ہیں، نہ ہاتھ، بے شک وہ ہی اصل حق دار ہیں۔"

انوری بیگم سُن سی بیٹھی تھیں، مگر ان کے اندر بھانبھڑ جل رہے تھے۔ انہیں جیسے کسی نے اندر تک جھنجوڑ دیا تھا۔

ان کے ذہن میں جھماکا ہوا تھا۔ انہیں یک دم گلی کے آخری سرے پر رہائش پذیر وہ بوڑھی عورت یاد آئی جو اپنی بیوہ بیٹی اور نواسی کے ساتھ ایک عرصے سے گھر کے باہر ایک چھوٹی سی ٹیبل پر ٹافیاں وغیرہ بیچتی تھی۔ تین اکیلی عورتیں بغیر کسی مرد کے سہارے۔

ایک چھوٹی سی دکان پر چاکلیٹ، ٹافیاں بیچ کر تینوں نجانے کس طرح گزر بسر کرتی تھیں۔ غربت کے باوجود خودداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ انہوں نے ان کو اپنی کسی ضرورت کے لیے کبھی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے، سوال کرتے نہ دیکھا تھا۔

وہ کیا کھاتی تھیں، کیا پہنتی اوڑھتی تھیں، کیسے رہتی تھیں، یہ جاننے کی انہوں نے کبھی کوشش نہیں کی تھی۔

انوری بیگم کی آنکھوں میں موتی چمکنے لگے۔ چارپائی سے اٹھنے سے قبل وہ دل میں مصمم ارادہ کر چکی تھیں کہ انہیں کیا کرنا ہے۔

آج کا سورج پوری آب و تاب سے چمکتا نہ صرف سارے جہاں بلکہ ان کے دل کو بھی روشنی سے بھر چکا تھا۔

ثمینہ عظمت گلی

بکھرے رشتے لبس

"ارے کوثر، تمہاری مچھلی بلی لے گئی؟"

"ہائیں..." کوثر حیران رہ گئی "تمہیں کیسے پتا، یہ تو ابھی دو منٹ پہلے..."

"فیس بک سے پتا چلا ہے بھئی؟ ابھی مجھے راحیلہ نے بتایا کہ سعدیہ کے اسٹیٹس میں لکھا ہے کہ مچھلی بلی لے گئی۔"

"یہ بچے نا بس!" کوثر غصے سے بولی۔ "ان کا بس نہیں چلتا کہ سانس لیں تو بھی فیس بک پہ لکھ دیں اور آپ نے بھی اتنی سی بات پہ کراچی سے فون کھڑکا دیا؟" اس نے خفگی سے کہا۔

"لو! یہ اتنی سی بات ہے۔ تمہاری لاپروائیوں کی کوئی حد ہے۔ مچھلی کوئی سستی ہے... اور بات مچھلی کی نہیں احتیاط کی ہے۔ تم تو سدا سے ایسی ہو۔ جب تک ہم ساتھ رہے' میں تمہاری غلطیوں پر پردہ ڈالتی رہی۔ تمہاری بڑی بہن ہوں اور جٹھانی بھی۔" وہ بولے چلی گئیں۔

"آہ!" کوثر نے آہ بھری۔ نسرین کا اس سے ایک سال بڑا ہونا' پھر اس کی جٹھانی بننا' اس کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا۔

فون بند کرتے ہی وہ سعدیہ پر برس پڑی۔

"ایک ایک منٹ کی رپورٹ اس منحوس فیس بک پر لکھنا ضروری ہے۔ کیا ضرورت تھی مچھلی کا لکھنے کی؟"

"امی!" وہ روہانسی ہوگئی۔ "راحیلہ پوچھ رہی تھی کہ کیا پکایا ہے' اسی وقت آپ نے بلی کا شور مچایا تو میں نے یوں ہی لکھ دیا۔"

"جانتی نہیں ہو اپنی تائی خالہ کو' بس فون کرکے مجھے سنا دیں... حد ہوگئی اور راحیلہ پر فرض تھا' کھانے کا پوچھنا؟ پڑھائی کے نام پر تم لوگوں نے لیپ ٹاپ' نیٹ کنکشن لے رکھے ہیں' مگر گپوں سے فرصت نہیں۔ کچھ دن پابندی تھی تو جان چھوٹی ہوئی تھی۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں اور سعدیہ اپنی ہنسی چھپاتے ہوئے اپنی بہن فرح کو پرائیویٹ ان باکس میں آج کا واقعہ لکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ثوبیہ اپنے کمرے میں بیٹھی مزے سے ندا کی تصویریں دیکھ رہی تھی' جو اس نے آج ہی فیس بک پہ اپ لوڈ کی تھیں۔ اس کا شوہر شام کی چائے پینے کے بعد اپنے کسی دوست کی طرف چلا گیا تھا۔ رات کے کھانے کی ذمہ داری ثوبیہ کی جٹھانی کی ہوتی تھی۔ ملازمہ ساتھ ہوتی تھی اس لیے ثوبیہ کا یہ وقت فارغ گزرتا تھا۔ ابھی اس کی شادی کو چھ ماہ ہوئے تھے۔ اس لیے اس کے ذمے ہلکے پھلکے کام ہی تھے' پھر گھر میں دو ملازمائیں بھی موجود تھیں' سو اس لحاظ سے اسے سسرال میں کوئی مسئلہ نہ تھا۔

ندا اس کے شوہر کی کزن تھی' جو تقریباً اسی کی ہم عمر تھی۔ وہ اپنے شوہر اور ایک چھوٹے بچے کے ساتھ دبئی میں رہتی تھی' جہاں اس کے شوہر کی ملازمت تھی۔ جب ثوبیہ کی شادی ہوئی تو وہ لوگ سالانہ چھٹی پر آئے ہوئے تھے۔ یوں ان کی دو' تین ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ ثوبیہ کو وہ بہت اچھی لگی تھی۔ اس کے جانے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو فیس بک پر دوست بنا لیا تھا اور صحیح معنوں میں ان کی دوستی یہیں پروان چڑھی تھی۔

آج ندا نے اپنے بچے کی پہلی سالگرہ کی تصویریں بھیجی تھیں' جو انہوں نے عالی شان ہوٹل میں منائی تھی۔

ندا تصویروں میں بے حد خوب صورت اور خوش لگ رہی تھی۔ ثوبیہ بڑے مزے سے اس کی تصویروں پر کمنٹس لکھ رہی تھی۔ باہر سے کچھ آوازیں آنے لگیں تو اس کی توجہ ہٹ گئی۔ آواز آپا (نند) کی تھی۔ ثوبیہ نے جلدی سے تصویریں بند کیں اور کمپیوٹر بند کرنے لگی' تاکہ آپا کے ساتھ جا کر بیٹھ سکے۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی کچھ کہہ دے۔ وہ ابھی تک اپنی لمبی چوڑی سسرال کو ٹھیک سے سمجھ نہیں پائی تھی۔ گو کہ سب کا رویہ اس کے ساتھ بہت اچھا تھا' لیکن پھر بھی وہ محتاط رہتی تھی۔

"السلام علیکم!" اس نے باہر آکر کہا۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہو؟" آپا نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں' آپ سنائیے' بچے کہاں ہیں؟"

"دونوں ٹیوشن گئے ہوئے تھے۔ میں نے سوچا اماں کے پاس چکر لگا آؤں۔" ان کا گھر نزدیک ہی تھا' اسی لیے وقتاً فوقتاً ان کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

"تم بتاؤ' کیا کر رہی تھیں؟ عبداللہ کہاں ہے۔" انہوں نے بھائی کا پوچھا۔

"وہ کسی دوست کی طرف گئے ہیں اور میں یوں ہی...."

"کمپیوٹر پر ہوگی' ہے نا؟" انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "بڑے بچوں والے شوق ہیں تمہارے۔"

"اس میں بچوں والی کیا بات ہے۔" ثوبیہ نے دل میں سوچا۔

پھر آپا اپنی اماں اور بڑی بھابھی سے مخاطب ہوئیں۔

"بس! یہ فیس بک کا شوق چڑھا ہوا ہے سب کو.... توبہ اماں! میں نے کوثر اور نسرین کی بیٹیوں کی تصویریں دیکھیں' ماڈل بنی ہوئی ہیں ساری کی ساری... ایسی تصویریں فیس بک پہ لگا کر خاندان کا نام خوب روشن کر رہی ہیں۔"

ثوبیہ الجھ کر انہیں دیکھنے لگی فرح اور راحیلہ کی یونیورسٹی کے فنکشن کی تصویریں اس نے بھی دیکھی تھیں۔

"تم نے کیسے دیکھیں؟" اس کی جٹھانی نے اس کے دل کی بات کی۔

"ارے میں کراچی گئی تھی' وہاں مجھے شیریں کی بیٹی رائمہ نے دکھائی تھیں۔"

"اوہ! اب سمجھی۔" ثوبیہ نے سوچا۔ شیریں اس کی نند کی نند تھی اور اس کی بیٹی فرح کی راحیلہ کے ساتھ دوستی تھی۔

"آپا! تصویروں پر پرائیویسی سیٹنگ ہوتی ہے۔ ہر کوئی نہیں دیکھ سکتا۔" اس نے وضاحت دینا چاہی۔

"تو....؟" وہ بھڑک گئیں۔ "یہ کون سی سیٹنگ ہے ہمیں نے دیکھ لیں تو سب دیکھ سکتے ہیں۔ رائمہ کے بھائیوں نے دیکھیں' میرے شوہر' دیور سب نے۔"

"انہوں نے رائمہ کو لسٹ میں رکھا ہوگا۔ اس لیے رائمہ وہ تصویریں دیکھ سکتی ہے۔ وہ تصویریں تو مجھے بھی آئی تھیں مگر میں نے تو کسی کو نہیں دکھائیں۔"

"تم نے شاید ابھی تک ہمیں اپنایا نہیں' جبکہ میں دیکھتی ہوں کوثر' نسرین' ندا کی فیملیز کے ساتھ تمہاری بہت بنتی ہے۔ خیال رکھنا ذرا' ان سے زیادہ کلوز ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ شروع سے یہ لوگ ہم سے جلتے ہیں۔ اب دیکھ لو! لڑکیوں کو اتنی آزادی دی ہوئی ہے۔ تم نہ لگا دینا اپنی تصویریں' ہمارے گھروں میں یہ رواج نہیں۔ میری نندوں کو دیکھ لو' ایک بھی نیٹ نہیں چلاتی۔ ان کے بھائی اجازت ہی نہیں دیتے۔"

ثوبیہ کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر خاندان کے سارے لوگ ان سے جلتے کیوں ہیں اور آپا کے بھائی اپنی بہنوں کو گھٹنوں تک کیپری اور سلیولیس قمیص پہننے سے تو نہیں روکتے تو نیٹ استعمال کرنے پر کیوں روکتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

رات کو وہ پھر ندا کی تصویریں دیکھنے لگی جو آپا کے آجانے کی وجہ سے ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی تھی۔ اب ان تصاویر پر زیادہ کمنٹس (تبصرے) آچکے تھے۔ ندا کے گھر والوں کے' سسرالیوں کے۔

"ندا لوگوں سے آپ کی کیا رشتے داری ہے؟" اس نے ٹی وی دیکھتے ہوئے عبداللہ سے پوچھا۔

عبداللہ کا خاندان اتنا لمبا چوڑا تھا کہ ابھی تک اسے ان کی رشتے داریاں ٹھیک سے سمجھ میں نہیں آئی تھیں۔

"ندا اور اس کا شوہر صفی دونوں ہی ہمارے کزن ہیں۔" عبداللہ نے اسے بتایا۔ "ندا' بابا کے کزن کی بیٹی ہے اور صفی اماں کے۔ ندا کی ساس' کوثر باجی کی بھابھی ہیں۔ ندا کی ایک نند کی شادی ہمارے چچا کے بیٹے سے ہوئی ہے اور اس کی ایک اور دیورانی بھی ہماری رشتے دار ہے اور جو چچی (ندا کی ساس) ہیں' وہ...."

"اف! بس کردیں۔" ثوبیہ نے کانوں پہ ہاتھ رکھا۔ "مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"مجھے بھی کچھ یقین نہیں ہے کہ ٹھیک بتا رہا ہوں یا نہیں۔" عبداللہ نے مسکرا کر کہا۔

"آپ کے رشتے دار تو پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے فیس بک کا People Connecting کا دعوا بالکل ٹھیک ہے۔" ثوبیہ نے مسکرا کر کہا۔ "ایک بہت بڑا گروپ بنا ہوا ہے سب کا۔"

"اب تو تم بھی ان کا حصہ ہو۔" عبداللہ نے کہا۔

"ہاں! جس جس کو رشتے داری کا علم ہوتا ہے، مجھے ایڈ کرلیتے ہیں اور سب بہت اچھی طرح پیش آتے ہیں۔ اس میں زیادہ کردار ندا، کوثر اور نسرین باجی کی بچیوں کا ہے، وہ ہی ہر جگہ مجھے متعارف کرواتی ہیں۔" ثوبیہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہاں... یہ سب بہت اچھے ہیں اور ہمارے گھر میں تو ایک میرا ہی فیس بک اکاؤنٹ ہے... اور کسی کو تو وقت ہی نہیں۔ دونوں آپائیں گھرداری اور بچوں میں مصروف ہیں۔ بھائی جان بھابھی کا بھی وہ ہی حال ہے۔" عبداللہ نے وضاحت کی۔

"اب تم ہو تو پھر خاندان سے رشتہ جڑ گیا ہے۔ بھولے بھٹکے رشتے دار بھی میلز کرنے لگے ہیں۔"

"ہاں... یہ تو ہے۔" ثوبیہ کا دھیان ندا کی تصویروں کی طرف تھا، جہاں اس کی نندوں نے اس کے لیے بہت اچھے اچھے کمنٹس لکھے ہوئے تھے۔

Beautiful (بیوٹی فل) ماشاءاللہ... بہت پیاری لگ رہی ہو۔ بیٹا تو تم پر گیا ہے۔ واہ! تم اور صفی کتنے اچھے لگ رہے ہو۔ ریڈ کلر تم پر بہت سوٹ کررہا ہے۔ بال کہاں سے بنائے وغیرہ وغیرہ۔"

ثوبیہ سوچنے لگی۔ "کتنی خوش قسمت ہے ندا۔ کس قدر چاہتے ہیں اسے سسرال والے۔"

ثوبیہ شادی کے بعد بالکل مطمئن تھی۔ عبداللہ اس سے بہت محبت کرتا تھا اور باقی گھر والوں کا رویہ بھی اچھا تھا، لیکن ندا کو دیکھ کر اسے تھوڑا احساس ہوتا تھا کہ اس کے سسرال والے کچھ روکھے سے ہیں۔ جس محبت، وارفتگی اور والہانہ پن سے ندا کے سسرال والے اس پر بکھرے لکھتے تھے، وہ ثوبیہ کے سسرال میں مفقود تھا۔ اسے یاد آیا، جب کسی تقریب میں وہ تیار ہوکر جاتی تھی تو عبداللہ کے دیگر رشتے دار خاص طور پر لڑکیاں اس کی بہت تعریف کرتی تھیں، لیکن اس کے اپنے گھر کے لوگ... بس نارمل بلکہ فارمل ہی رہتے۔

اس نے کمپیوٹر اسکرین پر چمکتی ہوئی ندا، صفی اور ان کے بچے کی خوب صورت تصویر پر نظر ڈالی نیچے لاتعداد میسج دیکھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑی سی افسردہ ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

"اماں! میں ذرا کوثر باجی کے ہاں سے چکر لگا آؤں؟ نسرین باجی بھی آئی ہوئی ہیں۔" وہ کہہ کر اجازت طلب نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"شام کو عبداللہ آئے تو دونوں چلے جانا۔" انہوں نے کہا۔

"وہ تو آج دیر سے آئیں گے... اسی لیے۔"

"اچھا! ٹھیک ہے جاؤ۔" انہوں نے کہا تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ کوثر کا گھر ان کے گھر سے بس چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا، بلکہ زیادہ تر رشتے داروں کے گھر اسی علاقے میں تھے۔

کوثر باجی کے گھر حسب توقع بہت گرم جوشی سے اس کا استقبال ہوا۔ فرح، راحیلہ، سعدیہ نے اسے دیکھ کر بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ ان لوگوں کو اپنے رشتے کی یہ بھابھی بہت پسند تھی۔ کوثر اور نسرین باجی بھی اس سادہ سی لڑکی کو بہت پسند کرتی تھیں۔

"ٹھہریں! پہلے میں اپنا اسٹیٹس لکھ لوں کہ ثوبیہ بھابھی آئی ہیں۔" فرح نے اپنے لیپ ٹاپ کی طرف دوڑ لگائی۔ ثوبیہ مسکرائے بنا نہ رہ سکی۔

"کیسی ہو بیٹا! سسرال میں سب کیسے ہیں؟" نسرین بڑی محبت سے پوچھ رہی تھیں۔

"سب ٹھیک ہیں، الحمداللہ۔"

"خوش تو ہونا گھر میں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی۔"

"بھابھی! آپ نے ندا باجی کی تصویریں دیکھیں؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"ہاں، بہت اچھی ہیں۔" وہ بھی ان تینوں کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ان کا بیٹا کتنا پیارا لگ رہا ہے۔" سعدیہ نے کہا۔

"ہاں واقعی!" اس نے پھر تائید کی۔

"ندا کی ساس ہماری بھابھی ہیں ایک طرح سے۔" کوثر نے اسے بتایا۔ "ان کے میاں ہمارے کزن ہیں۔"

"اف! باجی آپ کا خاندان، ماشاءاللہ۔"

"ہاں!" وہ ہنسنے لگیں۔ "آہستہ آہستہ سمجھ جاؤگی سارے رشتوں کو اور سارے لوگوں کو بھی۔" انہوں نے قدرے طنزیہ انداز میں کہا۔ نسرین نے ان پر تنبیہی نظر ڈالی تو وہ ہنس کر بولیں۔

"ارے نسرین! ثوبیہ اپنی ہی ہے۔"

"آپ کے رشتے دار تو ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔" ثوبیہ نے جلدی سے بات بدلی۔

"ہاں بس... سب آگے سے آگے کی دوڑ میں ہیں۔ اب بھابھی شاہین کے بچے ہی دیکھ لو۔ امریکہ، انگلینڈ، لاہور، دبئی، ساؤتھ افریقہ تک میں ان کا ایک بیٹا ہے، بیوی بچوں کے ساتھ۔ اب ایک بیٹی اور بیٹا ہی کنوارے رہ گئے ہیں۔ ابھی بھی لندن گئی ہوئی ہیں، بیٹے کے پاس۔ بیٹی بھی وہیں پڑھ رہی ہے۔ سنا ہے اب ان کی بھی شادی کا ارادہ ہے۔"

"اچھا!" ثوبیہ نے اس قدر ہی کہا۔ اب اسے اس قصے سے کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔

"امی، خالہ، تائی! یہ دیکھیں فراز کی تصویر... کتنا اچھا لگ رہا ہے۔" راحیلہ نے ان سب کو متوجہ کیا۔

ثوبیہ نے بھی دیکھا۔ اسے یاد آیا، یہ تو اس کی بھی فرینڈ لسٹ میں تھا۔ البتہ زیادہ بات چیت نہیں تھی۔

اچھا خاصا ہینڈسم لڑکا تھا۔

"اس طرح منہ پھاڑ کے لڑکوں کی تعریف نہیں کرتے۔" نسرین نے اپنی بیٹی کو ٹوکا۔

"اوہو امی! کزن ہی تو ہے۔" راحیلہ نے کہا۔

"پھر بھی بھابھی شاہین کے بچوں کے ساتھ تعلق رکھنے میں احتیاط کیا کرو۔ جانے وہ کیا سمجھیں۔"

"رہنے دو نسرین!" کوثر نے کہا۔ "ہماری بچیاں کب لڑکوں سے بے تکلف ہوتی ہیں؟ نیٹ کی بات اور ہے، دور کے رشتے دار بھی اپنے لگتے ہیں۔"

"نہیں کوثر! ہم بھی بیٹیوں والے ہیں اور وہ آج کل فراز کے لیے لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ وہ کچھ غلط بھی سمجھ سکتی ہیں۔"

"ارے تائی! آپ کس دنیا میں رہتی ہیں۔" فرح نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ایسا کوئی نہیں سوچتا اور ہم کسی سے کم ہیں کیا؟" اس نے مصنوعی غرور سے کہا۔

ثوبیہ نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ بیس سالہ معصوم سی خوب صورت لڑکی ذہین اور خود اعتماد، واقعی فراز کے ساتھ اچھی لگے گی۔ پھر وہ خود ہی اپنی سوچ پر ہنس دی۔ بھلا وہ کون ہوتی ہے یہ سب سوچنے والی۔

"دیکھیں ثوبیہ بھابھی! فاخرہ باجی کی تصویریں۔" سعدیہ نے اسے بلایا۔

"ایک تو ان کی فیملی بڑی ران رہتی ہے۔" کوثر نے کہا۔

"اب سارے بہن، بھائی الگ الگ ممالک میں رہیں گے تو ایسا ہی ہوگا۔" راحیلہ نے کہا۔

"اچھا! محمود بھائی جان گئے ہوئے ہیں ان کے پاس... دیکھیں تو کہاں کہاں گھوم رہے ہیں۔" سعدیہ نے رشک سے کہا۔

کوثر اور نسرین بھی متوجہ ہوگئیں۔ شاہین کی بیٹی فاخرہ جو نیویارک میں رہتی تھی، اس کے پاس اس کے بھائی اور بھابھی اسلام آباد سے گئے ہوئے تھے۔ سب لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ محبت اور خوش حالی کی تفسیر وہ تصویریں سب کو اچھی لگیں۔

"فاخرہ باجی تو بہت ہی اچھی ہیں۔ انہوں نے مجھے

بھی تیل کی تھی۔" ثوبیہ نے بتایا۔
"ہاں بھابھی! یہ سب لوگ بہت اچھے ہیں۔ دیکھیں نند بھابھیوں میں کس قدر محبت ہے۔ ان کی بھووئیں بھی ان سے بہت محبت کرتی ہیں اور وہ بھی ان سے۔"
وہ مختلف لوگوں کے کمنٹس پڑھنے لگیں۔ وہ فرح کا اکاؤنٹ تھا۔ وہ ہر پوسٹ کے آگے لکھ دیتی۔ "Lolz" اور سب ہنسنے لگتے۔
"ایک تو مجھے اس لفظ کی سمجھ میں نہیں آتی' کوئی مر بھی رہا ہو تو آگے سے لکھ دیتے ہیں" Lolz "کوثر نے چڑ کر کہا۔
"امی! آپ نے اس شخص کا سنا جسے پھانسی دیتے وقت اس کی آخری خواہش پوچھی گئی تو اس نے کہا کہ فیس بک پر اسٹیٹس لکھنا ہے۔" سعدیہ نے کہا۔
"اور وہ جس نے شادی ہوتے ہی سب سے پہلے "انفو" میں خود کو سنگل سے بدل کر میرڈ لکھا۔" راحیلہ نے یاد دلایا۔
"تو تم لوگ کسی سے کم ہو؟" ثوبیہ نے ہنس کر ان سے کہا۔ "نیند آرہی ہے' چائے پی رہی ہوں' بارش ہو رہی ہے' موڈ خراب ہے' موڈ اچھا ہے' اور پتا نہیں کیا کیا۔" سب خوب ہنسے۔
بہت دلچسپ وقت گزار کر ثوبیہ خوشی خوشی اپنے گھر لوٹی تو بڑی آپا بھی آئی ہوئی تھیں۔
ثوبیہ کو ان دونوں کا موڈ خراب سا لگا۔ وہ چپ چاپ کچن میں آگئی تاکہ کوئی اضافی کام ہو تو کر لے۔
"اماں! ذرا خیال رکھیں' آپ کی بہو ان لوگوں سے کچھ زیادہ ہی مراسم بڑھا رہی ہے۔" کچن تک لاؤنج کی آوازیں بخوبی آئی تھیں۔
"یہ ہی تو میں کہتی ہوں۔" دوسری آپا بھی بولیں۔
"لیکن نہ اماں دھیان دیتی ہیں نہ عبداللہ' اور یہ ہیں کہ انٹرنیٹ پر بھی ہر ایک سے دوستی کی ہوئی ہے۔ شاہین بھابھی نے شیریں کی بیٹی رائمہ میں دلچسپی ظاہر کی ہے' اب ایسا نہ ہو کہ ثوبیہ کوئی بات کر دے اور بات خراب ہو جائے۔"

ثوبیہ کا دل بجھ کے رہ گیا۔ بھلا وہ کیوں کسی کی بات خراب کرے گی۔ کسی کا رشتہ ہونے میں اس کا کیا نقصان ہے۔ اس آزردگی میں اسے شاہین بھابھی کی فیملی کا خیال آیا۔ کتنی محبت کرتے ہیں سب ایک دوسرے سے۔ اسے کوثر نے بتایا تھا کہ کسی عزیز کی شادی میں وہ سب لوگ جمع ہونے والے ہیں۔ ثوبیہ خوش تھی کہ نہ صرف ندا بلکہ دوسرے گھر والوں سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔

☼ ☼ ☼

"یہ تم کیا آفس سے آکر بھی بس کمپیوٹر پر بیٹھے رہتے ہو۔" شاہین نے اپنے بیٹے فراز کو لتاڑا۔
"بس امی! عادت ہو گئی ہے۔" وہ مسکرایا۔
"یہ فیس بک کی بیماری... ندا' صفی کے پاس جاؤ تو یہ حال... فاخرہ' محمود' سرمد' منزہ' ماہ نور' احسن' سب کا یہ ہی حال ہے۔"
"ہائے امی! سارے بہن' بھائی یاد دلا دیے۔ بس ان ہی کی یاد کی وجہ سے تو یہ لت لگی ہے۔ سارے رشتے دار قریب محسوس ہوتے ہیں۔" اس نے مزے سے کہا۔
"دکھاؤ تو ذرا مجھے بھی۔" وہ قریب آکر بولیں۔
"یہ فرح... کوثر کی بیٹی ہے نا؟" انہوں نے تصدیق چاہی۔
"جی امی!"
"اس سے بھی دوستی ہے تمہاری؟" انہوں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔
"امی! پورے خاندان کا گروپ ہے' اس میں یہ بھی ہے۔ یہ بھی CA کر رہی ہے میری طرح۔ اس لیے تھوڑی بہت گفتگو ہو جاتی ہے۔" اس نے وضاحت کی۔
"تم نہیں سمجھتے ان کو... کوثر تو یہ ہی چاہتی ہے کہ میں اس کی بیٹی کو اپنی بہو بناؤں... نظر رکھی ہوئی ہے تم پر۔"
"امی! ایسی کوئی بات نہیں۔ ہزاروں دوست ہیں

نیٹ پر۔ اس نیت سے کوئی دوستی نہیں کرتا' پھر یہ تو رشتے دار بھی ہیں۔ ویسے... وہ..." ذرا ہچکچایا "اتنا برا آئیڈیا بھی نہیں ہے یہ۔"
"دیکھا! مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا۔ خبردار! جو ایسا سوچا بھی۔ میرا ارادہ شیریں کی رائمہ کے لیے ہے۔ شیریں کا بھائی یونی سیف میں بہت بڑے عہدے پر ہے اور وہ لوگ منزہ میں انٹرسٹڈ ہیں۔ اب تم خوامخواہ ادھر ادھر ٹانگ مت اڑاؤ اور کوثر اور نسرین کی لڑکیوں سے زیادہ فری ہونے کی کوشش مت کرو۔"

☼ ☼ ☼

آج ثوبیہ اپنے میکے آئی ہوئی تھی اور اپنے بہن' بھائیوں کے درمیان بیٹھی خوب چہک رہی تھی۔ اس کی قریبی دوست فضا بھی اس کی آمد کا سن کر وہیں آگئی تھی۔
"ثوبیہ! تم نے تو بے مروتی کی حد ہی کر دی۔ بالکل بھول گئی ہو ہمیں۔" فضا نے گلہ کیا۔
"ارے! یہ تمہیں کیسے لگا؟" ثوبیہ نے حیرت سے پوچھا۔
"تو اور کیا... ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہیں فضا باجی اور آپ تو فیس بک پر بھی لفٹ نہیں کرواتیں۔ سارا اکاؤنٹ سسرالیوں سے بھرا پڑا ہے۔" اس کی بہن کومل نے بھی شکایت کی۔
"تم لوگ خود ہی میسج کم کرتے ہو۔" اس نے شکوہ کیا۔
"ہم کم نہیں کرتے تم نے اچانک ہی فرینڈز لسٹ اتنی وسیع کر دی ہے۔ ہم نظر ہی نہیں آتے ہوں گے۔" بھائی نے کہا۔
"بس وہ عبداللہ کے اتنے رشتے دار ہیں' جسے معلوم ہوتا ہے وہ فرینڈ ریکوئسٹ بھیج دیتا ہے۔ اب نظر انداز کرنا بھی برا لگتا ہے۔ جانے کیا سوچیں۔ بہت سے تو کوئی تعلق بھی نہیں رکھتے' بس ایڈ کر لیتے ہیں۔ اسی لیے رش بڑھ جاتا ہے۔" اس نے بتایا۔
"ان سب کو ہائیڈ کر دو تاکہ پیج پہ زیادہ رش نہ ہو۔"
"خیر! تمہاری کانووکیشن کی تصویریں تو دیکھی تھیں۔" اس نے بھائی کو بتایا۔
"اف! آپ نے دیکھا' ان لوگوں نے ایک دوسرے کو کیا' کیا کمنٹس دیے ہوئے تھے؟" فضا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔
"ہاں' تو ہم تمہاری طرح تھوڑی ہیں' تصویروں پر تعریفی جملے لکھیں اور پیچھے سے برائی کریں۔"
"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔" فضا نے اس کی حمایت کی۔
"تم نے ثوبیہ کی شادی کی تصویروں میں اپنے چچا کی بیٹیوں کی اتنی تعریف لکھی ہے حالانکہ ان میں سے کوئی بھی ایسی قابل ذکر نہیں لگ رہی تھی۔" فضا نے کومل سے کہا۔
"اوہو' فضا باجی! اب فیس بک پر تعریف تو کرنا ہی پڑتی ہے۔ وہ خود بڑھ بڑھ کر پوچھتی ہیں کہ ہم کیسے لگ رہے ہیں تو بندہ کیا جواب دے۔"
"میں نے اس پر تمہیں ایک پرائیویٹ میسج بھی کیا تھا۔" فضا نے کہا۔
"جی' مجھے یاد ہے۔ آپ نے لکھا تھا' فٹے منہ تمہارا۔" کومل نے ہنستے ہوئے کہا۔
"اچھا چھوڑو یہ سب... یہ بتاؤ عبداللہ بھائی کیسے ہیں؟" فضا نے ثوبیہ سے پوچھا۔
"بہت اچھے۔" اس نے شرما کر کہا۔
"اور گھر والے؟"
"گھر والے' خاندان والے سب اچھے ہیں' بہت پیار کرنے والے۔" گو کہ گھر والوں کی وجہ سے اس کا دل کچھ اداس سا تھا' لیکن باقی رشتے داروں کی وجہ سے وہ خوش تھی۔

☼ ☼ ☼

شادی میں ندا اور ثوبیہ بڑی گرم جوشی سے ایک دوسرے سے ملیں۔
"اف ندا! میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ میں کس قدر ایکسائٹڈ تھی شادی میں آنے کے لیے۔" ثوبیہ نے

اسے بتایا۔
"ہاں! میں بھی۔" ندا نے اس کی تائید کی۔
ان دنوں ندا کے سب سسرال والے آئے ہوئے تھے۔ وہ سب باہمی مشورے سے شیڈول اس طرح رکھتے کہ کم و بیش ساتھ ہی پاکستان آتے تھے اور اس بار تو فراز کا رشتہ فائنل کر کے منگنی بھی کرنا تھی۔
"تمہارا بیٹا تو بہت پیارا ہے۔" ثوبیہ نے اس کے بچے کو گود میں لیتے ہوئے کہا۔
"تم بتاؤ، کوئی گڈ نیوز ہے؟" ندا نے پوچھا تو وہ جھینپ گئی۔
"اچھا! مبارک ہو بہت۔" ندا نے خوشی سے کہا۔
"اچھا یہ بتاؤ، وہ فاخرہ باجی، ماہ نور باجی، محمود بھائی، منزہ، فراز، سرمد بھائی، ساری بھابھیاں اور آنٹی، انکل۔۔۔" ثوبیہ نے بے تابی سے پوچھا، کیونکہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی نہ کوئی آکر اس سے ملتا اور فیس بک کا حوالہ دیتا، لیکن وہ سب لوگ ابھی تک نہیں آئے تھے، صرف ندا ہی آئی تھی۔
"آجائیں گے، سارے نک چڑھے اور مغرور لوگ۔۔۔ اپنی اہمیت جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔۔۔ گھسی ہوئی ہوں گی، میری نندیں پارلرز میں۔"
"ایں؟" ثوبیہ نے حیرت سے اسے دیکھا اور سنا، وہ محبت، وہ شیرینی؟
"اور وہ بے چاری سرمد بھائی کی بیوی نجانے دنیا کے کس کونے میں رہتی ہیں کل مہندی میں اس قدر پینڈو لگ رہی تھیں۔ انہیں پاکستانی فیشن کا پتا ہی نہیں۔ وہ دیکھو انٹری ہو گئی، فاخرہ باجی کی۔ دیکھو تو اس ہیئر اسٹائل میں کتنی بری لگ رہی ہیں۔" ندا نے دور سے آتی فاخرہ باجی کی طرف اشارہ کیا۔
"لیکن ندا! تم نے فیس بک پہ تو ان کے ہیئر اسٹائل کی بڑی تعریف کی تھی اور تمہاری اور ان کی تو بہت بنتی ہے۔" ثوبیہ نے حیرت سے کہا۔
"لو!" ندا نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب فیس بک پہ تو تعریف ہی کرنا ہے نا؟ وال پہ کون برائی لکھتا ہے۔"

"لیکن یہ سب تو تمہیں بہت چاہتے ہیں۔" ثوبیہ نے کہا۔
"رہنے دو، دنیا دکھاوا ہے سب۔ انہوں نے میری شادی کی کس قدر مخالفت کی۔ میری نندیں اب تک فیک آئی ڈیز سے صفی کو میرے خلاف لکھتی رہتی ہیں۔" ندا نے بتایا۔
"فیک آئی ڈیز؟" ثوبیہ حیران رہ گئی۔ "لیکن تمہیں کیسے معلوم؟"
"ارے، پکڑی جاتی ہیں۔ چار دن فیس بک پر بیٹھنے سے کیا ساری آئی ٹی سمجھ میں آجاتی ہے۔ جبکہ میں نے تو ماسٹرز کیا ہوا ہے کمپیوٹر سائنس میں۔" تب تک فاخرہ باجی قریب آچکی تھیں۔
"تم۔۔۔ ثوبیہ ہو نا، عبداللہ کی دلہن؟"
وہ اس سے بڑی گرم جوشی سے ملیں۔ اسی وقت ماہ نور باجی بھی وہاں آگئیں۔ ثوبیہ ان سے بھی مل کر بہت خوش ہوئی۔ ندا بھی خوشدلی سے ملی، لیکن چند منٹ بعد معذرت کر کے اپنی کسی دوست کی طرف چلی گئی۔
"ماہ نور! دیکھا ندا کو۔۔۔ ہمیں دیکھ کر اس کی کیسی حالت ہو گئی۔ ہمارے ساتھ بھی نہیں آئی، پہلے ہی آگئی۔ کیا کہہ رہی تھی تم سے؟" اس نے ثوبیہ سے پوچھا، تو وہ بوکھلا گئی۔
"کچھ نہیں باجی! آپ کی تعریف کر رہی تھی۔"
"تعریف، اور ہماری؟" ماہ نور نے ہنستے ہوئے کہا۔
"اسے اپنی تعریفوں سے تو فرصت ملے۔ خود پسند، گھمنڈی دیکھا، کیسا کلر پہنا ہوا ہے؟ جاہل۔"
ثوبیہ نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا۔ فیس بک پہ ندا کی خوب صورتی اور خوش لباسی کی سب سے زیادہ تعریفیں وہ ہی کرتی تھیں۔
"باجی! آپ لوگوں کی تو بہت دوستی ہے۔ میں نے دیکھا ہے فیس بک پر۔" اس نے کہا۔
"ہائے! یہ منحوس فیس بک، اس کا کیا کریں، روز تصویریں ٹانگ دیتی ہے اپنی۔ ٹماٹر لینے جائے تو بھی تصویر لگا دیتی ہے۔ بج سنور کے پورے دبئی میں گھومتی پھرتی رہتی ہے اور ہمیں جلانے کے لیے روز تصویریں

لگا دیتی ہے۔ ہم کیا بھائی کے آگے برے بنیں؟ دنیا دکھاوے، تعریف ہی کرنا ہے۔ اسی منحوس فیس بک پہ تو صفی سے دوستی کی تھی اس نے، پیچھے ہی پڑ گیا کہ اسی سے شادی کرنا ہے۔ اتنی گھنی ہے۔ وہاں سے ہر وقت باجی جان، امی جان کرتی رہتی ہے۔ صفی تو کہتا ہے کہ میری بیوی مرتی ہے سسرال پر، تو لو جی! ہم بھی مر جاتے ہیں تمہاری بیوی پر۔ دو لفظ ہی تو ٹائپ کرنے ہیں نا۔" وہ بولتی چلی گئیں۔
"نہیں باجی! وہ تو آپ سب کی بہت عزت کرتی ہے، بہت چاہتی ہے۔" ثوبیہ کو ابھی تک یہ سب ہضم نہیں ہو رہا تھا۔
"تم بہت بھولی ہو ثوبیہ!" فاخرہ باجی نے کہا۔
"اب دبئی میں بیٹھی مزے کر رہی ہے۔ نہ سسرال کی جھنجھٹ، نہ کوئی اور فکر۔ میاں اتنا کمانے، لٹانے والا اور محبت کرنے والا، اب کمپیوٹر جیسی بے جان چیز سے دو لفظ محبت کے لکھ دیے تو کون سا کارنامہ کیا۔ سال میں ایک بار پاکستان آئے اور ہیلو، ہائے اور بائے کر کے چلے گئے۔ بہو تو تمہاری جیسی ہوتی ہے، جو اتنی لمبی چوڑی سسرال میں آکر رہے، لیے، سب سے محبت کرے، سب سے میل جول رکھے۔"
گو کہ ثوبیہ کو اس ساری صورت حال سے الجھن ہو رہی تھی، لیکن اپنی تعریف کسے بری لگتی ہے۔ کسی کو تو میری اچھائی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ پھر اس کی ملاقات آنٹی شاہین، محمود بھائی اور ان کی بیوی اور باقی سب افراد سے بھی ہوئی۔
آپا اپنی نند شیریں اور ان کی بیٹی رائمہ کے ساتھ آئیں۔ رائمہ کو دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی۔ جب سے شادی میں آنے کا پروگرام بنا تھا، رائمہ اسے روز میسج کرتی تھی کہ وہ اس سے ملنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ ثوبیہ کی ہر پوسٹ پہ وہ سب سے پہلے Like کا بٹن دباتی تھی۔
ثوبیہ بڑی گرم جوشی سے اس سے ملی، لیکن اس کا سرد مہرانہ انداز دیکھ کر ٹھٹک سی گئی۔
"تھانکس ٹو میٹ یو بھابھی! مائنڈ مت کیجئے گا، مجھے میری بچپن کی ایک دوست نظر آگئی ہے۔" وہ تیزی سے ایک طرف بڑھ گئی اور ثوبیہ ہکا بکا اسے دیکھتی رہ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ اسے آنٹی شاہین کے ساتھ چپکی ہوئی نظر آئی۔ وہ بچپن کی دوست آنٹی شاہین تھیں؟ ثوبیہ نے حیرانگی سے سوچا۔
"کیا سوچ رہی ہو ثوبیہ؟" کوثر باجی نے پوچھا۔
وہ دراصل ان ہی کے ساتھ آئی تھی اور ان کے ساتھ ہی نسرین باجی کے گھر رہنے کا پروگرام تھا۔ آپا اپنی نند کے پاس رکی تھیں۔ ان کے گھر میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ثوبیہ اور عبداللہ بھی رہ سکتے، اسی لیے انہوں نے نسرین باجی کے گھر رہنے کا فیصلہ کیا اور ثوبیہ بھی اس پر خوش تھی کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ زیادہ اطمینان محسوس کرتی تھی۔
"کچھ نہیں باجی ایسے ہی۔"
"ایک بات کہوں؟" انہوں نے جھجکتے ہوئے کہا۔
"جی باجی! کیا بات ہے؟"
"پتا نہیں مجھے کہنا چاہیے یا نہیں، لیکن یہ لوگ۔۔۔ یہ ندا، فاخرہ، ماہ نور یہ سب۔۔۔ ان سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔"
"کیوں؟ کیا ہوا؟" وہ بوکھلا گئی۔
"یہ ساری ابھی تمہاری نند کے پاس بیٹھی تمہارے ہی خلاف بول رہی تھیں۔ صرف اس لیے بتا رہی ہوں کہ تم محتاط رہو۔" انہوں نے کہا۔
"میرے خلاف؟" وہ شدید حیران ہوئی۔
"لیکن وہ تو مجھے اتنا پسند کرتی ہیں، اتنی دوستی ہے ہماری؟"
"فیس بک پر نا؟" انہوں نے مسکرا کر کہا۔
"میں یہ نہیں کہتی کہ وہاں اچھے دوست نہیں ملتے، لیکن یہ لوگ۔۔۔" وہ کہہ کر خاموش ہو گئیں۔
"کیا۔۔۔ کیا کہہ رہی تھیں؟" ثوبیہ نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"فاخرہ وغیرہ کہہ رہی تھیں کہ تم ان سے زبردستی چپکتی ہو۔ فیس بک پر فری ہوتی ہو، خواہ مخواہ۔"

"باجی!" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
"وہ لوگ خود مجھے میل کرتی ہیں، خود مجھے Add (ایڈ) کیا تھا۔"

"اور یہ بھی کہ بنا جانے سارے لڑکے اپنی لسٹ میں شامل کرلیے ہیں۔"

"باجی! وہ سارے عبداللہ کے کزنز ہیں۔ انہیں بتاکر، رشتہ پوچھ کر پھر ہی Ok کرتی ہوں۔" ثوبیہ بالکل ہی روہانسی ہوگئی۔

"یہاں تک کہ تم نے فراز سے بھی اس لیے دوستی کی ہے کہ تمہاری چھوٹی بہن ان میرڈ ہے۔"

"اس کی تو منگنی ہوچکی ہے باجی!" ثوبیہ تو بالکل ہی دنگ رہ گئی۔ فیس بک پر ہروقت اس کی تعریفیں کرنے والے اس طرح کی باتیں کرسکتے ہیں، وہ کیسے مان لے؟

صبح اس کی آنکھ قدرے دیر سے کھلی۔ شرمندہ شرمندہ سی لاؤنج میں آئی۔ کوثر اور نسرین باجی ناشتا بنا رہی تھیں۔ عبداللہ، فرح، راحیلہ، سعدیہ اور چند اور لوگ، کوئی چائے پی رہا تھا، کوئی گپیں ہانک رہا تھا۔ لڑکیاں حسب عادت لیپ ٹاپ پر مصروف تھیں۔

"سوری باجی!" اس نے شرمندگی سے کہا۔

"ارے سوری کی کیا بات ہے، رات کو اتنی دیر بھی تو ہوگئی تھی اور پھر یہ شیطان کی خالائیں، اپنے پیرو مرشد کو سارے دن کی باتصویر کہانی نہ سنائیں تو انہیں چین نہیں پڑتا۔" انہوں نے ہمیشہ کی طرح فیس بک پر غصہ نکالا۔

"آئیں آئیں بھابھی! رات کی شادی کی تصویریں دیکھیں۔"

"یہ لیں، اگر آپ کو اپنا اکاؤنٹ چیک کرنا ہے تو....." راحیلہ نے اپنا لیپ ٹاپ اس کی طرف بڑھایا۔ اس نے خالی خالی ذہن کے ساتھ لاگ اِن کیا۔

"دیکھیں! اس تصویر میں آنٹی شاہین کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔" فرح نے کہا اور نیچے کمنٹس میں لکھا۔

"are looking gorgeous"
(آپ بہت شان دار لگ رہی ہیں۔)

اپنے گھر میں فرح کی اپ لوڈ کی ہوئی تصویریں دیکھتے ہوئے آنٹی شاہین نے یہ تبصرہ دیکھا تو منہ بنایا۔

"اس لڑکی کو اب تک مجھ سے امید ہے کہ شاید فراز کا رشتہ اسی سے کروں گی، ہونہہ..... ندا! میری طرف سے لکھ دو۔

"Thank you darling' infact you are so beautiful"
(تھینک یو، درحقیقت تم بہت خوب صورت ہو۔)

پھر خود ہی ہنسنے لگیں۔ رائمہ نے یہ کمنٹس دیکھے تو چڑ کر ماں سے کہا۔

"ذرا آنٹی شاہین کو دیکھیں، رشتہ میرا مانگا ہے، لاڈ فرح کے ساتھ کررہی ہیں۔"

"تو تم بھی ان کی تعریف لکھو نا، دیکھو فرح کیسی چمچہ گیری کررہی ہے۔" ماں نے کہا۔

"کیا تعریف کروں؟ ان کی عمر ہے پشواز پہننے کی؟ پرانی اداکارہ لگ رہی ہیں۔" وہ ہنسنے لگی، پھر اس نے لکھا۔

"Farah is right aunty! you are so grace ful"
(فرح صحیح کہہ رہی ہیں آنٹی! آپ بہت باوقار لگ رہی ہیں۔)

ثوبیہ نے اپنے پیج پر دیکھا۔ فاخرہ، ماہ نور وغیرہ سب کے میسج تھے۔

"تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

"جیسا سنا تھا ویسا پایا۔"

"عبداللہ بہت خوش قسمت ہے۔"

"ہمارے خاندان کی سب سے اچھی بہو۔"

ثوبیہ نے لیپ ٹاپ کو نزدیک کیا اور اپنا آج کا اسٹیٹس لکھا۔

"کچھ رشتے بس..... فیس بک پر ہی اچھے لگتے ہیں۔" فرح نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ دونوں ایک دوسرے کی بات سمجھ گئیں۔ فرح نے اس کے نیچے کمنٹ لکھا۔

"Lolzzzz"

نزہت شبانہ حیدر

آپ جیسی لڑکی

ناولٹ

مرتضیٰ جرمنی سے آرہے تھے اور وہ بھی شادی کے سلسلے میں، یہاں چچی کا کافی بڑا خاندان تھا اور سب لڑکیوں کا ہی خیال تھا کہ مرتضیٰ اپنے ننھیال کی طرف جائیں گے۔

چچی کے میکے والے کافی امیر لوگ تھے اور اسی لحاظ سے ماڈرن بھی۔

اب جو وہ ساری زندگی جرمنی میں گزار کر آرہے ہیں تو انہیں کوئی پردہ نشین تو چاہیے نہیں ہوگی انہیں کسی ماڈرن لڑکی کی ہی آرزو ہوگی۔

لیکن کوشش کرنے میں کیا حرج تھا اور کیا پتا کس کا خلوص دل کام آجائے۔

اسی لیے آج چھوٹی تائی نے دعوت رکھ لی تھی۔

کوشش تو اماں نے بھی کی تھی کہ کسی طرح وہ بھی ایک دعوت رکھ لیں، لیکن برا ہو گھر کے بجٹ کا کہ اس میں گنجائش ہی نہیں نکل سکی اور پھر اس کا غصہ بھی ہم دونوں بہنوں پر ہی اترا کیونکہ اماں اتنی محنت ہم دونوں کے لیے ہی کر رہی تھیں۔

اور مجھے دیکھ کر تو ان کی پریشانی میں اور اضافہ ہو گیا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو گیا ہے، کون سی ایسی دوائی پی لی ہے کہ قد رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا ہے، تاڑ کی تاڑ ہوتی جا رہی ہے۔"

"اب یہ کیا بات ہوئی۔ میں تلملا جاتی۔ "اتنا اچھا قد تو ہے میرا، آج کل آپ دیکھ نہیں رہی ہیں اماں! لوگوں کے قد کہاں بڑھ رہے ہیں۔ سب پستہ قد ہو کر رہ گئے ہیں۔"

"تو بنو! یہ تو آخری وقت کی نشانی ہے کہ جیسے جیسے قیامت قریب آتی جائے گی۔ لوگوں کے قد چھوٹے ہوتے جائیں گے۔"

"اچھا!" میں سچ مچ فکر مند ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

لیکن اماں کو ایک بات تو بتانا بھول گئی تھی کہ اسی لمبے قد کی وجہ سے مجھے ایک اشتہاری کمپنی نے ماڈل بننے کی آفر کی تھی۔

وہ لوگ کالج میں کسی ورائٹی پروگرام کے سلسلے میں آئے تھے۔

ان لوگوں نے کافی اصرار کیا لیکن میں نے خود انکار کر دیا۔ اماں اس بات کو نہ مانتیں' لہٰذا بات وہیں کی وہیں ختم ہو گئی۔

اریزہ مجھ سے ایک سال چھوٹی تھی' مگر ابھی بھی وہ میرے کندھوں تک آتی تھی۔

اماں میک اپ کے نام پر صرف لپ اسٹک لگانے کی اجازت بھی بہت مشکل سے دیا کرتی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ میک اپ نہ کرنے کی وجہ سے ہم لوگ تھوڑی مناسب لگیں گے۔ یا پھر ہم پر پکے پن کا تاثر نہیں ابھرے گا۔

اب پتا نہیں' بات صحیح تھی یا غلط' کیونکہ کوئی اور تاثر ابھرے یا نہیں اس سے کوئی مطلب نہیں تھا' مگر کہیں جانے کے لیے تیار ہونے کے بعد آئینہ دیکھتی تو چہرے پر مجھے ایک حماقت کا تاثر ضرور نظر آتا تھا۔ پورے چہرے پر لپ اسٹک الگ سے ہی نظر آتی۔ تنگ آ کر وہ لپ اسٹک بھی اماں کے حوالے کر دی کہ اس کی بھی کیا ضرورت ہے اور اماں مجال ہے' جو پسیج جائیں۔

انہوں نے فوراً" ہم دونوں بہنوں کی اکلوتی لپ اسٹک بھی اپنے پاندان میں گھسا لی۔

"اف۔" اریزہ نے تو سر پیٹ لیا۔

"تمہیں کیا ضرورت تھی اریج! ہماری اکلوتی لپ اسٹک بھی دینے کی؟"

"مجھے کیا پتا تھا۔ میں تو ذرا انہیں جذباتی طور پر بلیک میل کر رہی تھی کہ کیا پتا وہ موم ہو ہی جائیں کہ اچھا چلو بچیو! ایک آدھ چیز اور لگائی جا سکتی ہے۔"

"توبہ کیجیے وہ ہماری اماں ہیں۔" اریزہ نے کپڑے سمیٹتے ہوئے کہا۔ "ضرور پچھلے کسی جنم میں ان کی ہٹلر سے دوستی رہی ہو گی..... اور آپ خود تو دریا میں ڈوبی ہی ہیں' ساتھ مجھے بھی گھسیٹ لیا۔ یار! کیا ہم اسی ایک لپ اسٹک سے تھری ان ون کام نہیں لے سکتے تھے۔ یعنی اسی کو ہلکا سا لے کر آنکھوں پر لگا لیا' یہ ہو گیا آئی شیڈ..... تھوڑا سا رخساروں پر رگڑ لیا' یہ ہو گیا' بلش آن..."

"تمہیں یہی کرنے کا شوق ہے تو کر لو اور لال بندریا جیسی شکل کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

میں نے اسے چھیڑا لیکن وہ خاموش رہی' غالباً" خود ہی اپنے منصوبے کے بارے میں غور کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

امتحان بالکل سر پر آ گئے تھے اور تیاری نہ ہونے کے برابر تھی۔ بالکل بھی ٹائم نہیں ملتا تھا کہ میں اپنی اسٹڈی ڈھنگ سے کر سکتی۔

کالج سے تھک ہار کر جاؤ تو تھوڑی دیر بعد ہی ٹیوشن کے بچے آ جاتے اور ان کے ساتھ مغز ماری کے بعد خود میرا اپنا دماغ اتنا پلپلا ہو جاتا کہ پھر پڑھنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

گو کہ اریزہ بھی میرا ساتھ دیتی مگر وہ تو بہت ہی نازک مزاج تھی۔ دو بچوں کے پڑھانے کے بعد ہی اس کے سر میں درد ہو جاتا تھا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب رزلٹ آیا تو میں شاندار نمبروں سے فیل تھی۔ مجھے تو پتا تھا' یہی ہو گا لیکن اماں کو کچھ زیادہ ہی صدمہ ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اسکول میں اس قسم کے نمبر آئے ہوتے تو وہ اب تک میرا اسکول بند کروا چکی ہوتیں کہ کوئی ضرورت نہیں ہے اس قدر کوڑھ مغز لڑکی کو پڑھانے کی لیکن یہ تو تب کی بات ہوتی' جب بابا زندہ تھے.....

ان کے انتقال کے بعد تو جیسے اماں ڈھے گئی تھیں۔ حالانکہ دل میرا اب بھی یہ چاہتا تھا کہ وہ پہلے کی طرح ہی کہا کریں۔

لیکن اب انہوں نے اتنا کہا کہ

"اگر اسی طرح پڑھنا ہے تو کیا ضرورت ہے۔ محنت کی کمائی کو اس طرح آگ لگانے کی۔ جتنے پیسے تمہارے

آگ میں پھینکتی ہوں۔ اس میں تو جہیز کی دو ایک اچھی چیزیں ہی آ جائیں۔"

"اچھا؟" اریزہ کو ذرا جو یقین آیا ہو۔ "اریج! اماں سے ان دو ایک اچھی چیزوں کا نام تو پوچھ لو۔ جو آ سکتی تھیں مگر صرف تمہارے پھوہڑ پن کی وجہ سے نہیں آ سکیں۔"

"بکواس نہیں کرو اور اماں کی باتوں کا برا نہیں مانا کرو' انہوں نے جتنی بھی باتیں سنائی ہیں' مجھے ہی سنائی ہیں..... مجھے کہا ہے' تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔"

"مجھے تکلیف کیوں نہیں ہو گی اریج! تمہیں موقع ہی کب ملتا ہے۔ اگر ملتا اور تم دو گھڑی بیٹھ کر ڈھنگ سے پڑھ سکتیں تو اتنا تو مجھے بھی یقین ہے کہ تم کم از کم کوڑھ مغز ہرگز نہیں کہلاتیں۔"

"اچھا۔" میں چپ ہو کر سوچنے لگی۔

میں نے جس اشتہار میں کام کرنے سے انکار کیا تھا' آج دوبارہ ان لوگوں کا فون آیا تھا۔ پہلے بھی وہ لوگ میرے خیال سے ٹھیک ٹھاک معاوضہ دے رہے تھے مگر اب انہوں نے اس میں اور اضافہ کر دیا تھا۔

میرے دوبارہ انکار کرنے پر انہوں نے بھی مجھے کچھ اسی قسم کی باتیں کہی تھیں' جن کا مختصر خلاصہ اماں کی زبان میں کچھ کوڑھ مغز قسم کا ہی بنتا تھا۔

میں نے اریزہ کو یہ بات بتائی تو وہ اپنی جگہ پر اچھل گئی۔

"تم سچ کہہ رہی ہو؟"

"مجھے کیا ضرورت ہے جھوٹ بولنے کی۔" میں نے برا مانا۔

"افوہ میرا مطلب یہ تھا کہ تم اتنی خوب صورت ہو کہ وہ لوگ دو دفعہ تمہارے پاس آئے اور تم نے دونوں دفعہ انکار کر دیا؟"

"تو اور کیا کرتی' اماں کبھی بھی اجازت نہیں دیتیں۔"

"اور کیا پتا دے ہی دیتیں۔ گھر کے حالات بھی تو اس قدر خراب ہیں۔ اور تم کیا سمجھتی ہو کہ ٹیوشن کر کے کیا ہو جائے گا۔ بہت بڑا تیر مار لو گی؟"

"میں نے ایسا کب کہا اریزہ!" میرا لہجہ کمزور تھا۔ "لیکن گزارا تو ہو ہی رہا ہے نا۔"

"گزارا تو ہو ہی جائے گا اریج مصطفیٰ! لیکن دیکھو' زندگی کیا صرف یہی ہے کہ بس ہر چیز کے لیے ترس ترس کر وقت گزاریں؟"

اس کا لہجہ کچھ کچھ زہر خند سا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں ہو پایا کہ ایسا کیوں ہے۔ اگر بات زندگی کے ترسانے کی تھی تو اس کے زخم خوردہ تو ہم دونوں ہی تھے۔

زندگی ہم دونوں ہی کو ترسا رہی تھی اور اماں کو بھی۔ لیکن فی الحال اماں کو ہم نے اپنی لسٹ میں سے نکال دیا تھا کہ وہ بہرحال اپنی عمر گزار چکی تھیں اور ان کی ساری آرزوئیں' امنگیں ہم دونوں کے ہی گرد گھومتی تھیں۔

اور رہے ہم دونوں..... تو کہتے ہیں کہ...

چاند جب زمین کے گرد گھومتا ہے تو ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے کہ زمین' چاند سے سورج کی روشنی چھین لیتی ہے اور چاند گہنا جاتا ہے۔

اس لیے اب ہمیں لگتا تھا کہ جیسے ہماری ساری زندگی پر یوں ہی گرہن چھایا رہے گا۔

میں سوچ میں گم بیٹھی تھی' جب اریزہ نے میرے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

"بتاؤ نا اریج! اب انکار تو نہیں کرو گی؟"

اور میں کچھ بول ہی نہیں سکی کہ وہ کوئی دو سال کی بچی نہیں تھی کہ میں اسے جھوٹ بول کر بہلا لیتی۔

ہمارا اور چچا جان کی فیملی کا نہ کوئی مقابلہ تھا نہ برابری لیکن پتا نہیں کیوں' یہ بات اریزہ کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی تھی۔

اس نے اس رات کھانا بھی نہیں کھایا۔ یوں ہی بھوکی لیٹ گئی۔ اماں تو مغرب کی نماز کے ساتھ ہی کھا لیا کرتی تھیں۔ یہ دستور ابا کے وقت سے تھا۔ پھر رات کے بارہ بجے تک میں اور اریزہ کھایا کرتے تھے۔ اس دن اکیلے مجھ سے بھی نہیں کھایا گیا۔ میں اسے اٹھانے گئی تو اس نے کروٹ بدل لی۔

"اریزہ! اٹھ جاؤ۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔" میں

نے نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔
"اریج، مجھے بھوک نہیں ہے تم کھانا کھالو۔" اس نے منہ پھیرے پھیرے ہی جواب دیا۔
بھوک کیوں نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے، تمہیں بھوک لگ رہی ہے، اٹھ جاؤ۔"
"اس طرح کا خیال نہیں رکھا کرو اریج! جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ تمہارا یہ خیال رکھنا مجھے کیا فائدہ دے سکتا ہے۔" اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں غالباً وہ رو رہی تھی۔
"خیال رکھنا چاہیے۔ چاہے وہ فائدہ دے یا نہ دے۔" میں نے اس کے آنسوؤں سے بھیگے بال پیچھے کیے۔ "چلو آجاؤ بھوک لگ رہی ہے۔"
کھانا کھاتے ہوئے وہ خاموش ہی تھی اور مجھے اس کی یہ خاموشی بولنے سے زیادہ خطرناک لگ رہی تھی۔
"اریج! ایک بات بتاؤ!" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔
"دیکھنے میں، میں کچھ کچھ تم جیسی ہی ہوں نا؟"
"ہوں! بلکہ مجھ سے بھی زیادہ پیاری۔"
میں نے بھی سوچوں میں گم اسے جواب دے دیا۔
اور..... دوسرے دن چوتھے پیریڈ میں مجھ پر انکشاف ہوا کہ اریزہ کے اس جملے کا مطلب کیا تھا۔ میں اس وقت بسمہ کے ساتھ چائے پی رہی تھی، پیریڈ لینے کو دل نہیں چاہا تھا تو بسمہ کے ساتھ کیفے آگئی تھی۔ میں ایک دم چائے کی پیالی رکھ کر کھڑی ہو گئی۔
"کیا ہوا خیریت!" بسمہ پریشان ہو گئی۔
"کچھ نہیں بس یونہی۔" میں نے پیشانی دونوں ہاتھوں سے ملی۔
"مجھے کالج سے باہر جانا ہے ابھی اور اسی وقت۔"
"کیا ہوا بھئی، کیا کسی کو ٹائم دے رکھا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔
"میں مذاق نہیں کر رہی ہوں بسمہ! پلیز جلدی کرو۔"
"کیا ہو گیا ہے تمہارا چہرہ کیوں اتنا زرد ہو رہا ہے؟"
"یہ میں تمہیں آکر بتا دوں گی۔ ابھی خان بابا سے کہہ دو کہ گیٹ کھول دیں۔"
"اچھا۔" وہ تھوڑی سی فکر مند ہوئی۔ مگر پھر اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ گھر سے تو میں اتنے پیسے لے کر نہیں نکلی تھی کہ رکشے سے کہیں جا سکتی اور اب اتنا ٹائم بھی نہیں تھا کہ میں بسوں کا انتظار کرتی، بسمہ سے ہی میں نے کچھ پیسے لیے، باہر آکر رکشے والے کو پتا بتا کر میں جلدی سے رکشے میں سوار ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

زندگی میں کبھی کوئی چیز مسئلہ نہیں ہوتی، نہ مسئلہ بنا کرتی ہے۔ ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل موجود ہوتا ہے۔
لیکن ذمہ داری اور وہ بھی کسی معصوم لڑکی کی.....
مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میرے کندھے کسی پہاڑ کے نیچے آگئے ہوں.. بارشوں کی وجہ سے سڑکیں بالکل ٹوٹ گئی تھیں۔
ہر دفعہ رکشے کو ایک زبردست جھٹکا لگتا اور ہر دفعہ نئے سرے سے سر میں درد ہونے لگتا۔ تنگ آکر میں سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔
جس اشتہار کی کمپنی نے مجھے آفر کی تھی۔ میں نے اس کا پتا نکال کر دیکھا اور رکشے والے سے کہا۔
"بس یہیں اتار دو۔" میں اسے کرایہ دے کر نیچے اتر گئی۔
"تھوڑی سی تلاش بسیار کے بعد میں مطلوبہ جگہ پر پہنچ ہی گئی۔ سب لوگ جا رہے تھے۔ میں منہ اٹھا کر سیدھی اندر چلی گئی۔
"آپ کون؟" اس نے دلچسپی سے مجھے دیکھا۔
"دیکھیے، میں جو کوئی بھی ہوں، آپ اس کو چھوڑ دیجیے۔ صرف مجھے یہ بتا دیں کہ یہاں کوئی لڑکی آئی ہے؟"
نہ جانے رکشے کے ہچکولوں نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا، یا میرا دماغ تھا ہی خراب، مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔
"یہاں لڑکیاں ہی آتی ہیں بی بی! آپ کو کس لڑکی کا معلوم کرنا ہے؟"
"خدایا! میرا مطلب ہے کہ اس کا نام....."
چند لمحے کے لیے اریزہ کا نام ہی میرے ذہن سے محو ہو گیا۔

اسی وقت شیشے کا دروازہ کھول کر اریزہ باہر نکلی تو میں ایک دم اس پر چیل کی طرح جھپٹی اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
وہ میرے اچانک ہاتھ پکڑ لینے سے بوکھلا گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر دوبارہ سرد مہری چھا گئی۔
"میرا ہاتھ چھوڑو اریج!"
"تم کیوں آئی ہو یہاں بتاؤ۔" میں نے بڑی مشکلوں سے پوچھا۔
بچپن میں ایک سال بڑی ہونے کا فائدہ اٹھا کر اس کی غلطی پر ایک عدد چھوٹا سا تھپڑ لگا دیا کرتی تھی مگر.. اب تھپڑ لگانا تو دور کی بات، مجھے یوں لگا جیسے میں اسے کچھ کہنے کا بھی حق نہیں رکھتی وہ ہاتھ چھڑا کر باہر نکل چکی تھی۔
میں بے دم ہو کر وہیں کرسیوں پر بیٹھ گئی۔
"پانی پی لیں!" اس نے ٹیبل بجا کر مجھے متوجہ کیا۔ "اور بتائیں مسئلہ کیا ہے؟"
وہ وہاں مسئلے سلجھانے کے لیے یقیناً نہیں بیٹھا تھا اور نہ میرا کوئی ارادہ تھا کہ میں یوں راہ چلتے چلتے کسی کو اپنی داستان سناؤں گی۔
لیکن... میں نے اپنی داستان اسے سنائی بھی اور بڑی مشکل سے آنسو بھی ضبط کیے۔ بارہا آنکھوں کے سامنے دھند سی چھا جاتی، جنہیں پلکیں جھپک جھپک کر میں پیچھے کرتی رہی۔
ساری بات سننے کے بعد اس نے گہری سانس لی۔
"سب سے پہلے تو میں آپ کو اپنا نام بتا دوں، میرا نام خضران ہے، جس سیریل کے لیے میں آج مختلف لڑکیوں کے آڈیشن وغیرہ لیتا رہا ہوں، آپ کو اس سیریل کے لیے دو دفعہ آفر کی جا چکی ہے۔ پتا نہیں آپ نے پہچانا یا نہیں..... خیر! یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ اور میں یہ بھی نہیں کہتا کہ آپ کی سسٹر کو چانس مل سکے گا یا نہیں لیکن یہ جو عمر ہوتی ہے ناں، یہ بڑی خطرناک عمر ہوتی ہے۔ اس عمر میں انسان کا دل چاہتا ہے کہ آگ سے کھیلے۔ کوئی سیڑھی لگا کر ستاروں پر اور بہت ہی اوپر چلا جائے۔ پوری دنیا کو حیرت زدہ کر دے۔ سب لوگ نیچے سے سر اٹھائے، بس اسے ہی دیکھتے رہیں۔"
اس کی براؤن آنکھوں میں سوچ کی تحریریں تھیں اور ہونٹ، جو کچھ بول رہے تھے، میں اسے سمجھ تو رہی تھی لیکن یہ میرے مسئلے کا حل تو نہیں تھا۔ بالآخر میں چیخ گئی۔
"ساری ہی عمریں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ہر عمر میں یہی دل چاہتا ہے کہ جادو کے زور سے کوئی ایسی سیڑھی مل جائے، جس پر چڑھ کر ستاروں تک پہنچا جا سکے، مگر کسی کو کیا خبر۔" میں ایک دم چپ ہو گئی۔
وہ شخص وہاں فارغ بیٹھا نظر آرہا تھا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ مسائل ہی حل کرتا رہتا۔ انسان کے اس دنیا میں اپنے بھی ہزاروں کام ہوتے ہیں۔
"اچھا جی..... آپ کا بہت شکریہ۔"
"شکریہ..... مگر کس بات کا؟" اس کا لہجہ استفہامیہ تھا اور یہ تو خود مجھے بھی نہیں پتا تھا کہ کس بات کا شکریہ، لیکن پھر بھی اس نے آدھے گھنٹے میری بک بک تو سنی تھی۔
"ہمیں آفس کے لیے ایک لڑکی کی ضرورت ہے۔ اگر آپ ڈراموں میں کام نہیں کرنا چاہتیں، تو یہاں جاب ہی کر لیجیے۔"
اس نے آفس کارڈ میری طرف بڑھایا۔
"او کے، میں سوچ کر جواب دوں گی۔"

☼ ☼ ☼

میں گھر پہنچی تو اریزہ سامنے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے ایک دم نظریں پھیر لیں۔
ہم دونوں کتنا لڑتے تھے۔ بحث کرتے تھے اور پھر ہمیشہ روٹھ کر مان بھی جاتے تھے۔ لیکن اب پتا نہیں کون سی خلیج بیچ میں حائل ہو گئی تھی۔ میں اس سے کچھ کہنا ہی چاہ رہی تھی کہ اماں اندر سے آگئیں۔
"آج تم دونوں بہنوں نے اتنی دیر کہاں لگا دی؟"
میں نے ایک نظر اریزہ کے چہرے پر ڈالی۔ اس کے چہرے پر ہٹ دھرمی رقم تھی۔

"بیٹا اریج! ذرا جلدی سے وہ کونے والا کمرا تم اور اریزہ مل کر سیٹ کر لو تمہارے تایا کا فون آیا تھا۔ مرتضیٰ کو کسی کام سے کراچی آنا ہے وہ ایک دو دن یہیں رہے گا۔"

"اماں! آپ ہی نے کہا ہوگا۔ کیا ضرورت تھی بھلا؟"

"کیا ہر کام ضرورتوں کا ہی محتاج ہوتا ہے اریج!" انہوں نے غور سے مجھے دیکھا۔ "کبھی کوئی کام ہم خلوص سے نہیں کر سکتے؟"

زندگی گزارنے کے ہر ایک کے اپنے ہی فلسفے ہوا کرتے ہیں اور ہمیں حق بھی کیا پہنچتا ہے کہ ہم ہر ایک کے اوپر اپنی رائے مسلط کریں۔

میں خاموش ہو گئی لیکن بس مجھے یہی ڈر تھا کہ وہ سارے راز کہیں کھل نہ جائیں جنہیں میں نے اماں سے بھی چھپایا تھا۔ مگر کب تک... مردوں کو بے وقوف بنانا کوئی آسان بات نہیں ہوتی۔

یہی سب سوچتے سوچتے میرے سر میں درد ہونے لگا۔ ساری رات نیند بھی نہیں آئی۔ جب ذرا آنکھ لگتی۔ ایسے عجیب خواب نظر آنے لگتے کہ فوراً" آنکھ کھل جاتی۔

میں نے سوئی ہوئی اریزہ پر نظر ڈالی' وہ سوتے ہوئے بے حد معصوم لگ رہی تھی۔ خوب صورت سیاہ بالوں کی ایک لٹ اس کے گالوں پر بکھری ہوئی تھی۔

خوب صورت شربتی آنکھوں پر گھنیری خم دار پلکیں سایہ فگن تھیں۔ کہیں سے نہیں لگ رہا تھا کہ اس معصوم صورت والی لڑکی نے آج سارا دن مجھے کس قدر تھکا مارا تھا۔

میں باہر آکر گملے کے پاس بیٹھ گئی۔ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

"یا اللہ! یہ صبح ہی صبح کون آگیا۔" ابھی ہلکا ہلکا سا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ اماں نے مرتضیٰ کے آنے کا بتایا تھا۔

اور واقعی آنے والے وہی حضرت تھے۔

میں تو کبھی اسلام آباد گئی نہیں تھی۔ لیکن اریزہ کی زبانی سب کے اتنے قصے سن رکھے تھے کہ کوئی اجنبی بھی اجنبی نہیں لگتا تھا۔

"آیئے! آپ مرتضیٰ ہیں نا؟"

"ہاں اور تم؟"

"میں اریج۔" "کبھی آئیں نہیں نا اسلام آباد۔"

"بس چھٹی ہی نہیں مل پائی۔"

میں نے بھی یوں کہہ دیا' جیسے بہت بڑی پوسٹ پر ہوں۔ کہنے کے بعد اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ کہیں ان حضرت نے پوچھ لیا کہ مس اریج مصطفیٰ! کون سی پوسٹ ہے آپ کی' لیکن غنیمت ہوا کہ اس نے کچھ پوچھا نہیں۔

"آیئے' آپ کو کمرا دکھا دوں۔"

میں اسے لے کر کونے والے کمرے میں آگئی۔ شکر ہے کہ رات کو ہی صاف کر لیا تھا اور ایک عدد بستر بھی ڈال دیا تھا' ورنہ اس وقت کہاں سلاتے اور کہاں بٹھاتے۔

☆ ☆ ☆

دوسرے دن کالج میں بسمہ میرے سر پر سوار تھی۔

"ہاں! اب بتاؤ' کل کیا ہوا تھا؟ پتا ہے تمہارے جانے کے بعد بھی میں اس قدر پریشان رہی تھی۔"

وہ صحیح کہہ رہی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ وہ واقعی پریشان ہو گئی ہوگی۔ میں اسے کیا بتاتی۔ صبح ہی تو اریزہ نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ "میں اس کی فکر کرنا چھوڑ دوں' وہ اب بڑی ہو گئی ہے۔ اور اگر آج میں اس کے پیچھے آئی تو وہ واپس گھر نہیں آئے گی۔"

اس کا لہجہ اور انداز دونوں سرد تھے۔ میں اندر تک کٹ کر رہ گئی۔ لیکن اس کے اس جملے پر کہ "وہ گھر واپس نہیں آئے گی۔" میں نے صرف ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

وہ چہرہ جو مجھے سوتے میں معصوم سا لگ رہا تھا۔ اب بالکل اجنبی تھا۔ اور اجنبی تو اجنبی ہی ہوتے ہیں۔ ان سے کیا بات کی جا سکتی ہے۔

لیکن میں نے آج ایک بات سوچ لی تھی' میں اماں کو بتا دوں گی۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ ان کے دل کو جو تکلیف پہنچتی' اسے تو میں روک نہیں سکتی تھی۔ لیکن خدانخواستہ اگر انہیں کچھ ہو جاتا تو.... پہلے بھی ایک دفعہ انہیں انجائنا کا اٹیک ہو چکا تھا۔

"آج تو تمہیں کہیں نہیں جانا؟" بسمہ نے شرارت سے بارہ بجے کے قریب گھڑی میرے آگے لہرائی تو میں سوچوں سے باہر آئی۔

"نہیں" آج مسافر نے کہیں نہیں جانا۔ وہ اب لوٹ کر آگیا ہے۔" میں نے زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجائی۔ میری مسکراہٹ دیکھ کر وہ تھوڑی سی مطمئن ہو گئی۔

گھر پہنچی تو اریزہ اب تک واپس نہیں آئی تھی۔ مرتضیٰ وہیں میرے موتیا کے گملے کے پاس بیٹھا تھا۔

"ہیلو لیڈی! میں آپ دونوں خواتین کا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

"کس لیے۔"

"میں نے جو گرز اتار کر انگلیاں سیدھی کرتے ہوئے پوچھا۔

"کس لیے؟ بھئی موسم اس قدر خوب صورت ہو رہا ہے تو میں نے اور تائی جان نے پکنک کا پروگرام بنا لیا۔ کیوں تائی اماں!"

"خوامخواہ' تائی کا نام بدنام نہ کرو۔ خود ہی پتا نہیں کہاں سے گاڑی لے کر آگیا ہے۔"

"کہاں سے کیا مطلب... کونے میں ہی تو کھڑی ہوئی تھی۔ سب سے آخر والا جو مکان ہے ناں...!"

"آئے ہائے۔" اماں گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔

"اے مرتضیٰ! کیا ہو گیا ہے تجھے' ابھی چوری کا الزام لگ جائے گا۔"

"مگر کیوں تائی اماں؟"

"لو مجھ سے پوچھ رہا ہے کیوں تائی اماں... وہ گاڑی ہے کوئی مرغی تو نہیں۔" اماں جھنجلا کر بولیں۔

میں اتنی تھکی ہوئی آئی تھی اور ذہن پر اریزہ کی فکر الگ سوار تھی' اس کے باوجود یہ تائی اور بھتیجے کی نوک جھونک مجھے اتنی اچھی لگی کہ میں بے ساختہ ہی ہنس پڑی۔

"ارے آپ ہنستی بھی ہیں؟" اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ "ہم تو سمجھے تھے کہ صرف رویا کرتی ہیں۔"

"کیا بدتمیزی ہے۔"

"بدتمیزی کی کیا بات ہے۔ آپ یقین کریں' کل صبح سے آپ کے منہ کا ایک ہی ڈیزائن نظر آرہا ہے۔ اسی لیے تو میں نے ذرا آؤٹنگ کا پروگرام بنا لیا کہ شاید مزاج میں کوئی تبدیلی آجائے۔"

"مقدر میں نہ کوئی تبدیلی آجائے۔" میں بیگ لے کر اندر آگئی۔ مجھے احساس تھا کہ میرا لہجہ کچھ تلخ ہو گیا تھا لیکن کرتی بھی کیا۔

☆ ☆ ☆

اس کے ساتھ آٹھ لڑکیاں اور تھیں جن میں پانچ تو بہت پیاری تھیں۔ ان میں سے دو کے فوٹو سیشن وہ دیکھ بھی چکی تھی۔

تیسری ماڈل فیشن شوز میں کام کرتی تھی لیکن وہ سی کلاس کی ماڈل تھی۔

پھر ایک وہ تھی۔ جس کا شمار باقاعدہ ماڈلز میں تھا نہ کسی کی سفارش پر منتخب کردہ لڑکیوں میں۔

اریزہ کی واحد اہلیت اس کی خوبصورتی تھی۔ لیکن وہ اپنے حسن سے اتنی ہی بے خبر تھی' جتنا کوئی نابینا شخص دنیا کی رنگینیوں سے ہو سکتا ہے۔ دل میں نا آسودہ خواہشوں کا ایک جنگل آباد تھا۔ لیکن اسے کوئی پروا نہ تھی۔

آج اس نے اریج کو بھی منع کر دیا تھا کہ میرے پیچھے آنے کی ضرورت نہیں لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں لاشعوری طور پر ہی سہی۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔ ہر دفعہ جب بھی کوئی شیشے کا دروازہ کھول کر اندر آتا۔ اس کی نظریں بلا ارادہ ہی اٹھ جاتیں۔

"آپ کو کسی کا انتظار ہے؟" جس لڑکی نے اس

سے سوال کیا تھا' وہ اسے جانتی نہیں تھی۔ لیکن چونکہ اس نے سرخ رنگ کی گہری لپ اسٹک لگائی ہوئی تھی۔ اس وجہ سے اریزہ نے اسے سرخ ہونٹوں والی خطاب دے دیا تھا۔

"نہیں تو۔" اس نے گڑبڑا کر کہا۔ "آپ کو کیوں شک ہوا۔" اس نے بھی بات برائے بات کرلی۔

"یوں ہی۔" سرخ ہونٹوں والی کی مسکراہٹ بہت دلفریب تھی۔ بلکہ وہاں پر موجود ہر لڑکی ہی ایک الگ حسن کی مالک تھی۔

پھر جو لڑکیاں اس سے پہلے آئی تھیں۔ ان ہی کے آڈیشن میں اتنی دیر لگ گئی کہ ان دونوں کی باری ہی نہیں آسکی۔

وہ گھر پہنچی تو بے حد تھکی ہوئی تھی۔ اور ستم بالائے ستم کہ سب لوگ کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہے تھے۔

"تم چل رہی ہو ہمارے ساتھ؟" مرتضیٰ نے اریزہ سے پوچھا' البتہ اریج نے کچھ نہیں کہا۔ وہ سر جھکائے پیکنگ کررہی تھی۔ غالباً" کچھ چیزیں گھر سے پکا کر لے جائی جارہی تھیں۔

"نہیں میں تھکی ہوئی ہوں۔" وہ کہہ کر کمرے میں گھس گئی۔

اریج نے ایک نظر اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ لیکن چلنے کے لیے نہیں کہا۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اور دیکھا جائے تو کبھی کبھی فائدے نقصان سب ہی بالکل بے کار نظر آتے ہیں۔

"تمہیں ایک دن احساس ہوگا اریزہ! کہ جو چیز آج تمہیں فائدہ مند لگ رہی ہے' کل وہ زندگی کے کسی موڑ پر تمہیں بالکل ہی بے کار نظر آئے گی۔۔۔ اور خدا کرے کہ تمہیں اس کا احساس جلد ہی ہوجائے۔"

میں نے بیگ کاندھے پر ڈالتے ہوئے سوچا۔ حالانکہ جانے کا دل میرا بھی نہیں تھا لیکن میں اماں کی وجہ سے تیار ہو گئی تھی۔ ہم دونوں تو پھر بھی کسی نہ کسی طرح۔ باہر کی دنیا گھوم ہی آتے تھے۔ لیکن اماں تو بالکل ہی قید ہو کر رہ گئی تھیں۔

میں تیار ہو کر باہر آئی "چلیں!"

"وہ نہیں جارہی واقعی؟" اس نے اریزہ کے متعلق دریافت کیا۔ "لڑکیاں تو اتنی شوقین ہوتی ہیں گھومنے پھرنے کی پکنک وغیرہ پر جانے کی۔ مجھے یہاں دوسرا دن ہے اور میں نے اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں سنا۔"

"اس کی مرضی ہے اپنی۔" میں نے بے اختیار ہی کہا اور خاموش ہو گئی۔

"کوئی پرابلم ہے؟" مرتضیٰ نے چونک کر مجھے دیکھا۔

"نہیں تو۔" میں کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"اچھا!" اس نے گہری سانس لی۔ "پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ آپ کے ذہن پر کوئی بوجھ ہے' بتادیتیں تو بہتر ہوتا۔"

تین دن کی بھی ملاقات نہیں تھی اور وہ کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی بوجھ ہے تو بتادیتیں۔

"یہ پیشکش آپ ہر ایک کو کرتے ہیں؟"

"کون سی؟" وہ غالباً" کہہ کر بھول گیا تھا۔

"جو کہہ کر بھول جائیں' ان پر کتنا اعتبار کیا جاسکتا ہے۔"

"بات اعتبار کی آجائے تو ایک دفعہ کرکے دیکھ لیجیے' ایسے ہی کسی پر الزام نہیں لگایا کرتے۔"

اماں کو شاید نیند آرہی تھی۔ مگر ہم لوگوں کی تکرار سن کر سیدھی بیٹھ گئیں۔

"اریج۔۔۔۔ بچوں کی طرح لڑنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔"

"آپ دو بہنیں ہیں اور ایک کا مزاج مشرق کی طرف رہتا ہے۔ دوسرے کا مغرب کی طرف۔"

"تو آخر آپ کو تکلیف کیا ہے؟"

"تکلیف کیوں نہیں ہوگی۔ گھر کو گھر کی طرح لگنا چاہیے۔ گھر کا اگر کوئی فرد گھر میں سرائے کی طرح رہ رہا ہو تو۔۔۔۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں خاموش ہو کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

کوئی خود ہی گھر کو سرائے سمجھ لے۔۔۔۔ کوئی گھر میں بسنا ہی نہیں چاہے۔۔۔ کوئی اپنے خوابوں میں آسمان جتنی اڑان بھرے۔۔۔۔ تو دوسرا کیا کرے۔ وہ کہاں جائے' کسے سمجھائے۔ جبکہ خود کو ہی سمجھانے میں اکثر بہت دیر ہوجاتی ہے۔"

میں اتنی یاسیت سے کہنا نہیں چاہتی تھی اور مجھے حق بھی کیا تھا کہ میں اپنے گھر کے معاملات کسی دوسرے پر عیاں کرتی۔

لیکن وہ بہت ظالم شخص تھا۔ مجھے اس کی چہرہ شناس آنکھوں سے خوف آنے لگا۔ اسے دل پر ہاتھ رکھنا آتا تھا۔ اسے درد پر ہاتھ رکھنا آتا تھا۔

پھر مجھے پیچھے بیٹھی اماں کا خیال آگیا۔

"اماں! مزا آرہا ہے ناں۔ کتنے عرصے بعد گھر سے نکلی ہیں۔"

"ہاں بیٹا مزا تو آرہا ہے لیکن دماغ اریزہ میں لگا ہوا ہے۔ پتا نہیں کھانا بھی کھایا ہوگا یا یونہی جا کر سو گئی ہوگی۔" ان کے لہجے میں ماؤں والی فکر تھی۔

اب انہیں نہ جانے کتنی فکریں سنبھالنا تھیں۔

☼ ☼ ☼

اماں نے تین چار سوٹ نکال رکھے تھے۔ پرانے انداز کے سلے ہوئے تھے۔

"اب اس قسم کی بیلیں کون پہنتا ہے۔" اریزہ نے ناک سکوڑی۔

"تم دیکھو تو سہی۔" اماں نے منت سے کہا۔ "اس کا کپڑا بہت اچھا ہے۔"

"اماں! کپڑے کا اچار ڈالنا ہے۔ اگر کپڑا سستا بھی ہو تو آج کل اس پر اتنا کام کیا جاتا ہے' اس کو اتنا اسٹائل دے دیا جاتا ہے کہ کپڑے کی اصل قیمت پتا ہی نہیں چلتی۔ میرا خیال ہے آپ یہ سوٹ اریج کو دے دیں۔ اس کو بہت شوق ہے پرانی چیزوں کو نیا کرکے پہننے کا۔"

"اریزہ۔۔۔۔ بس بہت ہو گیا ہمیشہ تم یہی کچھ کرتی آئی ہو۔ بہن نہ ہوئی' اسٹور روم ہو گئی۔ جتنا فالتو کاٹھ کباڑ ہے' سب اس میں بھردو۔" اماں نے ناراضی سے کہا۔

"کوئی انسان کسی دوسرے کو اسٹور روم نہیں بنا سکتا۔ یہ تو انسان خود ہی اس طرح بن جائے تو دوسری بات ہے۔" اریزہ نے شانے اچکا کر کہا۔

اماں دل ہی دل میں متفکر ہوگئیں۔ اریزہ بدتمیز تھی خود سر اور تھوڑی منہ پھٹ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اریج کو کچھ کہتی یا اس کے متعلق اتنے برے انداز میں بات کرتی۔۔۔۔

انہیں افسوس ہوا۔ اریزہ کے سامنے اس قسم کی مثال دینی ہی نہیں چاہیے تھی لیکن اب تو تیر نکل ہی چکا تھا اور اس تیر نے کہاں جا کر لگنا تھا۔ یہ تو ان کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

آج کا دن بڑا تھکا دینے والا تھا میں تمام کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھی ہی تھی کہ اماں کچھ سوٹ لیے آگئیں۔

"اریج! دیکھو تمہیں ان کا کچھ کرنا ہے۔" ان کا لہجہ ملتجی تھا۔

مجھے پتا تھا ہم جن حالات سے گزر رہے ہیں۔ وہاں کچھ بھی برباد کرنے کو عیاشی ہی کہہ سکتے تھے اور ہم دونوں کی وجہ سے اماں اتنی کفایت شعاری کرتی تھیں کہ غصے اور ترس سب آپس میں گڈمڈ ہو جاتے تھے۔

"اماں کپڑوں کا کیا کرنا ہوتا ہے۔ انہیں پہننا ہی ہوتا ہے۔" میں نے رسان سے کہا۔

"مگر اریزہ نے انہیں پہننے سے منع کردیا ہے تو میں نے سوچا کہ تم تو میری اچھی بیٹی ہو۔ اس کا کچھ نہ کچھ ہی لوگی۔" ہمیشہ کی طرح اماں کا دل رکھنے کو میں نے مسکرا کر کہا تو وہ خوش ہو گئیں۔

"چلو یہ تو ٹھکانے لگے۔ کھانا لگوا اب۔"

کھانا کھاتے وقت میں نے سوچا کہ آج تو اریزہ خوش ہوجائے گی۔

مرتضیٰ کی وجہ سے آج اماں نے بھنا ہوا قیمہ بنوایا تھا' گھر میں کوئی چیز بھننے کی نوبت کم ہی آتی تھی۔

اریزہ میرے کان میں گھس کر کہتی۔

"اریج! اس گھر میں صرف ہم دونوں ہی بھن سکتے

ہیں۔ بلکہ اماں نے ہمیں اتنا بھونا ہے کہ پک پک کر ہم دونوں کالے ہو گئے ہیں۔"

لیکن وہ بے توجہی سے روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے توڑتی رہی۔ کھانے سے ایک دم میری دلچسپی ختم ہو گئی۔

"کیا ہو گیا ہے اریزہ کو۔" میں نے دل میں سوچا۔ "یہ خوش کیوں نہیں ہوتی۔"

ہم دونوں بہنوں کی بہ نسبت مرتضیٰ نے بڑا دل لگا کر کھانا بھی کھایا اور تعریف بھی کی۔

"اب تم برتن دھو لینا۔" اماں نے اریزہ کو مخاطب کیا۔ "اریج تھک گئی ہو گی۔"

اریزہ نے کوئی جواب نہیں دیا مگر اماں کے جانے کے بعد کہا۔

"اریج! برتن تم خود دھو لینا۔ میری مجبوری ہے، میرے ہاتھ خراب ہو جائیں گے۔"

حالانکہ اریزہ نے صرف یہ کہا تھا کہ ہاتھ خراب ہو جائیں گے لیکن مجھے لگا کہ اس نے کہا "اب ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔" یا ہو ہی گئے تھے۔ کس کو پتا تھا۔ میں نے برتن سمیٹے اور دھونا شروع کر دیے۔

"ارے۔" مرتضیٰ کسی کام سے کچن میں آیا تو چونک گیا۔ "آپ انسان ہیں کہ جن... کتنا کام کرتی ہیں۔ اریزہ کو کہہ دیا ہوتا۔ آپ آرام کر لیتیں۔"

پتا نہیں اس نے جملہ رسما" کہا تھا یا خلوص سے لیکن میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پتا نہیں آنسو اور ہمدردی کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ میں نے دل گرفتگی سے سوچا۔ کہنے کو آنسو دوست ہوتے ہیں مگر کبھی کبھی دشمنوں والا کام کر دیتے ہیں۔

وہ مزید کہہ رہا تھا۔

"اریزہ کو آپ نے سر پر چڑھا رکھا ہے۔ ورنہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک بہن اتنی سمجھ دار اور ہمدرد ہو بلکہ سلیقہ مند بھی اور دوسری بہن...." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ ابھی چھوٹی ہے لیکن وہ بہت اچھی ہے۔" میں نے چڑ کر کہہ دیا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں وہ بہت اچھی ہے۔" اس کے جملے میں کیا تھا۔ میں فوری طور پر سمجھ نہیں سکی۔

"لیکن اچھا ہونے کا یہ مطلب کب ہوتا ہے کہ وہ سمجھ دار بھی ہو۔ اسے تھوڑا بہت تو آپ کا اثر قبول کرنا ہی چاہیے۔"

"یا اللہ۔" میں نے رخ موڑ کر مرتضیٰ کو دیکھا۔

"میں باہر جا رہا ہوں۔ آپ کو کچھ منگوانا ہے تو بتا دیں۔"

"نہیں شکریہ۔"

مجھے پتا تھا وہ خود بہت ذمہ دار اور اچھا آدمی ہے۔ اماں کے منع کرنے کے باوجود وہ خود سے کافی کچھ لے کر آ جاتا تھا۔ بعض لوگوں کے اندر اللہ تعالیٰ ذمہ داری اور محبت دونوں بھر دیتا ہے۔ اور یہ دونوں چیزیں ہی انسان کی شخصیت کو بڑا ہی پیارا بنا دیتی ہیں اور پیارے لوگ تو سب ہی کو اچھے لگتے ہیں۔ اس میں اتنی فکر کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے اپنے دل کو تسلی دی۔

"چلیں آئس کریم کھانے چلتے ہیں۔" اس نے تجویز پیش کی۔

"نہیں، اماں کو پسند نہیں ہے۔"

"اور اگر ہم اماں کو بھی لے جائیں تو۔" مرتضیٰ نے جھٹ کہا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ بات آئس کریم کی نہیں تھوڑی سی تبدیلی کی تھی اس لیے میں نے حامی بھر لی لیکن اماں نے منع کر دیا۔

"تم دونوں بہنیں چلی جاؤ۔"

پھر میں اریزہ کی طرف گئی۔

"اریزہ! آئس کریم کھانے چل رہی ہو؟" مجھے لگا، وہ مان جائے گی۔ اس میں تو کسی چیز کے خراب ہونے کا ڈر نہیں تھا۔ لیکن اس نے منع کر دیا۔ میں اس کی شکل دیکھتی رہی۔ آج ایک ہفتہ ہونے کو آ رہا تھا۔ وہ بات نہیں کر رہی تھی۔ حالانکہ پہلے تک اس کی یہی معصوم سی خواہشیں ہوتی تھیں۔ آئس کریم، شاپنگ حتیٰ کہ اپنی پسند کی ایک لپ اسٹک.... مجھے بہت کچھ یاد آ رہا

گیا۔

اور اب اسے پتا نہیں ــــ کون سی دنیا چاہیے تھی۔

کون سے ستاروں کو مسخر کرنا تھا۔

وہ اتنی پیاری تھی کہ لوگ ویسے بھی اس کے لیے ستارے توڑ کر لا سکتے تھے لیکن اب وہ اپنی پیاری صورت کو جہاں کیش کروانا چاہ رہی تھی، وہ تو راستے ہی اور تھے۔ اماں جان سے مار دیتیں لیکن کبھی شوبز میں جانے نہیں دیتیں۔

مجھے اپنے قد اور بالوں کی وجہ سے کالج کے دنوں میں آفر بھی آئی تو میں نے منع کر دیا۔ جس کام سے اماں ناخوش ہوں میں اسے سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

اور اب.... میں گہری سانس لے کر پلٹ گئی۔

"کیا ہوا؟" مرتضیٰ نے میری اتری ہوئی شکل دیکھی۔

"کچھ نہیں، کوئی نہیں جا رہا ہے۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کوئی بات نہیں، آپ تو چل رہی ہیں نا؟" اس نے خوش دلی سے کہا تو مجھے بڑا اچھا لگا۔

پہلے خضران اور اب یہ مرتضیٰ... میں نے سوچا۔ آج کل لڑکے خوش مزاج بھی ہو گئے ہیں اور اچھے بھی۔

"آپ کیوں مسکرا رہی ہیں۔" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

"کیوں، کیا میرا مسکرانا منع ہے، یا میرا مسکرانے اور جینے پر کوئی حق نہیں ہے؟" میں چڑ گئی۔

"شکر ہے آپ کا تعلق انسانوں سے ہی نکلا۔"

"میرا خیال ہے، میں انسان ہی ہوں۔"

"یقین کریں مجھے ابھی ابھی پتا چلا ہے۔ ورنہ اتنا صبر و برداشت اب آج کل کی لڑکیوں میں کہاں رہا ہے۔" اس نے سر کھجایا۔

وقت بہت آگے جا چکا ہے۔ لڑکیوں کا مزاج، رجحان، سب ہی کچھ بدل گیا ہے لیکن پھر بھی کیا ضروری ہے کہ ہم اپنی ساری رہتیات اور اقدار ــــ فراموش کر دیں۔ ابھی بھی ہم نے بہت کچھ ماڈرن دنیا سے مستعار لے لیا ہے۔ غلط یا صحیح۔ میں نے اپنا اسکارف ٹھیک کرتے ہوئے سوچا۔

☼ ☼ ☼

"لائٹ جلا دوں اریزہ؟" کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں اندر داخل ہوئی تو مجھے گھبراہٹ ہونے لگی۔ لیکن وہ جیسے تاریکی میں تاریک کا ہی ایک حصہ بن گئی تھی۔ اس نے مجھے کوئی جواب نہیں دیا۔

کمرے میں بہت عجیب سا سناٹا تھا۔ میں ایک دم ڈر گئی اور میں نے لائٹ جلا دی۔

"پلیز اریج! بند کر دو۔" اس نے اپنی آنکھوں پر بازو رکھ لیا۔

"روشنی سے کیوں ڈر رہی ہو؟" میں نے اس کا مزاج بدلنا چاہا۔ "اپنے منیر نیازی کہہ نہیں گئے ہیں۔ روشنی سے ڈرتے ہو روشنی تو ہم سب ہیں۔"

غلط شعر پڑھنے سے اس کی جان جاتی تھی اور اس بات پر تو وہ مجھ سے لڑ پڑتی تھی کہ "پلیز اریج! غلط شعر نہ پڑھا کرو شاعر کی روح کو تو تکلیف ہوتی ہی ہے، سننے والے کو بھی بڑی تکلیف ہوتی ہے۔"

مگر آج تکلیف تھی نہ لڑائی۔ بس خاموشی تھی یہاں سے وہاں تک۔

مسئلہ کیا ہے آخر؟" میں پھٹ پڑی۔ "یہاں اس گھر میں انسان رہتے ہیں۔ تم انسانوں کی طرح رہنا کیوں نہیں سیکھ رہیں۔ آج ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ مجھے یہ سب برداشت کرتے ہوئے۔"

"بہت خوب، صرف ایک مہینہ اور اتنی چیخ و پکار...؟ مجھے دیکھو بیس سال ہو گئے، اس جہنم میں ٹینشن برداشت کرتے ہوئے۔"

"جہنم؟" میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟"

"ہاں پتا ہے کیا کہہ رہی ہوں۔ اصل میں جب آدمی بہت دنوں تک جہنم میں رہے تو وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ جیسے تم.... تم بے بس ہو گئی ہو۔ تمہیں نہ اپنی

راہ کے کانٹے ہٹانے کا شوق ہے نہ میری راہ کے کانٹے چننے کا۔ تم جانتی ہو؟ میں سارے آڈیشن میں پاس ہو گئی تھی لیکن تم نے خضران سے کیا کہا تھا میں نہیں جانتی۔ لیکن اس نے مجھے ڈرامے میں سلیکٹ نہیں کیا۔ وہ بالکل تمہارے انداز میں سمجھا رہا تھا کہ آپ بالکل مختلف دنیا سے آئی ہیں اور یہ ایک الگ دنیا ہے۔ آپ یہاں مس فٹ رہیں گی۔ ہمارا گم گشتہ بھائی ..... اماں سے پوچھ لینا شاید بچپن میں کہیں گم ہو گیا ہو۔"

اس کے لہجے میں بہت کچھ تھا۔

اور میں اس کی کسی بات کو بھی نہیں سمجھ پائی۔

بعض دفعہ زندگی میں بہت ساری چیزیں اس طرح آپس میں الجھ جاتی ہیں کہ انہیں سلجھانے کی کوشش کرنا بے کار ہو جاتا ہے۔

اس کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور جن کا واپس آنے کا کوئی ارادہ نہ ہو..... وہ پچھلے سارے نشان مٹاتے ہوئے جاتے ہیں۔

اریزہ نے بھی ہر نشان مٹا دیا تھا۔

محبت کا' تربیت کا اور شاید روشنی کا بھی۔ وہ تو یہی سمجھ رہی تھی کہ اندھیروں سے روشنی کی طرف جا رہی ہے لیکن اسے کیا پتا کہ وہاں شوبز کی دنیا میں اتنی چکا چوند روشنی ہوتی ہی اس وجہ سے ہے کہ وہاں اندر بہت اندھیرے ہوتے ہیں۔ پھر انہیں مصنوعی روشنیوں کا سہارا لینا پڑ جاتا ہے۔

لیکن ابھی کچھ بھی کہنا بے کار تھا۔ آپ ایک دفعہ فلاح کے راستے سے ہٹ جائیں تو پھر واپسی کا راستہ بہت مشکل سے ملتا ہے۔

میں نے اریزہ کے لیے بہت دعائیں کیں۔

☼ ☼ ☼

اور ساری دعائیں ہی آخرت کا انتظار نہیں کرتیں کچھ دعائیں دنیا میں بھی پتا چل جاتی ہیں کہ قبول نہیں ہوئیں۔

اریزہ کے ٹی وی انٹرویو اور میگزین انٹرویو آنا شروع ہو گئے تھے۔ اس کو اسٹائل سے بولنا آگیا تھا اور ایک بولنے پر ہی کیا موقوف..... وہ مکمل طور پر بدل چکی تھی۔

وہ ہم میں سے نہیں رہی تھی یا ہم اس میں سے نہیں رہے تھے۔ اس سے کیا فرق پڑتا تھا۔

اماں کے آنسوؤں نے بھی اب صبر کا راستہ دیکھ لیا تھا۔

ایک غم پر آدمی کتنی دیر تک اور کب تک آنسو بہا سکتا ہے مگر وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔

"میں نے اس کی ایسی تربیت تو نہیں کی تھی' پھر ایسا کیوں ہو گیا۔"

"اماں! وقت بہت آگے جا چکا ہے۔ چھوڑیئے جانے دیجیے۔"

"ایسے کیسے چھوڑ دوں' وہ بہت معصوم ہے۔"

"کوئی معصوم نہیں رہتا اماں!" کوشش کے باوجود آنسوؤں کی نمی میری آواز میں اتر آئی۔

میگزین' اخبار سب جگہ تواتر سے اریزہ کی خبریں لگ رہی تھیں۔ کوئی لڑکا تھا' سعد بٹ' اریزہ اس کے ساتھ بہت دیکھی جا رہی تھی۔

سب کے پاس اپنی اپنی خبریں تھیں اور ہمارے پاس اپنے غم تھے۔

اریزہ سے اب بہت کم بات ہو پاتی تھی کیونکہ وہ نیچے آتی نہیں تھی۔ اس نے بہت زبردست سا اوپر کا پورشن بنوا لیا تھا اور وہ زیادہ تر اوپر ہی رہتی تھی۔

نیچے آتی تو ہمیں سمجھ میں ہی نہیں آتا کہ اس سے کیا باتیں کریں۔ ہم دو الگ دنیاؤں کے باسی ہو گئے تھے اور ہمیں ایک دوسرے کی زبان بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

اریزہ کو ٹی وی پر دیکھتی تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی وجود ہے' جو ہمارے گھر میں رہتا ہے۔ جس کے ساتھ بچپن کا بہت سارا وقت بسر کیا ہے۔ جس کے ساتھ زندگی کے دکھ سکھ دیکھے اور یہ کوئی بہت پرانی بات بھی نہیں تھی۔ محبتوں اور دکھ کا گزرا وقت کبھی پرانا نہیں لگتا۔

☼ ☼ ☼

مرتضیٰ نے دوسرا گھر آفس کے نزدیک ہی لے لیا تھا۔ اب اس کا آنا جانا بہت کم ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی تنہائی اور سناٹے کی وحشت سے گھبرا کر دل کرتا کہ میں بھاگ جاؤں۔ مگر کہاں؟

سوچ سوچ کر سر میں درد ہو جاتا کہ اماں کے ساتھ کسی ایسی جگہ چلی جاؤں' جہاں غم حیات کے ایسے تھپیڑے نہ ہوں۔

پہلے بھی اریزہ کے ساتھ مل کر ایسے ہی پلان بنایا کرتی تھی۔ مگر اس وقت ایک بے ساختگی اور معصومیت تھی۔

میں نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا وقت کو کتنی جلدی ہوتی ہے گزر جانے کی۔

"کیا پکا ہے اریج۔" مرتضیٰ نے آتے ہی شور مچا دیا۔

"کچھ نہ کچھ تو پکا ہی ہے۔ تم کہو' تو لے آؤں؟" اس کے آنے سے ایک دم خوش ہو گئی تھی۔

"یہ کنجوسوں کی طرح کیوں پوچھا جا رہا ہے۔" مرتضیٰ کچن میں آگیا۔

"اس لیے کہ ہم نے آج پھر آلو بنائے ہیں اور تمہیں آلو پسند نہیں ہیں۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" مرتضیٰ نے کندھے اچکائے۔

"بھوک کے وقت تو آلو کچے بھی کھائے جا سکتے ہیں۔"

"اف.....!"

اسی وقت میری نظر ٹی وی پر پڑی۔ اریزہ کا انٹرویو آ رہا تھا۔ مجھے اب ان سب چیزوں سے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ میں نے اٹھ کر ٹی وی بند کر دیا۔

"ٹی وی کیوں بند کر دیا۔ کیا تم اس سے جیلسی فیل کرتی ہو؟" مرتضیٰ کے الفاظ نے جیسے ایک دم سے مجھے جھلسا دیا۔

"بھئی میں مذاق کر رہا تھا۔" مرتضیٰ نے میری اتری صورت دیکھ کر کہا۔ لیکن مجھ سے کوئی جواب دیا ہی نہیں گیا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایک اچھا دل کسی کو نظر نہیں آتا۔ روشنیوں پر سب کی نگاہ پڑ جاتی ہے۔

میں نے تو کبھی اریزہ سے مقابلہ کرنے کا سوچا بھی نہیں اور سوچتی بھی کیسے وہ..... وہ نہیں تھی میں تھی میرا خون' میری چھوٹی بہن۔

ابا کے مرنے کے بعد میں اس کی ڈھال بن گئی تھی۔ اسے ہر تکلیف ہر غم سے بچانا چاہا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے تک وہ اس بات کو مانتی بھی تھی۔ اس محبت کی بھی اسے بہت قدر تھی' جو ہمیں اس سے تھی۔

مگر اب..... اب کسی چیز کے بارے میں' کچھ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ ہماری اس کی برائے نام بات چیت رہ گئی تھی۔

مجھے عادت نہیں تھی' بہت دیر تک کسی کو گردن اٹھا کر دیکھنے کی اور جو لوگ بلندیوں کا سفر طے کر رہے ہوتے ہیں' شاید ان کی بھی عادت ختم ہو جاتی ہے' گردن جھکا کر بات کرنے کی۔

کل اریزہ بھولے بھٹکے نیچے آگئی۔ اماں نے پکڑ لیا۔

"چھوڑ دے اریزہ! یہ سب کچھ۔" اماں نے منت سے کہا تھا۔

"بہت مشکل ہے۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

انسان کو ایک زندگی ملتی ہے اور وہ پوری زندگی ایک ایک چیز کے لیے سسک کر نہیں گزار سکتا۔ آدمی کے پاس دولت ہونی چاہیے۔ یہ آج کی حقیقت ہے۔ جب میں نے اس گھر سے باہر قدم نکالے تھے۔ تب ہی سوچ لیا تھا کہ اب کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھوں گی۔ آپ بار بار آوازیں نہ دیا کریں اماں! ہمیں آگے بڑھنے دیجیے۔ آپ نے ہمارے لیے کچھ نہیں کیا' اتنا تو کر ہی سکتی ہیں۔"

"اریزہ! چپ ہو جاؤ۔ تم اماں کو الزام دے رہی ہو۔ پاگل ہو گئی ہو؟" جس دن دنیا سمجھ میں آئے گی' اس

دن تم سے پوچھوں گی۔"

"ہونہہ۔" اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔ "جو لوگ کچھ نہیں کرتے' وہ صرف باتیں کرتے ہیں۔"

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ میں ایک تھپڑ اس کے منہ پر مارتی۔ اور شاید میں مار بھی دیتی لیکن مجھے ایک دم احساس ہوا کہ وہ خوفزدہ ہے اور کسی حد تک اس کی حالت ابتر بھی تھی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں رتجگے تھے اور تھکن۔

"تم خوف زدہ ہو؟"

پتا نہیں کیوں میں ایک دم اس سے پوچھ بیٹھی۔ میرا اس کا خون کا ایک رشتہ تو تھا' محبت کا اور مان کا رشتہ تو اس نے توڑ دیا تھا۔

"ہاں' مجھے لگتا ہے تم لوگ میرے لیے بد دعائیں کرتے ہو۔"

"اریزہ...؟" میری آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں "ہم تمہارے لیے بد دعا کریں گے... مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ تم لوگوں کو مجھ سے بہت پیار ہے۔"

"تو جن سے پیار ہوتا ہے ان کے لیے بد دعا کی جاتی ہے؟ اریزہ! دماغ خراب ہو گیا ہے کیا؟"

"صحیح کہہ رہی ہوں۔" اس کا لہجہ ضدی تھا۔ جن کے لیے دعا نہیں کی جاتی' ان کے لیے پھر بد دعاؤں کا ہی راستہ رہ جاتا ہے۔"

"اس کا فیصلہ تو تمہیں کرنا تھا۔ دعائیں چاہیے تھیں یا بد دعائیں۔"

"دیکھا... میں نے صحیح کہا تھا ناں۔" وہ چلائی تو میں ڈر گئی۔

وہ پاؤں پٹختے ہوئے اوپر چلی گئی اور میں نیچے ہی بیٹھی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

"اریج۔" اماں نے خفگی سے کہا۔ "میں دیکھ رہی ہوں' تم ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتی رہتی ہو۔ اتنا نہیں سوچو' بیمار پڑ جاؤ گی۔ اچھا' اندر آ کر مرتضیٰ کی امی سے مل لو' وہ کسی کام سے کراچی آئی ہیں تو تم سے بھی ملنے آ گئیں۔"

"آج سے پہلے تو کبھی نہیں آئیں تو پھر آج خیریت؟"

"اب آنے والوں سے یہ تو نہیں پوچھا جا سکتا۔ بہر حال' تم منہ ہاتھ دھو کر اور کپڑے بدل کر آ جاؤ۔"

"کپڑے ٹھیک ہیں اور ہاتھ منہ بھی' ابھی وضو کیا تھا میں نے۔ آپ چلیں میں آتی ہوں۔"

"نہیں' میرے ساتھ چلو ورنہ۔" اماں کہتے کہتے چپ ہو گئیں "سوچ سوچ کر اپنی جان کو ہی روگ لگا لیا ہے۔"

ابھی ہم باتیں کر رہے تھے کہ مرتضیٰ کی امی اٹھ کر آ گئیں۔

"بچی کو کیوں ڈانٹ رہی ہو سعیدہ!"

"نہیں نہیں ڈانٹ تو نہیں رہی ہوں۔" اماں گھبرائیں۔

"اور کیا... اتنے پیارے بچوں کو ڈانٹ کون سکتا ہے۔ ماشاءاللہ سعیدہ! تمہاری دونوں بیٹیاں بڑی خوب صورت ہیں۔"

"ارے! تم نے تو ابھی صرف اریج کو ہی دیکھا ہے۔" اماں نے بے خیالی میں کہا۔

"ارے نہیں اریزہ کو بھی دیکھا ہے۔ وہ تو اتنی مشہور ہو گئی ہے کہ ہر چینل سے اس کا ڈرامہ آ رہا ہوتا ہے۔ میں نے تو سب کو بتایا ہے کہ یہ ہمارے رشتے دار ہیں۔" آنٹی نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

"آنٹی! یہ بھی بتا دیتیں کہ بہت دور کے رشتے دار ہیں۔ جن سے رشتے داری نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"لو' دماغ خراب ہے میرا۔" انہوں نے گویا برا مان کر کہا۔

"خیر چھوڑو' میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گئی۔ لیکن سعیدہ! سنا ہے ٹی وی والے تو بڑا پیسہ دیتے ہیں مگر تمہارے گھر کے حالات تو زیادہ بدلے ہوئے نہیں لگ رہے۔"

"جی' مگر ہم لوگ بہت بدل گئے ہیں آنٹی!" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا۔" انہوں نے ناسمجھی سے کہا۔ "حالانکہ تم لوگوں کا رہن سہن تو ابھی تک مجھے ویسا ہی لگا ہے' جیسا پہلے تھا۔"

"آنٹی! آپ کو اس بات پر افسوس ہو رہا ہے؟"

اماں کبھی میری شکل دیکھتیں' کبھی مرتضیٰ کی امی جان کی۔ میری بھولی بھالی ماں کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ گفتگو کس رخ پر جا رہی ہے۔ ان کے لیے اریزہ کا یہ تعارف بھی بہت تکلیف دہ تھا۔

پرانی روایتوں اور اقدار کو سینے سے لگائے ہوئے پرانے اور خوب صورت لوگ۔

"چلو آؤ۔ تم بھی کون سے قصے لے کر بیٹھ گئیں۔" اماں نے ان کا ہاتھ تھاما۔

"اریج! کھانا نکال دو۔"

رات کے دس بجے باہر گاڑی کا ہارن بجا۔ اریزہ واپس آ گئی تھی۔ آج شاید اس کی شوٹنگ جلدی ختم ہو گئی تھی ورنہ وہ بارہ' ایک بجے تک آتی تھی' اماں کی تسبیح اسی وقت ختم ہوتی تھی۔

مجھے اماں کی محبت بڑی اچھی لگتی تھی شاید ساری دنیا کی ماؤں کی محبت اسی طرح ہوتی ہے۔

گاڑی کی آواز سنتے ہی آنٹی فوراً" متوجہ ہوئیں۔

"شاید اریزہ آ گئی ہے۔"

ان کے لہجے میں اتنی شیرینی تھی کہ مجھے الجھن ہونے لگی۔ "اتنی محبت کس لیے۔" میرا ذہن الجھ گیا۔ مرتضیٰ بھی نہیں تھا ورنہ اسی سے پوچھ لیتی کہ ان کو ہر ایک سے ہی اتنی محبت ہو جاتی ہے یا اریزہ میں کوئی خاص بات ہے؟ لیکن مرتضیٰ کام کے سلسلے میں سنگاپور گیا ہوا تھا۔

اریزہ اندر آئی تو آنٹی نے فوراً" اسے دبوچ لیا۔

"کتنی پیاری ہے میری بیٹی۔"

"جی! آپ کون؟" اس نے تنک مزاجی سے کہا۔

"بیٹا! میں مرتضیٰ کی امی ہوں۔ اتنی جلدی بھول گئیں۔" انہوں نے اس طرح شکوہ کیا جیسے ان کی اور اریزہ کی بہت ملاقاتیں رہی ہوں۔

"اچھا' اچھا۔" اس نے سر جھٹکا "السلام علیکم!" وہ کہتی ہوئی اندر چلی گئی۔

"ان سے صحیح سے مل تو لیتیں۔ وہ کب سے انتظار کر رہی تھیں۔"

"تو میں کیا کروں۔ مجھے نہیں پسند ایسے لوگوں سے ملنا۔"

"مجھے تو کوئی برائی نظر نہیں آتی۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"جھوٹی محبت کے مظاہرے۔ ہونہہ...!" اس نے سر جھٹکا۔

"دنیا سے اتنی بدگمان رہو گی تو دنیا جینے نہیں دے گی۔"

"مجھے خود سے جینا آ گیا ہے۔" اس کے انداز میں دوبارہ نخوت عود کر آئی پھر اماں سے کہنے لگی "مجھے ان کے سامنے دوبارہ نہیں بلایئے گا' میں اوپر جا رہی ہوں۔"

وہ پیر پٹختی ہوئی سیڑھیاں چڑھ گئی۔
وہ پہلے بھی منہ پھٹ تھی۔ لیکن اب تو اس کے منہ پھٹ ہونے میں جیسے چار چاند لگ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

آج جلدی گھر جانا تھا۔ اماں نے کہا تھا مرتضیٰ واپس آگیا ہے اور آنٹی بھی آئیں گی تو دو چار اچھی سی ڈشز بنا لینا۔ "اماں شاید اریزہ کے رویے کی تلافی کرنا چاہ رہی ہوں" میں نے یونہی سوچا۔

گھر جا کر کام کرتے کرتے مجھے پانچ بج گئے۔ اماں جس وقت کچن میں آئیں' بریانی دم پر تھی۔

"جاؤ اب نہا دھو کر کوئی اچھا سا سوٹ پہن لو۔"

"کیوں؟" میں چڑ گئی۔ "اماں! میں دیکھ رہی ہوں جب سے آنٹی آئی ہیں' آپ ہر وقت مجھے تیار رہنے کا حکم دیتی رہتی ہیں۔ آخر کس لیے؟"

اماں کی مسکراہٹ مبہم تھی مگر مجھے ایک منٹ میں سمجھ میں آگیا۔

مجھے تو بات سمجھ میں آگئی تھی مگر نہ جانے کیوں اماں کی سمجھ میں نہ آتی تھی کہ ہمارے گھر کے حالات نہیں بدلے تھے۔ صرف اریزہ کے حالات بدلے تھے۔

چلیے اماں! آپ کی کوئی تمنا ادھوری نہ رہ جائے۔ یہ کام بھی سہی۔ میں ان کے کہنے کے مطابق ہلکا پھلکا سا تیار بھی ہو گئی۔

"اماں! آپ بھی کیا یاد کریں گی۔ آپ کی ایک بیٹی تو فرمانبردار ہے۔ بے شک اسے آنے والے حالات کا علم ہے اور آنٹی کی نیت کا بھی۔

مرتضیٰ بہت اچھا تھا اور زندگی کے بارے میں میرے خواب بھی کوئی بہت اونچے نہیں تھے۔ لیکن جو لوگ آتے تھے ان کے خواب ان کی آنکھوں سے جھانکتے تھے اور ہونٹوں پہ بولتے تھے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ مرتضیٰ کے دل میں کیا ہے۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر میری تعریف رہتی تھی۔

"تمہارے جیسی خوب صورت سوچ۔"

"تمہارے جیسی سلیقہ مند لڑکی۔"

"تمہارے جیسی رحم دل لڑکی۔"

کتنی مرتبہ اس نے کہا تھا کہ ایک لڑکی میں جو خصوصیات ہونی چاہئیں وہ سب تم میں موجود ہیں لیکن..... تعریف اور تقدیر میں بہت فرق ہوتا ہے۔

میں ان ہی سوچوں میں گم تھی کہ اسی وقت مرتضیٰ کا فون آگیا۔ "کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ تم کچھ نہ کر رہی ہو اچھی لڑکی!" اسے میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی یقین تھا۔

"واقعی میں کچھ نہیں کر رہی تھی۔" مجھے جھوٹ بولنا پڑا' کیونکہ میں اسے بتا نہیں سکتی تھی کہ میری ماں نے مجھے تیار ہونے کا کہا ہے۔

"چلو بھئی ہم نے یقین کر لیا..... اور سب لوگ کیا کر رہے ہیں؟"

"وہ سب لوگ وہی کر رہے ہیں' جو تم نے انہیں ہمیشہ کرتے دیکھا ہے۔" میں نے ہنستے ہوئے بات نبھائی۔

"لگتا ہے آج کسی بھی سوال کا جواب صحیح نہیں ملے گا..... آج کوئی خاص دن ہے کیا؟"

"خاص دن کیا ہوتے ہیں مرتضیٰ! سورج بھی ہر روز نکلتا ہے۔ چاند بھی روز چمکتا ہے۔ دنیا کے سارے وہی کام روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔"

"آج تم فلسفہ بولنے کے موڈ میں نظر آ رہی ہو۔" وہ ہنسا۔

"شاید۔" میرے لہجے میں نہ چاہتے ہوئے بھی تلخی آگئی۔ ایک لمحے کو وہ چپ سا ہو گیا۔

"آج ہوا کیا ہے؟" اب وہ کچھ پریشان تھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے گہری سانس لی اور فون رکھ دیا۔

باہر شام آہستہ آہستہ ڈھل رہی تھی۔ کناروں پر پھیلی سرخ شفق کو شام کے سائے تیزی سے خود میں سمیٹ رہے تھے..... یا اللہ ہر چیز فنا ہو جاتی ہے' پھر بھی

انسان کو کتنی چیزیں اور کتنی دولت چاہیے ہوتی ہے' صرف ایک زندگی گزارنے کے لیے۔

میں نے پلکیں جھپک کر آنسوؤں کو اندر اتارا۔ آج ہی تو کاجل لگایا تھا۔ اس تیاری کو کم از کم تھوڑی دیر تو رہنا ہی چاہیے تھا۔

مجھے آنٹی سے بہت ڈر لگ رہا تھا اور ایک عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی جسے دل نے کوئی نام دینا نہیں چاہا۔ کیا مرتضیٰ اور آنٹی میں جھگڑا ہو گا۔ اب یہ بات تو ان کے آنے پر ہی پتا چل سکتی تھی۔

وہ لوگ رات کے نو بجے آئے۔ ان کے ساتھ مٹھائی اور فروٹ کے ٹوکرے تھے۔ اماں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ میں اماں کے خوشی سے جگمگاتے ہوئے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ مجھے ان کا ہنستا ہوا چہرہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"ماشاء اللہ سعیدہ! تمہاری دونوں ہی بیٹیاں بہت اچھی ہیں' لیکن ہمیں اریزہ زیادہ اچھی لگی۔"

اماں کا چہرہ ایک دم تاریک ہو گیا۔ وہ میرے لیے آس لگائے بیٹھی تھیں۔ اریزہ کا انہیں پتا تھا کہ اس نے ویسے ہی انہیں منہ نہیں لگایا تو رشتے کے لیے کہاں سے ہاں کر دے گی۔ یوں بھی وہ اب جس راہ کی مسافت طے کر رہی تھی۔ وہاں دور دور تک شادی کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔

میں نے ایک نظر مرتضیٰ کے چہرے پر ڈالی۔ شاید دل نے اب بھی کوئی امید کا سرا بچا کر رکھا تھا کہ شاید یہ سب کچھ غلط ہو' جو میرے کانوں نے سنا..... شاید مرتضیٰ کے چہرے پر کوئی اور تحریر ہو.....

لیکن وہاں کوئی خلاف معمول تاثر نہیں تھا۔ جو کچھ بھی تھا' وہ رضامندی سے تھا۔ جس آگ نے مجھے جلا کر راکھ کر دیا تھا' اس کا ہلکا سا عکس بھی اس چہرے پر نہیں تھا۔

اب سارے منظر تاریک تھے' نہ کہیں رنگ تھے' نہ کہیں روشنی مختصر تھی بس دولت اور شہرت کی چمک دمک' درد کی بازگشت "آپ بہت اچھی ہیں۔

آپ جیسا کوئی دوسرا مشکل سے ہی ہو گا۔

آپ جیسی لڑکیاں ....

میرے دماغ پر وہ الفاظ ہتھوڑے کی طرح برسنے لگے۔

ٹھکرائے جانے کا احساس مجھے پاتال میں لے گیا۔ میرا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا اور نظریں جھک گئیں۔ خفت اور شرمندگی کے مارے میرا وہاں مزید بیٹھے رہنا مشکل ہو گیا۔ میں ایک جھٹکے سے اٹھی اور ڈرائنگ روم سے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔ ابھی میں دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ مرتضیٰ کی بھاری آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔ میرے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ اپنی ماں سے مخاطب تھا۔

"میں نے زندگی بھر آپ کے تمام فیصلوں کا احترام کیا ہے' امی! مگر مجھے آپ کے اس فیصلے سے اتفاق نہیں۔ مجھے شادی کے لیے ایک ایسی لڑکی چاہیے جو میرا گھر آباد کرے..... نہ کہ اسٹوڈیو — میں جرمنی میں ہی شادی کر چکا ہوتا مگر..... مجھے ایک سلیقہ شعار لڑکی سے شادی کرنا ہے۔ جو میرا گھر بسانے کے ساتھ ساتھ میرے بچوں کی بہترین تربیت کرنے کے بھی قابل ہو۔" وہ ایک لمحے کو رکا۔

"مجھے اریج جیسی لڑکیاں پسند ہیں' کیونکہ اریج میں وہ تمام خوبیاں ہیں جو میں اپنی بیوی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اریج سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

میرے چاروں طرف جیسے پھول ہی پھول کھل اٹھے تھے۔ میں نے قدم دوبارہ باہر کی طرف بڑھا دیے مگر اس مرتبہ میرے قدموں سے شرمندگی نہیں بلکہ ایک فخر کا احساس لپٹا ہوا تھا۔

فائزہ افتخار

مکمل ناول

لاہور کے علاقے رنگ محل میں مقیم اس گھرانے کی بودوباش آج بھی ستر کی دہائی کے حصار میں ہے۔ زمانے کے بدلتے رواجوں نے ان پر کوئی اثرات مرتب نہیں کیے۔ دادا' دادی' تایا تائی' چاچا چاچی اور ان کی اولادوں کی بھی اولادوں پر مشتمل یہ گھرانہ مشترکہ خاندانی نظام کے تحت مل جل کر رہتا ہے۔
تایا اشرف کی اعظم کلاتھ مارکیٹ میں کپڑے کی جبکہ سہیل چاچا کی مال روڈ پر پرانی مشینوں کی دکان ہے۔
تایا اشرف کے دو بیٹے اکمل اور اجمل شادی شدہ ہیں۔ روبینہ' اکمل کی اور مسرت' اجمل کی بیوی ہے۔ تایا کی اکلوتی بیٹی ارم غیر شادی شدہ ہے۔
سہیل چاچا کی تین بیٹیاں شادی شدہ ہیں۔ جبکہ ان کے اکلوتے بیٹے ندیم اور ایک بیٹی فریحہ کی شادی نہیں ہوئی ہے۔
تایا اشرف اور سہیل چاچا سے چھوٹا سرفراز ہے۔ سرفراز کافی عرصے سے جرمنی میں مقیم ہے۔ اس نے وہاں شادی کرلی ہے۔ وہ کافی عرصے بعد پاکستان آرہا ہے۔
ندیم اور ارم کو توقع ہے کہ سرفراز چاچا اپنے بیٹے اور بیٹی کی شادی ان سے کردیں گے۔

۲
دوسری قسط

"گل ایہہ اے کڑیو... کہ یہ ویلا تھا انیس سو اٹھہتر کا۔" دادی نے ہنکارا بھرتے ہوئے کہا۔

"ہائے اللہ' یہ کہانی سننے میں تو بڑا مزا آئے گا۔" روبینہ نے دونوں ہتھیلیاں اشتیاق سے مسلتے ہوئے کہا۔

"مجھے وہ کہانیاں بڑی اچھی لگتی ہیں جو میرے پیدا ہونے سے پہلے کی ہوں۔"

اس بیان پہ مسرت نے اسے زہریلی نظروں سے گھورا۔

"دادی انیس سو اٹھہتر کی بات کر رہی ہیں' انیس سو اٹھارہ کی نہیں' ہونہہ... پیدا ہونے سے پہلے کی' چھنی کاکی۔"

مسرت کے کہنے کی دیر تھی' روبینہ نے آستینوں کے کف پلٹے۔ آدھی آستینوں کے فیشن میں بھی اس نے کبھی پوری آستین نہیں چھوڑی تھیں کہ لڑائی شروع کرنے سے پہلے کا سگنل رہ جاتا تھا پھر۔

"ہاں... ہوں میں چھنی کاکی' تھرڈی کلاس میں تھی جب سلمان خان کی فلم "میں نے پیار کیا" دیکھی تھی وی سی آر پہ۔"

اس بیان پہ ارم کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سلمان خان کی فلم پہلی بار اس نے تب دیکھی تھی جب وہ آٹھویں میں تھی... اور اس کی بھابھی' تین بچوں کی ماں' اس سے بھی چھوٹی بن رہی تھی۔

"آہو... میں نے تو رتک روشن کی پہلی فلم چھلّے میں دیکھی تھی۔"

مسرت بھی آج فل موڈ میں تھی' ورنہ روبینہ کے منہ لگنے سے وہ دیوار سے سر پھوڑنا بہتر سمجھتی تھی۔

"اوہو بھابھی' آپ لوگ کیوں بھول رہی ہیں کہ ہم یہاں کس وجہ سے اکٹھے ہوئے ہیں۔" فریحہ نے ان سب کو یاد دلایا۔

"اور کیا' آئے دادی کے لیے ہیں اور آپ سب کو اپنی پڑ گئی ہے' پہلے دادی کی تو سن لو۔"

ارم کے کہنے پہ دادی نے ٹانگیں پساریں۔

"ہور کی ... تی مسرت... تو یہ والی لت دبا... تے روبینہ تو یہ والی لت دبا' ارم تیرے میں بڑی جان ہے تو پچھے کھلو اور میرے مونڈے گھٹ۔"

دادی نے موقع سے فائدہ اٹھا کے سب کو اپنا کوئی نہ کوئی عضو دبانے کی سعادت بخشی اور ساتھ ساتھ داستان شروع کی۔

انیس سو اٹھہتر کا رنگین ماحول۔

رشی کپور اور ڈمپل کپاڈیہ کی بوبی۔

ہم تم ایک کمرے میں بند ہوں' اور چابی کھو جائے۔

زینت امان کی قربانی۔

آپ جیسا کوئی میری زندگی میں آئے۔

خالدہ ریاست' طلعت حسین اور شکیل کی جوانی کے بلیک اینڈ وائٹ ڈرامے۔

مالا بیگم اور رونا لیلیٰ کے گانے۔

فلیپر' اونچے جوڑے' بڑے بڑے چشمے۔

کشور کمار اور آر ڈی برمن کا عروج۔

چنگاری کوئی بھڑکے تو ساون اسے بجھائے۔

اور بیبی لہری کی آمد آمد۔

آئی ایم اے ڈسکو ڈانسر... ہو ہو ہو ہو۔

☼ ☼ ☼

وہ ہی گھر تھا' وہ ہی رنگ محل کے علاقے سنہری مسجد کی تنگ و تاریک گلی' بس تب گلی میں ایسی گندی بو نہیں چکراتی پھرتی تھی' نہ ہی اوپر سے بجلی کی تاریں اتنی بڑی تعداد میں نیچے جھول رہی ہوتی تھیں' نہ ہر گھر کے باہر دو' دو موٹر سائیکلیں کھڑی ہوتی تھیں۔ اِکا دُکا گھر کے آگے سائیکل ہوتی تھی۔

بیشتر گھروں کے سامنے کھلے صحن تھے۔ اب کی طرح نہیں کہ گلی کے منہ پہ کمرے آرہے ہوں' وہ تو بعد میں جیسے جیسے مکینوں نے آبادی بڑھائی' آنگنوں میں کمرے ڈالتے گئے' کھلی چھتوں پہ کابکیں بنا کے کرائے پہ چڑھاتے گئے۔ یہ ہی وجہ ہے کہ اس زمانے میں یہ گلی نسبتاً" کافی روشن اور ہوادار تھی۔ ہر دوسرے آنگن میں لگے دھریک' چنار اور آم کے چھتنار درختوں کی بہار تھی۔ تب والز والے نہیں' پھیری والے زیادہ گزرا کرتے تھے۔

لڈو پیٹھے والے' بڑے' کرارے۔

لچھا' مائی دا لچھا۔

کبھی کبھی یہ سریلی آوازیں آتیں تو کبھی جمعرات والے ملنگ رعب دار آوازوں میں پکارتے۔

"پیر سائیں آندا اے' تے مِٹھے چول کھاندا اے۔"

اور بیبیاں ذرا سا دروازہ کھول کے آٹے سے بھری پلیٹ باہر نکالتیں جن پہ ایک دیسی انڈا اور بارہ آنے پڑے ہوتے۔ یہ بارہ آنے ہفتے بھر کے صدقے خیرات کے لیے کافی ہوتے تھے۔ اب ذرا کسی مانگنے والے کو بارہ روپے بھی دے کے دیکھو' وہ برے منہ بناتے ہیں' کہ دینے والا بھی شرمندہ ہو جائے' اب تو سمن آباد سے اقبال ٹاؤن تک... یا فیصل ٹاؤن سے ماڈل ٹاؤن تک نکلو تو سارے راستے میں جتنے بھی سگنل آئیں' کم از کم دو درجن مانگنے والے تو ضرور بھگانے پڑتے ہیں۔ اور گھر کی گھنٹی بھی ساری دوپہر میں دس بارہ دفعہ ضرور بجاتے ہیں۔

اس وقت کے فقیر بھی قناعت پسند تھے یا شاید محنت سے جی چراتے تھے۔ ست کہیں کے' کام چور' بس جمعے کے جمعے نکلتے تھے۔

یہ دیکھو' لکڑی کے کواڑ' سبز قلعی والے' اوپر بھاری کنڈے' ذرا سا ہلا کے چھوڑو تو پچھلے کوٹھڑے تک کھٹک جائے۔

سن سن بھابھی ڈھول بیبا وجدا۔

نی ڈھول نہ وجے تے' میلہ ذرا نیئوں سجدا۔

یہ نکڑ والے دودھ دہی کے کھوکھے پہ لگا ریڈیو بج رہا ہے۔ اب یہاں ایزی لوڈ والا اسٹال ہے۔ اس سے چار سال پہلے پی سی او تھا' مگر اس زمانے میں دودھ دہی کا یہ اسٹال خوب رش لیتا تھا۔ یہ موٹی ملائی آتی تھی۔ سویرے دودھ جلیبی اور لسی پوری کا ناشتا کرنے پورا محلہ آتا تھا۔ شام کو ہر گھر کا بچہ اسٹیل کا ڈول لیے دودھ لینے آتا اور گھر کے گلک سے چرا کے لائے "دسو" سے ایک کھوئے والا پیڑا ضرور لیتا۔

اور یہ تیسرے نمبر پہ جو ادھ کھلا کواڑ ہے' وہ ہے تاؤ اشرف اور چاچا سہیل کے گھر کا۔ جس کے ایک کمرے میں اس وقت دادی ماضی کے ورق پلٹ رہی تھیں۔ ماضی کے اس دریچے سے دیکھو تو تب یہ کمرہ سفید قلعی سے لِپاچم چم کر رہا تھا۔ اب جہاں دادی بیٹھی تھیں وہ والی دیوار تو ساری کی ساری مسرت کی لڑکیوں اور حلیمہ کے لڑکوں کی خطاطی کے نمونوں سے بھری تھی۔ جس دیوار کے ساتھ روبینہ نے ٹیک لگا رکھی تھی اس سے ساری قلعی جھڑ چکی تھی۔ جگہ جگہ سے پلستر اکھڑا ہوا تھا اور روبینہ کی کریپ کی میرون قمیص ساری سفیدی سے بھر چکی تھی

فریج کے سامنے جو لکڑی کا دروازہ تھا اس پہ سالوں سے لکھے جاتے فون نمبرز تھے۔ البتہ تب نئی نئی قلعی کرائی تھی دادا جان نے۔ جو تب زیادہ تر اباجی کہلاتے تھے۔ رنگ تب بھی سیاہ تھا۔ مگر سیاہی میں اتنی سلوٹیں نہیں تھیں۔

مزاج اتنا زیادہ سڑا ہوا نہیں تھا۔ قد کچھ انچ لمبا لگتا تھا۔ نہیں... اب گھس نہیں گئے۔ ذرا سا کب نکال کے چلتے ہیں نا۔ تب تہبند صرف رات سونے کے لیے پہنا کرتے تھے۔ اب کی طرح دن رات نہیں۔ کام پہ جاتے ہوئے ملیشیا کے سوٹ پہنا کرتے جو دادی اپنے محنت کش ہاتھوں سے کوئلوں کی استری سے خوب دبا دبا کے استری کیا کرتیں۔

بڑے ٹھکیے تھے دادی کے تب۔ دو' دو بہویں آچکی تھیں۔ اشرف کی دلہن اور سہیل کی دلہن' سہیل کی بیوی کم عمر تھی مگر سمجھ دار تھی۔ تھوڑا بہت پڑھی لکھی بھی تھی۔ البتہ مذہبی بہت تھی۔ نماز' روزہ' نعتیں' مگر تب ان سب پہ ضرورت سے زیادہ عمل کرنے کو ڈھکوسلا سمجھا جاتا تھا۔

سہیل کی بیوی راشدہ (موجودہ چاچی جی) کو بھی سب برادری کی نماز چور دلہنیں ڈرامے باز کہتی تھیں' جس نے ہر وقت نماز والی چادر کی ٹکل ماری ہوئی ہوتی تھی۔ وہ سب بھی پردہ کرتی تھیں۔ فٹنگ والے ریشمی

برقعے۔ جن کے بٹن بند کرنے کے بعد سراپا بالکل آشا پاریکھ جیسا لگنے لگتا۔ گلی کا موڑ مڑتے ہی نقاب کا ڈھکن بھی اٹھ جاتا۔

راشدہ کے ہاں حلیمہ' سلیمہ اور بڑی والی کوثر کے ہاں اجمل' اکمل دونوں کا نزول ہو چکا تھا۔ کوثر کے ہاں ارم کی آمد آمد تھی' جبکہ راشدہ کے ہاں فی الحال فریحہ کے آثار دور' دور تک نہ تھے اور ندیم گود میں تھا۔

اجمل' اکمل کے وہ ہی مزاج تب بھی تھے' اکمل گلیوں میں ـــــ کھیلنے کا شوقین' اسکول سے بھاگنے کا عادی' فیل ہونے کا چیمپئن' اتنا ہی بے دید اور بدلحاظ' اجمل البتہ تب ایسا دینی بچہ نہ تھا۔ بلکہ جب گھر میں ٹی وی نہیں تھا تو چھپ کے ہمسایوں کے گھر ٹی وی دیکھنے جایا کرتا تھا۔

اتوار کے اتوار دوردرشن سے رامائن تک دیکھنے کا چسکا تھا اسے۔ حلیمہ' سلیمہ قد نکال رہی تھیں اور راشدہ ابھی سے ان کے لیے رضائیاں' گدے بنوا بنوا کے جست کی پیٹی میں پھینک رہی تھی' ندیم بچپن سے ہی رونے دھونے والا تھا۔ حلیمہ' سلیمہ میں لڑکپن سے ہی اپکا تھا۔

سرفراز کو ولایت گئے ڈھائی سال ہو گئے تھے۔ پچھلے سال گھر میں ٹی وی بھی آ گیا تھا۔ فون سننے کے لیے البتہ ابھی تک ڈاک خانے جانا پڑتا تھا۔ سرفراز نے پچھلے سال ہی جوڈی سے شادی کی تھی۔ کہتا تو یہ ہی تھا کہ اسے کلمہ پڑھا کے اب اسے جوڈی سے جمیلہ کر لیا ہے۔ مگر دادی سمیت کسی کو یقین نہیں تھا۔

"بھلا چوڑیاں بھی کبھی لین پہ آتی ہیں۔"

دادی کو اپنی نسل خراب ہونے کا بڑا قلق تھا۔

"ہائے سرفراز کے ابا' اب ہمارے پوتے پوترے بھی بو مارے ہوں گے جیسے چوڑے ہوتے ہیں۔"

"انگریزوں کے چوڑے بو والے نہیں ہوتے۔"

دادا جی نے اپنی منطق جھاڑی۔

"نہ جی۔۔۔ چوڑا چوڑا ہی ہوتا ہے یا ویں عطر میں ڈبکی لگا کے آئے' اس کی چھان ہی بڑی ہوتی ہے اور انگریز تو نہاتے بھی نہیں ہوں گے۔ ادھر ٹھنڈ جو اتنی ہوتی ہے اور میموں کے تو سنا ہے جوئیں ہی بڑی ہوتی ہیں۔ جوؤں نے ہی خون چوس چوس کے ان کے بال پھیکے رنگ کے کر دیے ہوتے ہیں۔"

ویسے تو سرفراز شروع سے دادی کا سب سے چہیتا بیٹا تھا۔ آخر کالج تک گیا تھا۔ کیا ہوا جو کالج سے ڈگری لیے بغیر ہی نکل آیا۔ اب کون سی ڈگری چار مہینے میں ملتی ہے' مگر گیا تو تھا نا کالج' جو اس بات کا پکا ثبوت تھا کہ اس نے میٹرک کسی نہ کسی طرح پاس کر لیا تھا۔

اوپر سے وہ سہیل اور اشرف کی نسبت ذرا قبول صورت بھی تھا۔ گورا' چوڑا ماتھا' کھلی کھلی آنکھیں' ناسیں ذرا زیادہ پھیلی ہوئی اور ہونٹ تھوڑے باہر کو لٹکے ہوئے تھے۔ مگر کیا ہوا' گورا رنگ اور کھلی آنکھیں سب عیب ڈھک لیتی ہیں۔

تیسری وجہ جو سرفراز کو دوسرے بھائیوں سے ممتاز کرتی تھی وہ یہ کہ وہ ماں' باپ کا چاپلوس بڑا تھا۔ سہیل فطرتاً" لاابالی اور اشرف چڑچڑا تھا۔ سرفراز کو عادت تھی ماں کی منجی پہ چڑھ کے ان کے تکیے پہ سر رکھ کے بھابھیوں کی چغلیاں کرنے کی۔

باپ کے سر پہ کلا کولا لگاتے ہوئے اللہ معاف کرے اس کے حسن و جوانی کی تعریفیں کرنے کی۔ اس لیے ماں' باپ دونوں اس سے زیادہ خوش تھے بہ نسبت اشرف اور سہیل کے اور اشرف اور سہیل دونوں کو اس کا جلاپا بھی بہت تھا۔

اسی لاڈ پیار کی وجہ سے اِدھر سرفراز کے منہ سے ولایت جانے کی فرمائش نکلی' اُدھر دادا' دادی نے سب جمع جتھا نکال کے دوسرے لڑکوں کے واویلا کرنے کے باوجود اسے روانہ کر دیا' مگر جیسے ہی اس نے جوڈی سے شادی کی۔ اس سے سب سے چہیتے بیٹے کا اسٹیٹس چھن گیا۔ اب ماں' باپ کو اس سے بے پناہ گلے تھے۔ اٹھتے بیٹھتے رونے روئے جاتے' اس کی طوطا چشمی اور بے دید ہونے کے۔

اشرف نے تو خیر ساری عمر یہ چالاکیاں نہ سیکھیں۔ البتہ سہیل نے موقع غنیمت جان کے ماں' باپ کی زندگی میں لاڈلے بیٹے کا خانہ خالی دیکھ کے اسے بھرنے کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہا۔ کسی حد تک اس لیے کہ جب جب ولایت سے سرفراز کے منی آرڈر آتے اس کی شبیہہ پھیکی پڑ جاتی اور کچھ دن تک گھر میں پھر سے سرفراز' سرفراز ہونے لگتا۔

آج کل پھر سے یہ نام گونج رہا تھا' گھر کی فضاؤں میں' کیونکہ سرفراز اپنی بیوی جوڈی' یعنی جمیلہ کو لے کر پاکستان آ رہا تھا۔ اپنے آنے سے پہلے اس نے ایک بھاری رقم بھجوا دی تھی۔ ایک لمبی فہرست اور تاکید کے ساتھ۔

نمبر ایک' گھر کا جو جو سوئچ کرنٹ مارتا ہے اسے فی الفور مرمت کرایا جائے۔

نمبر دو' غسل خانے کے دروازے کی چٹخنی لگائی جائے۔

نمبر تین' باورچی خانے میں گیس کے چولہے کے اوپر جو کپڑے سکھانے والی تار ہے' اسے فوراً" اتارا جائے' تاکہ بھابھیاں اپنے بچوں کے لنگوٹ جلدی سکھانے کے لیے وہاں نہ لٹکائیں۔

نمبر چار' کال بیل لگائی جائے' تاکہ ہر دو منٹ بعد کنڈا کھڑکانے کی مکروہ آواز کانوں میں رس نہ گھولے۔

نمبر پانچ' اوپر والی منزل پہ ایک عدد کمرہ بنوایا جائے' تاکہ سرفراز اور اس کی بیوی کو مکمل پرائیویسی مہیا کی جا سکے۔

(اس والی ہدایت پہ دادی نے ایک ایک بندے سے پرائیویسی کا مطلب پوچھا تھا۔ کوئی بھی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ اور جب کسی شامت کے مارے نے دے دیا تو دادی نے چپل اتار لی۔ بیڑہ غرق جلائے' کھوہ میں جائے پرائیویسی' شرم دا گھاٹا۔ اپنے منہ سے مانگ رہا ہے' ہائے۔)

نمبر چھ' بھابھیوں سے کہا جائے اپنے بچوں کو کنٹرول میں رکھیں۔

نمبر سات' اور آپ سے تاکید ہے آپ اپنے بچے یعنی سہیل کو کنٹرول میں رکھیں۔ خاص طور پہ اس کی زبان کو۔

نمبر آٹھ' چھوٹی بھابھی سے کہا جائے کہ جمیلہ کو الرجی ہے اس لیے اگربتیاں جلانے سے پرہیز کریں۔

(اس پہ دادی نے پھر سے نکتہ اٹھایا' اے الرجی کی بلا اے؟ اس وقت یہ لفظ اتنا زبان زد عام نہ تھا۔ اب تو خیر فقیر فقراء بھی مزے سے کہہ دیتے ہیں۔ ہمیں فلاں چیز سے الرجی ہے۔)

نمبر نو' مونگرے' گونگلو' چونگاں وغیرہ کم از کم دو مہینے نہ پکائے جائیں اور ہاں وہ جو سردیوں میں اماں مولیاں پالک خشک کر کے رکھتی ہیں گرمیوں میں پکا کے ناک جلانے کے لیے' وہ وہ مرتبان تو ہرگز نہ کھولا جائے۔

نمبر دس' اوٹ پٹانگ رشتے داروں کا داخلہ اس تمام عرصے میں سختی سے بند کیا جائے۔ خصوصاً" زینب پھوپھی (کیونکہ اس کی کرائے دار کے ساتھ سرفراز کا عشق چلتا رہا تھا۔) اور چاچا عابد (جس کے ڈھائی سو روپے سرفراز نے نوسربازی کر کے ہتھیا لیے تھے' جانے سے پہلے۔)

نمبر گیارہ' حلیمہ' سلیمہ کے سر کے جوئیں ختم کی جائیں۔

نمبر بارہ' ابا جی کی گیس کے عارضے کا علاج کرایا جائے۔ ان کو جوڈی کے ہوتے ہوئے قطعاً" کوئی بادی چیز کھانے کو نہ دی جائے' ورنہ وہ بے چاری دوسرے دن ہی گھبرا کے بھاگ جائے گی۔

(اس ہدایت پہ ابا جی کی گیس دماغ کو چڑھ گئی۔ وہ وہ مغلظات ابلنے لگیں کہ۔۔۔ کیونکہ گوبھی' مولی' آلو' بڑا گوشت ان کو بے حد مرغوب تھے۔ کیا تھا جو یہ کھانے کے بعد گیس کے گولے ان کے پیٹ میں گھومتے رات بھر سونے نہ دیتے تھے۔)

اس ہدایت کے بعد اگلی چار پڑھنے کی نوبت نہ آ سکی۔ کیونکہ ابا جی' یعنی موجودہ دادا جی نے فہرست ہی پھاڑ دی تھی۔

"الو کا پٹھا' اوقات بھول گیا اے' وڈا آیا ملکہ الزبتھ دا کھسم' نہیں پسند یہ جگہ تو نہ آئے' دفع ہو ادھر' نہ لائے اپنی لاڈوں پٹی کو۔"

یوں اس ہدایت نامے کی وجہ سے سب نے بڑے

ہی بڑے دل سے سرفراز اور اس کی میم (بیوی) کا مرے مرے دل سے استقبال کیا۔ اور کرنا تو تھا ہی، میم جوڈی زہر دینے جوگی تھی، مگر سرفراز تو بیٹا تھا۔ وہ بھی ولایت پلٹ بیٹا۔

کوثر تو پورے دنوں سے تھی اور راشدہ کے پاس چند مہینے کے ندیم کا عذر تھا، ورنہ دادی کا تو بس نہ چل رہا تھا کہ اوپر کی منزل پہ سرفراز اور اس کی بیوی کے لیے جو کمرہ ڈالا جارہا ہے وہ بھی راج مزدوروں کے بجائے اپنی ان دو بہوؤں سے بنوالیں۔ ہاں بعد میں قلعی انہوں نے خود بہوؤں کے ساتھ مل کے کی تھی۔ چھوٹی موٹی بچتوں کے لیے تب دادی اکثر ایسے ایسے کام کر گزرتی تھیں۔

منجی بُن لینا، پیڑھی ٹھونک لینا۔ دروازوں اور دیواروں پہ عید کے عید سفیدی گھول کے قلعی کر لینا۔ پتیل کے بڑے بڑے دیگچوں اور سینیوں پہ لیموں اور سرکہ مل کے چم چم کر لینا۔

سرفراز کی آمد پہ وہ سب تیاریاں ہوئیں جو عید کی آمد سے پہلے ہوتی ہیں۔ ہر کمرے کی دو چھتی پہ پڑے ساس اور دونوں بہوؤں کے جہیز کے برتن جو سارا سال مٹی دھول خود پہ جماتے رہتے۔ اتار کے رگڑے اور مانجھے گئے۔ لنڈے سے لائے پردے دھو کے استری کرکے دوبارہ ڈوری سے باندھے گئے۔ اسٹیل کے گلاس گھر والوں کے لیے مخصوص کرکے شیشے کے گلاس نکالے گئے۔ تب سارا گھر سویرے سویرے تام چینی کے بڑے منہ والے پیالوں میں چائے ڈال کے اندر باقر خانیاں بھگو بھگو کے کھاتا تھا ناشتے میں۔ اب چینی کے کپ پرچیں نکالی گئیں۔ نئے تولیے، خوشبو دار صابن، ساٹن کی بستر کی چادر، تکیے نئی روئی سے بھروائے گئے اور ایسے دبا کے بھروائے گئے کہ بس لگے، ابھی پھٹے کے پھٹے۔

☼ ☼ ☼

آخر کار سرفراز اور اس کی میم بیوی کی سواری اتری۔ جوڈی اتنی بھی میم نہیں تھی۔ رنگ گورا تھا۔

مگر بھوری چھائیوں اور سرخ تلوں سے بھرا ہوا۔ آنکھیں نیلی تھیں، مگر بہت ڈھونڈنے کے بعد نظر آتی تھیں۔ سرسری سا دیکھو تو بس لگے کہ ماتھے کے نیچے دو فیروزی نقطے ڈالے ہوں کسی نے... ناک ستواں تھی۔ ہونٹ گلابی، مگر وہ ہی آنکھوں والا حال کہ ناک کے نیچے ایک باریک سی گلابی لکیر کھینچی تھی اور ماشاء اللہ کیا خوب طویل کھینچی تھی۔ اس کان سے لے کر اس کان تک۔

غرض یہ کہ دینے والے نے جوڈی کو ان سب سے نوازا تھا جو حسن کے لوازمات میں شمار ہوتا ہے۔ گلابی ہونٹ، نیلی آنکھیں، گورا رنگ، سنہرے بال، ستواں ناک، مگر ساتھ ساتھ اس بات کا بھی پورا بندوبست کیا کہ وہ ان پہ مسرور ہو کے اوقات سے باہر نہ ہو جائے۔

ویسے اخلاق کی اچھی تھی۔ دبا دبا کے سب سے گلے ملی۔ بلاوجہ سب کے گال چٹاچٹ چومے۔

"آئے ہائے، تل کتنے ہیں اس کے منہ پہ۔"

بڑی بھابھی (تائی جی) نے اس کے گورے چٹے رنگ کے آگے اپنے جھلسی ہوئی رنگت کا عیب چھپانے کے لیے نقص نکالا۔

"اور کیا بھرجائی، تلوں والا لڈو لگ رہی ہے۔"

سہیل نے قہقہہ لگایا۔

"یا پھر تلوں والا کلچہ۔"

وہ شاید اس بیان میں مزید اضافے کرتا کہ راشدہ نے نظروں ہی نظروں میں گھرک کے چپ کرایا۔ سرفراز ادھر ہی تو آرہا تھا۔

"یہ تحفے آپ سب کے لیے۔"

باہر ڈھائی تین سال رہنے کے بعد بڑا بیبا بڑا تمیز والا ہو گیا تھا سرفراز، تو تکار کرنے کے بجائے آپ جناب کرنے لگا تھا اور دید لحاظ والا بھی ہو گیا تھا۔ تب ہی تو تحفے لایا تھا۔

"ان کی کیا ضرورت تھی سرفراز۔" راشدہ نے تکلف جھاڑا۔

"لے... ضرورت کیوں نہیں تھی۔ ہمارے پاس کون سا ڈھیر لگا ہے ولایت سے آئی چیزوں کا۔"

سہیل نے تھیلا جھپٹا اور ایک ایک کرکے سامان نکالنے لگا۔ اس کے اور اشرف بائی جان کے لیے ایک ایک سفاری سوٹ۔ راشدہ اور کوثر کے لیے چمڑے کے پرس اور میک اپ کا سامان۔ بچوں کے لیے نیکر شرٹیں، فراک اور گھڑیاں تو سب رشتے داروں میں بانٹنے کے لیے وہ بے تحاشا لایا تھا اور کسٹم سے بچانے کا کیا نرالا ڈھنگ نکالا تھا اس نے۔ اپنے اور جوڈی کے جتنے کپڑے تھے۔ ان کی جیبوں میں ایک ایک گھڑی ڈال کے سلیقے سے تہ کیا ہوا تھا۔ وہ سب رشتے داروں کو تبرک کے طور پہ بانٹی گئیں۔

"یہ کیا ہے سرفراز؟"

کوثر نے ایک ڈبیا اس کے سامنے کی۔

سرفراز غور سے دیکھنے لگا۔ پھر جوڈی سے انگلش میں کچھ کھسر پھسر کی۔ اور نہ جانے کیوں انگریزی سن کے کوثر اور راشدہ خوامخواہ شرما کے دوپٹے کے کونے دانتوں میں دبانے لگیں۔

"بھابھی! جوڈی نے لیا تھا یہ آپ کے لیے، اسے بلش آن کہتے ہیں۔"

"اچھا اچھا... بلش آن۔" کوثر نے سر ہلایا، جیسے ساری بات سمجھ گئی ہو۔

"بلش آن، پہلے بتانا تھا، میں سمجھتی تھی ہو رے کیا ہے، نی راشدہ بلش آن ہے یہ۔"

"جی بھابھی۔"

راشدہ نے بھی ڈبی الٹ پلٹ کر کے دیکھی۔

"ویسے اس کا کرتے کیا ہیں؟"

کوثر کے اگلے سوال پہ سرفراز نے گڑبڑا کے دوبارہ جوڈی سے رجوع کیا۔ جوڈی نے پریکٹیکل پہ یقین کرتے ہوئے کوثر کو بلش آن لگا کے دکھایا۔

"لے... سیدھی طرح کہہ... لالی ہے۔"

"ولایتی لالی۔" راشدہ نے لقمہ دیا۔

محلے میں خوب تماشا لگا رہا۔ عورتیں آ آ کے جوڈی کو دیکھتی اور شرماتی رہی، اللہ جانے شرما کیوں رہی تھیں، کوئی اس کی شلوار کا پائنچہ ذرا سا اٹھا کے دیکھتی اور باقیوں کو اطلاع دیتی۔

"نی... اس نے پنڈلیوں سے بال مونڈے ہوئے ہیں۔ صفاچٹ پنڈلیاں ضرور ولایت میں گوڈوں سے اونچے فراک پہنتی ہو گی، بے شرم۔"

اور جوڈی مسکرا مسکرا کے سر ہلاتی۔

"تھینک یو تھینک یو۔"

اسے لگتا وہ جمگھٹا بنائے اس کی پنڈلیوں کے سڈول پن کے قصیدے پڑھ رہی ہیں۔ یا اس کی سنہری زلفوں پہ نثار ہو رہی ہیں، حالانکہ دو گھر پرے والی کبڑی ماسی اس کی لٹیں ہاتھ میں لے کے اپنی پوتیوں کو عبرت دلا رہی تھی۔

"ایہہ دیکھو کڑیو... ہور نہ لاؤ تیل، جب تیل لگانے بلاتی ہوں نخرے شروع کر دیتی ہو، اس میم کا جھاٹا دیکھا ہے، جیسے بتیاں والا چولہا، وہ بھی سواہ سے بھرا ہوا، تیل نہیں لگاؤ گی تو تمہارے بال بھی ایسے ہی ہو جائیں گے۔"

"تھینک یو تھینک یو۔"

جوڈی نے کبڑی ماسی کے ہاتھ سے اپنی لٹ نزاکت سے چھڑاتے ہوئے انکساری سے کہا۔

"ڈولے دیکھ اس کے۔"

کوثر کی بڑی بھابھی نے جوڈی کے گداز بازو پہ چٹکی کاٹی تو جوڈی کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

"تائی... تائی۔"

"ویسے سوکھی سڑی ہڈیوں کی مٹھ ہے... مگر ڈولے اتنے تگڑے ہیں، لگتا ہے ورکشاپ میں گڈیاں ٹھیک کرتی رہی ہے۔"

"یو تائی۔"

کوثر کی بھابھی کے مسلسل چٹکیاں بھرنے پہ جوڈی نے اسے اس کی بے تکلفانہ اور دوستانہ ادا سمجھتے ہوئے اپنی بے تکلفی بھی جھاڑی۔

رات کو ان دونوں کی سواری اوپر بھیجی گئی۔ نئے بنے کمرے میں، جس میں پہلا قدم رکھتے ہی سرفراز کو ایک زور کا جھٹکا لگا۔

اندر مٹی کے تیل کی سخت ناگوار بو تھی۔ اس پہ حاوی ہوتی فینائل کی گولیوں کی بو۔

اور سب سے بڑھ کے ایک اور عجیب سی بو جسے وہ پہچاننے سے قاصر تھا۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ اس کے ولایت جانے کے بعد پچھلے گھر میں کوئی قصائی آ کے بس گئے تھے جو گوشت بیچ دینے کے بعد گائے بھینسوں کی بچ جانے والی چربی سمیٹ کے گھر لے آتے تھے اور پھر رات بھر چھت پر ٹین کے کنستروں میں چربی ڈال کے چولہوں پہ پکاتے رہتے تھے۔ ایسی منحوس واہیات حد تک غلیظ بدبو تھی کہ بندے کا بس نہ چلتا تھا اپنی ناک ہی کٹوا لے تاکہ نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری کے مصداق نہ رہے گی ناک نہ سونگھے گی ایسی جناتی بدبو.....

بڑے مشکل سے اس نے جوڈی کو مطمئن کیا۔ پردے برابر کر کے کھڑکیاں دروازے بند کر کے درزوں میں دوپٹے ٹھونس کے باہر سے آنے والی جلتی چربی کی بو تو کم ہو گئی' اندر والی فنائل اور مٹی کے تیل کی بو اس نے پرفیوم اسپرے کر کر کے کم کی۔ جس سے الرجی کی ماری جوڈی کو چھینکیں آنا شروع ہو گئیں۔

اوپر سے نئی مصیبت' اس نے سختی سے تاکید کی تھی کہ کمرے کے ساتھ اٹیچ باتھ ضرور بنایا جائے' پہلے تو اشرف نے اس فرمائش کو غیر ضروری جان کے کانوں میں مارا اور صرف کمرہ بنانے کو ہی اپنا احسان گردانا۔ مگر آنے سے پہلے جب سرفراز نے بار بار فون کر کے باتھ روم' وہ بھی اٹیچ باتھ روم کی بار بار یقین دہانی کرائی تو دادا نے کہا۔

"اشرف نہ ضد کر' بنا دے غسل خانہ اور لیٹرین۔"

"ایک گھر میں دو دو غسل خانے یہ تو فضول خرچی ہے ابا جی۔"

"اس نے پیسے بھیجے ہیں' اسے ہو گی لوڑ۔ تیرا کیا جاتا ہے۔ یہ نہ ہو وہ واپس آ کے کہہ دے کہ میرے دیے پیسے کھانے تھے اس لیے غسل خانہ نہیں بنایا۔ لگا دے جتنے پیسے بچے ہیں' زیادہ لگ گئے تو آ کے بھر دے گا۔"

چیں بہ جبیں ہوتے اشرف نے کمرہ مکمل تیار ہو جانے کے بعد اٹیچ باتھ روم بنوا تو دیا' مگر سو سو باتیں کرتے ہوئے۔

"یہ نئے نئے رواج ڈالے گا اب گھر میں' کیا لوڑ ہے ایک گھر میں دو دو لیٹرین بنوانے کی۔ اب کہے گا کہ گھر میں باورچی خانے بھی دو کرو۔ اتنا بھی کیا نیستی کہ بندہ چار سیڑھیاں نہیں اتر کے آ سکتا غسل خانے تک۔ وہ بھی بغل میں چاہیے نواب صاحب کو۔"

"جان دے اشرف' ہو سکتا ہے مجبوری ہو۔" دادا کے دل میں لاڈلے کی محبت جاگی۔

"کیہڑی مجبوری؟"

"ہو سکتا ہے چوڑی میم بیچس کی مریضہ ہو۔ اسے گھڑی گھڑی جانا پڑتا ہو۔ اب وچاری کدھر ادھی راتی پوڑیاں (سیڑھیاں) اترتی۔"

مگر اب جو سرفراز دیکھ رہا تھا کہیں باتھ روم کا نام و نشان نہ تھا۔ ہوتا تو ظاہر ہے اندر کہیں اس کا دروازہ بھی کھلتا' خیر رات تو کسی طرح اندر ہی اندر کھولتے گزار لی۔ مگر صبح حساب لیا گیا۔

"بنایا تو ہے غسل خانہ۔"

"کہاں ہے؟"

"بغل میں۔"

"کس کی بغل میں؟"

"کمرے کی بغل میں۔"

"کس کے کمرے کی بغل میں؟"

اس نے تحمل سے سوال یہ سوال داغا' یہ غلطی اسی سے ہوئی تھی کہ جب اشرف نے بڑے تحیر سے دریافت کیا تھا کہ یہ اٹیچ باتھ ہوتی کیا بلا ہے تو اس نے جواب دیا تھا۔

"وہ غسل خانہ جو کمرے کی بغل میں ہوتا ہے۔"

اشرف اسے ہاتھ پکڑ کے اوپر لے گیا۔

"لے یہ دیکھ' کمرے کی بغل میں غسل خانہ' چینی کے فرش اور چٹے فلش والا' ساتھ میں نیلے رنگ کا میچنگ لوٹا بھی ہے۔ بالٹی اور ڈول سے میچ کر کے رکھا لوٹا۔ نیلا تولیہ نہیں ملا' وہ خاکی اور نسواری ہی رکھ دیا ہے دھاریوں والا۔"

سرفراز نے سر پیٹ لیا۔ باتھ روم واقعی کمرے کی دائیں دیوار کے ساتھ جڑا تھا' مگر اس تک جانے کے لیے کمرے سے نکل کے دائیں جانب مڑ کے پورا گھوم کے وہاں تک پہنچنا پڑتا تھا۔ کمرے سے اس تک کوئی دروازہ نہیں نکالا گیا تھا۔

"کمرے میں سے نکالنا تھا دروازہ۔"

"لے کمرے کے اندر ساری بو ہو جانی تھی۔" اشرف نے ناک چڑھائی۔

سرفراز ٹھنڈی سانس بھر کے رہ گیا۔

"ایسا کر..... تجھے اتنا سا بھی چل کے جانا مشکل لگتا ہے تو یہ کھڑکی کھول اور چھال مار....."

"کیا کھڑکی؟" سرفراز نے حیرت سے کہا۔

"آہو... یہ باری میں نے کھبے پاسے رکھوائی تھی کہ شام کو کھلے گی تو چن کا چانن اندر آئے گا۔ مگر بعد میں تو نے غسلخانے کی رٹ پکڑ لی تو میں نے اس باری کے ساتھ بنوا دیا۔"

اشرف نے چٹخنی کھول کے کھڑکی کے پٹ وا کیے سامنے غسل خانے کا منظر واضح تھا۔

سرفراز نے ایک دفعہ اور سر پیٹ لیا۔

"اب کیا کھڑکی کھولنے سے بو اندر نہیں آئے گی۔"

"آتے جاتے وقت کھولو' ورنہ بند کر دو۔"

"اب ہم دونوں کھڑکیاں پھلانگ کے جائیں گے۔"

"کوئی مشکل نہیں' ایہہ دیکھ۔"

اشرف بھائی جان نے ذرا شوخے ہوتے ہوئے کھڑکی میں سے چھلانگ لگائی۔

"ایہہ ویکھ' ایتھے رکھ گوڈا تے اے گیا بندہ اندر ہائے۔"

ان کا گھٹنا چپس کے فرش سے ٹکرایا تھا۔ اس بار سرفراز نے دیر تک ماتھا پیٹا۔

"اور یہ مٹی کے تیل کی بو؟"

"اماں جی سے سفیدی کھولتے ہوئے مٹی کی تیل کی پوری کپی ڈل گئی تھی۔"

"کیا؟ اماں جی نے سفیدی کی تھی؟"

"تجھے تو پتا ہے اماں کی عادت کا۔"

"مگر میں نے اتنے پیسے بھیجے تھے۔ کم تھے کیا؟"

"نہیں' سفیدی والے کو دینے کے لیے بھی نکلتے تھے اس میں سے اور نکلے بھی تھے۔ وہ اماں نے لے لیے کہ سفیدی میں نے کی ہے تو یہ مزدوری میری۔"

سرفراز دانت کچکچا کے رہ گیا۔

"اب خدا کا واسطہ ہے اشرف بھائی جان' یہ بات جوڈی کو نہ بتانا' وہ کیا سوچے گی۔"

اس نے ہاتھ جوڑے' جن کو کھولتے ہوئے اشرف نے تسلی دی۔

"باغلا..... میں کیسے بتا سکتا ہوں۔"

"مگر آپ کو تو پرانی عادت ہے گھر کی باتیں کھولنے کی۔"

"اب بھی ہے مگر تیری زنانی کے سامنے کیسے کھول سکتا ہوں' مجھے انگریزی آتی ہے بھلا۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔" سرفراز کو تسلی ہوئی۔

یہی تسلی اس نے کچھ دیر بعد جوڈی کو بھی دی جب وہ بھی کھڑکی سے واش روم میں چھلانگ مارتے ہوئے گٹے میں چوٹ لگا بیٹھی۔

"تاں اتنی کیا آلکسی ہے؟" چار قدم پہ غسل خانہ ہے۔ باہر سے نکل کے چلی جائے۔ سرفراز کی شکایت پہ دادی نے کہا۔

"باہر جو چربی کی بُو ہے اس سے دم الٹنے لگتا ہے' بندے کا۔ ویسے اماں... یہ چربی جلاتے کیوں ہیں؟"

"گھیو بنانے کے لیے۔"

"گھی؟"

"آہو... چربی چار گھنٹے پکتی ہے تو پگھل کے گھیو بن جاتا ہے۔ بڑا بکتا ہے یہ گھیو۔"

"کون خریدتا ہے یہ مردہ جانوروں کی چربی سے بنا بدبودار گھی؟"

سرفراز نے ابکائی روک کے کہا۔

"سستے ہوٹلوں والے... ہسپتال کی کینٹین

والے۔ سموسے جلیبی تلنے والے۔"

اس شام سرفراز نے وہ سموسے جوڈی کو بالکل نہ کھانے دیے جو سہیل لایا تھا۔

"اماں.... سرفراز کی اکڑ دیکھی ہے؟ اپنی زنانی کو میرے لائے سموسے نہیں کھانے دیے نہیں نے کوئی زہر ڈالنا تھا اس میں۔"

اماں نے تسلی دی۔

"سمجھا کر سہیل... سموسے کھائے گی تو اس کے ٹڈ میں مروڑ اٹھیں گے۔ میرے غسل خانے جانا پڑے گا۔ اک گٹا توڑ کے بیٹھی ہے۔ دوسرا گوڈا بھی رہ جاتا، ویسے کیسی میم ہے یہ' ایک چھال بھی نہیں مارنی آتی اسے' ہمیں نے تو سنا تھا کہ میمیں بڑی کوٹھے ٹپنیاں ہوتی ہیں۔"

اگلی صبح جوڈی نے ایک اور غضب کیا' سو کے اٹھی اور نائٹی میں ہی کمرے سے نکل کے کوٹھے کا چکر کاٹ کے واش روم تک گئی۔ اب آس پڑوس میں تب تک خاصا رواج تھا کوٹھے یا برساتی پہ چارپائیاں ڈال کے سونے کا۔ بیبیاں تو دن چڑھنے سے پہلے ہی کھیس سرہانہ اٹھا کے نیچے اتر جاتیں کہ دن کے اجالے میں کسی کی نظر پڑنے سے بے پردگی نہ ہو۔

جوان جہان بھی کاموں پہ چلے جاتے مگر بابے چونکہ ایک تو ویلے ہوتے تھے' دوسرے انہوں نے از خود نوٹس لینے کا ٹھیکہ لیا ہوتا تھا اس لیے دھوپ سر پہ آنے کے بعد بھی اوپر پڑے کھنکارتے رہتے اور بہانے بہانے سے آس پاس کے گھروں میں جھانک کے جائزہ لیتے تو ان بابوں کو سب پتا ہوتا کہ کس کی زنانی کے گھیو والے پراٹھے کے ساتھ انڈا دیتی ہے' کس کو چائے کے ساتھ پاپے کھا کے جانا پڑتا ہے' کس کی بہو اتنی چٹوری ہے کہ ہانڈی بھونتے ہوئے گول بوٹیاں کھا جاتی ہے۔

ان بابوں کی عمر کا لحاظ کر کے کوئی ان کو تاک جھانک سے منع بھی نہیں کرتا تھا۔ اس بات پہ لونڈے لپاڑے بڑا ہنستے تھے۔

"واہ جی۔ ہم ذرا کوٹھے پہ جائیں تو سارے محلے کو پیڑ (درد) ہو جاتی ہے کہ منڈے کھنڈے کا کوٹھے پہ کی کم' نظر بازی کرتا ہے۔ بابے چنگے فیدے (فائدے) میں ہیں۔"

ایسے ہی دو تین بابوں نے اپنی بجھتی ہوئی بصارت سے بڑا کام لیتے ہوئے جوڈی کو نائٹی میں دیکھ لیا۔ اگرچہ وہ نائٹی کوئی ایسی قابل اعتراض نہ تھی۔ پوری نہ سہی' آدھی آستین تو تھی۔ ٹخنوں سے بس ذرا سی اونچی تھی۔ فٹنگ والے کالی ساٹن کے برقعوں سے بھی ذرا کم قابل اعتراض.... مگر جی ولایتی لباس تو پھر ولایتی لباس ہوتا ہے۔ نہ دوپٹہ... نہ لیر' وہ شور مچا کہ بس۔

دادی پہلے تو اہل محلہ سے خوب لڑیں۔ سب کے کچے چٹھے کھولے۔

"آہو۔ تیری نوں بڑی بی بی ہے ناں جیسے۔ تارے لانی... سبزی والا اسی کو کیوں سستے آلو دیتا ہے۔ ہمارے لیے تو روپیہ کم نہیں کرتا ہے۔ اور نی توں بتولاں! تیرے گھر کے سامنے چھے والا دوواری سائیکل کی گھنٹی بجا کے جاتا ہے۔ وجہ؟ اور یہ بابے ان کا تو اب مکو ٹھپنا ہی پڑے گا۔ ہر ویلے بنیرے سے لگے آلے دوالے جھانکیاں مارتے رہتے ہیں۔ ٹھہر۔ پتہ نہیں جوانی میں کون سے چن چاڑھے ہوں گے انہوں نے۔ خبردار جو کسی نے میری میم نوں پہ گل رکھی تو۔"

ان سے نمٹنے کے بعد سرفراز کی شامت آئی۔

"بے غیرتا... شرم دا گھاٹا۔ اس لیے منع کرتی تھی تجھے۔ دیکھا! آج سارا گوانڈ اکٹھا ہو کے لامہ (الزام) دینے آیا ہے کہ تیری زنانی ادھے کپڑے پہن کے بابوں کی آنکھوں میں ٹھنڈ ڈالتی ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے اماں! اسے ہفتہ ہونے والا ہے یہاں۔ کبھی آپ نے اسے کسی ایسے ویسے لباس میں دیکھا۔" نیچے آنے سے پہلے وہ شلوار قمیص اور دوپٹہ لیتی ہے۔ اب بے چاری سحری کے وقت باتھ روم جانے کے لیے بھی بطور خاص کپڑے بدلے؟"

"اندر باری (کھڑکی) ہے ناں۔ اس سے جائے چھال مار کے۔"

"مجھے اپنی بیوی سالم واپس لے کے جانی ہے اماں!

ایک گٹا اس کا زخمی ہے۔ اب کیا لنگڑی کروانی ہے۔"

سرفراز کی جان مصیبت میں آئی ہوئی تھی مگر جوڈی کے مزے تھے۔ وہ تو ایسے انجوائے کر رہی تھی جیسے ساری عمر چھچھو کی ملیاں گزارنے والا' ڈزنی لینڈ کی سیر کو چلا جائے۔

کبھی صدیقاں کے ساتھ جڑ کے بیٹھی اس سے یہ فن سیکھ رہی ہوتی کہ بچے کو گھٹنوں میں دبوچ کے اس کے جھتے کے جھتے بالوں میں سے 'چن چن کے لیکھیں کیسے نکالی جاتی ہیں اور پھر ان کو ایک ناخن کے اوپر رکھ کے دوسرے ناخن سے مارا کیسے جاتا ہے۔

کبھی بڑی حیرت سے دابڑے۔ میں جمے کالے دیسی صابن کو چیک کرتی کہ صابن کی اتنی بڑی ٹکیہ کیسے بنی؟ اسے اس نے سوپ کیک کا نام دیا تھا۔

کبھی کوثر' جو پورے دن سے تھی اور ہر وقت لسوڑھے کا اچار چوستی رہتی تھی' اس سے ذرا ذرا سا اچار چکھ کے دیر تک اپنی چندی مندی آنکھوں کو اور بھی چندا منداکرتی رہتی۔

کبھی دادی سے شلوار کا ازار بند باندھنا اور نیفے میں ڈالنا سیکھتی۔ تو کبھی راشدہ سے دودھ لسی بنانا۔

مگر غضب تو تب ہوا جب اس نے سہیل سے کچھ سیکھنا شروع کر دیا۔

سدا کے شوخے سہیل کے ہاتھ اچھا مشغلہ آ گیا تھا۔ میم بھرجائی کی صورت میں۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا جوڈی کو پینٹ بشرٹ پہنا کے اپنے ساتھ لارنس گارڈن گول گپے کھلانے یا شالامار باغ دکھانے لے جائے۔ بے چارے کی اوقات اتنی ہی تھی۔ اور وہ لے کے بھی گیا۔ گول گپے کھلانے کی اپنی سی کوشش بھی کی۔ مگر... پینٹ بشرٹ پہنانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دادی' دادا تو ایک طرف۔ خود سرفراز بڑا سخت غیور ثابت ہوا تھا بیوی کے بارے میں۔ حرام ہے جو اسے شلوار قمیص کے علاوہ کچھ پہننے دے۔

سہیل بعد میں بھڑاس نکالتا۔

"دو ٹوپی ڈرامے۔ ہمیں کیا پتا نہیں ہے میموں کا ادھر چاہے سمندر میں ڈبکیاں لگاتی ہو ادھر آ کے پردے کرا رہا ہے۔"

بہر حال ایک دن وہ اس بات پہ جوڈی کو رضامند کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ گھر کے اندر ہی سہی پہ مگر میکسی اور جینز شرٹ پہن کے سہیل کے ساتھ تصویر کھنچوا لے۔

اس دن راشدہ میکے گئی ہوئی تھی۔ کوثر اندر دائی سے مالش کرا رہی تھی۔ دادی محلے کی چند خستہ حال مائیاں جمع کر کے رضائیاں نگند رہی تھی۔ دادا جی اشرف کے ساتھ دکان پہ تھے۔ اور اندر سہیل جوڈی کو شیشے میں اتار رہا تھا۔ آخر میم آئی تھی گھر میں۔ ٹھیک ہے بھابی ہے' بھائی کی عزت ہے۔ وہ کون سا خدانخواستہ غلط نظر ڈال رہا ہے۔ اللہ معاف کرے، مگر اب میم کے گھر آنے کا اتنا بھی فائدہ نہ ہو کہ بندہ چار یاروں کے سامنے شو بھی نہ مار سکے۔ اور یہ شو شلوار قمیص والی میم کے ساتھ تصویر کھنچوا کے نہیں ماری جا سکتی تھی۔

"مگر میرے پاس تو جینز شرٹ ہے ہی نہیں"۔ بہت مشکل سے جوڈی سہیل کو سمجھا پائی۔

"کوئی بات نہیں۔ ابھی نکالتے ہیں اس کا حل۔"

اس نے بھی اتنی ہی مشکل سے اپنی بات سمجھائی۔

اور اندر سے سرفراز کی پینٹ نکال لایا۔ سرفراز کی کمر تھی تب 32 اور جوڈی سوکھی سڑی۔.... خاص مزا نہ آیا' مگر بہر حال کمر بیلٹ سے خوب کس لی گئی۔

شرٹ البتہ سہیل نے اپنی دی۔ آدھی آستینوں والی اور بڑے کالروں والی... چیک دار۔

جوڈی کے بال کھولے گئے۔ ایک پھول کان میں اڑکایا گیا' افشاں پپوٹوں پہ چھڑکی۔ شمیم آرا اسٹائل کے جوڑے۔ جو رنگ محل کی دکانوں پہ لٹکے ہوتے تھے اور نشو بیگم کے جیسی گھنگھریالی لٹیں جو انار کلی کی ہر دوسری دکان پہ اٹکی ہوتی تھیں' وہ بھی لائی گئیں۔ تھوڑی پہ سیاہ تل بھی بنایا اور لگا دھڑا دھڑ پوز دینے۔ کیمرہ اپنے فوٹو گرافر دوست سے کرائے پہ لایا تھا... دو دن بعد جب تصویریں ڈھل کے آئیں تو سب سے پہلے

سرفراز کو ہی دکھائیں۔
وہ دیکھتے ہی برا مان گیا۔
"اماں! دیکھا آپ نے سہیل کو... شادی ہو گئی تین بچے ہو گئے اس کی بے وقوفیوں اور شوخے پن کو آرام نہیں آیا۔
اب اس عمر میں یہ اس کی حرکتیں ہیں کرنے والی۔"
"کی کردا اے؟"
دادی نے ڈنڈے سے تابڑ توڑ حملے کر کے دادا جی کے کرتے سے میل چھڑاتے ہوئے پوچھا۔
"شادی شدہ بال بچے دار... ستائیس اٹھائیس سال کے بندے پہ یہ سوٹ کرتا ہے کہ وہ مغل پورے کی نہر کے کنارے کھڑے کھسروں کی تصویریں بناتا پھرے۔"
"ہیں؟" سہیل سٹ پٹا گیا۔
"اور کھسرے بھی ایسے واہیات... سنبھال لو اماں اسے۔ کھسروں کی محبت میں آوارہ ہو جائے گا۔ کسی نے اسے کھسروں کے ساتھ مذاکرات کرتے دیکھ لیا تو ناک کٹ جائے گی خاندان میں' میں تو کہتا ہوں اس کا مغل پورے جانا ہی بند کراؤ۔"
"اوبائی... غور سے دیکھ' یہ مغل پورے کی نہر والا کھسرا نہیں ہے... یہ تو۔"
"کیا یہ تو؟ اچھا تو پھر میلہ چراغاں میں جو سرکس لگتی ہے اس میں ناچنے والے کسی کھسرے سے یاری لگائی ہو گی۔ شرم کر سہیل... شرم کر دو دو بچیوں کا باپ ہے تو... اور۔"
"او یہ بھابی ہے... جمیلہ بھابی' جوڈی بھابی' غور سے دیکھ۔"
سرفراز کو ایک شدید جھٹکا لگا۔
وہ بوکھلا کے غور سے تصویریں دیکھنے لگا۔ بہت کھوجنے پہ انکشاف ہوا کہ تبت سنو کریم کی تہہ کے نیچے چھپا یہ چہرہ اس کی عزیز از جان بیگم کا ہی ہے۔ اس رات سہیل اور سرفراز میں بڑی مارا ماری ہوئی... ہاتھا پائی تک نوبت آ گئی۔
"بے غیرت' بھابی ہے وہ تیری۔"
"ہاں ہے تو... میں نے کون سا بھابی کے نگ اتار لیے ہیں؟"
"تیرے دل میں عزت ہی نہیں ہے رشتوں کی۔"
"کیوں نہیں ہے؟ عزت ہے تو تصویریں بنوا رہا تھا۔"
"ایسی تصویریں؟"
"او برائی کیا ہے ان تصویروں میں اور تو تو ایسے تپ رہا ہے جیسے وہ ولایت میں برقعے چادریں لیتی تھی؟ کبھی نہیں پہنی تھی اس نے پتلون؟"
"مگر اس نیت سے نہیں پہنی تھی... سب سمجھتا ہوں۔ تم یہ تصویریں لے جا کے اپنے لفنگے دوستوں کے سامنے پھڑیں (شیخیاں) مارنے والے تھے۔ ہے ناں؟"
"کیہڑیاں پھڑاں... کھسرے ورگی زنانی... تے گلاں سنو... ہونہہ... پھڑاں۔"
اب کے سرفراز نے آگے بڑھ کے سہیل کے ہاتھ جڑ دیا۔ سہیل کون سا کم تھا۔ وہ تو شروع سے ہی ہتھ چھٹ تھا...
دادی نے سینہ پیٹ پیٹ کے سارا محلہ اکٹھا کر لیا۔
"ہائے او لوکو... باہر والی نے آ کے میرے منڈے لڑا دیے۔ بھائی بھائی سے لڑنے لگا۔"
"ناں نی ہینفاں... باہر والی تو دس دن پہلے آئی ہے۔ مجھے تیرے گوانڈ (پڑوس) میں آئے دس سال ہو گئے ہیں۔ ہر دوسرے دن تو تیرے منڈے ایک دوسرے کے گلے پڑے ہوتے ہیں۔"
جس ہمسائی نے سچ بولنے کی جرات کی تھی۔ سب سے پہلے تو دادی نے اس کی گت مروڑ کے اسے گھر سے نکالا اس کے بعد سہیل اور سرفراز دونوں کو دو ہنٹر مارے۔ اشرف شور سن کے بنیان پیٹ سے اٹھاتا پسلیاں کھجاتا کچی نیند میں باہر نکل آیا۔
"کی رولا اے؟"
"چھڑا ویروں کو۔"
دادی نے ہلکان ہوتے ہوئے دہائی دی۔

"ان کا روز کا تماشا ہے۔ میں سارے دن کا کھپا ہوا' یہ سیاپے دیکھتے ہی رہ گیا ہوں۔"
وہ اسی طرح بنیان اٹھا کے پیٹ کھجاتا اندر گھس گیا۔ مگر دو منٹ بعد ہی بنیان کے اوپر کرتا پہنتا گرتا پڑتا افراتفری کے عالم میں گھر سے باہر بھاگا۔ کوثر کو درد ہو رہا تھا۔ دائی کو لینے جانا تھا اور شامت اعمال کہ محترمہ دائی صاحبہ وہی ہمسائی خاتون تھیں جس کی ابھی ابھی تازہ تازہ دادی کے ہاتھوں گت مروڑی گئی تھی... اور جس کی بیٹی کے تازہ کارناموں اور طلاق کے اسباب پہ روشنی ڈالی گئی تھی۔ وہ مزے سے اکڑ گئی۔
"میں تے نئیں آندی۔"
فی الحال کوئی جان پہچان والی دائی۔ خصوصاً" زندہ سلامت دائی نظر میں نہ تھی... اس لیے رکشہ کر کے کوثر کو ہسپتال لے جانا پڑا۔ یوں ارم خاندان کی وہ پہلی اولاد تھی جسے گنگا رام ہسپتال میں پیدا ہونے کا شرف حاصل ہوا اور وہ بھی کمزور نظر اور مضبوط ہڈ پیر والی دائیوں کی بجائے چرچڑی ڈاکٹروں کے ہاتھوں۔
کوثر کی اس تازہ کارروائی کے نتیجے میں سہیل اور سرفراز کا جھگڑا وقتی طور پہ دب گیا۔ مگر سہیل کو اندر ہی اندر بڑا قلق تھا۔ اب وہ بال بچے دار آدمی تھا۔ اس کی قدر نکلتی بچیوں کے سامنے سرفراز نے اسے رپٹا دے مارا تھا۔ وہ شرم کے مارے بچیوں کے سامنے نہ جا رہا تھا۔
"دفع کرو جی۔ تسی منہ ای نہ لگایا کرو جوڈی چوہٹری کو۔"
راشدہ نے دل سوزی سے مشورہ دیا... ویسے بھی اسے شوہر کا جوڈی کے ارد گرد منڈلانا ذرا پسند نہیں تھا چاہے وہ رشتے میں اس کی بھابی ہی کیوں نہ ہو۔
"اتنی جلدی دفع کیسے کروں؟ کون کون سی بات نہیں کر ڈالی سرفراز نے مجھے... کیا کیا طعنہ نہیں دیا اتنی آسانی سے میں اسے چھوڑنے نہیں والا۔"
"رہن دیو' دفع کرو' ویسے بھی مہینے تک اس نے واپس چلے جانا ہے۔"
"میرے سے بے عزتی خراب کرائے بغیر وہ یہاں سے نہیں جائے گا۔ جیسے سارے محلے اور سارے گھر کے سامنے میرا تماشا لگا ہے۔ ایسے ہی اس کا اور اس کے تلوں والے کلیجے کا لگے گا۔"
اور سہیل کے شیطانی تخریب کار دماغ میں ایک سازش پلنے لگی۔ جس پہ عمل درآمد اس نے اگلی صبح سے ہی کر دیا۔
"نی راشدہ... تیرا رنگ تو بڑا لاٹیں مارنا شروع ہو گیا ہے... شاوا۔"
دادی نے غور سے چھوٹی بہو کے لشکارے مارتے چہرے کو دیکھ کے کہا۔
"وہ اماں جی... جوڈی' میرا مطلب ہے جمیلہ نے جو کریم دی تھی لگانے کے لیے' اس کا اثر ہے۔"
"اچھا۔" دادی دل مسوس کے رہ گئی۔ کیا تھا جو سرفراز اور اس کی میم ماں کو بھی کوئی کریم پوڈر دے دیتے ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی۔ کوثر اور راشدہ کی طرح... بیس پار کرنے کے بعد نہیں بیاہی گئی تھی' بلکہ بیس تک پہنچنے سے بہت پہلے ہی تینوں لڑکے اس کی گود میں تھے۔
اس اولاد نے تو اسے ابھی سے بوڑھا سمجھ لیا تھا۔ اس کے دل میں ابھی بننے سنورنے کے ارمان باقی تھے مگر وہ شادی بیاہ کے بہانے ہی ذرا سج بن لے تو ٹھیک' ورنہ سب اس سے یہی توقع رکھتے تھے کہ وہ پھیکے رنگوں کے جوڑے پہنے' بالوں کو کالی مہندی کے بجائے لال مہندی سے رنگے اور زیور کے نام پہ کانوں میں سونے کی مرکیوں' ناک کے کوکے اور ہاتھ کے چاندی کے کڑوں کے علاوہ کچھ نہ پہنے۔
ان کا بھی جی چاہتا تھا ابھی رنگ برنگی کانچ کی چوڑیوں کو...
ایک بڑی پرانی سرخی سالوں سے ان کے پاس تھی۔ اب تو کھولنے پہ اس کی چونچ بھی باہر نہ نکلتی تھی۔ چھوٹی انگلی اندر ڈال کے سرخی کی باقیات نکالنی پڑتیں اور رگڑ کے ہونٹوں پہ لگائی جاتی۔
میاں میر کے عرس سے کوئی گیارہ بارہ سال پہلے لی تھی۔ اب ایسی سرخیاں کہاں' اب تو ادھر لگاؤ ادھر

غائب۔ یہ ایسی ڈھیٹ سرخی تھی کہ دو دن سے پہلے اترتی نہیں تھی' اوپر اوپر سے اتر بھی جائے تو سوکھے ہونٹوں کی درزوں میں جو چھپ کے بیٹھتی تو ہفتے بعد نکلتی۔ جب دادی اپنے سوکھے ہونٹوں کے اوپر آیا چھلکا کھینچ کر اتارتیں تو پھر جلن سے بچنے کے لیے مکھن کا لیپ کر دیتیں..... مگر یہ سرخی وہ صرف خاندان کی شادی بیاہ والی تقریبات پہ لگاتیں۔ وہ بھی بہوؤں کے اصرار پہ..... اوپر اوپر سے.....

"نی چل رہن دے..... ہُن ایسی عمرے میں بلیاں لال کراں....." کی تکرار کے ساتھ۔

اگرچہ دانت چمکانے کے بہانے وہ "داتن" ملا کرتی تھیں بلا ناغہ..... اور دانتوں سے زیادہ ہونٹوں پہ ملا کرتیں۔ خوب رنگ چڑھتا مگر جو مزا سرخی سے ہونٹ لال کرنے کا تھا۔ وہ داتن سے نہیں۔

جوڈی کے پاس ایک سے ایک سامان تھا میک اپ کا کوثر اور راشدہ کے ساتھ ساتھ خود دادی کا دل بھی للچا جاتا۔

پھر ایک دن جب جوڈی نہا رہی تھی تو اس کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرنے اوپر گئیں اور چپکے سے ایک دو شیشیاں اٹھا لائیں۔ اب ان کی جانے بلا کہ یہ شیشیاں کس چیز کی ہیں مگر چونکہ سنگھار میز پہ رکھی تھیں اس لیے یہی فرض کر لیا گیا کہ رنگ گورا کرنے والی وہی کریمیں ہوں گی جن کی کرشمہ سازی راشدہ کے چہرے پہ دیکھی تھی۔

دوپہر کو جب سارا گھر چقیں گرا کے گیلے دوپٹے منہ پہ رکھ کے سو رہا تھا تو دادی نے سب سے بڑی والی شیشی نکالی اس پہ ایک خاصی واہیات سی میم آدھے ادھورے کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔

"درفٹے منہ....."

اس لعنت کے بعد ایک اور گالی بھی دی گئی۔ ویسے آدھ درجن ذرا کم واہیات گالیاں تو ہر وقت دادی کی زبان پہ ہوتیں۔ اب اس میں بھی دادی کا کیا قصور۔

جینز اور خون کا اثر بھی ہوتا ہے اور دادی کے اندر ننکانے کے سکھوں کا خون تھا۔ جی ہاں۔ ان کے دادا گرودھر نام اور گوبند سنگھ کے خاص چیلے اور سکھ برادری کے جانے مانے سرپنچ تھے..... بعد میں اسلام قبول کر لیا کوئی کہتا ہے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کے مشرف بہ اسلام ہوئے' کچھ کا کہنا تھا اسلام قبول کرنے کے پیچھے بھی گرونانک کی محبت تھی کیونکہ ننکانہ شریف تقسیم کے بعد پاکستان میں رہ گیا تھا اور ان کو اپنے اس مذہبی استھان سے اتنی محبت تھی کہ چھوڑنے پہ تیار ہی نہ تھے اس لیے صرف ننکانہ شریف میں بسنے کی خاطر وہ کلجیت سنگھ سے کرامت حسین بھٹی ہو گئے..... مگر اس دلیل میں زیادہ دم نہ تھا۔ یہ کسی بدخواہ کی اڑائی گپ تھی۔ کیونکہ اب بھی ننکانہ بلکہ پاکستان کے کئی علاقوں میں سکھ برادری بستی ہے اور بڑے طمطراق سے بستی ہے۔

ہاں تو ذکر خیر ہو رہا تھا گرو کلجیت سنگھ کا جو کہ بعد میں کرامت حسین بھٹی ہوئے۔ ان کے سکھ خون اور روایات کا جو دادی میں بدرجہ اتم موجود تھا۔

زندہ دلی۔

مہمان نوازی۔

سادہ لوحی۔

اور محنت کش ہاتھ پیروں کے ساتھ دو چیزیں اور بھی وراثت میں ملی تھیں انہیں۔

ایک تو یہ کہ ان کے بارہ اکثر بج جاتے اور دوسرا یہ کہ اپنی خاندانی روایات کے مطابق وہ ایسی ایسی گالیاں بڑی روانی سے دیا کرتیں جن کو ادا کرتے ہوئے مرد بھی ایک لمحے کے لیے ہچکچا جائیں۔

ان سے یہ اثر اولاد میں بھی آیا اور سہیل میں تو خاصا جم کے آیا۔ دادا جی جب اس کی بدزبانی سے خائف ہوتے اس کے ننھیال کو کوستے۔

"لعنتیا..... سکھ نانکیاں دی نسل..... گندی زبان والا....."

خیر جی..... دادی نے کریم کی شیشی پہ بجی عورت کو گالیوں میں تولتے ہوئے انگلیاں بھر کے کریم نکالی۔ عجیب چیچی نسواری سی کریم تھی' وہ منہ پہ ملی ..... خوشبو بھی عجیب میٹھی سی تھی' مکھن ٹافی والی چلو

..... کسی طرح او کھے سوکھے ہو لے سارے منہ پہ مل لی۔ اس کے بعد دوسری شیشی کھولی۔ اس پہ بنی حسینہ کو گالی دینے کی نوبت نہ آسکی..... اس کا صرف کلوز اپ تھا اور آبشار پکھ والے بال جمائے ہوئے تھے۔ بالکل وہی بیا کے گھونسلے جیسا جوڑا اور لمبا سا کنڈل آگے ڈالا ہوا۔

"بھلا..... بالوں کا تیل ہے۔"

دادی نے ڈھکن احتیاط سے کھولا کہ تیل نیچے نہ گر جائے۔

"وڈے عقلاں والے انگریز..... اتنے وڈے منہ والی شیشی میں تیل' تیل تے تنگ منہ والی شیشی میں ہونا چاہیے کہ وگ (بہہ) نہ جائے..... اوئے ایہہ کی۔ ڈھکن کھولنے پہ دیکھا کہ بے رنگ وبو تیل جما ہوا تھا۔ بالکل جیلی کے جیسا۔

"تیل جم گیا؟ اتنی گرمی میں' خیر باہر کا تیل ہے ولایتی جما ہوا ہو گا۔"

دادی نے پھر سے انگلیاں بھری اور گت کھول کے مل مل کے بالوں میں یہ جما ہوا تیل لگایا..... خوب چمپی کی اور پھر دروازے کا کواڑ بھیڑ کے لیٹ گئیں کہ دو گھنٹے دونوں کریموں کا اثر ہو..... بعد میں باندھی جائے گی۔ گت۔

باقی سب کی طرح دادی نے بھی دوپٹہ گیلا کر کے نچوڑا اور منہ پہ پھیلا کے خراٹے بھرنے لگی۔

یہ دوپٹہ گیلے کرنے میں بھی ایک سائنسی تکنیک تھی۔ ہلکا ہلکا نم دوپٹہ منہ پہ..... پنکھے کی ہوا جب اس میں سے چھن کے آتی تو اندر تک ٹھنڈ پڑ جاتی۔

دو گھنٹے گزرے' منہ کی جلد پہ اینٹھن ہونے سے آنکھ کھلی۔

"ہائے ہائے میرا منہ۔"

دادی سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"نی مینوں لقوہ تے نہیں مار گیا۔"

مگر ان کی دہائی کون سنتا..... منہ پوری طرح کھل ہی نہیں رہا تھا۔ آواز کیا نکلتی۔ بھاگم بھاگ غسل خانے تک گئیں۔ اندر کوثر بیٹھی تھی اور وہ جب جاتی تو ایسا بیٹھتی کہ نکلنے کا نام نہ لیتی' دادی نے دونوں ہاتھوں سے لوہے کا دروازہ پیٹ ڈالا ساتھ ساتھ مسلسل دہائی بھی جاری تھی۔

"نی باہر نکل نی..... کتنی واری کہا ہے اتنا لمبا تہلانا ہوتا ہے اپنا مردہ تو ادھر کھرے میں منجھاں کھڑی کر کے نہا مر لیا کر..... باہر نکل دیکھ تے سہی میرا کی بنیا؟؟"

اگرچہ کوثر کو اس دہائی کے الفاظ پوری طرح سمجھ میں نہیں آرہے تھے مگر ظاہر ہے آواز سمجھ میں آگئی تھی کہ اس کی ساس کی ہے اور ساس اب اس قدر جلال میں ہیں کہ الفاظ ہی صحیح طرح سے نہیں ادا کر پا رہیں۔

جیسے ہی کوثر باہر نکلی۔ اس کی اپنی چیخ گلے میں گھٹ گئی۔ یوں تو اس کی ساس عام حالات میں بھی کم خوفناک نہیں تھی مگر اس وقت تو حد سے زیادہ بھیانک..... لگ رہی تھی۔ سرمئی کیچڑ منہ پہ تھوپے ہوئے بے شمار جھریوں کے ساتھ سر کے بالوں کی مہندی رنگی لٹیں اکڑ کے دو نگھوں کی طرح کھڑی تھیں۔

"ہائے اماں جی....."

کوثر نے دلدوز چیخ ماری پھر ذرا غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔

"اماں جی تسی او؟"

تصدیق طلب کرنے پہ اماں جی نے اسے زور کا دھکا دے کر پرے کیا..... غسل خانے میں گھسیں اور رگڑ رگڑ کے کریم اتارنے لگیں..... مگر کریم گوند کی طرح چہرے سے چپک گئی تھی..... سارا حمام خالی کر دیا مگر کریم نہ اتری..... اب تو جلد کھرچنے کی وجہ سے دکھنے لگی تھی۔ تنگ آ کے اس نے رونا دھونا مچا دیا۔ سارا گھر اکٹھا ہو گیا۔ ہر کوئی اس کی حالت پہ پریشان کم حیران زیادہ تھا۔

"نی توں جھوٹا قرآن تے نئیں چک لیا؟"

اس کی سمدھن راشدہ کی ماں نے قیاس آرائی کی کہ شاید جھوٹا قرآن اٹھانے یا جھوٹی قسم اٹھانے کی وجہ سے اللہ نے ایسی شکل کر دی ہو۔

جواب میں دادی نے اپنی نسل در نسل چلتی آ رہی میکے کی سوغات گالیوں سے نوازا۔
اب اصل بات بتانی ہی پڑی..... چاہے شرمندہ ہو کے سہی ظاہر ہے اس عذاب سے نجات بھی حاصل کرنی تھی۔
جوڈی کو بلایا گیا کہ اس کے کمرے سے اٹھائے سامان نے یہ درگت بنائی ہے وہی سدِباب بھی کرے..... اس کے ساتھ ساتھ سارا گھر ملامت کرنے میں بھی پیش پیش تھا۔
"شوہدی رہیں ساری عمر..... بڈھے ویلے بھی حرکتیں نہ چھوڑیں۔"
داداجی نے دل کی بھڑاس نکالی۔
"حد ہے اماں..... جوان نوؤں (بہوؤں) کے سامنے یہ حرکتیں؟"
یہ اشرف تھا۔
"اماں جی..... میرے سے پوچھ لیتی، کیسے لگاتا ہے تو یہ حال تو نہ ہوتا۔"
راشدہ نے قابلیت جھاڑی۔
کوثر البتہ چپ تھی..... وہ بچھل پیری کہہ چکی تھی انہیں اب اور کیا کہتی.....
جوڈی کی بھی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی..... اس نے وہ شیشیاں طلب کیں تو پتا چلا کہ بالوں میں انہوں نے جما ہوا تیل نہیں، ہیئر جیل لگالی تھی..... اور چہرے پہ ویکس لگائی تھی۔
"یہ ہے کیا بلا؟"
اشرف کے پوچھنے پہ اس نے انگریزی میں کچھ بتایا پھر پلے نہ پڑنے پہ مزید سمجھانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے اس نے کوثر کی سلائی مشین پہ رکھا بکرم کا ٹکڑا اٹھایا دادی کے منہ پہ رکھ کے دبایا اور ایک جھٹکے سے کھینچ لیا۔ ادھر چہرے سے ویکس نکلی..... ادھر دادی کے منہ سے چیخ نکلی اور ادھر اس چیخ کی دہشت سے گھبرا کے باقی سب کمرے سے نکلے۔
دادی کے شور مچانے کے باوجود..... ہاتھا پائی کی پروا نہ کرتے ہوئے۔ جوڈی نے باقی کی ویکس بھی اسی طرح اتاری۔ ساتھ میں ان کے چہرے کا سرمئی رواں بھی اترا..... دادی کا درد کم کرنے کے لیے۔ جوڈی نے انہیں آئینہ دکھایا اور لگی انگریزی بگھارنے..... انہیں یہ یقین دلانے کہ وہ اب کتنی حسین لگ رہی ہیں ان کی جلد کتنی صاف شفاف اور ملائم لگ رہی ہے۔
"یو آر لکنگ سو کیوٹ..... سو فریش، سوینگ۔"
"کی؟"
"آئی مین..... یو یو۔"
جوڈی نے انگشت شہادت دادی کے سینے پہ رکھ کے جملہ مکمل کیا۔
"یو....."
اور دادی کے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ جوڈی کے منہ سے وہی گالی سن کے..... جو اس نے ویکس کی شیشی پہ بنی واہیات ناکافی لباس والی عورت کے لیے منہ سے نکالی تھی۔
"نی..... کی کہیا؟" دادی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
اپنی سماعت پہ دھوکے کا گمان ہوا اس لیے تصدیق چاہی۔ جوڈی نے مسکرا مسکرا کے وہ گالی دہرادی۔ اب دادی نے دو ہتڑ مارے اپنے سینے پہ..... چار ہتڑ مارے جوڈی کے تھوبڑے پہ اور وہ شور مچایا کہ گھر تو گھر محلہ اکٹھا کرلیا۔
"میم نے مجھے گال دی ہے۔"
مگر ان کے رونے دھونے پہ کسی نے یقین نہ کیا۔
"او جان دیو اماں جی! اس نے پتا نہیں انگریزی میں کیا کہا ہوگا آپ کو کون سا سمجھ آتی ہے۔"
"انگریزی میں نہیں پنجابی میں وہ والی۔"
اس نے گالی دہرائی سب کے رونگٹے ایک لمحے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ سرفراز تو بلبلا اٹھا۔
"اماں جی پندرہ دن میں اس نے ہاں جی ناں جی کے علاوہ کچھ نہیں سیکھا آپ یہ کیا الزام لگا رہی ہیں۔"
"پچھ لے اس سے ہم اس نے مجھے کیا کہا ہے۔"
جوڈی دروازے سے لگی سہمی کھڑی تھی۔ اس کی سمجھ میں یہ سارا قصہ نہیں آرہا تھا مگر اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ بہت غلط بہت سنگین ہوا ہے..... شاید سہیل

نے اسے جو اکا دکا اردو اور پنجابی کے لفظ سکھائے تھے۔ ساس سسر کے دل جیتنے کے لیے ان کو وہی صحیح طرح سے یاد نہیں کرپائی۔ اس نے وہ لفظ غلط بول دیا جو کہ بقول سہیل کے بیوٹی فل کو پنجابی میں کہتے ہیں، ضرور اس نے غلط بول کے سارا مفہوم بدل دیا ہے۔ بدصورت کہہ دیا ہے۔ مصلحت اس میں ہے کہ اپنی انگریز نسل کی روایات پہ عمل کرتے ہوئے کیے کرائے سے ہی مکر جائے اس لیے جب سرفراز نے سارا قصہ دریافت کیا تو اس نے بھولپن سے کہہ دیا کہ میں نے صرف ریلیکس کہا تھا۔
اب دادی لاکھ واویلا مچائے کس نے یقین کرنا تھا۔ سہیل تلملا کے رہ گیا۔
کتنی مشکل سے یہ گالی جوڈی کی زبان پہ چڑھی تھی۔ پھر کچھ سوچ کے شکر بھی ادا کیا کہ اچھا ہوا جوڈی مکر گئی۔ ورنہ اس کا نام لے لیتی تو؟
"اچھا تو یہ جوڈی اس سرمئی چکیلی کریم سے بال مونڈتی ہے پنڈلیوں کے۔"
بعد میں کوثر اور راشدہ لگیں کھسر پھسر کرنے۔
"قیامت والے دن اس کی پنڈلیوں پہ گرم چمٹے مارے جائیں گے۔ قبر میں دیکھنا کیا عذاب اترتا ہے۔"
"ہائے ہائے..... میں کیوں اس کی قبر میں جھاتیاں ماروں؟"
کوثر نے راشدہ کے ڈرانے پہ جھرجھری لی۔
"ویسے راشدہ! اماں نے تو منہ سے اتارے ہیں بال، ان کے منہ پہ لگیں گے گرم چمٹے؟"
"نہیں بھول بھلیکے لگ جانے سے اللہ سزا نہیں دیتا..... اماں نے کون سا جان کے کیا ہے۔"
راشدہ نے ذرا مایوسی سے کہا۔ "ہاں پر چوری تو جان کے کی ہے۔ چوری کے دو چمٹے تو بنتے ہیں۔"
کوثر کی بات سے ذرا تسلی بندھی۔
"آہو..... دو تو بنتے ہیں۔"
دادی کو اس ساری رات نیند نہ آئی ایک جانب کروٹ بدلتیں تو وہی گالی، دوسری جانب کروٹ لیتیں تو وہی گالی اور.....
"سارے جو مرضی کہیں میں بڈھی ضرور ہو رہی ہوں میرے بارہ بھی ضرور بجتے ہیں مگر تیرہ نہیں بجتے جو مجھے سمجھ نہ آئے اس نے مجھے گال ہی نکالی تھی۔"
دادی کے دل میں جوڈی کے لیے نفرت انتہائی پختہ ہوگئی۔ اور ساتھ ساتھ سرفراز کے لیے شکایت بھی کہ ماں رو رو کے یقین سے بات کر رہی ہے مگر وہ بیوی پہ الزام برداشت ہی نہیں کرپا رہا۔ اسے ماں کا نہیں بیوی کا زیادہ یقین ہے۔
ایک دو دن اسی سرد مہری میں گزر گئے۔
دادی نے صبح صبح نہ تو سرفراز کے لیے بلوں والے پراٹھے بنائے..... نہ وعدے کے مطابق او جھڑی بھون کے دی۔ نہ جوڈی کو رنگ محل کے بازار چوڑیاں پہنوانے لے کے گئیں۔ نہ اپنی پرانی سہیلی بختاں کے ہاں لے کے گئیں۔ جوڈی کو گلی محلے میں پھرتی گائے بھینسیں دیکھ کے بہت حیرت ہوتی تھی اور جب سے سرفراز نے یہ بتایا تھا کہ ابھی بھی بہت سے لوگ ان کا گوبر بطور ایندھن استعمال کرتے ہیں تو وہ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے مچل گئی تھی۔
"آخر ہے ناں ذات کی چوڑی..... گوں بھی کوئی ایسی چیز ہے جسے دیکھنے کے لیے کوئی آپے سے باہر ہو جائے۔ نی صبر کر بختاں کے گھر لے جاؤں گی تجھے اس کے ویہڑے میں آٹھ نو گاواں اور گیارہ مجاں ہیں دو ترے کٹے بھی ہیں، رج کے ویکھ لینا۔"
اس زمانے میں ابھی شہر کی حدود سے مویشیوں کا انخلا شروع نہیں ہوا تھا ہر گلی میں ایک آدھ گھر ایسا تھا۔ جس کے آنگن میں بندھی گائے بھینسوں کا دودھ پڑوسیوں کو سپلائی ہوتا تھا..... ہر دوسرے گھر میں مرغیاں کڑکڑاتی پھرتیں اور وہ پہلا گھر جو دیسی مرغیوں سے محروم تھا اس گھر کی کوئی بچی صبح صبح دوسرے گھر جا کے وہاں کی مالکن کو اٹھنی پکڑا کے دو انڈے ضرور لے کے آتی..... اسی بختاں کے گھر کی سیر کسی ونڈر لینڈ کی طرح کرانی تھی دادی نے جوڈی کو مگر اب تو ان کا دل میم سے کھٹا ہوچکا تھا۔

کوثر اور راشدہ احتیاطاً اس سے کھنچی کھنچی سی تھیں کہ جب ساس کا موڈ ہی اس سے خوشگوار نہیں ہے تو وہ خوامخواہ ہنس بول کے ساس کی نظر میں کیوں بری بنیں..... بے چاری جوڈی اوپر والے کمرے میں اداس سی، اکیلی پڑی تھی۔ سرفراز ٹکٹوں کا انتظام کرنے گیا تھا۔ ان کا ارادہ اگلے ہفتے واپسی کا تھا تب ہی سہیل اپنی ٹیوشن دینے اوپر آگیا۔

پہلے تو بھابھی کی خدمت میں ریگل چوک کی فروٹ چاٹ اور بیڈن روڈ کی آئس کریم پیش کر کے اس کا موڈ ذرا..... بلکہ خاصا خوشگوار کیا گیا پھر اسے تسلی دی گئی کہ وہ بالکل دل اداس نہ کرے..... جب وہ یہاں سے رخصت ہوگی تو گھر کے ایک ایک بندے کے دل میں جگہ بنا چکی ہوگی۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کے ساتھ ان کی زبان میں چھوٹی چھوٹی بات کیا کرے، سارا مسئلہ اس زبان کا تو ہے۔ جس کی وجہ سے یہ فاصلے ہیں۔

سہیل اپنی ٹوٹی ہوئی بلکہ لولی لنگڑی انگریزی میں یہ باتیں جوڈی کو کیسے سمجھاتا تھا۔ وہ ایک الگ تفصیل طلب باب ہے۔ بہرحال کچھ this اور کچھ that کچھ I am اور کچھ you کچھ good اور کچھ bad کچھ Love اور کچھ hate کی مدد سے اور باقی سب کچھ ہاتھ کے اشاروں کی مدد سے اس نے جوڈی کو اس بات پہ تیار کر ہی لیا کہ وہ دل چھوٹا نہ کرے۔ نہ ہمت ہارے، اردو اور پنجابی اتنی بھی مشکل نہیں ہیں۔ بہت سے لفظ تو پنجابی اردو اور انگلش میں ایک ہی جیسے ہیں۔

جیسے گلاس، جیسے کوکا کولا جیسے آنٹی، جیسے پلیٹ..... جیسے کولر، جیسے ٹی وی جیسے فریج باقی سب وہ تھوڑا تھوڑا سکھا دیتا ہے۔ کم از کم اتنا کہ وہ جاتے جاتے اپنے دل کی بات سب کو کہہ سکے اور جو وہ جواب میں سنائیں ان کو سمجھ سکے۔

اس دن جوڈی نے بڑے دل سے اس سے کلاس لی اور سب باتیں ذہن نشین کرلیں۔

اس سے اگلے دن ریہرسل ہوئی اور سہیل نے اوکے کر دیا اور تیسرے دن وہ تاریخی واقعہ پیش آیا جس سے.....

"اماں میری واپسی کی سیٹ ہوگئی ہے۔"

سرفراز نے ماں کے گھٹنے تھامتے ہوئے کہا جو اس دن کی گالی والی بات سے ابھی تک ناراض تھیں۔

"ہیں..... کب جا رہا ہے؟"

"اگلے جمعے....."

دادی آنسو پونچھنے لگیں، لاکھ ناراضی سہی، بیٹے سے جدائی کا غم اپنی جگہ مگر.....

"اوہو..... اماں! روتی کیوں ہو؟ آتا جاتا رہوں گا ..... بلکہ میرے کاغذ پکے ہو جائیں تجھے اور ابے کو بھی بلاؤں گا پاس۔"

"ولایت؟"

"ہاں اپنے پاس ولایت۔"

تب تک حالات سنوارنے کی کوشش ہو رہی تھی، اس لیے آتے جاتے رہنے کے وعدے بھی ہو رہے تھے اور پاس بلانے کے عزائم کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔

"تیری زنانی مجھے رکھے گی؟"

"جوڈی بہت اچھی ہے اماں..... اس کا دل بڑا صاف ہے۔"

"زبان تے بڑی گندی اے..... اس دن مجھے گال دی۔"

"اوہو بس رہنے بھی دو اماں! وہ کوئی غلط فہمی تھی۔ بھول جائیں اسے، آپ نے بھی اسے کتنا برا بھلا کہا اور تو اور..... اس پہ ہاتھ تک اٹھا لیا وہ تو سب بھلائے آپ لوگوں کے لیے تحفے تحائف لے رہی ہے۔"

"ہیں تحفے؟"

"حالانکہ وہ آتے ہوئے بھی تحفے لائی تھی۔ اب جا رہی ہے تو اس کا حق بنتا ہے اور آپ سب کا فرض بھی کہ اسے تحفے دے دلا کے رخصت کریں خیر کم از کم اتنا کر دیں کہ اس سے سیدھے منہ بات کریں۔"

سرفراز کی خواہش تھی..... تین چار دن میں اس کے جانے میں سب معاملات ہنسی خوشی سیٹ ہو جائیں۔ وہ اور جوڈی سب کے لیے تحفے بھی لے آئے تھے۔ رات کے کھانے پہ دادی نے بھی سب گلے شکوے بھلا کے اپنے ہاتھ سے تنجن بنایا، پالک گوشت اور توے والی مچھلی..... شامی کباب راشدہ نے سل پہ خوب دل لگا کے پیسے کوثر کو جان بوجھ کے چولہے کے پاس نہ پھٹکنے دیا گیا کہ اس کا ہاتھ سخت بدذائقہ تھا۔ پلاؤ بھی پکاتی تو کھانے والے کے منہ میں کھچڑی کا ذائقہ آتا۔

کھانے کے بعد اشرف کنجوس کے لائے پان کا دور چلا۔ سہیل نے موج میں آ کے سب کو ٹھنڈی ٹھار والی بوتل سوڈا پلانے کا اعلان کیا، مگر اس کے پیسے بچ گئے کیونکہ اس سے پہلے کہ وہ جیب ڈھیلی کرتا اور سوڈا پلا کے سب کے معدوں میں ڈرون حملے کراتا..... وہ ایٹم بم پھٹ گیا۔

"جوڈی سب سے پہلے ابا جی کو تحفہ دو۔"

سرفراز نے بیوی کی واہ واہ کرانی چاہی۔

جوڈی مسکراتے اتراتے اٹھی اور لفافے سے ریشمی کرتے کا کپڑا نکال کے دادا جی کے کاندھوں پہ پھیلایا۔

"واہ جی واہ، ابا جی تے سج گئے۔" اشرف نے داد دی۔

اس کے بعد جوڈی نے دادی کی خدمت میں کریم کی شیشی پیش کی، نہ ویکس کی نہ تبت سنو کی بلکہ ولایتی nivea کی پھر راشدہ اور کوثر دونوں کو جاپانی سلک کا سوٹ، ان کے بچوں کے لیے نقی مارکیٹ سے لیے فراک اور نیکر، چابی والے کھلونے، اشرف اور سہیل کے لیے بھی سوٹ کا کپڑا۔

اب سب نے خوب گھٹ گھٹ کے جوڈی کو گلے سے لگایا اور پھر دھماکا ہو ہی گیا۔

جوڈی نے دادی کے گلے لگتے ہی فرط جذبات سے مچل کے کہا۔

"یو کمینی چڑیل۔"

دادی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے ایک جھٹکے سے خود سے الگ کیا..... باقی سب بھی حیرانی سے دیکھ رہے تھے وہ چٹاچٹ دادی کے گالوں کے بوسے لیتے کہہ رہی تھی۔

"چوڑیل، چوڑیل۔"

اس کے بعد ہکا بکا کھڑے دادا جی کے پاس جا کے سر جھکا کے ادب سے کہنے لگی۔

"آئی ول مس یو کالا کوا۔"

کوثر کے دونوں لڑکے اجمل اور اکمل ٹھٹھا مار کے ہنس پڑے، کوثر نے انہیں چپ کرانے کے لیے بہتیری "شش، شش" کی مگر وہ لوٹ پوٹ ہو رہے تھے۔

"سرفراز! دیکھ پتر تیری زنانی مجھے کیا کہہ رہی ہے۔"

دادا جی نے حیران پریشان کھڑے سرفراز سے کہا تو وہ سکتے سے نکلا اور جوڈی کو اندر لے جانے کے لیے بڑھا۔

"کم آن جوڈی اسٹاپ اٹ۔"

مگر اب جوڈی بے تحاشا ہنستے ہوئے اکمل اور اجمل سے پوچھ رہی تھی۔ "کیا ہوا۔"

اور جواب نہ ملنے پہ اشرف سے ہاتھ کے اشارے اور لنگڑی اردو میں کہنے لگی۔

"اشرف بائی جھان کیا ہوا۔ آپ کا کتوراز کو؟"

"کی؟" اشرف آگ بگولا ہو گیا۔

"اکمل، اجمل your کتوراز۔"

اشرف کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا اور سرفراز کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

"میرے بچوں کو کتے کے بچے کہہ رہی ہے۔ کتورے بنا ڈالا، سرفراز ایہہ لے پھڑ اپنا تحفہ۔"

اشرف سوٹ سرفراز کے منہ پہ مار کے دھپ دھپ کرتا اندر چلا گیا۔

جوڈی حیرت سے مڑی۔

"سرفراز تمہارا لانتی (لعنتی) برادر۔"

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی..... سرفراز نے آگے بڑھ کے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ دیا۔

اس کی حیرت سے بھری آنکھیں مزید کھل گئیں۔ اسے لگا سرفراز اسے مارنے لگا ہے۔ وہ پھڑ پھڑانے لگی۔

"لگتا ہے تیری زنانی "پیتی" ہے۔" دادی نے قیاس ظاہر کیا۔

"اس دن بھی چسکیاں لگائی ہوں گی..... اسی لیے مجھے گندی گالی دی۔ مگر تو نہ مانا' اب یقین آیا کہ کیسی گندی زبان ہے اس کی۔"

"جوڈی! اوپر چلو۔"

سرفراز اسے کھینچتا ہوا اوپر لے جا رہا تھا۔ وہ بھرپور مزاحمت کر رہی تھی کیونکہ یہ سارا معاملہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ اپنی دانست میں تو اس نے ایک اچھی بہو بننے کی پوری کوشش کی تھی پھر سرفراز اسے مارنے اور کمرے میں لے کے قید کرنے کے درپے کیوں ہے۔

اس کے شور مچانے پہ سرفراز نے سیڑھیوں کے عین درمیان اس پہ گرفت ذرا ڈھیلی۔

راشدہ کو پتا نہیں کیوں لگ رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے اور جوڈی کے ساتھ کچھ ہاتھ ہوا ہے وہ اس کی ہمدردی میں پانی کا گلاس لیے سیڑھیوں تک گئی۔

"سرفراز بھائی اسے پانی دو..... اس کا سانس پھول رہا ہے پھر آرام سے اندر لے جا کے بات کرنا۔"

سرفراز کے ہاتھ سے پانی لے کے جوڈی وہیں سیڑھیوں پہ بیٹھ کے غٹا غٹ چڑھانے لگی۔

"آن دے سہیل کو اس راشدہ کا تو مکو ٹھپنی ہوں وڈی ھیجلی' کیسے پانی لے کے گئی ہے سگی کے لیے۔"

دادی نے دانت کچکچا کے کہا۔

اور جیسے ہی جوڈی نے راشدہ کو گلاس واپس کرتے ہوئے شکریہ ادا کیا۔ سب کے ہاتھوں کے طوطے' کبوتر' چڑیاں سب کچھ اڑ گئے...... راشدہ کے ہاتھوں سے گلاس گر گیا۔

"کیونکہ جوڈی نے شکریہ اپنی مادری زبان میں نہیں بلکہ اپنے تئیں پنجابی یا اردو میں ادا کیا تھا' مگر اس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ وہ گھر بھر کے سامنے منہ پھاڑ کے کیسے نازیبا اور معیوب لفظ ادا کر چکی ہے۔

ذرا حواس قابو میں آتے ہی راشدہ نے سرفراز کے سامنے شرم محسوس کرتے ہوئے دوپٹے کا پلو منہ پہ ڈالا اور بیگ شٹ اندر بھاگی۔ دادا جی دل پہ ہاتھ رکھے بیٹھ گئے۔

"بڑا کہتا تھا۔ میم لا رہا ہوں۔ اک ہور سکھنی آ گئی گند بکنے والی۔"

✡ ✡ ✡

قصہ ختم۔

دادی ان سب کو 1978ء سے واپس لے آئی تھیں۔

بی لہری سے ہیش ریشما کے زمانے میں۔

ہیلن سے ملیکا شراوت اور ملائکہ اروڑا کے دور میں "لیلیٰ میں لیلیٰ' ایسی میں لیلیٰ ہر کوئی چاہے مجھ سے ملنا اکیلا" سے "منی بدنام ہوئی" اور "جلیبی بائی تک۔"

راجیش کھنہ سے ہرتیک روشن تک۔

اور ممتاز سے کرینہ کپور تک۔

سب منہ کھولے سن رہی تھیں اور دادی کے پوپلے منہ پہ دبی دبی سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے کسی بچے کی شرارت پہ ماں پہلے اسے اوپر اوپر سے خوب لتاڑے اور بعد میں دوپٹے میں منہ چھپا کے مسکرائے۔

"تو یہ تھا سارا قصہ۔" روبینہ نے مٹکا سا سر ہلایا۔

"میں تو پہلے فریحہ سے کہہ رہی تھی کہ دیکھ لینا یہ تیرے ہی ابا جی کا کوئی کارنامہ ہو گا۔"

مسرت نے اپنی قیافہ شناسی کی داد چاہی۔ البتہ فریحہ سر جھکائے شرمندہ سی بیٹھی تھی۔

ارم الگ تاؤ کھا رہی تھی۔

"آنے تو دو میم چاچی کو..... میرے ویروں کو کتورے بولا اس نے۔"

"بتا تو دیا ہے..... اس بے چاری کا قصور نہیں ہے وہ تو جب اس کے منہ سے واہیاتی سن کے سرفراز نے لگایا ایک رپٹا تو وہ رو رو کے سہیل کو مدد کے لیے بلانے لگی۔ اوپر سے سہیل غائب اب ہوں تو میں ماں' اپنی اولاد کا سب سے زیادہ ماں کو ہی پتا ہوتا ہے۔ مجھے پکا یقین ہو گیا کہ یہ تیلی سہیل نے لگائی ہے۔ میں نے بھیجا اشرف کو' مجھے پتا تھا سہیل کدھر ہو گا۔"

"یعنی آپ نے تاؤ جی کو بھیجا کہ ابا جی کو پکڑ کے لائیں۔"

"نہیں..... میں نے اس لیے بھیجا اشرف کو کہ وہ سہیل کو خبردار کر دے کہ سرفراز کو سارا کچھ پتہ چل گیا ہے' وہ اس جمعے تک گھر نہ آئے۔"

"اوہ..... میں بھی کہوں۔ آپ اتنی انصاف پسند کب سے ہو گئیں۔" ارم بڑبڑائی۔

"پر سہیل' اشرف کے ہاتھ نہ لگا۔ آگیا شامی گھومتا گھامتا اور سرفراز کے ہتھے چڑھ گیا۔"

"واہ جی' فیر تے سرفراز چاچا جی نے سہیل چاچا جی کی بڑی شامت لائی ہو گی۔"

روبینہ نے چسکارا ابھرا۔

"بس میری غلطی..... جوڈی کی ضد میں اس میم نوں کی چڑ میں میں نے سہیل کی طرف داری کی اور سرفراز رس گیا۔ جمعے کے بجائے اسی دن گھر سے نکل گیا۔ ہورے کسی ہوٹل میں رہا پھر تب کا گیا' آج آ رہا ہے خیر سے۔"

"ویسے دادی۔" روبینہ ذرا اور پاس کھسکی۔

"اک بات تو بتائیں؟"

"کی اے؟"

دادی اس کی قربت سے ذرا مشکوک ہوئیں..... عام حالات میں وہ کہاں اتنا منہ لگاتی تھی دادی ساس کو۔

"آخر جوڈی چاچی نے راشدہ چاچی کو کہا کیا تھا؟"

"تیرا سر۔" دادی کو جلال آ گیا۔

"لعنت میرے تے..... جس نے تم شہدیوں کو اتنا بڑا راز بتا دیا۔ اب چسکے لے رہی ہو..... میں نہیں بتانے والی۔"

پھر ذرا سی سنجیدہ اور بہت سی رنجیدہ ہو کے کہنے لگیں۔

"ویسے بھی وہ دن..... تے آج کا دن..... میں نے اپنی زبان صاف کر لی ہے۔ سرفراز نے اس دن غصے میں جو کچھ کہا وہ مجھے برا تو بڑا لگا..... میں نے اسے بڑی لعنتیں دیں کہ دفع ہو۔ اپنے خاندان اپنی نسل کو برا کہتا ہے۔ اپنے ماں پیو کی تربیت میں کیڑے نکال رہا ہے۔ مگر بعد میں اس کی باتیں یاد آئیں تو سوچا۔ صحیح ہی تو کہتا تھا وہ کہ کی فیدہ ہمارے پنج وقت وضو کرنے کا' زبان تو پلید رہی ہے ہر ویلے گالیاں نکال نکال کے۔ بندے کے اندر سے شرم و حیا اور غیرت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ غیرت رہتی تو سہیل بھائی کو ایسی واہیات باتیں کیوں سکھاتا..... مذاق مذاق میں ہی سہی..... غلطی میری تھی۔ ماں کے اپنے اندر نقص ہوں تو اولاد کو کیا دے گی..... میں نے ہمیشہ اپنی نسل در نسل سیکھی گالیوں پہ فخر کیا تھا کہ میرے آگے لڑائی میں کوئی ٹک نہیں سکتا۔ پھر جب سہیل نے میرے سے سیکھ کے گالیاں نکالنا شروع کیں تو میں کس منہ سے روکتی۔ ہاں پر اس واقعے کے بعد میں نے اور سہیل دونوں نے بدزبانی چھوڑ دی..... اور نہ آگے سے بچوں کو سیکھنے دی۔"

"ہائے ہائے تے فیر میرے بندے کے منہ میں زہر کون ڈال گیا۔ وہ تو مجھے دن رات گالیوں میں تولتا ہے۔"

روبینہ نے دہائی دی تو دادی نے چٹکی سی بھری۔

"کچھ لوگ ہوتے ہی اس قابل ہیں کہ ان کو دیکھ کے بندہ قسم بھی توڑ دے۔ نی روبینہ! تیرا گالیوں کے علاوہ بھی کوئی علاج ہے؟"

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

حمیرا کلیم

سبز رُتوں کا موسم

غصے اور پریشانی کے سبب تائی اماں کا بلڈ پریشر آسمان کو چھونے لگا تھا۔ جتنا وہ اپنا دھیان اِدھر اُدھر کے کاموں میں لگانے کی کوشش کرتیں' اتنا ہی کچھ دیر پہلے کا منظر آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتا اور وہ آنے والے وقت کا سوچ کر ہول جاتیں۔ آج انہوں نے بالآخر اپنے شوہر سے بات کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

"چاہے دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے' میں یہ سب نہیں ہونے دوں گی۔" کڑھتے دل سے انہوں نے سوچا اور پھر وہ نوید صاحب کے دفتر سے آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ لیکن آج تو وقت کاٹے نہیں رہا تھا۔

خدا خدا کر کے شام ہوئی اور نوید صاحب اور عدیل دونوں دفتر سے آئے تو ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ انہیں چائے دینے سے پہلے ہی اپنی داستان سنانا شروع کردیں۔

"بھئی اب تو آپ مجھے بتا ہی دیں کہ کس بات نے آپ کو پریشان کر رکھا ہے۔" خلاف توقع خبرنامہ سننے کے بعد ٹاک شو دیکھے بغیر وہ کمرے میں آکر بولے۔

جواب میں انہوں نے نہایت خشمگیں نگاہوں سے انہیں گھورا۔

"شام سے دیکھ رہا ہوں کہ نوین کو آپ بلاوجہ دوبار ڈانٹ چکی ہیں' کھانا آپ نے کھایا نہیں ورنہ آپ کو پتا چلتا کہ نمک کتنا تیز ڈلا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے گویا ہوئے۔

"آپ کو نمک کی پڑی ہے اور میں جو صبح سے پریشان ہوں' اس کا اندازہ ہے آپ کو؟" گویا لاوا ابلنے کو بے تاب تھا۔

"کس نے شیر کی کچھار میں ہاتھ ڈالنے کی جرأت کی ہے۔" وہ مسکراہٹ دباتے ہوئے بولے۔

"مسکرالیں۔ مسکرالیں... پر جب بیٹے کی زندگی خراب ہوگی تو پوچھوں گی۔"

"کون کس کی زندگی خراب کر رہا ہے' پتا بھی تو چلے۔" وہ ہنوز مطمئن تھے۔

"میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ثمرین ایسی حرکت بھی کر سکتی ہے۔ مجھے عدیل کی شادی ثمرین سے نہیں کرنا۔"

اب نوید صاحب چونک گئے اور سنجیدہ ہو گئے۔

"کیا مطلب ہے آپ کا؟ ایسا کیا ہو گیا؟"

"آج صبح میں ثانیہ کے یہاں گئی تو عازم نے بتایا کہ امی درزی کے پاس گئی ہیں۔ عازم کے دو دوست آئے ہوئے تھے۔ اس نے ثمرین کو ان کے لیے کولڈ ڈرنک لانے کو کہا۔ میں کچن کے دروازے پہ پہنچی تو....."

ان کی آنکھیں بے اختیار بھر آئیں۔ وہ خاموش ہو کر آنکھیں صاف کرنے لگیں۔

"تو!..... تو کیا؟ صاف بات کریں۔" انہوں نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"آپ کی لاڈلی نوین بھی اس کے ساتھ کچن میں تھی اور...... جانتے ہیں' ان دونوں نے کیا کیا؟" انہوں نے لہجے کو مزید پُراسرار بنایا۔

"ثمرین کے ہاتھ میں کوک کی بوتل تھی۔ اس نے بوتل گلاسوں میں ڈالی تو وہ بمشکل دو گلاس نکلی۔" اتنا

کہہ کر وہ سانس لینے کو رکیں اور دوبارہ اپنی آنکھیں پونچھیں۔

"پھر!" نوید صاحب نے اب کے بے صبری سے پوچھا۔

"آپ کی لاڈلی نوین نے برف کے کیوبز سے دونوں گلاس بھر دیے۔ لیکن عازم سمیت تین لڑکے ڈرائنگ روم میں تھے پھر۔۔۔" اب کے یکدم ہی ان کا لہجہ بدل گیا اور انہوں نے بے اختیار مٹھیاں بھینچ لیں۔

"پھر ثمرین نے جانتے ہیں کیا کیا؟" گلا رندھ گیا۔

"اس نے پانی کا جگ لیا' اس میں دونوں گلاسوں کی کولڈ ڈرنک برف سمیت انڈیلی۔ ایک گلاس پانی ملایا۔ چمچ چلا کر اچھی طرح ملایا اور پھر تینوں گلاسوں میں بھر کے بھیج دی۔ میں تو دیکھتی رہ گئی اور۔۔۔۔"

زوردار قہقہے کی آواز پہ انہوں نے ڈبڈبائی نظروں سے سامنے دیکھا تو نوید صاحب ہنس ہنس کر دوہرے ہو رہے تھے۔ چند لمحوں کے لیے وہ چپ سی رہ گئیں' پھر آنسو مزید زور و شور سے بہنے لگے جبکہ وہ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ اپنے آنسوؤں کا ان پر کوئی اثر نہ پا کر وہ زور سے کمرے کا دروازہ بند کر کے باہر چلی گئیں۔

☆ ☆ ☆

نوید صاحب اور وحید صاحب' دونوں بھائیوں میں بے پناہ پیار تھا اس وجہ سے انہوں نے گھر بھی ساتھ ساتھ بنائے تھے ان کی بیگمات بھی بے انتہا سلوک سے رہتی تھیں۔

نوید صاحب بڑے بھائی تھے اور ان کا بڑا بیٹا عدیل اور پھر بیٹی نوین تھی جبکہ وحید صاحب کی بڑی بیٹی ثمرین اور چھوٹا بیٹا عازم تھا۔ عدیل امریکہ سے ایم بی اے کر کے آیا تھا اور اپنے والد کے بزنس کو بڑھا رہا تھا۔ عدیل انتہائی سلجھا ہوا دھیمے مزاج کا لڑکا تھا۔ اس کی بات ثمرین سے تب سے طے تھی' جب ثمرین کا میٹرک کا رزلٹ آیا تھا۔ اس وقت نوید صاحب نے اسے گلے لگا کر اپنی بیٹی بنانے کا اعلان کیا تھا اور تہمینہ بیگم نے سونے کا نازک سا سیٹ شگن کے طور پر اسے پہنا دیا تھا۔

وحید صاحب اور ثانیہ بیگم کو بھی اس رشتے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ دونوں بھائیوں نے چونکہ ساتھ ساتھ گھر بنائے تھے اور گھر کی مشترکہ دیوار میں دروازہ نکال رکھا تھا سو ان کا آنا جانا اسی راستے سے ہوتا تھا۔

نوین اور ثمرین میں بمشکل دو مہینے کا فرق تھا اس لیے ان کی آپس میں بہت دوستی تھی۔ جب بھی کہیں کوئی "تخریب کاری" ہوتی تو سب کو پتا چل جاتا تھا کہ ان دونوں کا ہی کارنامہ ہے۔ دونوں کی سہیلیاں ایک تھیں مشغلے ایک سے تھے' کوئی کام بغیر مشورے کے نہیں کرتی تھیں' ایک دوسرے پہ جان چھڑکتی تھیں اور ہر وقت ساتھ رہتی تھیں۔ دونوں اکٹھے ہی ماسٹرز کر رہی تھیں اکنامکس میں۔

اگرچہ دونوں ہی اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی رہتی تھیں اور سب ہی ہنس کر ٹال دیا کرتے تھے مگر گزشتہ سات' آٹھ مہینوں سے ثمرین کا رویہ تہمینہ بیگم کو ناگوار گزرنے لگا تھا اور اس کی وجہ "عدیل" تھا۔

وہ جتنا سنجیدہ اور ذمہ دار طبیعت کا مالک تھا' ثمرین اتنی ہی ہنسی کھیل تماشوں کی شوقین تھی۔ اگرچہ وہ دونوں ہی ساتھ پلے بڑھے تھے مگر دونوں میں کبھی روایتی منگیتروں والی چھیڑ چھاڑ اور گپ شپ نہیں ہوئی تھی۔ دونوں بالکل عام طریقے سے ملتے اور بات چیت کرتے تھے۔ دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لیے کیا جذبات ہیں' یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہی ہنسی کھیل اور حرکتیں۔۔۔۔ جن پر کبھی تائی امی کو پیار آتا تھا' اب ان سے چڑ ہو گئی تھی اور جب بھی وہ آنے والے دنوں کا تصور کرتیں' انہیں بیٹے کی زندگی نہایت ناکام نظر آنے لگتی' ان کے خیال میں ان کی بیٹی نوین کو بگاڑنے میں بھی ثمرین کا ہاتھ تھا۔ زندگی سے بھرپور کھلکھلاتے قہقہے ان کی سماعتوں پر گراں گزرنے لگے تھے۔ پھر انہوں نے نوین کو ثمرین سے دور رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆ ☆ ☆

دونوں کے قہقہے ٹی وی لاؤنج سے باہر تک آ رہے تھے' عدیل اپنے کمرے میں جاتے جاتے رک گیا اور آہستگی سے اندر چلا آیا۔ دس مرتبہ کی دیکھی ہوئی "ہوم الون" دیکھتے ہوئے بھی ان کا انداز ایسا تھا' جیسے پہلی بار دیکھ رہی ہوں۔

ارد گرد پھیلے ہوئے کشنز پر ہنستے ہنستے دونوں دوہری ہو رہی تھیں۔ وہ ایک نظر دیکھ کر مسکراتے ہوئے مڑنے لگا تھا کہ ثمرین ہنستے ہوئے سیدھی ہوئی۔ آنکھوں میں آیا پانی' چہرے پر لاپروائی سے آئی لٹیں۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیچھے کرتے ہوئے کیچر کھول کر باندھنے لگی۔ ڈارک براؤن کمر تک جھولتے سلکی بالوں نے ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ ڈھانپ لیا اس نے لمحوں میں بال دوبارہ لپیٹ کر باندھ لیے مگر وہ ان چند لمحات کے سحر میں کھو سا گیا۔

اس پل پہلی بار اس کا دل بے ایمان ہوا اور وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔ یوں جیسے چاند پر ایک لمحے کے لیے بادل آئے اور تیرتے ہوئے گزر گئے۔

"نوین! یہ کیا بدتمیزی ہے؟" تیز آواز پر جہاں عدیل ہڑبڑا کر مڑا' وہ دونوں بھی چونک گئیں۔ جانے وہ کب آئی تھیں' یہ منظر دیکھ کر ان کا پارہ چڑھ گیا۔

ان دونوں کو دروازے پر کھڑے دیکھ کر وہ دونوں سنجیدہ ہو گئیں۔ فوراً ہی دوپٹہ درست کر کے سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں اور آواز کم کر دی۔

"ہم فلم دیکھ رہے تھے۔"

"کب بڑی ہو گی تم دونوں؟ بچوں جیسی حرکتیں کرتی رہتی ہو۔ کوئی دیکھے تو کیا کہے گا۔ شرم کرو۔" عدیل کے سامنے غصہ دباتے ہوئے وہ ناگواری سے بولیں۔

"اور تم کب آئے؟" یکدم وہ اس کی طرف متوجہ ہوئیں' جو اس طرح پکڑے جانے پر کھسیاتا ہوا کھڑا تھا۔

"بس ابھی آیا تھا۔ ان کے ہنسنے کی آواز پر دیکھنے آ گیا کہ کیا ہوا ہے۔" اس نے گھبرا کر وضاحت دی۔

"تم کپڑے بدل لو۔ میں کھانا لگواتی ہوں۔" اسے وہاں سے بھیج کر وہ پھر ان کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"بند کرو ٹی وی اور نوین! کھانا لگاؤ پھر کمرے میں آ کر میری بات سن جاؤ اور بڑے بھائی کے سامنے دونوں تمیز کے دائرے میں رہا کرو۔" وہ کہہ کر چلی گئیں جبکہ وہ حیران پریشان ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"بھائی۔۔۔!" نوین اس کی جانب اشارہ کر کے شوخی سے بولی پھر دونوں کے قہقہے بے ساختہ تھے۔

☆ ☆ ☆

دن پر لگا کر گزرتے گئے۔ دونوں کے امتحانات بھی قریب آتے جا رہے تھے' لہٰذا کافی حد تک دیگر دلچسپیاں کم کر کے پڑھائی کو وقت دیا جا رہا تھا' مگر جب بھی موقع ملتا' دونوں اس سے ضرور فائدہ اٹھاتی تھیں۔

کبھی ثمرین کی وجہ سے انہوں نے نوین کو ڈانٹ ڈپٹ کرنا چاہی تو ہر مرتبہ نوید صاحب آڑے آ جاتے اور انہیں خاموش کرا دیتے۔ اگرچہ انہوں نے دبی دبی آواز میں اپنا نکتہ نظر انہیں دوبارہ سمجھانے کی کوشش

کی تھی مگر نوید صاحب نے دو ٹوک انداز میں ان کو چپ کرا دیا تھا۔

شروع میں انہوں نے اپنی پوری کوشش کی کہ عدیل کے سامنے ان کی اوٹ پٹانگ حرکتیں نہ آئیں مگر پھر وہ خود ہی پیچھے ہٹ گئیں' اچھا ہے کہ خود دیکھ لے اور انکار کر دے۔

تہمینہ بیگم کے تیور تانیہ بیگم کو بھی پریشان کر رہے تھے۔ انہوں نے بارہا ثمرین کے لیے ان کے انداز میں ناگواری دیکھی تھی۔ انہوں نے چاہا بھی کہ ثمرین کو سمجھائیں مگر اس کے امتحانات کی وجہ سے رک گئیں وہ اسے پریشان نہیں کرنا چاہتی تھیں وحید صاحب سے بھی اس لیے بات نہ کی کہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان کا وہم سمجھ کر ٹال نہ دیں' لیکن بات بہر حال پریشانی کی تھی۔

☼ ☼ ☼

سہانی شام نے چار سو اپنے پر پھیلائے تو وہ کاٹن کے سوٹ میں ملبوس آستینیں موڑتا' اپنے کمرے سے باہر آیا۔ اپنے تصور میں آئے دلکش چہرے کو مسکرا کر سوچتے ہوئے وہ چچا کے گھر کے درمیانی دروازے کو عبور کر کے ان سے ملنے جا رہا تھا۔

وہ یورپ کے تقریباً" بیس دن کے کاروباری دورے کے بعد آج دوپہر ہی واپس آیا تھا۔ اس وقت سب سو رہے تھے' سو اب وہ تازہ دم ہو کر ان سے ملنے چلا آیا۔ اندر سے آتی شور و غل کی آوازوں پر وہ بے ساختہ مسکرایا۔ یقیناً" سب سے پہلے وہی نظر آئے گی۔ وہ اس کے خوش کن تصور میں گم تھا کہ اچانک کوئی سخت سی چیز اڑتی ہوئی آئی اور سیدھا اس کے سر پر لگی۔

"آہ!" وہ کراہ کر سر پکڑ کر رہ گیا۔ حقیقتاً" اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

"آوٹ..... آوٹ.....'' اور ساتھ ہی کوئی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا اور وہ جو دروازے کے ساتھ ہی کھڑا تھا' اس سے ٹکرا کر لڑکھڑا گیا۔

"آپ.....!" ساری تکلیف لمحوں میں دور ہو گئی۔

"کیا دعائیں اتنی جلدی بھی قبول ہوتی ہیں؟" سر سہلاتے ہوئے اس نے سوچا۔

"کب آئے آپ؟ ہائیں! آپ اپنا سر کیوں دبا رہے ہیں؟ کیا درد ہے؟"

گہرے نیلے اور سفید رنگ کے پرنٹڈ سوٹ میں کمر پر دوپٹہ باندھے' چہرے پر ہلکا سا پسینہ' بھاگنے سے سرخ ہوتا چہرہ..... اس کو اپنی تکلیف بھلانے کے لیے کافی تھا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھے گیا۔

"ثمی آپی! کہاں گئیں آپ؟" عازم ہاتھ میں بلا لیے وہیں چلا آیا۔ پیچھے ہی نوین بھی آ گئی۔

"اوہ عدیل بھائی! کب آئے آپ؟" وہ خوشی سے اس سے لپٹ گیا تو وہ بھی مسکرا دیا جبکہ ایک ہاتھ بدستور سر پر تھا۔

"آپ کے سر کو کیا ہوا؟" نوین نے تشویش سے پوچھا۔

"پتا نہیں کوئی چیز زور سے آ کر سر پر لگی ہے۔" وہ سر سہلاتے ہوئے بولا جبکہ اس کی بات پہ وہ تینوں کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

"چوٹ تو نہیں آئی؟" زور سے آتی ہنسی کو بمشکل ضبط کرتے ہوئے ثمرین نے پوچھا۔

"نہیں' زیادہ درد نہیں ہے۔" سر میں اٹھتی ٹیسوں کو برداشت کرتے اسے دیکھا۔

"شکر ہے' مگر پہلے تلاش تو کرو وہ کہاں گرا ہے۔" عازم بولا۔

اور وہ تینوں جو اس کے ساتھ اندر کی جانب بڑھ رہے تھے' واپسی کے لیے مڑ گئے۔ وہ اپنی حیرانی کو پس پشت ڈال کر انکل آنٹی کی طرف بڑھ گیا جو کہ امی ابا کے ساتھ چائے پر اس کا انتظار کر رہے تھے۔

ڈرائنگ روم میں چائے کے دوران باہر سے وقفے وقفے سے ہنسنے اور شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تہمینہ بیگم ناگواری سے بار بار پہلو بدل رہی تھیں۔ ان کی ناگواری کا احساس تانیہ بیگم کو بخوبی ہو رہا تھا' لہٰذا انہوں نے رشیدہ کو آواز دے کر بلایا اور ان تینوں کو بلوا لیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ اندر آ گئے تھے۔

"آپ نے بلایا امی!" عازم ہاتھ میں پکڑی ہوئی کوئی چیز ہوا میں اچھال کر کیچ کرتے بولا۔

"ثمرین بیٹا! چائے کے برتن سمیٹو اور اندر لے جاؤ۔" انہوں نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا۔

"مما! اس کام کے لیے آپ نے مجھے بلوایا ہے؟ رشیدہ کہاں ہے؟" وہ لاپروائی سے بولی۔ اس بات سے بے خبر کہ تائی امی نہایت تنقیدی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھیں اور جتاتی نظروں سے نوید صاحب کو بھی دیکھا مگر وہ نظر انداز کر گئے۔

"ہماری بیٹی کس کام میں مصروف تھی؟" نوید صاحب شفقت سے مسکرا کر بولے۔

"ہم کرکٹ کھیل رہے تھے۔"

"وہ بھی ہارڈ بال سے۔" عازم نے لقمہ دیا تو وہ دونوں بے اختیار ہنسنے لگیں۔

"مطلب؟" وہ بھنویں اچکا کر بولے۔

"مطلب یہ کہ رات کو ان دونوں نے کوکنگ شو دیکھ کر بسکٹ بنانا سیکھے اور..... یہ دیکھیں!" عازم نے جھٹ ہاتھ آگے کر کے انہیں بسکٹ دکھایا' عدیل نے بسکٹ لے کر اس کا بغور جائزہ لیا۔

"بنے تو اچھے ہیں' بس ٹوٹ نہیں رہے۔"

"پہلے تو انہیں دیوار پر مارنے کی کوشش کی مگر جب نہیں ٹوٹے تو اب ہم اس ہارڈ بال سے کرکٹ کھیل رہے تھے۔"

تینوں کی ہنسی بے اختیار تھی۔ عدیل کا ہاتھ بے اختیار اپنے سر کی جانب چلا گیا۔ تایا ابا کھل کر مسکرا دیے جبکہ چچی نے تائی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر فوراً" اسے گھر کا۔

"یہ کیا بچپنا ہے' چلو برتن اٹھاؤ اور جا کر دیکھو کہ رشیدہ کیا کر رہی ہے۔"

وہ اسے فوراً" سامنے سے ہٹانا چاہ رہی تھیں۔ ان کی چھٹی حس کچھ غلط ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔ اتنے میں تہمینہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"میں ذرا رات کے کھانے کی تیاری کر لوں۔" وہ فوراً" چلی گئیں۔

☼ ☼ ☼

رات کھانے کے بعد وہ کمرے میں آیا اور اپنا بیگ کھولنے لگا' جس میں وہ سب کے لیے گفٹس لایا تھا اسی وقت نوین کمرے میں آ گئی۔

"کیا کر رہے ہیں بھائی؟" وہ بیگ میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "واؤ! گفٹس ہیں۔ پہلے مجھے میرا گفٹ دیں۔" وہ بے صبری سے بولی۔

"یہ لو! یہ تمہارے لیے ہے۔" وہ ایک پیکٹ اسے پکڑاتا ہوا بولا۔

"اور یہ باقی؟" وہ باقی پیکٹ دیکھتے ہوئے بولی۔

"ندیدی! یہ امی ابو اور چچا کی فیملی کے لیے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"اوہ!" اس نے معنی خیزی سے آنکھیں گھمائیں۔

"اور اس کے لیے یقیناً" کوئی خاص چیز ہو گی' مجھے بھی دکھائیں۔" وہ بیگ میں جھانکتے ہوئے بولی تو عدیل کے لبوں پہ ایک دلکش مسکراہٹ پھیل گئی۔

"دکھاتا ہوں صبر تو کرو۔" اتنے میں تہمینہ بیگم کمرے میں آ گئیں۔

"امی! دیکھیں بھائی سب کے لیے تحفے لائے ہیں۔ ہمارے لیے بھی اور چچا کے لیے بھی۔"

وہ مسکرا دیں اور دونوں کو چائے کے کپ پکڑا کر ادھر ہی بیٹھ گئیں اور گفٹ دیکھنے لگیں۔ سارے تحائف وہ کھول کر دکھا رہا تھا تب ہی نوید صاحب آ گئے۔

"بھائی! ثمرین کے لیے کیا لائے ہیں؟ دکھائیں نا۔"

نوین نے کہا تو وہ امی ابو کی موجودگی میں جھینپ گیا' جبکہ تہمینہ بیگم کی مسکراہٹ فوراً" سمٹ گئی۔

عدیل نے بیگ میں سے ایک چھوٹی سی ڈبیا نکالی تو انہوں نے فوراً" لے کر کھول لی' نفیس سا گولڈ کا بریسلیٹ تھا۔

"واؤ بھائی! بہت خوب صورت ہے۔" اس نے ستائشی انداز میں کہا نوید صاحب نے بھی اس کی تائید

کی جبکہ وہ چپ رہیں۔

"چلیں بھائی! سب کو ابھی گفٹس دے کر آئیں۔" نوین فوراً" اٹھتے ہوئے بولی۔

"ابھی جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ سب آرام کر رہے ہوں گے۔" تہمینہ بیگم نے ٹھنڈے انداز میں انہیں روک دیا۔

"بیگم! گھر کی بات ہے۔ کون سا اتنا زیادہ وقت ہو گیا ہے، صرف نو تو بجے ہیں۔" وہ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھتے بولے اور خبرنامہ دیکھنے چلے گئے۔

"امی چلیں ناں... اور بھائی! یہ بریسلٹ آپ خود ثمرین کو دیجیے گا۔ وہ شرارت سے بولی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے اسے یہ دینے کی، خوامخواہ اس کے دل میں غلط فہمی پیدا ہو گی۔" وہ چیزیں سمیٹتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔

"غلط فہمی؟" اب کی بار دونوں نے چونک کر انہیں دیکھا۔

"کس بات کی غلط فہمی؟"

"یہی کہ ہم اس کے بارے میں کسی قسم کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"واٹ؟" عدیل کے منہ سے بے اختیار نکلا، کمرے میں چند لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا۔

"امی! وہ بھائی کی منگیتر ہے اور آج سے نہیں، سالوں سے ہے۔" نوین تڑپ کر بولی۔

عدیل کے چہرے پر بے پناہ سنجیدگی چھا گئی تھی، وہ خاموشی سے ماں کو دیکھتا رہا۔ وہ اس کے اس طرح دیکھنے پر خائف سی ہو گئی تھیں، مگر ظاہر نہ کیا۔

"وہ بچپن کی بات تھی اور ہاں... تم بھی اس سے ذرا فاصلے پر رہا کرو۔ مجھے پسند نہیں تم دونوں کا ہر وقت کا میل ملاپ۔" وہ فیصلہ کن انداز میں کہہ کر اٹھ گئیں۔

"ابو کو آپ کے فیصلے کا پتا ہے؟" اب کی بار عدیل نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

"ہاں! ان سے میری بات ہو چکی ہے اور مجھے امید ہے کہ تم دونوں بھی خاموشی سے اس فیصلے کو تسلیم کرو گے۔ ابھی ان سے ذکر مت کرنا اور نہ ہی ثمرین کو بتانا اور تم..." وہ نوین کی طرف مڑیں "اپنے پیپرز کی تیاری کرو۔ دس بارہ دن رہ گئے ہیں صرف۔" یہ کہتے ہوئے وہ کمرے سے نکل گئیں اور وہ دونوں ساکت بیٹھے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

گھر میں واضح کھنچاؤ کی سی کیفیت تھی اور اگر کوئی سکون میں تھا، تو صرف وہ... انہوں نے عدیل کے لیے سنجیدگی سے لڑکیاں دیکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اب وہ جلد از جلد اس کی شادی کرنا چاہتی تھیں۔ نوین پڑھائی کے بہانے کمرے تک محدود ہو گئی تھی۔

ثمرین کے بارہا اصرار اور بار بار آنے کے باوجود وہ اس کے ساتھ مل کر نہ پڑھ سکی اور اس سے کترائی کترائی رہنے لگی۔ ثمرین اس کے رویے پر حیران تھی مگر کچھ سمجھ نہ سکی۔ عدیل نے کام کے بہانے زیادہ وقت آفس میں گزارنا شروع کر دیا۔ نوید صاحب نے اس سے بات بھی کی، مگر عدیل ان سے کچھ کہہ نہ سکا۔ ان کو قصوروار سمجھ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنا بڑا فیصلہ اس کی مرضی کے بغیر یوں ہو جائے گا۔

اگرچہ وہ کبھی بھی ثمرین سے زیادہ مخاطب نہ ہوتا تھا مگر روزانہ اس کو دیکھتا ضرور تھا۔ وہ اسے پسند کرتا تھا۔ اور وہ اس کی پڑھائی ختم ہونے کے انتظار میں تھا اس لیے مطمئن تھا۔ اس کی ہنسی اور شرارتیں حقیقت میں اس کے لیے سکون کا باعث تھیں، مگر اب وہ بے سکون تھا اور گھر والوں سے نالاں بھی کہ بغیر کوئی وجہ بتائے اس کا رشتہ ختم کر دیا۔

☼ ☼ ☼

ثمرین پیپر دے کر آئی تو لاؤنج میں امی کو سوچوں میں گم دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

"کیا بات ہے امی؟" وہ لاڈ سے ان کے کندھے پر سر رکھ کر بولی تو وہ اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"آج ہی ایک جاننے والی نے انہیں بتایا تھا کہ ان کی جٹھانی عدیل کے لیے رشتہ ڈھونڈ رہی ہیں اور یہ بات ان کے لیے پریشان کن تھی۔ ان کی چھٹی حس نے انہیں اگرچہ خبردار کر دیا تھا مگر بات اب سنجیدہ رخ اختیار کر گئی تھی، اسی لیے وہ پریشان تھیں، مگر ابھی وہ اس سے کچھ کہنا نہیں چاہتی تھیں کہ وہ امتحانات سے فارغ ہو جائے۔ تب ہی مسکرا کر اس کو لپٹا لیا۔

"تمہارا پیپر کیسا ہوا؟"

"فنٹاسٹک!" وہ خوشی سے بولی "اور اب زبردست بھوک بھی لگی ہے۔"

"چلو! میں اپنی بیٹی کو لنچ کروا دوں۔"

"او کے!" وہ جوتے اتارتے ہوئے بولی، پھر ان کے چہرے پر نظر پڑی تو الجھن کا شکار ہو گئی۔ "آپ اتنی اداس کیوں ہیں؟"

"اداس؟" وہ مصنوعی حیرت سے بولیں۔ "اداس نہیں بلکہ تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ تمہارے ابو اور عازم بھی گھر پر نہیں تو اکیلی خود سے باتیں تو نہیں کروں گی ناں۔"

انہوں نے لہجے کو شگفتہ بنایا تو وہ بھی ہنس دی۔ انہوں نے سوچ لیا تھا کہ اگر تہمینہ بیگم عدیل کے لیے کہیں اور رشتہ دیکھ رہی ہیں تو وہ بھی خود سے اپنی بیٹی کے لیے ہرگز بات نہیں کریں گی۔

☼ ☼ ☼

دن گزرتے گئے حتیٰ کہ دونوں کے پیپرز بھی ختم ہو گئے۔ وہ خوب ساری نیند لے کر اٹھی اور نہا کر تازہ دم ہو کے باہر آ گئی۔

"آج چائے نوین کے ساتھ پیوں گی۔" یہ سوچ کر وہ تائی امی کی طرف چلی آئی۔ لاؤنج سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

"السلام علیکم!" وہ با آواز بلند سلام کر کے بیٹھ گئی۔ وہ سب چائے پی رہے تھے۔

"وعلیکم السلام! کیسی ہے ہماری بیٹی؟" نوید صاحب نے پیار سے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا جبکہ تہمینہ بیگم کے چہرے پر ناگواری چھا گئی۔

"بالکل ٹھیک ٹھاک۔ آپ کیسے ہیں؟"

"بھئی، ہم تو سدا بہار ہیں، پوچھ لو اپنی تائی امی سے۔" وہ قہقہہ لگا کر بولے۔

"اونہہ!" ان کا حلق تک کڑوا ہو گیا۔

عدیل نے گرم چائے جلدی جلدی حلق سے اتاری اور اٹھ کر چلا گیا۔ تائی امی کے تاثرات دیکھ کر نوین بھی فوراً" ہی اٹھ گئی۔

"آؤ ثمی! کمرے میں چلتے ہیں۔" وہ ماں کی تنبیہی نظروں کو نظر انداز کرتے اسے لے گئی۔

"آج فیصلہ کن بات کر کے رہوں گی۔" وہ ملازمہ کو آواز دے کر چائے کے برتن اٹھانے کی ہدایت کر کے سوچنے لگیں۔ اب صرف ثمرین کے واپس جانے کا انتظار تھا۔

وہ دونوں — گپیں لگاتی نمکو اور چائے کے ساتھ انصاف کر رہی تھیں۔ نوین مناسب موقع دیکھ کر اسے ساری صورت حال بتانا چاہتی تھی مگر جب بھی وہ کچھ کہنے لگتی، حوصلہ جواب دے جاتا۔ اسے الجھا سا دیکھ کر ثمرین نے پوچھ ہی لیا۔

"کیا بات ہے؟ پریشان ہو، کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ!"

"ہاں! تم سے کچھ کہنا تھا بلکہ کچھ بتانا تھا۔" چند لمحے توقف کے بعد وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

"کیا بات ہے، کوئی گڑبڑ ہے تو مجھے بتاؤ، مابدولت ابھی ٹھیک کر دیں گے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ انداز اب بھی بے فکرا تھا۔ نوین سنجیدگی سے اسے دیکھے گئی۔ اس کے مسلسل خود کو دیکھنے پر اب وہ بھی سنجیدہ ہو گئی۔

"کیا بات ہے نوین!" وہ پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔

"ثمرین! امی..." اسی لمحے دروازہ کھلا اور ملازمہ نے کہا "باجی! آپ کو بیگم صاحبہ نے بلایا ہے، مہمان آئے ہیں۔"

"اچھا تم چلو! ہم آتے ہیں۔" وہ سر ہلا کر بولی۔

"باجی! وہ کہہ رہی ہیں کہ ساتھ لے کر آنا۔"

"کیا مسئلہ ہے؟" وہ بادل نخواستہ اٹھتے ہوئے بولی "تم بیٹھو! میں ابھی آتی ہوں۔"

نوین اسے پریشانی میں مبتلا کر گئی۔ وہ کافی دیر تک اسی ادھیڑبن میں تھی کہ دروازہ کھلا اور نوین اندر داخل ہوئی۔

"کیا ہوا؟" وہ اس کا سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کر جلدی سے پاس آئی۔ "تمہیں تو پسینہ بھی آرہا ہے۔ کیا ہوا ہے نوین؟" وہ اسے جھنجھوڑتے ہوئے بولی۔

"وہ آنٹی فاطمہ آئی ہیں اور۔" وہ رک گئی بولتے بولتے۔

"تو پھر؟" اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"وہ..... وہ ساتھ میں منیب بھی ہے اور انکل بھی۔" لہجہ ابھی بھی نارمل نہ تھا۔

"وہ..... وہ میرا رشتہ لائی ہیں منیب کے لیے۔" وہ سرخ ہوتے بولی تو وہ خوشی سے چلا اٹھی۔

"کیا... واقعی؟ او گاڈ!" اس نے بے اختیار اسے خود سے لپٹایا تو دونوں ہنس دیں۔

"ہاں.... اور منیب کے سامنے ہی کہہ رہی تھیں۔ توبہ، مجھے تو اتنی شرم آئی کہ میں تو بس بھاگ آئی۔" وہ پھر سرخ ہو گئی۔

"شرم کیوں؟ ہماری آنٹی کا بیٹا ہے۔" وہ اسے چھیڑتے ہوئے بولی۔

"توبہ ہے! تمہاری دفعہ پوچھوں گی کہ کیا ہوا.... " وہ بھی فوراً بولی۔

"میری تو گھر کی بات ہے۔ شرم کیسی۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرائی تو یکدم ہی نوین کے تاثرات بدل گئے وہ توجہ دیے بنا ہی بولے گئی۔

"میں جا کر امی کو بتاتی ہوں، اچھا!" اور باہر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

تائی امی نے ثمرین کے لیے بھی باقاعدہ رشتہ ڈال دیا۔

یہ کایا یکایک کیسے پلٹی تھی، کوئی نہیں جانتا تھا۔ عدیل کی آنکھوں میں حیرت کے ساتھ ساتھ بھرپور خوشی اور محبت نظر آرہی تھی۔ ثمرین کی ہتھیلیاں ایک دم ہی نم ہو گئیں، تائی امی نے اسے خود سے لپٹا کر برفی کا ایک ٹکڑا اس کے منہ میں ڈال دیا۔ عدیل کی وارفتہ نظروں کی تپش سے اس سے مزید وہاں بیٹھا ہی نہ گیا، وہ بھاگ کر نوین کے پاس چلی گئی۔

نوین نے خوشی کے مارے سب سے پہلے تو اسے گھما ڈالا، پھر اس کے سرخ پڑتے چہرے کو دیکھ کر چھیڑنے لگی پھر... دونوں مل کر باہر سے آتی خوشی سے بھرپور آوازیں سننے لگیں۔

یکایک یہ کایا کیسے پلٹ گئی۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا بات دراصل یہ ہوئی کہ جس وقت فاطمہ آنٹی نے منیب کے لیے نوین کا رشتہ مانگا تو تہمینہ بیگم بہت خوش ہوئیں مگر اسی وقت انہیں نوین کی کم عمری اور کھلنڈرے مزاج کا احساس ہوا تو وہ مامتا کے فطری جذبے سے مغلوب ہو کر ان کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت بھرے انداز میں بولیں۔

"فاطمہ! ابھی اس میں بہت بچپنا ہے، امید ہے کہ تم درگزر کرو گی۔"

اسی پل ثمرین اپنے امی ابو کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی۔ وہ اپنے لہجے میں بھری لجاجت کو محسوس کر کے لمحے بھر میں سُن سی رہ گئیں۔

انہیں یکدم ایک عجیب سا احساس ہوا، اگر وہ اپنی بیٹی کے بچپنے اور کھلنڈرے مزاج سے عاجز نہیں ہیں تو ثمرین کے لیے شکوہ کناں کیوں ہیں۔ وہ اپنی ہونے والی سمدھن سے اپنی بیٹی کے لیے دل وسیع کرنے کی متقاضی ہیں تو خود ثمرین کے لیے کیوں دل بڑا نہیں کر پا رہیں۔ اس ایک پل میں انہیں لگا کہ ثمرین کی جگہ ان کی نوین آگئی ہے اور یوں وہ پل ان کے لیے فیصلہ کن ثابت ہوا تھوڑی دیر بعد تینوں فیملیز آپس میں گپ شپ کر رہی تھیں اور وہ دونوں کمرے میں تھی باہر سے آتی آوازوں پر ایک دوسرے کو چھیڑتی ہوئی ہنسی و خوشی کا ایک طوفان اٹھائے ہوئے تھیں۔

شیریں ملک

میری زندگی ہے تو

آئی سی یو کے باہر کھڑے سرمد اعوان کو زندگی نے آج اس دوراہے پہ لا کھڑا کیا تھا جہاں پہ وہ زندگی اور موت کے درمیان معلق ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ خود تو ٹھیک ہی تھا، لیکن وہ ٹھیک نہیں تھی جو اس کی زندگی تھی، جو اس کی آتی جاتی سانسوں کی ضمانت تھی۔ وہ کومل سی لڑکی بیڈ پہ پڑی مسلسل اسے کچوکے لگا رہی تھی۔

سرمد اعوان ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ پلکیں جھپکے بغیر وہ اس کا مشینوں میں جکڑا وجود دیکھ رہا تھا۔ جیسے اگر اس نے نظر ہٹائی تو وہ روٹھ جائے گی۔ وہ ویسے بھی تو اس سے روٹھنے ہی چلی تھی۔ وجہ بتائے بغیر، قصور بتائے بغیر۔ حرا اعوان اس سے ناراض ہو گئی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سرمد اعوان اس کے بغیر ادھورا ہے۔ اس دنیا میں وہی تو اس کا خالص رشتہ تھی۔ اس دنیا میں اگر سرمد کو کسی کی پروا تھی تو وہ صرف حرا کی تھی۔ وہ سب رشتوں سے بڑھ کر تھی۔ اس کی زندگی کا ایک خاص رنگ تھی۔ جسے وہ کبھی بھی ماند پڑتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن آج حرا نے اس کی ذرا سی بات کا اتنا اثر لیا تھا کہ اس حال کو پہنچ گئی تھی۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ سرمد اس سے کتنا پیار کرتا ہے

مکمل ناول

لیکن پھر بھی... سرمد کی آنکھوں سے آنسو گر گر کر اسے اس کی بے بسی کا احساس دلا رہے تھے۔

"حرا! میں نے یوں تو نہیں چاہا تھا۔ کوئی کسی کے ساتھ بھلا یوں بھی کرتا ہے..؟"

پاس سے گزرتے لوگ حیرانی سے اتنے بڑے مرد کو بچوں کی طرح روتا دیکھ رہے تھے، لیکن اسے تو جیسے کسی کی پروا ہی نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ ایک عام سا دن تھا۔ سرمد آفس سے آکر ابھی چائے ہی پی رہا تھا، جب حویلی سے اسے بابا جان کا فون آیا تھا۔

"سرمد! جلد از جلد گاؤں پہنچنے کی کوشش کرو۔" ان کے اس حکم پر سرمد کا پریشان ہونا فطری سی بات تھی۔

"خیریت تو ہے نا بابا جان! آپ اس وقت مجھے حویلی پہنچنے کا کہہ رہے ہیں؟"

"خیریت ہی تو نہیں ہے، اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ جلد پہنچو۔" ان کا لہجہ معمول سے ہٹ کر غصیلا تھا۔

"بابا جان! آپ مجھے بتائیں تو سہی، آخر ہوا کیا ہے؟"

لیکن اس کے مزید بولنے سے پہلے وہ فون رکھ چکے تھے۔ وہ بس ایسے ہی حکم دیا کرتے تھے اور فوراً اس کی تعمیل چاہتے تھے کیوں اور کیسے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سرمد کے ذہن میں نجانے کتنے وسوسے آرہے تھے۔ وہ کتنی دقت سے چار گھنٹے کی ڈرائیونگ کر کے حویلی پہنچا تھا، یہ صرف وہی جانتا تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً دس بج چکے تھے۔ سرمد کو وہ رات انتہائی تاریک لگی تھی۔ لیکن حویلی آکر اس نے جو بات سنی تھی وہ اس سے کہیں زیادہ تاریک اور گھناؤنی تھی۔

بابا جان نے اسے بتایا تھا کہ آج دوپہر کو جب وہ زمینوں پر تھے تو شہر کی کوئی فیملی ان کے ہاں حرا کا رشتہ لے کر آئی تھی اور ان لوگوں نے یہ بھی کہا کہ حرا اور ان کا بیٹا ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اسی لیے وہ رشتہ لے کر آئے ہیں، یہ بات بابا جان کی غیر موجودگی میں ہوئی جب حویلی میں صرف نصرت چچی تھیں، نصرت چچی نے ان کی تو بے عزتی کر کے گھر سے نکال دیا کہ ہم اپنی بیٹی غیروں میں نہیں دیا کرتے، لیکن بابا جان کے آنے پر ساری بات انہیں بتادی۔

ان کا جلال میں آنا تو ویسے بھی عام سی بات تھی اور اسی جلال میں انہوں نے ڈرائیور بھیج کر حرا کو بھی ہاسٹل سے حویلی بلا لیا تھا اور سرمد کو بھی بلا لیا تاکہ اسے بھی اپنے فیصلے سے آگاہ کر سکیں۔ اپنی طرف سے انہوں نے بدنامی سے بچنے کے لیے ایک فیصلہ کیا تھا اور وہ فیصلہ تھا کہ حرا کا نکاح سزا کے طور پر چچی کے دس سالہ بھانجے اور منہ بولے بیٹے فہد سے کر دیا جائے۔

یہ بھی یقیناً چچی کا ہی مشورہ تھا تاکہ حرا آئندہ ان کے خاندان کی عزت کو شہر میں رول نہ سکے۔

"بابا جان! آپ جلد بازی کر رہے ہیں۔ حرا ایسی نہیں ہے، جیسا آپ سمجھ رہے ہیں۔ آپ نے کیسے ان سب باتوں پر یقین کر لیا؟" وہ دکھ سے بابا جان کو دیکھ رہا تھا۔ جو حرا کے سگے باپ تھے۔

"سرمد یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں، تمہاری چچی نے خود یہ باتیں مجھے بتائی ہیں۔ اس کی غلطی یہ ہے کہ اس نے ان لوگوں کو جانے دیا، ورنہ میں ان لوگوں کو عبرت بنا دیتا جنہوں نے اتنی جرأت کی کہ وہاب اعوان کی حویلی میں رشتہ لینے آگئے اور وہ بھی اس کی بیٹی کا۔"

سرمد کو نصرت چچی آج پہلے سے زیادہ شاطر لگ رہی تھیں۔

"بابا جان! یہ سب جھوٹ ہے۔ آپ کیسے بغیر ثبوت کے اوروں کو اپنی بیٹی پر ترجیح دے رہے ہیں۔ آپ کیوں نہیں سمجھ رہے کہ حرا بہت معصوم ہے۔ میں اسے جانتا ہوں، وہ اس طرح کا کام نہیں کر سکتی اور اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ واقعی اس طرح کی کوئی فیملی آئی تھی تو اس میں حرا کا کیا قصور؟ جب گھروں میں رشتے آتے ہیں تو اس میں بیٹیوں کا کہاں قصور ہوتا ہے۔ آنے والے تو اپنی مرضی سے آتے ہیں۔ وہ بھلا کسی کی بیٹی کی مرضی سے تھوڑی آتے ہیں۔"

وہ ہر حال میں حرا کو بابا جان کے اس ظالم فیصلے سے بچانا چاہتا تھا۔

"سرمد! تم ہوش میں تو ہو؟ اپنی ماں جیسی چچی کو جھوٹا کہہ رہے ہو۔ شہر میں رہتے رہتے مجھے لگتا ہے تم اپنے خاندان کے رسم و رواج کو بھلائے بیٹھے ہو، جو یہ باتیں کیے جا رہے ہو؟" بابا جان نے اسے جھٹلایا۔

"بابا جان! مجھے لگتا ہے کہ ہمیں ان لوگوں سے مل لینا چاہیے۔ کیا پتا وہ واقعی اتنے اچھے ہوں کہ ہم خوشی سے اپنی حرا ان کو دے دیں۔"

چچی کو دیکھتے ہوئے سرمد نے اندھیرے میں ایک تیر چلایا تھا، نجانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ یہ ساری کہانی ہی من گھڑت ہے۔

"سرمد! تم بھول رہے ہو کہ وہ وہاب اعوان کی بیٹی ہے، وہاب اعوان کی، وہ لوگ اگر میرے سامنے آئیں تو میں ان کا خون پی جاؤں اور یہ تمہاری ہی کرنی کا پھل ہے۔ نہ تم اس کی پڑھنے کی ضد پوری کرتے اور نہ یہ نوبت آتی، میں تو اسے ہاسٹل بھیجنے پر قطعاً راضی نہ تھا، تمہیں ہی بڑا اعتبار تھا جو اسے اتنی دور بھیج دیا۔" غصے سے اونچا بولتے ہوئے ان کے گلے کی نسیں بھی پھول گئیں۔

"لیکن بابا جان! ہم حرا کا رشتہ اپنی مرضی سے اس کے ہم عمر لڑکے سے بھی تو کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ نے فہد کو ہی منتخب کیوں کیا؟"

"اس لیے کہ حرا جیسی لڑکیوں سے کوئی شادی نہیں کرتا۔ خاندان کے ہی لڑکوں کو اپنی عزت بچانے کے لیے قربانی دینا پڑتی ہے۔"

چچی نے اس کی بات مکمل ہی نہ ہونے دی اور بڑے تنفر سے زہر اگلا۔ سرمد نے جلدی سے بابا جان کی طرف دیکھا تھا کہ شاید وہ اپنی بیٹی کی اس توہین پر کچھ کہیں، لیکن وہاں تو کوئی اثر ہی نہ تھا۔ نجانے چچی نے بابا جان کو کیا گھول کر پلا دیا تھا کہ انہیں کچھ اور سنائی ہی نہیں دے رہا تھا۔

"حرا جیسی لڑکی" کہنے پر سرمد کا جی چاہا تھا کہ وہ ان کا منہ نوچ لے لیکن بڑوں کی عزت کرنا بھی ان کے خاندان کی روایت تھی جسے وہ توڑ نہیں سکتا تھا۔ جب سرمد کو لگا کہ وہ انہیں قائل نہیں کر سکے گا، حرا کا تحفظ نہیں کر سکے گا تو اس سے وہ فیصلہ ہو گیا جس کا شاید وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن حرا اسے بہت عزیز تھی اور وہ اسے چچی کی گھناؤنی سازش سے بچانا چاہتا تھا۔ جس کا مقصد ابھی وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ اسی لیے اس نے بے بسی میں وہ فیصلہ کر لیا۔

"بابا جان! میں آپ کی ساری باتیں مانتا ہوں۔ مانتا ہوں کہ ایک فیملی آپ کی غیر موجودگی میں آئی اور آپ سے ملے بغیر چلی گئی..... میں مانتا ہوں کہ حرا جیسی لڑکی سے کوئی شادی نہیں کرتا۔ اس لیے آپ نے چاچی کے کہنے پر مجبوری میں اس کی شادی فہد سے طے کر دی، لیکن آپ مجھے صرف یہ بتائیں کہ اس سارے عمل میں "میں" کہاں ہوں؟ میں آپ کو کیوں یاد نہ آیا؟ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ میں بھی خاندان کی عزت سنبھال سکتا ہوں اور حرا سے شادی کر سکتا ہوں۔ آپ کو اس کام کے لیے چچی کا معصوم بھانجا کیوں نظر آیا؟

آپ کو اپنا بھتیجا کیوں یاد نہ آیا؟"

اس کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ وہاب اعوان جیسے چند لمحوں کے لیے سکتے میں آ گئے' انہوں نے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔

"تیرا ہی خیال آیا تھا بیٹا! لیکن تیری چچی کہتی تھیں کہ تو حرا کو اپنی بہن کی طرح سمجھتا ہے' مجبوراً مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔" وہ اسے سچ بتائے بغیر نہ رہ سکے۔

"بہن کی طرح سمجھتا تھا۔ بہن ہے تو نہیں' کیوں چچی! میرا فیصلہ ٹھیک ہے نا؟" اس نے مڑ کر ان کی طرف دیکھا لیکن وہاں اس کی بات سننے کے لیے کوئی نہ تھا۔

وہاب اعوان کی خوشی کا تو کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ اسی لیے وہ نصرت کے رویے کو نہ دیکھ سکے۔

"بابا جان! آپ مجھے بتائیں۔ ماں جی کہاں ہیں؟" نجانے کیوں وہ یہ فیصلہ کر کے ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

"اندر ہی کہیں اپنی بیٹی کے پاس بیٹھی رو رہی ہو گی' اگر بیٹی کی اچھی پرورش کرتی تو آج مجھے یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

سرمد بہت دکھ سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ جنہوں نے ساری زندگی اپنی بیٹی اور بیوی کو ان کا مقام نہ دیا تھا۔ اس دنیا میں اگر انہیں کوئی عزیز تھا تو صرف سرمد اعوان تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ سرمد اعوان ایک لڑکا تھا۔ ان کا بیٹے جیسا بھتیجا تھا۔ ان کا وارث تھا۔ ان کی جاگیر اور نسلوں کا امین تھا۔ کیونکہ بیٹا ان کی محرومی تھا جو ان کے نصیب میں نہ تھا اور اس کا ذمہ دار وہ اپنی بیوی کو سمجھتے تھے۔ جو ان کو ایک بیٹا تک نہ دے سکی۔ لیکن سرمد کو بابا جان کی بیوی آسیہ جنہیں وہ ماں جی کہتا تھا' سے بہت پیار تھا۔ اس صابر اور شفیق سی عورت کی موجودگی میں اسے کبھی اپنی ماں کی کمی محسوس نہ ہوئی لیکن وہ بابا جان کی سوچ کو چاہنے کے باوجود بھی نہ بدل سکا۔ جو مرد ہونے کے زعم میں ہر فیصلہ ٹھونس دیا کرتے تھے جیسے روایتی جاگیردار ہوا کرتے ہیں۔ وہ یہی سوچتے ہوئے ماں جی کے کمرے میں آیا تھا' جہاں

حرا ان کی گود میں سر رکھے رو رہی تھی۔ اس کے سلام کی آواز پر حرا نے سر اٹھا کر بھیگی پلکوں سے اسے دیکھا اور پھر بھاگتی ہوئی آ کر ہمیشہ کی طرح اس کے سینے سے لگ گئی۔

"بھیا! آپ بابا جان کو بتائیں نا! میں ایسی لڑکی نہیں ہوں' جیسا وہ سمجھ رہے ہیں۔ آپ یقین کریں بھیا! میں کسی لڑکے کو جانتی تک نہیں۔ آپ بابا جان کو بتائیں نا کہ میں گرلز کالج میں پڑھتی ہوں' وہاں کوئی لڑکا نہیں ہوتا۔"

رونے سے اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی اور سوجی ہوئی آنکھیں مسلسل اشک بہا رہی تھیں اور سرمد تو اس کے لفظ "بھیا" سے ہی باہر نہیں نکلا تھا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس نے ساری دلیلیں دے لیں' لیکن اس کی شنوائی نہیں ہوئی۔ وہ بس اسے ساتھ لگائے ہولے ہولے سر تھپکے جا رہا تھا۔

"آپ خاموش کیوں ہیں؟ کہیں آپ بھی بابا جان کی طرح مجھے ہی تو غلط نہیں سمجھ رہے؟" وہ ایک دم اس سے الگ ہو کر اس کو دیکھتے ہوئے پوچھ رہی تھی اور سرمد کو لگ رہا تھا کہ اگر وہ اسی طرح اس کے سامنے کھڑی رہی تو اس کا دل دھڑکنا بھول جائے گا۔ نجانے کیوں سرمد کو اپنی اس چچا زاد سے حد سے زیادہ انس تھا۔ وہ اس سے چھوٹی بھی بہت تھی۔ ابھی حال ہی میں اس نے بی اے کرنے کے بعد ایم اے انگلش میں ایڈمیشن لیا تھا۔ اور سرمد کو اپنا بزنس اسٹیبلش کیے بھی پانچ چھ سال ہو چکے تھے۔ شاید عمروں کے اتنے تفاوت کی وجہ سے ہی سرمد کا ذہن اس نہج پر نہ سوچ سکا جس کا آج وہ فیصلہ کر چکا تھا۔ اب وہ اس کے سامنے کھڑی اس کے اعتماد کا یقین چاہتی تھی۔ سرمد کو اس لمحے وہ پہلے سے بھی کم سن لگی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر پیار سے اس کا بھیگا چہرہ اپنے ہاتھوں کی اوک میں لے لیا۔

"میں جانتا ہوں حرا بہت معصوم اور پاکیزہ ہے۔ غلط کام کرنا تو دور کنار سوچنا بھی اس کے لیے گناہ ہے۔ وہ میرا یقین کبھی نہیں توڑ سکتی' وہ کبھی بھی غلط کام...!"

اور اس سے آگے اس سے بولا ہی نہیں گیا۔ کیونکہ حرا اس کی اتنی سی بات پر اس کے ہاتھوں کو عقیدت سے چومنے لگی تھی۔

"دیکھا ماں جی! سرمد بھیا کو مجھ پر اعتبار ہے' ماں جی انہیں مجھ پر اعتبار ہے۔" وہ برستی آنکھوں کے ساتھ ہنستے ہوئے کہیں سے بھی نارمل نہیں لگ رہی تھی۔

سرمد اس سے آگے برداشت نہ کر سکا تو تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔ کمرے میں آ کر اس نے اپنا چکراتا ہوا سر دونوں ہاتھوں پہ گرا لیا۔ "نجانے میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ حرا کیسے برداشت کرے گی' جھوٹے الزام کی وجہ سے وہ پہلے ہی ادھ موئی ہو چکی ہے۔ اوپر سے یہ فیصلہ' وہ کیسے اتنی سی عمر میں اتنے بڑے بڑے شاک برداشت کرے گی اور میں خود اس کا سامنا کیسے کروں گا' اس کو کیسے کسی اور حیثیت میں تسلیم کروں گا؟"

وہ صدمے کی کیفیت میں خود سے سوال جواب کیے جا رہا تھا۔

"میں نے یہ سب کچھ حرا کی خوشی کے لیے کیا ہے نا! تو میں کبھی اس رشتے کو اس کے لیے دکھ کا باعث نہیں بننے دوں گا' میں اس کا ہر خواب پورا کروں گا۔ اسے پڑھاؤں گا' اس کو ہر خوشی دوں گا۔"

وہ اس وقت صرف اور صرف حرا کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سہراب اعوان' وہاب اعوان' اور شہاب اعوان تینوں بھائی جدی پشتی جاگیردار تھے۔ وہاب اعوان باقی دونوں بھائیوں کی نسبت عجیب طبیعت کے مالک تھے۔ بہت مغرور' ضدی اور اپنی منوانے والے' جبکہ سہراب اور شہاب بہت نرم طبیعت کے اور خوش اخلاق تھے۔ بڑے بھائی سہراب اعوان کا ایک ہی بیٹا سرمد تھا۔ اس کی پیدائش پہ ہی اس کی ماں کی وفات ہو گئی۔ وہ نہ صرف اپنے گھر کا بلکہ پورے خاندان کا اکلوتا وارث تھا کیونکہ وہاب اعوان کی بیوی آسیہ نے

یکے بعد دیگرے دو مردہ بیٹیوں کو جنم دیا تھا۔ کچھ تو وہاب اعوان ویسے ہی چڑچڑے اور ضدی تھے۔ اب تو وہ اس ساری صورتِ حال کی وجہ آسیہ کو سمجھتے تھے۔ اسی لیے انہیں بیوی سے بہت زیادہ نفرت تھی۔ جو بیٹا تو کیا ایک زندہ بیٹی بھی پیدا نہ کر سکی۔ اسی لیے ان کا رویہ آسیہ سے خراب تر ہوتا گیا۔ ذرا ذرا سی بات پر ہتک اور مار پیٹ عام سی بات تھی۔ اگر آسیہ عام لڑکی ہوتی تو شاید وہ کب کا اسے چھوڑ چکے ہوتے۔ لیکن آسیہ بہت بڑے جاگیردار رجب اعوان کی اکلوتی بیٹی تھی اور تمام جاگیر کی اکلوتی وارث تھی۔ جو وہ اپنے جہیز میں لائی تھی۔ اسی لیے وہاب اعوان لالچ میں ہی سہی ساری زندگی آسیہ کو چھوڑنے کی خواہش کے باوجود چھوڑ نہ سکے۔ پھر یہ بھی تھا کہ بیٹے کی کمی سرمد نے پوری کر دی تھی۔

اور پھر بہت عرصے بعد' بہت منتوں مرادوں کے بعد وہاب اعوان کے گھر حرا کی صورت میں جیتا جاگتا وجود تو آ گیا لیکن وہ اولادِ نرینہ سے محروم ہی رہے۔ پھر بھی صابر سی آسیہ کو قدرت سے کوئی شکایت نہ تھی۔ کیونکہ اس کے پاس سرمد کی صورت میں بیٹا بھی تھا اور حرا جیسی معصوم سی بیٹی بھی تھی۔ وہ بنیادی طور پہ ایک صابر و شاکر خاتون تھیں۔

ان ہی رنگ بدلتے موسموں میں سب سے چھوٹے بھائی شہاب اعوان کی شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔ شہاب سب سے چھوٹے اور لاڈلے تھے۔ اسی لیے بہت دھوم دھام سے شادی کر کے سب نے اپنے اپنے ارمان نکالے۔ جو سب سے حیران کن بات تھی وہ یہ تھی کہ شہاب نے اپنے ہی گاؤں کے ایک غریب کسان کی بیٹی نصرت سے شادی کی تھی۔ جس کے حسن کے جلووں نے انہیں گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔

شہاب کے چھوٹا اور لاڈلا ہونے کی وجہ سے بڑے بھائیوں نے وسیع القلبی دکھائی اور دھوم دھام سے شادی کر دی۔ لیکن یہ ان سب کی بدقسمتی کہ ابھی شادی کو دو سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ شہر سے آتے ہوئے سب سے بڑے بھائی سہراب اعوان اور سب

سے چھوٹے بھائی شہاب اعوان کی گاڑی لوڈ ڈ ٹرک سے ٹکرائی اور دونوں بھائیوں نے موقع پر ہی دم توڑ دیا۔ یہ خبر جہاں نصرت کے لیے قیامت خیز تھی، وہیں پہ جیسے اس خبر نے وہاب اعوان کی کمر توڑ دی۔ کیونکہ تینوں بھائیوں میں بے حد پیار تھا۔

وہاب اعوان کو لگا جیسے ان کے آگے پیچھے آہنی دیواریں تھیں جو موت کا طوفان اڑا لے گیا اور اب وہ حالات کے بے رحم تھپیڑوں پہ آگئے ہوں۔ اور پھر وہ شخص جس نے کبھی اپنی بیوی اور بیٹی کو اپنی ذمہ داری نہ سمجھا اس نے اپنے بڑے بھائی کے بیٹے سرمد اور چھوٹے بھائی کی بیوی نصرت کو اس کی نشانی سمجھتے ہوئے ایسے اپنی ذمہ داری سمجھا کہ ان کی خوشی کو سب سے مقدم جانا، حتیٰ کہ کبھی کبھی تو وہ ان کو اپنی ذات پر بھی ترجیح دینے سے نہ چوکتے، لیکن ان کے اسی رویے کا نصرت نے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ وہ اگر چاہتیں تو شہاب کی موت کے بعد اپنے میکے جاسکتی تھیں۔ لیکن اب وہ دوبارہ سے غربت کی زندگی جینا نہیں چاہتی تھیں۔ لیکن وہ آسیہ کی طرح صابر بھی نہ تھیں۔ انہیں اپنی سونی گود کا شدت سے احساس تھا اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی انہیں جائیداد میں سے حصہ دلانے والا نہ تھا۔

انہیں بے ضرر سی آسیہ اور حرا سے کوئی شکایت نہ تھی، لیکن سرمد ان کی نگاہوں میں بہت کھٹکتا تھا۔ جو تین بھائیوں کی جائیداد کا اکلوتا وارث تھا۔

نصرت بیگم کو اپنا آپ غیر محفوظ سا لگتا۔ حالانکہ جتنا حویلی میں ان کا ہولڈ تھا، اتنا کسی کا نہ تھا۔ حویلی کا سارا انتظام و انصرام ان کے ہاتھ میں تھا۔ کسی چیز کی روک ٹوک نہ تھی۔ لیکن دل تھا جو مطمئن ہی نہ ہو پاتا ان ہی حاسدانہ سوچوں کے باعث۔ وہ اپنی بیوہ بہن کے ایک پانچ سالہ بچے کو حویلی میں لے آئیں، اپنا بیٹا بنا کر۔

یہاں پر وہاب اعوان کو کچھ اعتراض ہوا، کیونکہ وہ لڑکا جب ان کا خون نہ تھا تو اس حویلی میں کیسے رہ سکتا تھا، لیکن پھر نصرت کے آنسوؤں پہ وہ خود کو مجرم سا سمجھنے لگے۔ ان کی زندگی کا ایک ہی تو مقصد تھا اپنے بھتیجے اور بھابھی کو ہر دکھ سے بچانا، پھر بھلا کیسے وہ ان کی کوئی محرومی دیکھ سکتے تھے۔ نصرت نے اپنی سونی گود کا ذکر کر کے اپنے بھانجے کو حویلی میں رکھنے کا جواز پیدا کر ہی لیا۔

وقت گزرتا گیا، سرمد اپنی تعلیم مکمل کر کے اپنا بزنس اسٹیبلش کر چکا تھا۔ بابا جان اور ماں جی کی خواہش کے باوجود وہ شادی کے لیے تیار نہ تھا، کیونکہ اسے ابھی اپنی پسند کی لڑکی ہی نہ ملی تھی۔

حرا اپنے گاؤں کے اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد ہوسٹل میں رہ کر پڑھ رہی تھی۔ ابھی اس کا بی۔ اے ہی مکمل ہوا تھا۔ جب نصرت بیگم کے شیطانی ذہن نے وہ چال چلی جو سب کچھ ختم کرنے کے درپے تھی۔ لیکن سرمد کی وجہ سے ان کا سارا پلان چوپٹ ہو گیا۔ اصل میں حالات کا تجزیہ کرنے پر ان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ وہاب اعوان کے مرنے کے بعد سب کچھ سرمد کا ہی رہے گا۔ کیونکہ اس جائیداد میں ان کا بھانجا کبھی شریک نہیں ہو سکتا۔ وہ اسی صورت میں اس گھر میں اپنی جگہ مستحکم بنا سکتی ہیں، جب وہ اپنے بھانجے سے حرا کی شادی کروا دیں۔ حالانکہ ان کا بھانجا دس سال کا اور حرا بیس سال کی تھی۔

وہاب اعوان عام صورتِ حال میں تو کبھی نہ مانتے اس لیے نصرت نے حرا کے پرپوزل والی کہانی گھڑی اور نہ جانے کیا کیا وہاب اعوان کو جھوٹی سچی باتیں بتا کر ان کے غصے کو ہوا دینے میں کامیاب ہو گئیں۔ انہوں نے صحیح معنوں میں وہاب اعوان کے جذباتی ہونے کا فائدہ اٹھایا اور حالات کو اپنی مرضی کا رخ دینے میں کامیاب ہو گئیں، لیکن سرمد نے آکر ان کے ارادوں کو ملیا میٹ کر دیا۔

✡ ✡ ✡

حرا پاگلوں کی طرح روئے جا رہی تھی۔

"ماں جی! میں سرمد بھیا سے شادی نہیں کروں گی۔ آپ بابا جان سے کہیں بے شک میری شادی کہیں بھی

کر دیں لیکن سرمد بھیا سے نہیں۔ نجانے کیوں مجھے لگ رہا ہے جیسے میں کوئی گناہ کرنے جا رہی ہوں۔ میں ایسا نہیں کروں گی۔"

"حرا! میری جان ایسا نہیں کہتے۔ بے شک تم سرمد کو اپنے بھائی کی طرح سمجھتی ہو، لیکن وہ تمہارا حقیقی بھائی نہیں ہے۔ تمہارا اس سے شادی کرنا کوئی گناہ کا کام نہیں۔ تم ابھی چھوٹی ہو، حویلی کے رواجوں کو سمجھ نہیں سکتیں، تمہاری شادی سرمد سے ہو اسی میں رب تعالیٰ کی مصلحت ہو گی اور ویسے بھی انسان جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا جوڑ لکھ دیا جاتا ہے۔ تو پھر تمہارا جوڑ بھی اللہ تعالیٰ نے سرمد کے ساتھ لکھ دیا تھا۔ دنیا میں تو بس حیلہ بنتا ہے، باقی سب کچھ تو اوپر طے ہوتا ہے۔"

آسیہ خاتون اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اسے بہت رسان سے سمجھا رہی تھیں، انہوں نے نصرت بیگم یا ان کے بھانجے کا نام لینا بھی گوارا نہ کیا اس فیصلے پر جتنا وہ خوش تھیں، اتنا خوش شاید ہی کوئی ہو۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے انہیں ان کے صبر کا پھل مل گیا ہو۔ بے شک یہ سب کچھ ان چاہے طریقے سے ہی ہوا تھا، لیکن وہ یہ بھی جانتی تھیں کہ اس دنیا میں اگر ان کے علاوہ ان کی بیٹی کو کوئی چاہتا ہے تو وہ صرف سرمد ہے۔

وہ شکر کر رہی تھیں کہ ان کی بیٹی کو ان جیسی زندگی نہیں گزارنی پڑے گی۔ کیونکہ سرمد ہو بہو اپنے والد سہراب خان کی طرح تھا۔ جنہیں رشتوں کی پہچان تھی۔

"تم نہیں جانتیں حرا! دنیا میں تمہارے جیسی خوش نصیب لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں جنہیں سرمد جیسا شریکِ حیات نصیب ہوتا ہے۔ حرا! تم کہتی ہو ناکہ میں جب تمہارے لیے دعا کرتی ہوں تو تمہارا ہر کام اچھے طریقے سے ہو جاتا ہے۔ تو بس پھر یہ سوچ کے مطمئن ہو جا کہ یہ تیری ماں کی دعا ہے اور ماں کی دعائیں صرف اچھے کے لیے ہوتی ہیں، صرف اچھے کے لیے۔"

اور حرا آنسو روکے حیرانی سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے چہرے پر عجیب الوہی سی خوشی تھی۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ حرا کی آنکھوں میں آنسو ہوں اور اس کی ماں کی آنکھیں نم نہ ہوں۔ ماں جی کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ تھی۔ جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔ لیکن اس مسکراہٹ کو محسوس کر کے حرا کے دل میں نجانے کیوں ڈھیروں اطمینان اتر آیا۔

✡ ✡ ✡

عجلت میں ہی سہی، لیکن حرا اور سرمد کی شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ شہاب اعوان کی شادی کے بعد حویلی میں آج بڑی مدت بعد شادیانے بجے تھے۔

سب کے دلوں میں اپنی اپنی سوچ کے مطابق اطمینان تھا ماسوائے نصرت کے۔ انہیں اپنی جلد بازی پر غصہ آرہا تھا، نہ وہ ابھی حرا کی شادی کا شوشا چھوڑتیں اور نہ سرمد کا خیال اس کی طرف جاتا۔ جب سرمد کی شادی کہیں اور اپنی ہم عمر لڑکی سے ہوتی تو تب بھی وہ یہ کام کر سکتی تھیں۔ لیکن اب پچھتانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ جاگیر اور جائیداد کل بھی حرا اور سرمد کی تھی اور آج بھی ان کی تھی۔ نصرت اور ان کا بھانجا درمیان میں کہیں نہ تھے۔

اگر عام حالات میں شادی ہوتی تو حرا نے رخصت ہو کر حویلی سے ملحق دوسرے پورشن میں ہی جانا تھا۔ لیکن اب سرمد کسی طور حرا کو یہاں رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ جب دلوں میں اعتبار مفقود ہو تو ساتھ کا کیا فائدہ؟ اس لیے روتی بلکتی حرا رخصت ہو کر شہر میں موجود اعوان ولا میں آئی تھی۔ جب کبھی کبھار وہ ماں جی کے ساتھ یہاں آتی تھی تو اسے بڑا اچھا لگتا تھا، نجانے کیوں وہ بچپن سے ہی حویلی کی گھٹی گھٹی سی فضا میں رہتی آئی تھی لیکن وہ اس فضا اور اس ماحول کی عادی کبھی نہ ہوئی تھی۔

اس کے برعکس اعوان ولا کی ہر چیز میں زندگی کا لمس تھا۔ ایک آزادی سی تھی۔ یہاں پر کہیں نصرت چچی کی گھوریاں نہ تھیں، وہاب اعوان کا غصہ نہ تھا، بلکہ بڑا ہی اپنا پن تھا پہلے جب وہ یہاں آتی تھی تو سرمد اس کے خوب ناز نخرے اٹھاتا، لیکن اب رشتے بدل

چکے تھے' زاویۂ نظر بدل چکا تھا' اب دونوں ہی اپنی اپنی جگہ صرف ایک دوسرے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ نجانے کیسی سوچیں تھیں' کیسی صورتِ حال تھی کہ ہر طرف سکون ہی سکون تھا۔

حرا جس کمرے میں آکر پہلے رہتی تھی' اسی میں آئی تھی اور چینج کرکے لیٹی ہی تھی کہ نیند مہربان ہو گئی۔ اپنے کمرے میں موجود سرمد بھی زندگی کے اس موڑ پر خالی الذہنی کی کیفیت میں ایزی چیئر پہ بیٹھا تھا کہ تھکن کی وجہ سے اسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ بیڈ پر نہیں چیئر پر ہے اور سو بھی گیا۔

نیند بھی قدرت کا ایک انمول تحفہ ہے۔ انسان اور پریشانیوں کے درمیان حائل ایک پردہ ہے۔ انسان اس کی آغوش میں آکر سب کچھ فراموش کرکے پُرسکون ہو جاتا ہے۔ یہی سرمد اور حرا کے ساتھ ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح جب سرمد نماز اور واک کے بعد گھر لوٹا تو حرا کچن میں ملازمہ کے ساتھ مصروف تھی۔ سرمد بلند آواز میں سلام کرتا کچن سے ملحق ڈائننگ ہال میں بیٹھ چکا تھا۔ حرا اپنا دوپٹہ درست کرتی ملک شیک کا جگ اٹھائے اس کے پاس آگئی۔

"ناشتہ لے آؤں؟" سرمد نے صرف "ہوں" پر ہی اکتفا کیا تھا۔ نجانے کیوں وہ حرا سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ حرا خود کو نارمل پوز کرنے کی کافی کوشش کر رہی تھی۔ سرمد سوچ رہا تھا کہ وہ اس سے کوئی شکایت کرے گی یا اس سے شادی کے متعلق کوئی بات کرے گی لیکن وہ سنجیدگی سے ناشتہ ٹیبل پہ لگا کے خود بھی کرنے لگی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ سرمد نے جو کچھ بھی کیا ہے صرف اس کی بہتری کے لیے کیا ہے۔ اپنی ذات کو پسِ پشت ڈال کر صرف اور صرف حرا کا سوچا ہے۔ جبکہ سرمد اس کو مطمئن دیکھ کر ہی پُرسکون ہو گیا۔

"کالج کب جانا ہے؟" سرمد نے چائے پیتے ہوئے اس پہ پہلی نظر ڈالی' نجانے کیوں اسے لگا کہ اس کی پاکیزگی اور معصومیت سوا ہو گئی ہے۔

"جب آپ کہیں گے۔" پڑھنے کے نام پہ اس کے معصوم چہرے پہ عجیب سی خوشی ہویدا ہوتی تھی۔

"میرا خیال ہے آج ریسٹ کرو' کل سے چلی جانا' تم مجھے یہ بتاؤ گی کہ تم گھر میں رہ کر پڑھو گی یا ہاسٹل میں ہی رہو گی؟"

"آپ جیسا کہیں گے' ویسے ہی پڑھ لوں گی۔" دودھ پیتے ہوئے وہ لاپروائی سے بولی اور سرمد کو اس کے رویے پہ حیرانی نہیں ہو رہی تھی' لیکن اپنے رویے پر ضرور ہو رہی تھی۔ پہلے کب حرا نے اپنی مرضی کی تھی۔ سبجیکٹ سلیکٹ کرنے سے لے کر کالج تک تو سب کچھ سرمد نے منتخب کیا تھا تو آج حرا کیسے اپنی مرضی اسے بتا سکتی تھی۔

"بتائیں نا' گھر ٹھیک ہے یا ہاسٹل؟" حرا اس کی خاموشی سے اکتا کر بولی۔

"میرا خیال ہے ہاسٹل زیادہ بہتر ہے۔ کیونکہ مجھے آفس میں بہت دیر ہو جاتی ہے۔ تم اکیلی گھر میں بور ہو گی' وہاں تمہاری دوست ہیں' ٹیچرز ہیں۔ وہاں پڑھتے اور رہتے ہوئے تمہیں کافی عرصہ ہو گیا ہے' اس لیے ہاسٹل ٹھیک رہے گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ نیپکن سے ہاتھ صاف کرتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"تو کیا ویک اینڈ پہ بھی گھر نہ آؤں؟" وہ اداسی سے بولی تھی۔

"نہیں نہیں' ویک اینڈ پہ میں خود تمہیں لینے آیا کروں گا۔ وہ سارا دن اکٹھے گزارا کریں گے۔" سرمد کے نرمی سے بولنے پر وہ سر ہلا کر رہ گئی۔

"ماں جی تو مجھ سے یہاں ملنے آیا کریں گی نا؟" آنکھیں ایک دم اداس ہو گئیں۔

"میں خود ماں جی کو لے آیا کروں گا اور جب تمہارا دل کرے گا تو تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔" سرمد نے اس کو تسلی دی۔

"نہیں' آپ ماں جی کو یہاں لے آیا کرنا' میں گاؤں نہیں جاؤں گی۔"

"جیسا تم کہو گی' ویسا ہی کروں گا۔" اس نے تسلی دی۔

"ایک اور بات حرا! کالج میں کسی کو ابھی شادی والی بات بتانے سے گریز کرنا۔"

یہ بات کہہ کر وہ رکا نہیں اور تیار ہونے اپنے کمرے میں چل دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کالج میں یہ بات پتہ چلے اور حرا کو ڈھیر سارے کیوں کا جواب دینا پڑے۔ جب کہ حرا حیرانی سے اس کی پشت کو دیکھ رہی تھی۔ وہ تو یہ بات مریم کو بتانے کے لیے بے چین تھی اور سرمد اسے منع کر رہا تھا۔

"خیر اگر وہ کہہ رہے ہیں تو ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔" اس نے لاپروائی سے سر جھٹکا اور ملازمہ کو بتا کر جلدی سے اپنی پسندیدہ جگہ پر آگئی۔ اس گھر میں اس کی پسندیدہ جگہ سرمد کی اسٹڈی تھی' جہاں زمانے بھر کی کتابیں تھیں۔ وہاں پر اگر حرا جاتی تو اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا۔

سرمد جب تیار ہو کر باہر آیا تو حرا کہیں نہ تھی۔ ملازمہ کے بتانے پر کہ حرا اسٹڈی میں ہے' سرمد کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ اپنے معمول سے نہیں ہٹی لیکن سرمد بار بار ٹھٹک رہا تھا۔ انہی خیالوں میں گم وہ اسٹڈی کے دروازے پر تھا۔

"حرا! میں آفس جا رہا ہوں۔۔۔ اگر کوئی شاپنگ وغیرہ کرنی ہو تو شام کو تیار رہنا میں جلدی آجاؤں گا۔" اس کی موجودگی میں سرمد جب بھی آفس جاتا تھا' اس کے ہمیشہ یہی الفاظ ہوتے تھے۔ حرا نے سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا اور کتابوں میں گم ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

شام کو چاہتے ہوئے بھی سرمد جلدی نہ آسکا۔ لیکن اس نے حرا کو فون کر دیا۔ پھر وہ رات گئے جب گھر واپس آیا تو وہ سو چکی تھی۔ اسی لیے سرمد کی حرا سے ملاقات ناشتے کی میز پہ ہوئی۔ کالج کے سفید یونیفارم میں گھنے بالوں کی سادہ سی چٹیا کیے بغیر میک اپ کے پاکیزہ سے چہرے کے ساتھ وہ بہت کم سن لگ رہی تھی۔ سرمد تو اس کو دیکھ کر کہیں اور ہی کھو گیا۔ جب پہلی دفعہ ماں جی نے سرمد کی ضد پر حرا کو اس کی گود میں دیا تھا۔ اس وقت وہ تقریباً دس سال کا تھا' اسے وہ گلابی سی حرا بڑی اچھی لگی تھی۔ اس دن سے آج تک اس پسندیدگی اور پیار میں اضافہ ہی ہوا تھا۔ لیکن اس کا رنگ کچھ اور تھا۔ اس طرح کا ہرگز نہ تھا جس طرح کا حالات نے موڑ لیا تھا۔ سرمد کو آج بہت سی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے ناشتے کی طرف متوجہ ہوا۔

"کل بہت اہم میٹنگ تھی' اس لیے میں نہیں آ سکا' لیکن اگر کوئی ضروری چیز لینی ہے تو میں ابھی دِلا دوں گا یا بعد میں بھیج دوں گا۔" وہ اپنی کل کی خفت مٹا رہا تھا۔

"نہیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ اگر ہوئی تو آپ کو فون کر دوں گی۔ لیکن آپ ویک اینڈ پہ مجھے ضرور گھر لائیے گا' یہ نہ ہو آپ اپنی مصروفیت میں مجھے بھول جائیں۔"

اور سرمد حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "حرا! تمہیں ایسا لگتا ہے کہ میں اپنی مصروفیت میں تمہیں بھول جاؤں گا۔ پہلے کبھی ایسا ہوا ہے جو تم ایسا کہہ رہی ہو؟"

"نہیں' میرے کہنے کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ وہ... آپ بہت مصروف رہتے ہیں نا' اس لیے کہہ رہی تھی۔" حرا کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

"اچھا چلو ناشتہ ختم کرو۔ میں گاڑی میں انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ بھی جلدی سے بیگ اٹھا کر اس کے پیچھے چل دی۔

☼ ☼ ☼

حرا سارا دن تو کالج میں مصروف رہتی تھی۔ لیکن شام ہوتے ہی اسے ماں جی کی بہت یاد آتی تھی۔ اگر ماں جی کے علاوہ اسے کوئی یاد آتا تو وہ صرف سرمد تھا۔ وہ اپنے اور اس کے رشتے کے بارے میں سوچتے ہوئے عجیب سے احساسات میں گھر جاتی' جو اس کی سمجھ سے بالا ہی تھے۔ وہ ان احساسات سے گھبرا کر جلدی سے نیند میں پناہ لیتی' لیکن وہ یہ بات بڑی شدّت سے

محسوس کر رہی تھی کہ وہ سرمد کو کچھ زیادہ ہی سوچ رہی ہے۔ اس کی واحد دوست مریم کتنی بار اس کے بدلتے رویّے کی وجہ پوچھ چکی تھی' لیکن اس نے اسے ٹال دیا۔ حالانکہ اس کا اپنا اتنا دل کرتا کہ وہ مریم سے ساری بات شیئر کرے لیکن سرمد نے منع کیا تھا یہی سوچ کر وہ چپ تھی۔ نجانے کیوں وہ ابھی سے ویک اینڈ کا انتظار کر رہی تھی۔ حالانکہ آج اسے کالج آئے تیسرا دن تھا اور اسے ابھی سے ویک اینڈ کا انتظار تھا۔ اس کا دل کرتا کہ وہ کم از کم فون پر تو سرمد سے بات کرے' لیکن ہاسٹل کی وارڈن اتنی سخت تھی کہ انہوں نے موبائل رکھنے پر پابندی لگائی ہوئی تھی' کچھ لڑکیوں نے چوری چھپے رکھے ہوئے تھے' لیکن حرا اور مریم کے اپنے گھر کا ماحول بھی ایسا تھا کہ انہوں نے اس چوری چھپے کی عادت سے اجتناب ہی برتا تھا۔ یہ ایک نجی کالج تھا' ابھی حال ہی میں اس میں ماسٹرز کی کلاسیں شروع ہوئی تھیں' اس کی ریپوٹیشن بہت اچھی تھی۔ سرمد نے اسے یہاں اسی لیے ایڈمیشن دلایا تھا' ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اس کالج کی پرنسپل سرمد کے دوست ضیا کی امی تھیں۔ وہ بہت سخت مزاج تھیں اور جوان کے اصولوں کی پاس داری کرتا اس کے ساتھ وہ بہت اچھی بھی تھیں۔ ان ہی کے ایما پر ہاسٹل کی وارڈن بھی سختی سے پیش آتی۔ اشد ضرورت کے علاوہ اور گھر سے پرمیشن کے علاوہ کوئی لڑکی کالج اور ہاسٹل کی چار دیواری سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی تھی۔ انہوں نے برملا یہ کہا ہوا تھا کہ جس لڑکی کے پاس موبائل ہوا وہ اسے نکال دیں گی' ہاں کسی کو ضرورت ہو تو کالج کے آفس سے آ کر فون کر سکتا ہے۔ اب کس کی ہمت تھی کہ آفس میں میڈم کشور کے سامنے فون کر سکے۔ اس لیے لڑکیاں صبر کیے ہوئے تھیں اور آج سے پہلے تک تو حرا کو کبھی ان کے اصولوں پر اعتراض نہ تھا۔ لیکن اب ہونے لگا تھا کیوں کہ اب اس کے احساسات جو تبدیل ہو گئے تھے۔

☆☆☆

بالآخر ہفتے کا دن آ ہی گیا۔ کالج کے گیٹ پہ سلور گرے پجارو کے ساتھ سرمد ٹیک لگائے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے آج سے پہلے سرمد اتنا وجیہہ کبھی نہ لگا تھا' جتنا آج بلیک پینٹ کے ساتھ وائٹ ڈریس شرٹ اور بلیک کوٹ پہنے لگ رہا تھا۔ اس کے سلام کرنے پہ وہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"آج آنٹی کشور نے تعریف تو نہیں کر دی' بڑی خوش لگ رہی ہو۔" سرمد نے اس کے بلیک چادر کے ہالے میں مقید دمکتے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں وہ اتنے دنوں بعد..." بے اختیاری پہ ایک دم پہرے لگے تھے۔ "آپ کو دیکھا ہے۔" کے الفاظ بمشکل زبان تک آنے سے روکے تھے۔

"کوئی گھر کا شخص دیکھا ہے اس لیے خوش ہو رہی ہوں۔" احتیاط پسندی بہت ضروری تھی۔

"اچھا چھوڑو' تم یہ بتاؤ آئس کریم کھانی ہے؟"

سرمد نے اس کا دھیان بٹانا چاہا۔ حرا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور اس نے گاڑی کا رخ آئس کریم پارلر کی طرف موڑ دیا' سرمد عورتوں کا پبلک پلیس پر جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ سو آئس کریم پیک کروا کر لے آیا۔

"میں بھی حد کرتی ہوں۔ اگر میرے منہ سے کوئی غلط لفظ نکلتا تو وہ میرے بارے میں کیا سوچتے" آئندہ خیال رکھوں گی۔"

اس نے خود کو سرزنش کرتے ہوئے خبردار کیا تھا اور گھر آنے تک وہ پہلے کی طرح سرمد کو اپنی پڑھائی اور کالج کی چھوٹی چھوٹی باتیں بتانے لگی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی حرا کو مانوس سے احساس نے چھوا اور پھر جیسے ہی اس نے قدم لاؤنج میں رکھا' مانوس احساس نے مجسم شکل میں جھلک دکھائی۔ ماں جی کو سامنے دیکھ کر وہ خوشی سے پاگل ہو گئی اور ان کی پھیلی بانہوں میں آتے اور گرم آغوش کو پاتے ہی چہرہ آنسوؤں سے نم ہو تا گیا۔

"ناں میری دھی! روتے نہیں' بلکہ تم تو اپنے رب کا شکر ادا کیا کرو' جس نے تمہاری ماں کی ساری دعائیں سن لیں۔"

وہ نم آنکھوں سے اسے چومتے ہوئے چپ کرا رہی تھیں۔ جبکہ سرمد پاس ہی کھڑا یہ جذباتی منظر دیکھ رہا

تھا۔ اس نے حرا کو سرپرائز دیا تھا۔ وہ رات ہی کو ماں جی کو گاؤں سے لے آیا تھا تاکہ حرا کی خوشی کے لیے اپنے تئیں کچھ کر سکے۔ پر اسے کیا خبر تھی کہ قدرت کے اس فیصلے پر جہاں اسے اپنوں کی بے اعتباری کا دکھ ملا تھا' وہیں اس دکھ سے کہیں زیادہ خوشیوں سے قدرت نے اس کا دامن بھر دیا تھا۔ جن کو پا کر وہ بہت خوش تھی۔ ہاں یہ اور بات کہ وہ اس کا اظہار نہیں کر رہی تھی۔ کیونکہ جھجک مانع تھی۔

"آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ ماں جی آئی ہیں؟" سرمد کو بغیر مخاطب کیے گلہ کرتی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔

سرمد نے مسکراتے ہوئے کندھے اچکا دیے۔

"ماں جی! آپ بتائیں نا آپ یہاں کتنے دن رہیں گی؟" وہ پھر سے ماں جی کی طرف متوجہ ہوئی۔

"ارے پگلی! کتنے دن کیا' ایک دو دن ہی رہوں گی۔ وہ بھی تیرے بابا نے سرمد کی وجہ سے اجازت دے دی' ورنہ وہ کہاں گھر کی عورتوں کا باہر جانا پسند کرتے ہیں۔ جانتی نہیں کیا کہ میری تو ان کے سامنے ایک نہیں چلتی' تجھ سے ملنے کی چاہ کے باوجود ان سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ وہ تو رب حیاتی کرے سرمد کی جو تیری ماں کو یہاں لے آیا۔ پر اپنے رب کا شکر ادا کرتی ہوں کہ تیرے سر کا سائیں بہت اچھا ہے۔ تجھے سمجھتا ہے' تیرا خیال کرتا ہے۔

تمہاری طرف سے مجھے کوئی فکر نہیں' میں تو نصرت کو بھی دعائیں دیتی ہوں۔ چاہے جیسی بھی نیت کے ساتھ اس نے یہ حالات پیدا کیے لیکن ہمارا تو بھلا ہو گیا نا! تم بھی اس کی قدر کرنا' کبھی اس کی کوئی بات رد نہ کرنا۔"

ماں جی' سرمد کے سامنے ہی اسے کیا کیا نصیحتیں کیے جا رہی تھیں اور سرمد حیرانی سے حرا کے گالوں کی شفق دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

ایک بہت اچھا ویک اینڈ گزار کے ماں جی کی دعاؤں کے حصار میں حرا ایک دفعہ پھر ہاسٹل پہنچ گئی۔

"حرا! اس دفعہ تم اداس لگ رہی ہو' حالانکہ تم بتا رہی ہو کہ شہر والے گھر میں تمہاری ماں جی آئی ہوئی تھیں؟" مریم نے اسے اداس دیکھا تو پوچھے بنا نہ رہ سکی۔

"بس ایسے ہی سوچ رہی ہوں کہ کب ماسٹرز کمپلیٹ ہو گا اور اس روکھے پھیکے ہاسٹل سے چھٹکارا ملے گا۔" اس نے مریم کو ٹالنے کے لیے ایسے ہی بات بنائی۔

"اچھا ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اگلے ہفتے میری آپی کی شادی ہے' میرے ساتھ میرے گاؤں چلو گی۔ کیونکہ ویسے بھی میرے بغیر تم رہ نہیں سکو گی' اس لیے میرے ساتھ چلنا' قسم سے بڑا مزا آئے گا' ایک تو آپی زہرہ کے علاوہ میری کوئی بہن بھی نہیں اور نہ ہی کوئی دوست تم چلو گی نا؟"

وہ دوستوں والا حق جتاتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ جبکہ حرا سوچ میں پڑ گئی' اس کا اپنا دل تو چاہ رہا تھا لیکن پتہ نہیں سرمد سے اجازت ملتی ہے یا نہیں۔

"بتاؤ ناں چلو گی۔ بلکہ تم ایسا کرنا سرمد بھیا سے کہنا وہ تمہیں میڈم کشور اور بابا جان دونوں سے اجازت لے دیں گے۔"

مریم' سرمد کو اچھی طرح جانتی تھی سو مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے میں کوشش کرتی ہوں' لیکن وعدہ نہیں کرتی۔ کیا خبر گھر سے اجازت ملے یا نہ ملے' لیکن تم ناراض نہیں ہو گی۔" اس نے مریم کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ سرمد بھیا تمہاری بات نہ مانیں۔ مجھے پکا یقین ہے تم میرے ساتھ ضرور چلو گی۔" وہ یقین سے بولی۔

"اچھا بڑی آپا! تم کہتی ہو تو مان لیتی ہوں۔ اب ڈنر کرنے چلیں' ورنہ ٹائم سے نہ پہنچنے کی شکایت میڈم کو پہنچ جاتی ہے اور انہوں نے ہمارے بارہ بجا دینے ہیں۔"

"چلو مرو' ایک تو تمہیں کام کی بات پر کھانا یاد آتا ہے۔" وہ بھی اسے گھورتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

✿ ✿ ✿

سرمد فائلوں میں مصروف تھا' جب اس کا موبائل بجا حرا کے کالج کا نمبر دیکھ کر اس کا ماتھا ٹھنکا' ابھی دو دن پہلے ہی تو حرا مل کے گئی تھی۔ نجانے کیوں وہ حرا کے بارے اتنا احساس ہو گیا تھا۔ بہر حال اس نے فون کان سے لگایا' دوسری طرف حرا ہی تھی۔

"السلام علیکم! میں حرا بول رہی ہوں۔" سرمد کو بغیر مخاطب کیے بولنا اس کی عادت بن چکا تھا۔

"وعلیکم السلام تم ٹھیک تو ہو نا؟" وہ پریشان ہوا تھا۔

"جی بالکل! میں ٹھیک ہوں آپ آج یا کل مجھ سے ملنے آسکتے ہیں؟ ایک کام ہے۔" وہ خاصا جھجکتے ہوئے بول رہی تھی۔

"میں آج ہی آجاؤں گا' لیکن تم کام ابھی بتا دو' مجھے الجھن رہے گی۔" سرمد کو اس کے رویے سے حیرانی ہو رہی تھی۔ اب وہ میڈم کشور کے سامنے انہیں کیسے بتا سکتی تھی۔ کیونکہ وہ مسلسل اپنی بڑی بڑی غلافی آنکھوں سے اسے گھورے جا رہی تھیں۔

"آپ آئیں گے تو بتا دوں گی' اللہ حافظ۔"

سرمد کے کسی بھی سوال سے پہلے اس نے فون رکھ دیا اور میڈم کا شکریہ ادا کرتے ہوئے باہر آکر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ جہاں مریم اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا ہوا سرمد بھائی سے بات ہوئی کہ نہیں؟" مریم نے بے چینی سے پوچھا۔

"ہاں بات ہو گئی ہے۔ میں تو یہ سوچ رہی ہوں کہ میڈم کشور کے بچے ان کے ساتھ کیسے رہتے ہوں گے۔ میرا تو ان کے سامنے سانس ہی رک جاتا ہے۔" حرا وہیں گھاس پہ فائل پھینک کے خود بھی بیٹھ گئی۔ مجبوراً" مریم کو بھی تقلید کرنی پڑی۔

"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ وہ سختی تو صرف لڑکیوں کو راہ راست پر لانے کے لیے کرتی ہیں۔ ورنہ تو نا سمجھ لڑکیاں کالج آکر کیا کیا غلط کام کرتی پھرتی ہیں۔ لیکن ہمارے کالج کی ریپوٹیشن میڈم کشور کے سخت اصولوں کی وجہ سے ہی اپ ٹو ڈیٹ ہے اور جتنی ہماری میڈم نائس اور خوب صورت ہیں شاید ہی کوئی ہو۔ کتنی گریس فل ہیں۔ ڈریسنگ بھی غضب کی کرتی ہیں اور ان کی آنکھیں توبہ میں تو دیوانی ہوں ان کی آنکھوں کی' جی کرتا ہے' کاش! میں بھی شاعرہ ہوتی تو ضرور ان پر نظم کہتی۔"

مریم کی یہ باتیں سن کر حرا نے فائل اٹھائی اور پھر سارے کالج نے دیکھا کہ آگے مریم تھی اور پیچھے حرا' لیکن مریم حرا سے تیز تھی' اس لیے پکڑی نہ گئی۔

✿ ✿ ✿

حرا اگلے دن کے ٹیسٹ کی تیاری کر رہی تھی اور مریم ساتھ والے کمرے کی صبا لیاقت کی مزاج پرسی کے لیے گئی ہوئی تھی۔ کیونکہ وہ دو تین دن سے بہت سخت بیمار تھی۔ حرا تو صبح کالج جانے سے پہلے اس سے مل کے گئی تھی' جبکہ مریم دیر سے اٹھنے کی وجہ سے جا نہیں پائی تھی۔ تب ہی انٹر کام پر وارڈن نے اسے گیسٹ روم میں سرمد کے آنے کی اطلاع دی تھی۔ وہ جلدی سے دوپٹہ درست کرتی گیسٹ روم میں آئی' جہاں سرمد اس کا انتظار کر رہا تھا۔

بلیک پینٹ کے اوپر کیمل کلر شرٹ اور بلیک کوٹ پہنے' ہاتھوں میں سن گلاسز اور موبائل پکڑے' سلیقے سے بنے بالوں کے ساتھ وہ کسی فلم کا ہیرو لگ رہا تھا۔ پہلی ہی نظر میں سلام کرنے کے ساتھ ہی یہ خیال حرا کے ذہن میں آیا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی وہ سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"وہ میں نے آپ کو اس لیے بلایا تھا کہ آپ میری دوست مریم کو تو جانتے ہیں نا؟"

"ہاں کیوں؟ مریم حیدر کی بات کر رہی ہو نا' جو حسن پور کے چوہدری حیدر کی بیٹی ہے؟"

سرمد اس کی دوست کو اس لیے بھی جانتا تھا کہ پچھلے چار سالوں سے وہ اس کی اکلوتی دوست تھی۔ اس کی باتوں میں صرف اس کا ذکر ہوتا تھا' دوسرا الیکشن وغیرہ کے سلسلے میں چوہدری حیدر سے بھی اس کا آمنا سامنا تھا۔

"جی وہی' اصل میں اس کی بڑی بہن کی شادی ہے۔ تو اس نے مجھے بھی دعوت دی ہے۔ میں نے سوچا آپ سے پوچھ کر بتاؤں گی۔ میں اس کے ساتھ چلی جاؤں؟"

آج بات کرتے ہوئے اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔ کیونکہ اس طرح کی فرمائش اس نے پہلی دفعہ کی تھی۔

"ہرگز نہیں۔" دوسری طرف سے بھی قطعیت سے جواب وصول ہوا تھا اور وہ جو بڑے مان سے پوچھ رہی تھی۔ دکھ سے اسے دیکھنے لگی۔

"مجھے دکھ ہو رہا ہے حرا! کہ تم نے مجھ سے یہ بات پوچھی بھی کیوں؟ کیا تم نہیں جانتیں کہ تم پردہ کرتی ہو اور اس طرح غیر برادری اور غیر لوگوں میں جانے کا مطلب سراسر بے پردگی ہے۔ وہاں تم کیسے شادی جیسے فنکشن میں خود کو غلیظ نظروں سے محفوظ رکھ سکو گی۔ تم اتنی نا سمجھ ہرگز نہیں ہو جو اس حقیقت کو سمجھ نہ سکو۔ میں تمہیں آئس کریم پارلر میں آئسکریم اس لیے نہیں کھلاتا کہ وہاں پر طرح طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ میں اتنے لوگوں سے تو نہیں کہہ سکتا کہ اپنی آنکھیں بند کر لیں' لیکن میں اپنی عزت کو محفوظ ضرور رکھ سکتا ہوں۔ میں آج تک تمہیں کبھی بھی ہوٹلنگ کے لیے نہیں لے کے گیا۔ جو تم نے کہا وہ آرڈر پر ہمارے گھر پہنچ گیا۔ پھر ان سب باتوں کے باوجود تم کیسے مجھ سے اتنی دور' اکیلے' اور بہت سے دنوں کے لیے جانے کی اجازت مانگ رہی ہو؟"

آج وہ حرا کو بالکل وہاب خان کی طرح لگا تھا۔ دوسروں کے احساسات کی پروا کیے بغیر اپنا قانون اور اپنے اصول لاگو کرنے والا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ جس شخص نے کبھی آپ کی بات رد نہ کی ہو۔ جب وہ آپ کی بات سے انحراف کرتا ہے تو دکھ تو ہوتا ہے۔ چاہے وہ بات غلط ہی کیوں نہ ہو۔

"حرا!" وہ دروازے تک پہنچی تھی' جب سرمد نے پیچھے سے اسے پکارا۔

"یہ لے جاؤ' میں تمہارے لیے لایا تھا۔" سرمد نے اس شاپر کی طرف اشارہ کیا..... وہ آتے ہوئے اس کے لیے کیک اور چاکلیٹ لے کے آیا تھا۔

وہ خاموشی سے شاپر اٹھا کے تیز تیز قدموں سے باہر چلی گئی۔ سرمد کو سچ مچ غصہ آیا ہوا تھا۔ اسے حرا سے اس نادانی کی توقع نہ تھی' اس لیے اس نے نرم رویہ ہرگز نہ اپنایا۔

مریم جب کمرے میں واپس آئی تو حرا آگے بیٹھی گھٹنوں میں منہ دیے رو رہی تھی۔ وہ اس کے اس طرح رونے سے بوکھلا گئی۔

"حرا! خیریت تو ہے نا؟ تم کیوں اس طرح رو رہی ہو؟" لیکن وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر روئے جا رہی تھی۔ پھر مریم کی نظر شاپر پر پڑی تو وہ سمجھ گئی کہ سرمد بھائی آئے تھے اور یقیناً" اجازت نہ ملنے کی ہی خبر سنائی ہے۔ جو اس طرح رو رہی ہے۔

"حرا! تمہیں میرے ساتھ شادی پہ جانے کی اجازت نہیں ملی، اس لیے رو رہی ہو؟"

حرا نے اثبات میں سر ہلا دیا' حالانکہ اسے شادی پہ نہ جانے کا دکھ ہرگز نہ تھا' بلکہ اسے تو سرمد کا رویہ رلا رہا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ دنیا میں سرمد وہ واحد شخص ہے جو اس کی کسی بات کو رد نہیں کر سکتا' لیکن اسے خود اندازہ ہی نہ تھا کہ پہلے بھی اس کی اپنی فرمائش رد کیے جانے کے قابل نہ تھی' اس نے بات ہی ایسی کی جو سرمد کے اصولوں کے خلاف تھی۔

"اچھا چلو کوئی بات نہیں' مجھے بھی تمہارے بغیر مزا تو نہیں آئے گا لیکن سارے فنکشنز کی تصویریں لے کے آؤں گی۔ آؤ چلو' جلدی سے کیک کھاتے ہیں اس سے پہلے کہ خراب ہو جائے۔"

مریم کا اپنا دل بھی خراب تو ہوا تھا۔ لیکن وہ اس کے سامنے ظاہر کر کے اسے مزید دکھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے اس کی توجہ کیک اور چاکلیٹ کی طرف مبذول کروائی۔ لیکن آج حرا کو کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

"اب ویک اینڈ پہ گھر بھی نہیں جاؤں گی۔" برستی آنکھوں کے ساتھ اس نے خود سے عہد کیا اور اس

عہد پر قائم بھی رہی' آخر سرمد پر اپنی ناراضی ظاہر بھی تو کرنی تھی۔ دوسرے ہی دن میڈم کشور کی خشمگیں نگاہوں کی پروا کیے بغیر وہ آفس میں گئی اور ضروری کام کا کہہ کر سرمد کا نمبر ملایا' سرمد کی وجہ سے میڈم کا رویہ اس کے ساتھ کافی نرم تھا۔ دوسری طرف سرمد نے دوسری ہی بیل پر فون اٹھا لیا۔

"آپ مجھے ویک اینڈ پہ لینے نہ آئیے گا۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔" سلام کے بعد اس نے یہ بات کہی اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا' اس کی بات پر سرمد کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔

اب وہ حرا کو کیا بتاتا کہ وہ ویک اینڈ پہ گھر آئے یا نہ آئے لیکن وہ اس کی پل پل کی خبر رکھتا ہے۔ وہ ہر روز آنٹی کشور سے بات کرکے اور تسلی کرکے سوتا تھا۔ لیکن حرا نے تو چھوٹی سی بات کو خود پر سوار کرلیا۔ انہی جلتے کڑھتے دنوں میں مریم کی روانگی کا دن آگیا۔

وہ دو ہفتوں کی چھٹی پہ جارہی تھی اور یہی سوچتے ہوئے حرا کا دل بیٹھا جارہا تھا کہ وہ اس کے جانے کے بعد دن کیسے گزارے گی۔ کیونکہ اس کی تو کوئی دوست بھی نہ تھی۔ دونوں یہی باتیں کرتے ہوئے ویٹنگ روم تک آگئیں اور یہی حرا اعوان کی غلطی تھی۔ وہ جو کسی کے سامنے نہیں آتی تھی' آج غیر ارادی طور پر ہی سہی' لیکن مصطفیٰ حیدر کے سامنے آگئی اور مصطفیٰ حیدر جو اپنی چھوٹی بہن کو لینے آیا تھا' آج زندگی میں پہلی بار اتنے پاکیزہ حسن کو دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور اسے لگا کہ اس کی تلاش ختم ہو گئی۔ حرا اب بھی مریم سے باتیں کیے جارہی تھیں اور اسے اندازہ ہی نہ تھا کہ کسی کی آنکھیں اسے ازبر کیے جارہی ہیں۔

ریڈ ویلوٹ کی قمیص اور آف وائٹ پاجامے کے اوپر لاپروائی سے لیا ہوا آف وائٹ اور ریڈ ٹائی اینڈ ڈائی کیا ہوا دوپٹہ' ڈھیلی ڈھالی سی لمبے گھنے بالوں کی چٹیا اور نم بھنورا سی آنکھوں کے ساتھ وہ کسی کو اپنا کر گئی۔ وہ تو وہیں دروازے سے ہی مریم سے مل کر چلی گئی' لیکن مصطفیٰ حیدر کو لگا کہ اس کا دل کبھی اس دہلیز سے جا نہیں پائے گا۔ وہ دل ہی دل میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

مریم جب حویلی پہنچی تو وہاں پہ خوب چہل پہل تھی۔ آپی زہرہ کو آج ہی سے مایوں بٹھا دیا گیا تھا۔ اس لیے سارے عزیز رشتہ دار حویلی میں جمع ہو چکے تھے۔ اتنی ساری کزنز کے درمیان بھی مریم کو حرا کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ سارا دن تو وہ پھر بھی مصروف رہی لیکن جب رات کو اپنے کمرے میں سونے کے لیے آئی تو اسے حرا بہت یاد آئی۔ ان کو ایک ہی کمرہ شیئر کرتے پانچواں سال شروع ہو چکا تھا اور آج تک کسی چھوٹی سی بات پر بھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ اسی لیے وہ ایک دوسرے کی کمی کو بہت محسوس کرتی تھیں۔ ویسے تو وہ زہرہ آپی کے کمرے میں سو جاتی لیکن وہاں پر سب کزنز نے ڈیرہ جمایا ہوا تھا اور وہ اتنے رش میں تو سو نہیں سکتی تھی۔ اسی لیے وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ لیکن اس وقت وہ خوش ہو گئی۔ جب مصطفیٰ بھائی کو اپنے کمرے داخل ہوتے دیکھا۔ دونوں بہن بھائی میں بلا کی ہم آہنگی تھی۔ اس لیے دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ لیکن آج اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ محض اس سے گپ شپ کرنے نہیں آیا بلکہ اپنے دل کی فرمائش پر اس کومل سی لڑکی کے بارے میں جاننے آیا تھا۔

"شکر ہے مصطفیٰ بھائی! آپ آگئے۔ قسم سے میں بڑی بور ہو رہی تھی۔" اس نے بیڈ پر بھائی کے لیے جگہ بناتے ہوئے کہا۔

"اگر بور ہو رہی ہو تو اس بوریت کو دور کرنے کا کوئی بندوبست کرتیں' اپنی دوستوں کو ساتھ لے آتیں۔" ڈائریکٹ اپنی چھوٹی بہن سے بات کرتے ہوئے جھجک ہو رہی تھی۔

"دوستوں کہاں مصطفیٰ بھائی! میری ایک ہی دوست ہے حرا اعوان اور اسے گھر سے اجازت ہی نہیں ملی' تب ہی تو بے چاری رو رہی تھی۔"

"حرا اعوان!" مصطفیٰ نے زیر لب اس کا نام دہرایا۔ "ویسے موموا ایک بات تو بتاؤ' لڑکیوں کو کتنا شوق ہوتا ہے اپنے بھائیوں کی شادی کا' تمہیں اس قسم کا کوئی شوق لاحق نہیں۔" وہ بڑے شریر انداز میں دیکھتے ہوئے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"کیوں بھائی! آپ کو کوئی لڑکی پسند آگئی ہے' جو خود بخود یہ موضوع لے کر بیٹھ گئے اور شوق کی بھی خوب کہی آپ نے۔ جب بھی امی بات کرتی ہیں' آپ ٹال دیتے ہیں تو مجبوراً اپنے شوق دبانے پڑے' لیکن اب آپ نے بات کی ہے تو اس خوش نصیب کا نام بھی بتا دیں۔ جس پر چوہدری مصطفیٰ حیدر کی نظر ٹھہر گئی۔"

وہ بھی شرارت کے موڈ میں تھی۔

"موموا وہ لڑکی جو ویٹنگ روم کے دروازے پر تم سے باتیں کر رہی تھی۔ وہی تمہاری دوست حرا اعوان ہے نا؟"

"ہاں کیوں؟"

"وہ انگیجڈ تو نہیں۔" مریم جو پہلے تو نا سمجھی کے عالم میں اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ سمجھنے پر حیرانی اور خوشی سے اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

"بھائی! آپ کو حرا پسند آئی ہے۔ او میرے خدا! یہ خیال میرے ذہن میں کیوں نہ آیا کہ میں اپنی اس پیاری دوست کو بھابھی کے روپ میں ہمیشہ کے لیے اپنے گھر لے آؤں۔ بھائی آپ کو وہ اچھی لگی ہے نا؟" مریم بڑے جوش سے اپنے وجیہہ بھائی سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں بے وقوف' اچھی لگی ہے تبھی بات کر رہا ہوں۔" مریم کے جوش سے اسے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ بات بن سکتی ہے۔

"بھائی! وہ ابھی تک انگیجڈ نہیں لیکن اب ہم بھی دیر نہیں کریں گے۔ بلکہ بابا جان سے بات کرکے جلدی سے اس کو اپنے نام کرلیں گے۔" مریم کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنی خوشی کا اظہار کس طرح کرے۔

"نہیں نہیں اتنی جلدی نہیں' ابھی تم اس کا خیال معلوم کرو' کیا پتہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہو؟" یہ خدشہ ظاہر کرتے ہوئے مصطفیٰ حیدر کی زبان تک کڑوی ہو گئی لیکن وہ زبردستی کا قائل نہ تھا۔

"ارے بھائی! میں اور حرا پانچ سالوں سے ساتھ رہ رہے ہیں۔ بھلا ایسی کوئی بات مجھ سے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ آپ اس طرف سے تو بے فکر رہیں لیکن ایک بات ہے کہ اس کے بابا بہت سخت گیر ہیں۔ خاندان سے باہر شادی پر انہیں یقیناً اعتراض ہو گا۔" مریم باتوں ہی باتوں میں کہاں تک پہنچ گئی۔

"ارے تمہارا بھائی کوئی گرا پڑا تو ہے نہیں جو کوئی انکار کر سکے۔" مصطفیٰ نے بات مذاق میں اڑا دی۔ "بہرحال کسی طریقے سے حرا کی رائے لینا ضروری ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتا اس کا موبائل بج اٹھا اور وہ بات کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ لیکن مریم کے لیے سوچوں کے در وا کر گیا۔

"اگر ہم براہ راست حرا کے بابا جان کے پاس پہنچ گئے تو حرا کی ریپوٹیشن خراب ہو گی' ہم پہلے سرمد بھائی کو قائل کریں گے اور ان کے ذریعے مصطفیٰ بھائی کا پرپوزل بھیجیں گے پھر یقیناً بات بن جائے گی۔"

وہ دل ہی دل میں کیا کیا پروگرام بنانے لگی۔ اسے اگر اپنا بھائی بہت عزیز تھا تو حرا بھی کچھ کم عزیز نہ تھی۔

☼ ☼ ☼

اس دن حرا بوریت سے بچنے کے لیے اشفاق احمد کی "شہر آرزو" پڑھ رہی تھی۔ جب اسے وارڈن کا میسج ملا تھا کہ جلدی سے گیٹ پہ آئے اسے گھر سے لینے کوئی آیا ہے۔ ان کے گھر کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہے۔

"یا الٰہی خیر!" پیغام ملتے ہی وہ دہلتے دل کے ساتھ بڑی سی چادر اوڑھے بھاگتی ہوئی گیٹ تک پہنچی تھی' جہاں پہ سرمد گاڑی میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر ہراساں نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس میں کچھ پوچھنے کی بھی سکت نہ رہی۔

"وہ دراصل فہد ننھیال جا رہا تھا کہ راستے میں

گاڑی کی بریکس فیل ہو گئیں' اور ڈرائیور توازن برقرار نہیں رکھ سکا' گاڑی ایک مکان کی دیوار سے جا لگی' ڈرائیور کو تو اتنی چوٹیں نہیں آئیں لیکن فہد کو بہت زیادہ چوٹیں آئی ہیں' ابھی ابھی مجھے بابا جان کا فون آیا تو انہوں نے بتایا۔ وہ ہسپتال پہنچ چکے ہیں۔ تو میں نے سوچا تمہیں بھی ساتھ لے جاؤں۔"

حرا کی نگاہوں میں معصوم سے فہد کا چہرہ گھوم گیا۔ اس کے ساتھ حرا کی بڑی دوستی تھی' چچی کی نسبت وہ ان سب کے بہت قریب تھا۔

"اللہ کرے اسے کچھ نہ ہو۔" وہ دل ہی دل میں دعائیں کر رہی تھی۔

جب وہ ہاسپٹل پہنچے تو وہاں پر ماں جی' چاچی نصرت' بابا جان حویلی کے ملازموں کے ساتھ موجود تھے۔ وہاب' اعوان بڑے گھبرائے ہوئے سرمد کی طرف بڑھے۔

"کیا بات ہے بابا جان! کیا فہد کی حالت بہت تشویش ناک ہے؟" وہ ان کے کچھ بتانے سے پہلے بول اٹھا۔

"ہاں حالت تو اس کی بہت خراب ہے' بہت خون بہہ گیا ہے اور مسئلہ یہ ہے کہ اس کا بلڈ گروپ او نیگٹو ہے۔ ہم میں کسی کا گروپ اس کے ساتھ میچ نہیں کر رہا اور یہاں سے مل بھی نہیں رہا۔ ڈاکٹر ٹریٹمنٹ تو کر رہے ہیں لیکن وہ جلد از جلد خون کا بندوبست کرنے کو کہہ رہے ہیں۔" بابا جان نے فکرمندی سے اسے بتایا۔

"سرمد بچے! میرے فہد کو بچالو۔ میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

گھٹنوں میں سر دیے روتی ہوئی نصرت کی نظر اب ہی سرمد پر پڑی تھی' اسی لیے وہ تیزی سے اس تک آئی تھیں۔

"آپ فکر نہ کریں چچی! ان شاء اللہ فہد ٹھیک ہو جائے گا' میں بلڈ ٹیسٹ کرواتا ہوں۔ اللہ کرے میچ ہو جائے' ورنہ میں اپنے دوستوں کو فون کرتا ہوں۔"

اسی اثنا میں حرا جو بہت گھبرائی ہوئی تھی' اس کے ذہن میں ایک دم کچھ کلک ہوا۔

"میرا بلڈ گروپ او نیگٹو ہے۔ میں فہد کو بلڈ دوں گی۔" کالج میں ایڈمیشن کے وقت فارم میں بلڈ گروپ بھی لکھنا تھا۔ ان سب لڑکیوں کا کالج کی لیب میں ہی ٹیسٹ ہوا تھا' عرصہ تو بہت گزر گیا تھا لیکن اسے پھر بھی یاد رہ گیا۔

"نہیں نہیں' تم رہنے دو' خود اتنی ویک ہو۔ میں خود انتظام کرتا ہوں۔" سرمد کو اچھی خاصی حرا دیک لگ رہی تھی۔

"وہاب صاحب! آپ ابھی تک ایسے ہی کھڑے ہیں۔ جلدی کریں بچے کی حالت بہت نازک ہے۔" ایمرجنسی روم سے ڈاکٹر عذیر نے آکر ایسے بات کی کہ حرا خود ہی ان کے سامنے آگئی۔

"ڈاکٹر صاحب میرا بلڈ گروپ فہد سے میچ کرتا ہے۔"

"تو بیٹا جلدی آئیں۔" ڈاکٹر عذیر نے اس کی بات مکمل ہی نہ ہونے دی اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ اس وقت سرمد بھی کچھ نہ کہہ سکا۔

اور پھر حرا کا بلڈ ڈائریکٹ فہد کو دیا جانے لگا۔ ایک ایک کر کے خون کا قطرہ حرا کے جسم سے کشید ہو رہا تھا اور فہد کے جسم میں داخل ہو کر زندگی کی نوید بنتا جا رہا تھا۔ نصرت چچی تو ندامت سے منظر دیکھ رہی تھیں' لیکن نجانے کیوں سرمد سے یہ منظر برداشت ہی نہیں ہو رہا تھا' بیڈ پر لیٹی ہوئی حرا کو دیکھ کر اسے دکھ ہو رہا تھا اور پھر وہ تیزی سے چلتا ہوا ڈاکٹر عذیر کے کمرے میں آیا تھا۔ وہ ان کے فیملی ڈاکٹر تھے۔

"ڈاکٹر صاحب اگر میں کچھ اور بندوبست کر لوں تو فہد کی باڈی وہ بلڈ ایکسپٹ کر لے گی نا! میرا مطلب ہے تاکہ حرا کو زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔" اس کی بات پر ڈاکٹر کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"سرمد! ادھر بیٹھو۔" انہوں نے ایک چیئر کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے معلوم ہے کہ تم حرا کے بارے میں کافی حساس ہو' لیکن میں تمہاری تسلی کے لیے بتا دوں کہ حرا کو کوئی تکلیف نہیں ہو رہی۔ جب ایک صحت مند انسان خون دیتا ہے تو یہ اس کے لیے فائدہ مند ہوتا ہے ناکہ تکلیف دہ' بس اتنی احتیاط کرنی چاہیے کہ بعد میں اچھی خوراک اور جوسز کا استعمال زیادہ کرنا چاہیے' تاکہ نیا خون جلد بن سکے۔ تم بے فکر رہو۔" ڈاکٹر کے سمجھانے پر بھی اس کی تسلی تو نہ ہوئی لیکن وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن باہر جاتے جاتے وہ پھر رک گیا۔

"کون سا جوس زیادہ بہتر رہے گا؟" اس کی بات پر وہ ایک دفعہ پھر مسکرا دیے۔

"انار کا' انار کا جوس زیادہ بہتر رہے گا۔" ان کی بات سن کر وہ باہر آ گیا۔ جہاں یہ ماں جی تو تسبیح پڑھے جا رہی تھیں جبکہ نصرت صرف روئے جا رہی تھیں اور وہ آنسو دکھ سے زیادہ ندامت کے تھے۔ جس کی زندگی وہ برباد کرنے پر تلی تھیں' آج وہی ان کے بیٹے کی زندگی کی وجہ بنتے جا رہی تھی۔ یہ حادثہ انہیں یہ باور کرانے کے لیے کافی تھا کہ جس فہد کی وجہ سے وہ اپنی زندگی اور اپنا مستقبل محفوظ کرنا چاہ رہی تھیں وہی فہد اگر اللہ تعالیٰ واپس لے لیتا تو پھر وہ کیا کر سکتی تھیں۔ انسان کبھی بھی گھناؤنی سازشوں سے اپنا مستقبل محفوظ نہیں کر سکتا' یہ کام اس خدائے لم یزل کے ہیں جو سب کا پالنے والا ہے۔ آج ان کا سویا ہوا ضمیر بیدار ہو گیا تھا اور انہیں لگ رہا تھا کہ وہ اتنے عرصے سے زندہ کیسے تھیں۔ ایک بیٹی کو اپنے ماں باپ سے دور کر کے وہ کیسے اپنے بیٹے کو پاس رکھے ہوئے تھیں۔ آج نجانے کون کون سی آوازیں سر اٹھا رہی تھیں' تب ہی کتنی دیر بعد حرا کو باہر لایا گیا تو سب نے عجیب منظر دیکھا۔ وہ حرا کے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئیں اور رو رو کے معافی مانگنے لگیں۔ حرا تو بوکھلا اٹھی۔

"نصرت! حرا نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا' فہد اس کا بھی تو بھائی ہے۔"

ماں جی نے اپنی سادگی میں یہی سمجھا کہ وہ شکریے کے طور پر یہ کر رہی ہیں۔ لیکن جب روتے ہوئے انہوں نے اپنی سازشوں سے پردہ اٹھایا اور معافی مانگی تو سرمد' حرا اور ماں جی تو زیادہ حیران نہ ہوئے' کیونکہ وہ جانتے تھے حرا بے قصور ہے لیکن وہاب اعوان کو کافی دھچکا لگا۔ جس کو سکھ دینے کے لیے انہوں نے اپنی ذات کو بھی پس پشت ڈال دیا تھا' اس نے ان کو یوں ڈسا تھا۔ حرا نے ہچکیاں لیتی نصرت چاچی کو اوپر بٹھایا۔

"بھائی صاحب! آپ بے شک مجھے گھر سے نکال دیں' میں اپنے بیٹے کے ساتھ میکے چلی جاؤں گی لیکن آپ سب مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ سب کی زندگی میں بہت زہر گھولا ہے' لیکن آج میرے رب نے میری آنکھیں کھول دیں۔" ان کی حالت بہت خراب ہو رہی تھی اور ان سے بولا بھی نہیں جا رہا تھا۔

"نصرت! تم میرے شہاب کی امانت ہو' تم غلطیاں بھی کرو' تب بھی تمہارا اس گھر پہ اتنا ہی حق ہے' جتنا ہم سب کا' لیکن میرے رب کا شکر ہے کہ اس نے مجھے غلط فیصلے سے بچا لیا اور میری بیٹی آج اپنے گھر میں خوش ہے۔"

ماں جی بھی انہیں چپ کراتے ہوئے پانی دے رہی تھیں اور سرمد کو نجانے کیوں یہ بھی ڈراما ہی لگ رہا تھا۔ اسے اب یہ تو تسلی تھی کہ فہد خطرے سے باہر ہے۔ لیکن اس کا دل ماں جی اور بابا جان کی طرح بڑا نہ تھا جو نصرت جیسی عورت کی دلجوئی کرتا رہتا۔

"حرا! اٹھو ہم گھر چلیں۔" اور پھر اس کے کچھ بولنے سے پہلے' بغیر کسی کی طرف دیکھے اس نے حرا کو بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور سہارا دے کر چل پڑا۔ حالانکہ حرا کو سہارے کی ضرورت ہرگز نہ تھی۔ لیکن اب سرمد کو کون بتاتا اور پھر ایک جگہ گاڑی روک کر وہ باہر چلا گیا۔ واپسی پر نجانے کیا کچھ اس کے ساتھ تھا۔

"میں آنٹی کشور کو فون کر دوں گا۔ تم پورا ہفتہ گھر میں رہو گی اور یہ ساری چیزیں وقتاً فوقتاً کھاتی رہنا۔ وہاں ہاسٹل میں تو اچھا کھانا نہیں بنتا نا!"

وہ اور بھی نجانے کیا کیا بولے جا رہا تھا اور حرا ناراضی بھلائے اسے سنے جا رہی تھی۔ ایک تو اتنے دنوں بعد اسے دیکھا تھا اوپر سے اس کا فکرمند ہونا حرا کو اندر تک نہال کر گیا اور اس کا کتنا خون بڑھا گیا۔ اب حرا اسے کیا بتاتی کہ اسے پھلوں اور چیزوں سے زیادہ

اس کی یہ فکر اچھی لگ رہی ہے۔

"آپ کو اتنی جلدی وہاں سے نہیں آنا چاہیے تھا۔" آخر بہت دیر بعد وہ بولی تھی۔

"کیوں؟" سرمد کی ماتھے کی سلوٹوں میں ایک دم اضافہ ہوا تھا۔

"ایک انسان جب اپنے کیے پہ نادم ہو تو اسے معاف کر دینے میں کیا حرج ہے؟" وہ رسان سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"حرا میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں، لیکن تمہاری ذات سے منسلک کسی کی کوئی کوتاہی معاف نہیں کر سکتا، شاید اپنی بھی نہیں۔"

حرا حیرانی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یہ اظہار کی کون سی کیفیت تھی، جس سے وہ گزر رہا تھا۔

"نصرت چچی کے علاوہ وہاں پہ فہد بھی تھا اور وہ بیمار تھا، کیا تھا جو اس کے ہوش میں آنے تک وہاں رکے رہتے۔" حرا بھی شاید آج بہت کچھ سننے کے موڈ میں تھی۔

"فہد کیا لگتا ہے ہمارا؟ سوائے انسانیت کے ہمارا اس سے اور کوئی رشتہ نہیں اور انسانیت کا فرض تم اپنا خون دے کر پورا کر چکی ہو، اس دنیا میں اگر مجھے کسی کی پروا ہے تو صرف تمہاری اور میں صرف ان کی عزت اور پروا کروں گا، جنہیں حرا اعوان عزیز ہو گی نہیں تو میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔"

سرمد جیسے اپنے آپ سے بول رہا تھا اور حرا بے یقینی کے عالم میں ڈوب رہی تھی کہ یہ آج سرمد کو کیا ہو گیا ہے، اب سرمد اسے کیا بتاتا کہ اسے ہاسپٹل کے بیڈ پہ لیٹے دیکھ کر وہ نجانے کون کون سی منزلیں طے کر آیا ہے جس پہ اسے کوئی اختیار نہ تھا۔

حرا کیسے گاڑی سے گھر اور گھر میں اپنے کمرے میں پہنچی، اسے محسوس ہی نہ ہوا، وہ تو ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ سرمد اسے دو گلاس انار کے جوس کے پلا چکا تھا اور اب تیسرے پر مصر تھا، لیکن میٹھے سے اس کا جی متلانے لگا۔

"بس بھی کریں سرمد! آپ تو حد کرتے ہیں۔" اور گلاس سرمد کے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچا تھا۔ سرمد نے آج پہلی دفعہ اپنا نام اس کے منہ سے سنا تھا، حرا کو شاید محسوس بھی نہیں ہوا تھا، لیکن سرمد کو لگا تھا آج اس کی ذات، ان کا رشتہ مکمل ہو گیا۔ وہ اس کو آرام کا کہہ کر خود باہر آ گیا تھا۔ وہ اکثر سوچتا تھا کہ حرا یہ رشتہ کیسے ایکسیپٹ کرے گی، لیکن آج اس کے صرف سرمد کہنے پر ہی اس کے تمام خدشات کا جواب مل گیا تھا، اسے کیا خبر تھی کہ عورت، مرد سے زیادہ حساس ہوتی ہے اور رشتوں کی نزاکت کو وہ مرد سے بہتر طور پر جانتی ہے۔

اسے کیا خبر تھی کہ حرا نے تو صرف ماں کی باتوں پر ہی اس رشتے کو دل و جان سے قبول کیا تھا اور سرمد سے بھی اسی رویے کی متقاضی تھی۔ جو آج اس نے پا لیا تھا اور وہ بہت پُرسکون تھی۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن سرمد نے آفس سے چھٹی کی تھی اور وہ دونوں آج بہت دنوں بعد پہلے کی طرح باتیں کر رہے تھے۔ جب ماں جی اور بابا جان دونوں لاؤنج میں داخل ہوئے۔ حرا، بابا جان کو یہاں دیکھ کر حیران ہوئی۔ لیکن اس وقت تو بے ہوش ہوتے ہوتے بچی جب انہوں نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

"حرا میرے بچے! ہو سکے تو اپنے بابا جان کو معاف کر دینا۔ تجھے بڑا دکھ دیا ہے۔ بھائیوں کی ذمہ داری پوری کرتے کرتے اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی برت گیا۔"

وہاب اعوان اسے سینے سے لگائے رو رہے تھے اور حرا بھی رو رہی تھی۔ جبکہ ماں جی کو آج بڑے عرصے بعد دلی سکون ملا تھا، یوں باپ بیٹی کے ملن پر وہ مسکرا رہی تھیں، سرمد بھی مطمئن سا ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔

"بابا! آپ ایسا نہ کہیں میں آپ سے ناراض نہیں ہوں۔ لیکن آپ مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ کبھی مجھ سے بدگمان نہیں ہوں گے۔ اور اب میں آپ سے ملنے گاؤں آ جایا کروں نا!" یہ سن کر وہاب اعوان کی نظریں ندامت سے جھک گئیں۔

دوسروں کے لیے اپنی اولاد پہ گھر کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ اور یہ سوال ان کی اپنی سگی اکلوتی بیٹی کر رہی تھی۔ ہاں لیکن یہ عہد انہوں نے ضرور کیا تھا کہ وہ آئندہ ایسی غلطی کبھی نہیں کریں گے۔

وہ دن حرا اور سرمد کی زندگی کا یادگار دن تو تھا ہی، لیکن حرا تو سرخرو بھی ہو گئی تھی۔ اس دن اس کے سارے اپنے اس کے پاس تھے۔

☼ ☼ ☼

"مومو! اپنی دوست سے باتوں باتوں میں رائے ضرور لینا۔" مصطفیٰ جب مریم کو کالج چھوڑنے آیا تو جاتے جاتے اسے پھر تاکید کی۔

"ارے بھئی آپ فکر نہ کریں، بس سمجھیں یہ کام تو آج ہی ہو جائے گا، میں آپ کو فون کر دوں گی، پھر بابا جان سے فائنل کر کے مجھے بھی لے جائیے گا۔ مل کر پروپوزل لے کر جائیں گے۔" وہ مصطفیٰ سے بھی زیادہ بے قرار تھی۔

اور مصطفیٰ اس کی باتوں پر مسکراتے ہوئے چلا گیا۔ مریم کو جب اپنا کمرہ خالی ملا تو اسے حیرانی ہوئی۔ کیونکہ اس وقت تو حرا عموماً سوتی تھی، آج اس کا بیڈ خالی تھا اور کمرہ بھی ایسے لگ رہا تھا جیسے یہاں کوئی رہتا ہی نہیں۔ وہ جلدی سے ساتھ والے کمرے کی صبا لیاقت کی طرف آئی۔

"حرا کو کہیں دیکھا ہے؟" سلام دعا کے بعد اس نے فوراً سوال کیا تھا۔

"اسے تو گھر گئے کافی دن ہو گئے ہیں۔"

"خیریت تو تھی نا؟ کیوں گئی ہے؟" نجانے کیوں اسے بے چینی سے ہونے لگی۔

"معلوم نہیں تم وارڈن سے پوچھ لو، انہیں خبر ہو گی۔"

اور مریم نے سانس بھی نہ لیا اور بھاگتی ہوئی وارڈن کے آفس پہنچی لیکن وہاں سے سوائے اس کے کہ ان کے گھر ایمرجنسی تھی، سو وہ چلی گئی ہے اور کچھ معلوم نہ ہوا۔

اب اس کے پاس اور کوئی ذریعہ بھی نہ تھا، جس سے وہ اس کے بارے میں معلوم کر سکتی، انہوں نے تو آج تک ایک دوسرے کو گھر کا فون نمبر بھی نہیں دیا تھا، کیونکہ حرا کہتی تھی کہ اس کے بابا جان کو ان کاموں سے چڑ ہے۔ وہ بہت سخت مزاج ہیں اسی ڈر یا فرماں برداری کی وجہ سے دونوں نے خود پہ پہرے لگائے ہوئے تھے۔ اسی لیے مریم سوائے صبر اور انتظار کے اور کچھ نہیں کر سکتی تھی جو کہ اس جیسی لڑکی کے لیے کافی مشکل کام تھا۔ ایک تو ویسے ہی حرا کے بغیر ٹائم گزرتا ہی نہیں تھا اوپر سے اس کے گھر نہ جانے کیا ہوا ہے۔ یہی سوچ کر وہ بے چین رہی۔

اسے آج ہوئے دوسرا دن تھا۔ وہ فری پریڈ میں اپنی فیس اور ہاسٹل ڈیوز جمع کرانے کلرک کے آفس چلی آئی۔ یہ کام کر کے وہ بے دلی سے چلتی ہوئی لائبریری کی طرف جانے کا سوچ ہی رہی تھی جب میڈم کشور کے آفس سے باہر آتے ہوئے سرمد پر اس کی نظر پڑی تھی۔ اور پھر سب کچھ بھلائے وہ اس کی طرف دوڑ لگا چکی تھی۔ آفس والا حصہ بالکل گیٹ کے پاس تھا۔ جس میں میڈم کا آفس اور کلرک کے آفس کے علاوہ ریسپشن لائی تھی سرمد ویسے تو فون پر میڈم کشور کو حرا کی خراب طبیعت کا بتا چکا تھا۔ لیکن آج وہ خود آ گیا تھا تاکہ بات بھی کر سکے اور فیس وغیرہ بھی جمع کرا سکے۔ اس نے یوں ایک انجان لڑکی کو اپنی طرف آتے دیکھا تو حیران ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ کیونکہ سرمد تو مریم کو نہیں جانتا تھا لیکن مریم نے اس کو ایک آدھ دفعہ ایسے ہی آتے جاتے دیکھا ہوا تھا اور حرا کے بتانے پر کہ یہ سرمد ہے وہ اسے جانتی تھی۔

"السلام علیکم! آپ سرمد بھائی ہی ہیں نا؟ حرا کے کزن؟" اپنی پھولی ہوئی سانس بحال کرتے ہوئے اس نے اپنی طرف سے تائید چاہی۔

"جی، وہ" کچھ نا سمجھی کے عالم میں بولا۔

"میرا نام مریم ہے میں حرا کی دوست ہوں۔ وہ میں نے حرا کے بارے میں پوچھنا تھا۔ وہ کالج نہیں آ رہی

اس لیے۔"

"حرا کی دوست مریم۔" ان الفاظ پر سنجیدہ سے سرمد کا رویہ خود بخود نرم ہو گیا۔

"گھر میں ایک مسئلہ تھا، اس لیے اب دو تین دنوں میں آجائے گی۔" سرمد نے تفصیل میں جانے کے بجائے اختصار سے کام لیا تھا۔ لیکن مریم کے سر پر تو ایک ہی بھوت سوار تھا کہ جلد از جلد حرا کے گھر اپنے بھائی کا پرپوزل بھیج سکے، پھر یہ سوچا کہ اس سلسلے میں ویسے بھی سرمد کی رائے اور موجودگی زیادہ اہم ہے۔ سو فوراً بول پڑی۔

"اصل میں سرمد بھائی مجھے آپ سے ایک بات کرنا تھی۔" اور سرمد جو جانے کے لیے قدم بڑھا چکا تھا۔ حیرانی کے ساتھ رک چکا تھا۔

"مجھ سے؟ مجھ سے کیا بات کرنی ہے؟" اسے یوں گرلز کالج کے گیٹ پہ ایک لڑکی کے ساتھ کھڑا ہونا اور باتیں کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ لیکن حرا کی دوست کا حوالہ ایسا تھا کہ وہ کچھ کر بھی نہ سکتا تھا۔

"اصل میں سرمد بھائی ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ آپ ہمارا ساتھ دیں تو حرا کے بابا جان ضرور مان جائیں گے۔"

وہ کیا کہہ رہی تھی، سرمد کو کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

"میں کچھ سمجھا نہیں۔" سرمد نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔

"میرے بھائی ہیں نا، مصطفیٰ حیدر، وہ حرا کو پسند کرتے ہیں۔ اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آپ حرا کے بابا جان سے میرے بھائی کی سفارش کریں گے نا؟"

اس کی بات نے سرمد کو اندر تک جھلسا دیا۔ جی چاہا، سامنے کھڑی لڑکی کے منہ پر طمانچوں کی بارش کر دے۔

"حرا میری بیوی ہے۔ یہ اپنے ذہن سے محو نہ ہونے دیجیے گا۔ اور اپنے بھائی کو بھی انفارم کر دیں۔"

یہ کہہ کر سرمد رکا نہیں ورنہ نجانے وہ کیا کر بیٹھتا جبکہ حرا میری بیوی ہے کے الفاظ سن کر مریم کو لگا، وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہل سکے گی۔

"مریم! آپ یہاں کیوں کھڑی ہیں؟" ان لفظوں کے حصار میں وہ نہ جانے کتنی دیر سے کھڑی تھی اور کھڑی ہی رہتی اگر میڈم کشور باہر آکر اس کے کھڑا ہونے کی وجہ نہ پوچھتیں۔

"میڈم! میں فیس جمع کرانے آئی تھی۔" یہ کہتے ہوئے اس کے آنسو پلکوں کی باڑ توڑ کر باہر نکل آئے۔

"آر یو او کے؟ کیا ہوا ہے؟ آپ کیوں رو رہی ہیں؟" میڈم کشور نے اسے روتے دیکھ کر پوچھا۔

"کچھ نہیں میم! وہ سر میں درد ہے اس لیے۔"

یہ کہہ کر وہ رکی نہیں اور بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی آئی۔ اپنے کمرے میں آکر بھی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ اس نے سنا ہے وہ سچ ہے۔

"مجھے کیا خبر تھی کہ میرے پیچھے اس کا نکاح ہو جائے گا۔" وہ سمجھ رہی تھی کہ انہی دنوں میں اس کا نکاح ہوا ہے۔

"اب میں مصطفیٰ بھائی کو کیا جواب دوں گی؟ زندگی میں پہلی بار تو انہیں کوئی لڑکی پسند آئی ہے۔"

آنسو اس کی گود میں گر رہے تھے اور وہ اکیلے بیٹھی روئے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سرمد کو بار بار مریم کے الفاظ یاد آرہے تھے کہ میرا بھائی مصطفیٰ حیدر، حرا کو پسند کرتا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ یہ الفاظ اسے انگاروں کی طرح دہکا رہے تھے۔ مصطفیٰ حیدر نے حرا کو کہاں دیکھا ہے۔ جبکہ وہ تو پردہ کرتی ہے۔ وہ کیسے اسے پسند کرنے لگا۔ اگرچہ سرمد حرا سے پیار کرتا تھا، لیکن تھا تو ایک مرد ہی۔ شک کا احساس نا چاہتے ہوئے بھی اس پر حاوی ہوتا چلا جا رہا تھا۔

جب وہ گھر میں داخل ہوا تو حرا لان میں گھاس پر چوکڑی مار کر بیٹھی کتابیں کھولے کچھ لکھ رہی تھی۔ سی گرین اور آف وائٹ تھری پیس سوٹ میں وہ بہت کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ اس کے کھلے دراز گھنے بال ہوا سے ہولے ہولے اڑ رہے تھے۔ عموماً وہ بال کھلے

نہیں رکھتی تھی۔ یقیناً وہ ابھی ابھی نہا کر آئی تھی، تب ہی اس کے بال نم تھے۔ اگر سرمد مریم سے مل کر نہ آرہا ہوتا تو یہ منظر اس کو نہال کرنے کے لیے کافی تھا۔ لیکن اب اسے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ مصطفیٰ حیدر بھی تو حرا کا ایسا ہی کوئی روپ دیکھ کر فریفتہ ہوا ہو گا اور یہ خیال آنے کی دیر تھی کہ وہ اس کے پاس سے گزر کر بات کیے بنا اندر چلا گیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک تو اسے حرا کی کتنی فکر تھی اور اب اسے فکر تھی تو اس بات کی کہ مصطفیٰ حیدر نے اسے کہاں اور کیسے دیکھا۔ حرا نے اس کو یوں بنا بات کیے اندر جاتے دیکھا تو حیران ہونا تو فطری سے بات تھی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ اس کے پیچھے اندر گئی تھی۔ بالوں کو پیچھے کر کے ان کی گرہ لگاتے ہوئے وہ فکر مندی سے تقریباً بھاگتے ہوئے اس تک پہنچی۔

"خیریت تو ہے نا، آپ کیوں اس طرح بغیر سلام دعا کے اندر آگئے؟" سرمد نے ابھی اپنے کمرے کے دروازے کے ہینڈل پر ہی ہاتھ رکھا تھا، جب وہ آئی اور اس کا بازو پکڑ کر پوچھنے لگی سرمد کو کبھی وہ ہاتھ جو پھولوں کی طرح نرم لگتے تھے، آج اسے ان سے کوفت ہونے لگی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اس سارے قصے میں حرا کا کوئی قصور نہیں بنتا پھر بھی۔

"حرا! تھوڑی دیر کے لیے یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے آرام کرنا ہے۔" لہجہ بے زاری سے عبارت تھا۔ اور یہی بے زاری حرا کو چونکانے کے لیے کافی تھی۔

"میں یہاں سے چلی جاؤں، پر کیوں؟" وہ اس کو پیچھے دھکیلتے ہوئے اس کے سامنے کھڑی دکھ اور حیرت سے پوچھ رہی تھی۔ خوب صورت آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔ وہ معصوم سا چہرہ اس کے سامنے کھڑا استفسار کر رہا تھا۔ سرمد ان آنکھوں کی گہرائی میں ڈوب کے ابھرا تھا۔ دل نے تو فوراً اس کی صفائی دے ڈالی۔ لیکن دماغ دل پر حاوی ہونے لگا۔

"تم مصطفیٰ حیدر کو جانتی ہو؟" یکدم اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"مصطفیٰ حیدر!" حرا ناسمجھی کے عالم میں بڑبڑائی۔

"تمہاری دوست مریم حیدر کا بھائی۔" آج سرمد کا لہجہ عجیب سا تھا۔

"ہاں یاد آیا، مریم اکثر مصطفیٰ بھائی کا ذکر کرتی ہے۔ لیکن میں نے ان کو کبھی دیکھا نہیں، کیا ہوا ہے انہیں؟" بڑی معصومیت سے سوال پوچھا گیا تھا۔

"وہ لوگ تمہارے لیے بابا جان کے پاس مصطفیٰ حیدر کا پرپوزل لے کر جانا چاہتے ہیں۔" کڑواہٹ میں گندھا لہجہ سن کر وہ حیران ضرور ہوئی لیکن اس معاملے میں اپنا قصور اور اس کی بے زاری کی وجہ جاننا چاہتی تھی۔

اور پھر جیسے سب کچھ عیاں ہوتا گیا۔ حرا نے اس کے بازو پر دھرا ہاتھ اپنے کھلے ہوئے منہ پر رکھا تھا۔ آنکھیں ایک دم خشک ہو گئیں۔ وہ دکھ سے سامنے کھڑے شخص کو دیکھ رہی تھی جو کبھی اعتبار سے عبارت ہوا کرتا تھا۔ آج اس کا بت اس کے سامنے بھربھری مٹی کی مانند گرا پڑا تھا۔ وہ پیچھے ہٹتی گئی۔

"لیکن میں نے ان کو کبھی دیکھا نہیں۔" یہ الفاظ سرمد کے لیے کافی تھے۔ پر کچھ ثانیے کی دیر بھی بعض دفعہ بڑی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔

"حرا!" سرمد نے بڑے پیار اور بے تابی سے پکارا تھا، لیکن دیر تو ہو گئی تھی۔ شاک کے عالم میں حرا کو زمین ختم ہوتی محسوس ہوئی تھی۔

اسے یہ یاد ہی نہیں رہا کہ وہ پیچھے کی طرف جا رہی ہے جہاں سے سیڑھیاں شروع ہو رہی ہیں۔ ایک قدم پیچھے کی طرف ایسا اٹھا کہ سرمد کے کچھ بولنے سے پہلے اس کا وجود بے جان چیز کی طرح لڑھکتا چلا گیا۔ سرمد چلاتا ہوا اس کی طرف بڑھا تھا۔ لیکن اس وقت تک وہ آخری سیڑھی پر پہنچ چکی تھی اور حرا کی بلند ہوتی چیخیں اس وقت دم توڑ گئیں جب سیڑھی کی گرل کے ساتھ پڑا ہوا ڈیکوریشن پیس جو پیتل کے بھاری گلدان کی صورت میں تھا، حرا کا ہاتھ لگنے سے اس کے اوپر گرا تھا۔ اس دھان پان سے وجود کے لیے یہ سب کچھ قیامت سے کم نہ تھا اور سرمد تو اس کے پاس پھیلے خون کو پھٹی پھٹی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ اگر حرا کی چیخیں سن کر تمام ملازمین وہاں نہ آتے تو شاید ہی سرمد اپنے

بے جان ہوتے وجود کے ساتھ اس کو ہسپتال لے جا سکتا۔

مصطفیٰ حیدر صرف تین دن تک انتظار کر سکا تھا۔ پھر نہ چاہتے ہوئے بھی وہ مریم کے ہاسٹل پہنچ چکا تھا۔ یہاں حرا اعوان بھی رہتی تھی۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ ان دونوں کی ملاقات اس روز اتفاقاً ہوئی تھی اور اتفاق روز روز نہیں ہوا کرتے۔ لیکن پھر بھی وہ آ گیا تھا اس کے لیے یہی کافی تھا کہ اس شہر میں حرا بستی ہے۔ اس ہاسٹل میں رہتی ہے اور مریم سے حرا کی چند باتیں ہی کر لے گا۔ دلِ ناداں کو بہلانے کے لیے یہ بہانے ہی کافی تھے اور مریم تک جب وارڈن کا پیغام پہنچا تو بے بسی کے احساس سے اس کے آنسو نکل آئے۔

"اب میں مصطفیٰ بھائی کا سامنا کیسے کروں گی۔ میں کیسے ان کو دکھی ہوتے دیکھوں گی۔ اب تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ کاش! میں اس بات کو ان سے چھپا سکتی۔"

وارڈن کا پیغام دوبارہ ملنے پر اسے احساس ہوا کہ وہ دس منٹ سے بیٹھی آنسو بہا رہی ہے۔ سو جلدی سے چہرہ صاف کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ایک دم سے نہیں بتاؤں گی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کے تب بتاؤں گی۔"

سوچتے ہوئے وہ گیسٹ روم میں داخل ہوئی تھی اور پھر بھائی کو دیکھ کر اس کی ہمت سلام کرنے تک ہی مجتمع رہی۔ پھر وہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"مومو! کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو؟" مصطفیٰ بوکھلا اٹھا۔ لیکن وہ روئے جا رہی تھی۔ "مومو بہنا! بتاؤ تو سہی ہوا کیا ہے؟" وہ اس کا چہرہ پیار سے اوپر کیے پوچھ رہا تھا۔

"بھائی! جب میں زہرہ آپی کی شادی میں گئی ہوئی تھی تو پیچھے سے حرا کا نکاح ہو گیا۔"

وہ اسے ایسے بتا رہی تھی کہ اگر وہ یہاں ہوتی تو ایسا نہ ہوتا اور مصطفیٰ کو ایک پل کے لیے سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ وہ تو حرا کو دیکھنے کے بعد کہاں تک کا سفر کر چکا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ خوابوں کی بُنت کا جو سامان وہ جمع کر رہا تھا وہ سب رائیگاں جائے گا اور پھر اس نے مریم کے لرزتے وجود کو دیکھا تھا۔ یہ بہن اسے بہت زیادہ پیاری تھی اور وہ اس کی آنکھوں میں آنسو کبھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن آج وہ اس کی وجہ سے رو رہی تھی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس خبر سے اس کا بھائی دکھی ہوا ہے۔ اس نے مشکل سے ہی سہی، لیکن خود کو سنبھال لیا۔

"مومو! ادھر دیکھو، پاگل ایسے تھوڑی روتے ہیں کیا ہوا جو تمہاری دوست کی شادی ہو گئی۔" وہ اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیے پیار سے اسے سمجھا رہا تھا۔

"اسی میں رب کی مرضی تھی۔ وہ میرے نصیب میں ہی نہ تھی اب رونا نہیں، تمہارے بھائی کے لیے کوئی لڑکیوں کی کمی ہے۔ دیکھنا میں تمہیں حرا سے بھی اچھی بھابھی لا کر دوں گا۔"

دل نے زبان کی اس کارگزاری پر واویلا کیا تھا۔ لیکن عزیز بہن کی دل جوئی بھی ضروری تھی۔ "چلو اب آنسو صاف کرو۔

میں ادھر ایک کام سے آیا تھا۔ وہاں جلدی پہنچنا ہے۔ اب جلدی سے ایک دفعہ مسکرا دو تاکہ میں جا سکوں۔" وہ اپنے لہجے کو نارمل کرتے ہوئے مشکل سے بول رہا تھا۔ مریم بھی بھائی کی تسلی کے لیے پھیکے سے انداز میں مسکرا دی اور وہ بھی پیار سے اس کے گال تھپتھپا تا خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

باہر آ کر مصطفیٰ حیدر جیسے مضبوط شخص کی آنکھیں بھی دھندلا گئیں۔ مصطفیٰ حیدر اندر جو اپنی بہن کو کہہ کر آیا تھا "یقیناً" ایسا ہی ہوتا تھا۔ بظاہر سب کچھ نارمل بھی ہو جاتا۔ لیکن "یقیناً" دل کا ایک کونا ہمیشہ اس کی یاد سے آباد رہنا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے مصطفیٰ حیدر کو دوست سے سنی ہوئی ایک نظم یاد آ گئی۔

بھلے دِنوں کی بات ہے
بھلی سے ایک شکل تھی
بھلے کے حسن نام ہو
نہ دیکھنے میں عام سی
نہ یہ کہ وہ چلے تو کہکشاں سی رہ گزر لگے

مگر وہ ساتھ ہو تو پھر بھلا بھلا سفر لگے
کوئی بھی رُت ہو اس کی چھب
فضا کا رنگ و روپ تھی
وہ گرمیوں کی چھاؤں تھی
وہ سردیوں کی دھوپ تھی
نہ ایسی خوش لباسیاں کہ سادگی گِلہ کرے
نہ اتنی بے تکلفی کہ آئینہ حیا کرے
نہ عاشقی جنون کی کہ زندگی عذاب ہو
نہ اس قدر کٹھور پن کہ دوستی خراب ہو
ہجر شجر نہیں کہ ہمیشہ پابہ گِل رہے
نہ ڈھول ہیں کہ رسیاں گلے میں مستقل رہیں
نہ اس کو مجھ پہ مان تھا
نہ اس کو مجھ پر زعم تھا
جو عہد ہی کوئی نہ ہو تو
کیا غمِ شکستگی
سو اپنا اپنا راستہ خوشی خوشی بدل لیا
وہ اپنی راہ پہ چل پڑی میں اپنی راہ کو چل دیا

☼ ☼ ☼

آج حرا کو ہسپتال میں پورا ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس دوران فہد اور نصرت چچی گھر جا چکے تھے۔ لیکن بابا جان اور ماں جی یہیں تھے۔ وہ تو ابھی فہد والے حادثے سے پریشان تھے کہ حرا بھی خون میں لت پت ہسپتال پہنچ گئی۔ اولاد کو اس حالت میں دیکھنا کسی بھی ماں باپ کے لیے قیامت سے کم نہیں ہوتا، لیکن وہ سرمد کی وجہ سے خود کو سنبھالے ہوئے تھے۔ کیونکہ اس کی حالت بہت دگرگوں تھی۔

وہ بار بار بچوں کی طرح رونے لگتا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ حرا کا زخمی ہونا اس سے برداشت نہیں ہو پا رہا، لیکن اسے تو رہ رہ کر اپنا رویہ یاد آ رہا تھا دوہری اذیت تھی، وہ نہ صرف اس کے زخمی ہونے کا موجب بنا بلکہ اس نے تو حرا کی روح کو زخمی کر دیا تھا۔ وہ رہ رہ کر اپنے آپ کو کوستا۔

حرا دوسرے روز ہی ہوش میں تو آ گئی تھی، لیکن وہ سرمد کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ سرمد اس کی بے اعتنائی برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ لیکن وہ اس بات پر اپنے رب کا شکر ادا کر رہا تھا کہ حرا کو ایسی کوئی چوٹ نہیں لگی تھی۔ جو اسے ساری زندگی کے لیے شرمسار رکھتی۔ چوٹیں آئی تو کافی ساری تھیں، لیکن شدید نوعیت کی نہ تھیں۔

"ماں جی! آپ مجھے اپنے ساتھ گاؤں لے جائیں، مجھے یہاں نہیں رہنا، آپ مجھے لے جائیں گی نا!"

وہ روتے ہوئے ماں جی سے التجا کر رہی تھی اور سرمد اعوان کو اس کے آنسو کوڑے کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ وہ برداشت نہ کر سکا تو باہر آ گیا۔

"یا اللہ! حرا کے دل میں موجود بدگمانی کو ختم فرما دے۔ وہ پہلے کی طرح ہو جائے، میرے لیے اس کی نفرت ختم ہو جائے۔"

"سرمد!" ماں جی کی آواز پہ وہ چونکا اور ان کی طرف متوجہ ہوا۔

"بچے! حرا گاؤں جانے کی ضد کر رہی ہے، تم کیا کہتے ہو، ہم اسے لے جائیں؟" ماں جی، سرمد سے اجازت لینے والے انداز میں بات کر رہی تھیں۔

"ماں جی! جیسا وہ کہتی ہے، ایسا ہی کریں۔ میں آج ہی ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔ اگر وہ اجازت دیتے ہیں تو آپ اسے لے جائیں۔" وہ یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلا آیا۔

آج سرمد اداس تھا۔ آج اسے اپنے اکیلے ہونے کا بہت احساس ہو رہا تھا۔ کیونکہ آج بابا جان، ماں جی اور حرا گاؤں چلے گئے تھے۔ اگر حرا نے اس سے بات نہیں کی تھی تو اس نے بھی بات کرنے کی کوشش نہ کی اور وہ بات کرتا بھی تو کس منہ سے۔ وہ اپنے کیے پر بہت شرمندہ تھا۔ آج اس کا دل چاہ رہا تھا کہ کوئی ہو جو اس سے بات کرے، وہ یہی سوچ رہا تھا جب اس کے موبائل کی بیل کی آواز آئی۔

☼ ☼ ☼

مریم کو کچھ دِنوں سے عجیب عجیب وسوسے آ رہے

تھے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے حرا کسی مشکل میں نہ ہو' نجانے کیوں اسے لگ رہا تھا کہ اس سے کچھ غلط ہو گیا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ جو اتنے دنوں سے صرف اپنے بھائی کے لیے پریشان ہے کہ اسے حرا نہیں ملی۔ لیکن حرا کے لیے تو ایک لمحہ بھی نہیں سوچا۔

"کیا خبر سرمد بھائی نے میری بات کا کیا مطلب لیا ہو؟ اور حرا کی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑا ہو۔ وہ تو اس بات کے بارے میں جانتی بھی نہ تھی اور سرمد بھائی پتہ نہیں کیا سمجھ بیٹھے ہوں۔ مجھے کسی طرح سرمد بھائی سے بات کرنی چاہیے۔ ایک دفعہ اپنی دوست کی طرف سے ان کا دل صاف کرنا چاہیے۔ بے شک انہوں نے غلط مطلب نہ لیا ہو' لیکن مجھے اپنے دل کی خلش دور کرنے کے لیے ان سے بات کرنی چاہیے۔"

وہ یہی سوچتے ہوئے کلرک آفس تک آگئی تھی۔ دوست کوئی اور تھی نہیں، جس سے مشورہ کرتی۔ پہلے بھی جلد بازی میں وہ ایک قدم اٹھا چکی تھی اور اب دوسرا اٹھانے چلی تھی لیکن یہ قدم' پہلے کا اثر دور کرنے کے لیے تھا۔ وہ اجازت لے کر اندر داخل ہوئی۔

"انکل! مجھے آپ سے ایک کام تھا۔" سلام کے بعد اس نے ایک دم کہا سر فاروق حیرانی سے اسے دیکھنے لگے۔

"آپ پلیز مجھے حرا اعوان کا کانٹیکٹ نمبر دے دیں۔ اس کے فارم میں ضرور لکھا ہو گا۔ وہ بہت دنوں سے یونیورسٹی نہیں آرہی۔ مجھے اس کی خیریت معلوم کرنا تھی۔"

ایک دن باتوں ہی باتوں میں حرا نے اسے بتایا تھا کہ اس کے فارم وغیرہ پر بھی بابا جان کے بجائے سرمد کے سائن ہیں۔ کیونکہ بابا جان تو اس حق میں ہی نہیں کہ وہ پڑھے۔ اس لیے ساری ذمہ داری سرمد نے ہی اٹھائی ہے۔ حتیٰ کہ کانٹیکٹ نمبر تک سرمد بھائی کے ہیں۔ اس لیے وہ سر فاروق کی منت کر رہی تھی۔

"بیٹا! ہمیں اس کی اجازت نہیں۔" سر فاروق بہت نائس تھے۔ ریٹائرڈ فوجی تھے۔ اصولوں کے پابند اور بہت ایماندار۔

"لیکن انکل! میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ پلیز آپ نمبر دے دیں۔ آپ میرا یقین کریں کہ میں صرف ایک دفعہ فون کروں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ رو دینے کو تھی۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے سر فاروق نے اسے نمبر دے دیا۔ انہیں یہاں کام کرتے اور مریم کو پڑھتے بہت عرصہ ہو چکا تھا اور وہ جانتے تھے کہ یہ دونوں لڑکیاں باقی لڑکیوں سے کتنی مختلف ہیں۔

اس لیے آج انہوں نے اس اچھی سی لڑکی کے لیے اپنا اصول توڑ دیا اور اصول تو آج مریم نے بھی توڑا تھا۔ حالانکہ وہ ان لڑکیوں سے کبھی بات تک نہیں کرتی تھی جو چوری چھپے موبائل اپنے پاس رکھتی تھیں اور اپنے گھر والوں کے اعتماد کو ٹھیس پہنچاتی تھیں لیکن آج وہ رجا کے پاس آگئی۔ کیونکہ میڈم کشور کے سامنے تو وہ بات نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لیے اسے موبائل کی ضرورت تھی' جو رجا پوری کر سکتی تھی۔ اس نے بھی حیران ہو کے مریم کو دیکھا تھا۔ جب وہ اس سے موبائل کا مطالبہ کر رہی تھی۔ لیکن اظہار کیے بغیر وہ اپنا سیل اسے دے کر باہر چلی گئی۔ اور مریم نے کانپتے ہاتھوں سے سرمد کا نمبر ملایا تھا۔

انجان نمبر دیکھ کر سرمد نے حیران ہوتے ہوئے کال ریسیو کی۔

"مجھے سرمد بھائی سے بات کرنی ہے۔" سلام کے بعد ہی نسوانی آواز میں یہ مطالبہ سرمد کے لیے بڑا حیرانی کا باعث تھا۔

"جی میں سرمد ہی بول رہا ہوں۔ آپ کون؟"

"سرمد بھائی! میں مریم بول رہی ہوں۔ حرا کی دوست! میں آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔ اس دن بے خبری میں نجانے میرے منہ سے کیا نکل گیا' آپ پلیز اس بات کو بھول جائیے گا اور مجھے بھی معاف کر دیجیے گا۔" اس کے بعد وہ چپ ہو گئی۔

"یہی بات کرنا تھی یا کچھ اور بھی۔" وہ حیران ہوا کہ اسے غصہ نہیں آیا تھا' بلکہ وہ بڑے نارمل انداز میں بات کر رہا تھا۔

"اور سرمد بھائی! آپ سے ایک ریکویسٹ ہے کہ آپ یہ بات حرا سے نہ کیجیے گا۔ کیونکہ وہ یہ سب نہیں جانتی تھی۔ وہ تو میں نے ایک دن اپنے بھائی کے سامنے اس کی تعریف کر دی تھی کہ حرا جیسی معصوم اور با کردار لڑکیاں بہت کم ہوتی ہیں اور میری ہی فرمائش پر وہ اس سے شادی پر رضامند ہو گئے۔ کیونکہ مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہے اور میرا دل کرتا ہے کہ میں ہمیشہ اسے اپنے پاس رکھوں۔ اس لیے آپ سے بھی بات کر لی۔" آج مریم آدھا سچ اور آدھا جھوٹ بول رہی تھی۔

"تو آپ نے مجھے کیوں کہا کہ آپ کا بھائی حرا کو پسند کرتا ہے۔" سرمد نے بڑے عام سے انداز میں یہ سوال کیا تھا۔

"صرف اور صرف اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے۔ تاکہ آپ میری بات کو سیریسلی لیں اور کچھ بھی نہیں۔ آپ پلیز حرا کو کچھ نہ بتائیے گا میں نہیں چاہتی کہ اگر ہم ملیں تو ہم دونوں میں کچھ ناراضی ہو۔ آپ میری بات مانیں گے نا؟"

وہ منت بھرے لہجے میں بول رہی تھی اور سرمد کو یوں لگ رہا تھا کہ وہ پاتال میں دھنستا چلا جا رہا ہو۔

"آپ بے فکر رہیں۔ آپ کی دوست آپ سے کبھی بدگمان نہیں ہو گی۔ اللہ حافظ۔"

اس کے بعد سرمد میں کچھ سننے کی ہمت نہ تھی۔ حالانکہ مریم نے ابھی حرا کا پوچھنا تھا۔ لیکن وہ مطمئن ضرور ہو گئی کہ اس نے جو غلطی کی تھی' اپنے تئیں اس کا کچھ نہ کچھ ازالہ ضرور کر دیا ہے اور سرمد صرف یہی سوچے جا رہا تھا کہ

"مریم حرا کی کچھ بھی نہیں لگتی' صرف دوست ہے' پھر بھی وہ نہیں چاہتی کہ ان کے درمیان کچھ ناراضی ہو۔ اور اسے یہ بات معلوم ہو۔ لیکن میں' میری تو سب کچھ ہے حرا' اور میں اس کے لیے سب کچھ تو پھر میں نے کیوں اس کے اور اپنے درمیان دوریاں پیدا کر لی ہیں۔ مجھ سے تو اچھا وہ مصطفیٰ حیدر ہے۔ جس نے صرف اپنی بہن کے منہ سے تعریف سن کر اسے اپنانا چاہا۔ میرے سامنے تو اس کی زندگی گزری ہے۔ وہ میرے سامنے پلی بڑھی ہے۔ پھر میں نے کیوں اپنے اور اس کے تعلق کو بے اعتباری کی نذر کر دیا؟ کیوں' کیوں میں نے یہ سب کچھ کیا؟" آنکھوں کے کنارے تھے کہ خشک ہوتے ہی نہ تھے۔

✡ ✡ ✡

حرا کو آج حویلی آئے نجانے کتنے دن ہو گئے تھے' لیکن اسے وہ لہجہ ہی نہیں بھولتا تھا۔ آج تک سرمد نے اس سے اس انداز میں بات نہ کی تھی اور جب کی تو اسے ایک پل میں بے مول کر دیا کہ اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی تھی۔ اسے کسی پل چین نہ تھا۔ حالانکہ اب حویلی کا ماحول پہلے سے یکسر مختلف تھا۔ بابا جان اب اسے پہلے کی طرح نظر انداز نہ کرتے بلکہ ہر روز باقاعدگی سے اس کے پاس بیٹھتے' اس سے چھوٹی موٹی باتیں کرتے' اپنے ہاتھوں سے دوائیں دیتے' کھانا کھلاتے' نصرت چچی اس سے کتنی دفعہ معافی مانگ چکی تھیں اور اس کے یقین دلانے پر کہ وہ ان سے ناراض نہیں ان کا رویہ بھی نارمل تھا۔ ماں جی نے ویسے ہی اسے ہتھیلی کا چھالا بنایا ہوا تھا۔ لیکن پھر بھی وہ ان سب میں ہوتے ہوئے بھی ان میں نہیں تھی۔

حویلی میں سرمد کے فون اکثر آتے رہتے تھے۔ لیکن وہ غیر محسوس طریقے سے وہاں سے اٹھ جاتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ سب کے سامنے اس سے بات کرے اور نمبر لوز کر بیٹھے۔ اسے یوں بھی اپنی ذات کی بے پردگی منظور نہ تھی۔ اس کے لیے تکلیف دہ یہ تھا کہ وہ اپنا دکھ کسی سے شیئر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ حتیٰ کہ ماں جی سے بھی نہیں' وہ نہیں چاہتی تھی کہ ماں جی جو اس کی سرمد سے شادی پہ اتنی مطمئن تھیں' ایک بار پھر اندیشوں میں گھر جائیں۔ یہی سوچ کر وہ اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔

اس دن بھی وہ حویلی کے بڑے سے صحن میں چارپائیاں ڈالے ماں جی اور نصرت چچی کے پاس بیٹھی تھی۔ دسمبر کا ایک بڑا ہی چمکیلا سا دن تھا' نرم گرم سی

دھوپ بڑا مزا دے رہی تھی۔ نصرت چچی حلوے کے لیے گاجریں چھیل رہی تھیں۔ ماں جی بھی ان کی مدد کر رہی تھیں جبکہ وہ ماں جی کے اصرار پر بے دلی سے کینو کھا رہی تھی۔ وہ بڑی کوشش کے باوجود بھی ماں جی اور چچی کی باتوں کو نہیں سن پا رہی تھی۔ ذہنی رو بار بار بھٹک رہی تھی۔ جب مخصوص ہارن نے تینوں کی توجہ اپنی طرف کھینچی تھی۔

"ارے یہ آواز تو میرے سرمد کی گاڑی کی ہے۔" ماں جی نے خوش ہو کر بیرونی احاطے پر نظریں جما دیں اور پھر تھوڑی ہی دیر میں سرمد ادھر آتا دکھائی دیا تھا۔ ڈارک گرے کھدر کے قمیص شلوار میں اور لیدر کی بلیک جیکٹ پہنے، ہمیشہ کی طرح پروقار سا سرمد سلام کرتا ہوا ماں جی کے آگے جھک گیا اور ماں جی اسے گلے سے لگائے کتنی دیر چومتی رہیں۔

"اس دفعہ تو میرے بیٹے نے آنے میں بہت دن لگا دیے؟"

"بس ماں جی! اس دفعہ شہر میں بہت کام تھا۔ اس لیے دیر ہو گئی۔" اب وہ یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ حویلی آنے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔

"سرمد! کام اپنی جگہ، لیکن اب تمہیں خیال کرنا چاہیے کہ حویلی میں تمہاری بیوی بھی رہتی ہے۔" چچی نے شرارت سے اس کا دھیان حرا کی طرف کیا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ وہیں بیٹھنے پر مجبور تھی۔ ورنہ دل تو اس کا چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر اپنے کمرے میں بند ہو جائے۔ لیکن چچی اور ماں جی کے سامنے وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" سرمد نے بیٹھتے ہی اسے مخاطب کیا جو سیاہ رنگ کے ویلوٹ کے سوٹ پر سیاہ شال اوڑھے، بہت کمزور لگ رہی تھی۔

"ٹھیک ہوں۔" حرا نے دیکھے بغیر جواب دیا تھا اور سرمد جو یہ امید دل میں لیے یہاں آیا تھا کہ اتنے دن گزرنے کے بعد حرا اپنی ناراضی کو ختم کر دے گی۔ وہ دکھ سے اس کے خفگی بھرے رویے کو برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

"تم دونوں باتیں کرو، میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ بھجواتی ہوں۔" ماں جی کے اٹھتے ہی نصرت چچی بھی گاجروں کی ٹوکری اٹھائے ان کے ساتھ چلی گئیں۔

"حرا! ابھی تک ناراض ہو مجھ سے؟" سرمد نے بڑے مان سے سوال کیا تھا اور پھر اس کے سوال پہ جس طرح حرا نے اسے کاٹ دار نظروں سے دیکھا تھا، سرمد نے کیسے برداشت کیا یہ صرف وہی جانتا تھا۔

"دیکھو حرا.....!" لیکن اس کی بات ادھوری ہی رہ گئی۔ کیونکہ حرا ایک دم اٹھ کر اندر چلی گئی اور وہ دکھ سے اسے اندر جاتا دیکھ رہا تھا۔

"میں کیسے اپنی غلطی کا مداوا کروں گا۔" کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے وہ بڑے کرب سے سوچ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سارا دن تو وہ اس سے چھپتی رہی تھی۔ لیکن رات کو بیٹھی لایعنی سوچوں میں الجھی ہوئی تھی، جب دروازے پر دستک دے کر سرمد اندر داخل ہوا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر جانے لگی تو سرمد نے اسے ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔

"حرا! تم نے بابا جان کو بھی تو معاف کر دیا ہے تو پھر میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں؟"

"اس لیے کہ بابا جان کے ساتھ میرا مان کا رشتہ ہی نہ بن سکا۔ اس لیے کہ انہوں نے کبھی مجھے جاننے کا دعوا نہیں کیا لیکن آپ پر تو مجھے بڑا مان تھا۔ آپ تو مجھے جاننے کا دعوا کرتے تھے نا! تو پھر کیوں مجھے بے اعتباری کی سولی پر چڑھایا؟ آپ نے خود ہی بابا جان سے کہا تھا کہ جب لڑکی کا رشتہ آتا ہے تو وہ اس سے پوچھ کر تھوڑی آتا ہے تو پھر اب آپ کیوں اپنی ہی بات کو بھول گئے، اس لیے کہ میں آپ کی بیوی ہوں۔ لیکن یہ بھی یاد رکھیں کہ کالج میں بتانے سے بھی آپ نے خود منع کیا تھا۔ اگر میں بتا دیتی تو شاید یہ نوبت نہ آتی۔ لیکن اب آپ سب باتوں کے لیے مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرائیں گے؟"

وہ بول رہی تھی اور سرمد شرمندگی سے سر جھکائے سن رہا تھا۔

"سرمد! آپ نے کہا کہ میں نے بابا جان کو معاف کر دیا، وہ اس لیے کہ ان کا قصور نہ تھا، انہیں چچی نے بدگمان کرنے کے لیے کہانی سنائی اور وہ بدگمان ہو گئے۔ آپ کبھی نہیں سمجھ سکتے۔ ان لمحوں میں مجھ پہ کیا قیامت بیتی ہے۔ میں اتنے دنوں سے صرف ایک بات سوچ رہی ہوں کہ کیا میں اتنی بری ہوں کہ نہ میرے باپ کو مجھ پر اعتبار ہے اور نہ میرے شوہر کو، تو جب میں اتنی ہی بری ہوں تو آپ کیوں مجھ سے معافی مانگ رہے ہیں۔"

اس کے ہاتھ ابھی بھی سرمد کے ہاتھوں میں تھے اور آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔

"حرا! تم مجھے خود بتاؤ اب میں کیا کروں کہ سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔" سرمد بے بسی سے پوچھ رہا تھا۔

"آپ میری زندگی سے ان لمحوں کو مٹا دیں، جب آپ نے مجھ سے ایک غیر مرد کے بارے میں پوچھا تھا۔" اب کے حرا نے اپنے ہاتھ چھڑاتے ہوئے اپنے آنسو صاف کیے اور سخت لہجے میں بولی۔ سرمد کو آج سے پہلے وہ کبھی اتنی ضدی نہ لگی تھی۔

"فرض کرو حرا! اگر تمہیں پتہ چلے کہ فلاں لڑکی مجھے پسند کرتی ہے۔ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے تو کیا تم مجھ سے کوئی سوال نہیں کرو گی؟" سرمد نے اپنی طرف سے ایک مضبوط دلیل دی تھی۔

"کیوں نہیں، سوال کروں گی۔ بیوی ہوں آپ کی، سوال ضرور کروں گی۔ لیکن میرا لہجہ کبھی آپ کی طرح نہیں ہو گا۔ میں کبھی آپ کو شک کی مار نہیں ماروں گی۔ کیوں کہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں کہ کوئی آپ کو پسند کرتا ہے۔ میں کبھی آپ کو نہیں کہوں گی کہ میری نظروں سے دور ہو جائیں۔" اب کے سرمد کو اپنی دلیل بڑی بودی لگی تھی۔ آج اسے پہلے کی طرح حرا چھوٹی نہیں لگ رہی تھی، بلکہ اسے اپنا آپ چھوٹا لگ رہا تھا۔ وہ بالکل چپ ہو گیا پھر وہ شکستہ قدموں سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک بات یاد رکھنا حرا! کہ تمہاری زندگی میں میرے علاوہ اور بھی رشتے ہیں۔ لیکن میری زندگی میں تمہارے علاوہ اور کوئی بھی نہیں۔ میں تمہارے بغیر ادھورا اور تنہا ہوں۔ میری غلطی کو پہلی اور آخری غلطی سمجھ کر مجھے ایک موقع ضرور دینا۔ میرے ایک لمحے کی کوتاہی کو میرے لیے شرمندگی نہ بناؤ۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ رکا نہیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر چلا گیا اور حرا کو لگا کہ اس کا سارا غم و غصہ اس ایک فقرے میں بہہ گیا تھا کہ "میں تمہارے بغیر بالکل ادھورا اور تنہا ہوں۔" آنکھیں پھر سے دھندلانے لگیں۔

"سرمد! آپ کے بغیر ادھوری تو میں بھی ہوں۔" وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

سرمد معمول کے مطابق واک کے بعد جب حویلی لوٹا تو اسے دروازے پہ ہی ڈاکٹر قمر ملے۔

"خیریت ڈاکٹر صاحب! آپ یہاں؟" سلام کے بعد اس نے ایک دم سوال کیا، کیونکہ دو گھنٹے پہلے ہی تو وہ نماز اور واک کے لیے گھر سے گیا تھا، اس وقت تو سب اپنے اپنے کمروں میں تھے۔

"چھوٹی بی بی کی طبیعت خراب تھی۔ انہی کا چیک اپ کرنے آیا تھا۔"

"کیا ہوا حرا کو؟" بے چینی لہجے سے مترشح تھی۔

"ان کے زخم ابھی مکمل ٹھیک نہیں ہوئے، احتیاط کی ضرورت ہے جو وہ کرتیں نہیں۔ اوپر سے سردی کا موسم اسی لیے اب بخار ہو گیا ہے۔ میں نے میڈیسن دی ہیں۔ ان شاءاللہ آرام آ جائے گا۔" ڈاکٹر قمر نے اپنے پیشہ ورانہ انداز میں اسے تفصیل بتا کر تسلی دی۔

وہ تو خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ لیکن سرمد وہیں کھڑا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اسی کی وجہ سے بیمار ہوئی ہے۔ کیونکہ وہ کل سے مسلسل ٹینشن میں تھی۔

وہ یہی سوچتے اس کے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ بیڈ پر لیٹی کل سے بھی کمزور لگ رہی تھی۔ ماں جی اسے سوپ پلانے کی کوشش کر رہی تھیں اور وہ برے

برے منہ بنارہی تھی۔

"ماں جی! حرا کو کیا ہوا ہے؟ اگر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہے تو میں اسے شہر لے جاتا ہوں۔" وہ دیکھ حرا کو رہا تھا اور پوچھ ماں جی سے رہا تھا۔

"ارے بیٹا! یہ بیمار اتنی نہیں ہے۔ لیکن کھانے پینے کا نام نہیں لیتی' اسی لیے کمزوری کی وجہ سے بخار ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر بار بار تاکید کرتے ہیں کہ اپنی خوراک کا خیال رکھے تاکہ اندر کوئی طاقت ہو تب ہی تو خون بنے گا اور صحت بھی ٹھیک ہو گی نا' لیکن اس نے مجھے ستانے کی قسم کھا رکھی ہے۔ اب بھی منتوں سے یخنی کے دو تین چمچ لیے ہیں۔ کل بھی صرف اس کے لیے گاجر کا حلوہ بنایا تھا لیکن اس نے ابھی تک چکھا بھی نہیں ہے۔"

ماں جی پہلے کی طرح اس سے حرا کی شکایت کر رہی تھیں۔ وہ کسی اور کی نہ مانے لیکن سرمد کی بات سے کبھی انکار نہیں کرتی تھی۔

"آپ یہ باؤل مجھے دیں' دیکھیے گا میں سارا خالی کروا دوں گا۔"

نجانے کس جھونک میں سرمد نے ماں جی سے سوپ کا باؤل پکڑ لیا اور ماں جی کے جانے کے بعد حرا نے پہلے کی طرح اس کی بات مان لی تھی۔ اس نے بڑی فرمانبرداری سے سارا سوپ ختم کیا تھا۔ کیونکہ ساری رات حرا کو سرمد کی باتیں ستاتی رہی تھیں۔

"کیا تھا جو میں ان کے معافی مانگنے پر ان سے راضی ہو جاتی! اتنی سخت دل تو کبھی نہ تھی کہ ان کی طرف سے اپنا دل نہ صاف کر سکی۔ میں اتنی بدظن ہو گئی کہ ان کی پوری بات بھی نہ سنی اور انہیں موردِ الزام ٹھہرا دیا۔ وہ کتنے دکھی لگ رہے تھے اور میرا دل پھر بھی نہ پسیجا۔ آئندہ وہ جو کچھ کہیں گے' مان لوں گی۔" دل کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔ یہی حرا تھی جو کل تک سرمد کو موردِ الزام ٹھہرا رہی تھی اور آج اسے اپنا آپ غلط لگ رہا تھا۔

"حرا! تم نے میری وجہ سے ٹینشن لی ہے نا اور بیمار پڑ گئی ہو۔ لیکن آج میں کوشش کروں گا کہ چلا جاؤں لیکن تم سے ایک ریکویسٹ ہے کہ اپنا بہت سا خیال رکھنا۔"

حرا اپنے ہی خیالوں میں گم تھی' جب اسے سرمد کے یہ الفاظ سنائی دیے تھے وہ یہ کہہ کر رکا نہیں' جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ لیکن حرا نے یکدم اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ سرمد نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

"سرمد! کل آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کا میرے بغیر کوئی رشتہ نہیں' تو میں آپ پہ واضح کر دوں کہ بابا جان تو صرف آپ سے پیار کرتے ہیں اور آپ کے بابا جان ہیں' جبکہ ماں جی بھی مجھ سے پہلے اور مجھ سے زیادہ آپ سے پیار کرتی ہیں۔ تو پھر اکیلے آپ نہیں' اکیلی تو میں ہوئی نا! میرے پاس تو صرف آپ ہیں۔ اسی لیے تو میں آپ کی ذرا سی بھی بے اعتنائی اور بدگمانی برداشت نہیں کر سکتی۔" آنکھوں کے کنارے بھیگنے لگے تھے۔ سرمد کو آج وہ پہلے والی حرا لگ رہی تھی۔

"حرا! تم نے مجھے معاف کر دیا؟" سرمد کل کی طرح ایک دم اس کے پاس بیٹھ کر ہاتھ پکڑتے ہوئے خوشی سے بولا۔

"آپ آج چلے جائیں گے تو کیا حرا کو یہیں چھوڑ جائیں گے؟" اب کے وہ شرارت سے بولی تھی۔

"ہرگز نہیں' تمہیں تو میں کبھی خود سے جدا نہ کروں۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ پتہ ہے حرا! جب تم گاؤں چلی آئیں تو مجھے یوں لگا جیسے میری زندگی میں کچھ بھی نہیں رہا۔ میں نے آج سے پہلے خود کو اتنا تنہا کبھی بھی محسوس نہیں کیا۔ مجھے اتنا دکھ کبھی نہیں ہوا' جتنا تمہاری ناراضی سے ہوا۔"

سرمد اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا اور حرا لبوں پر دلکش مسکراہٹ سجائے اسے سن رہی تھی۔ وہ اپنا عکس سرمد کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ جو خوشی سے چمکتی ہوئی اور بھی خوب صورت لگ رہی تھیں۔

وہ سوچ رہی تھی کہ جن سے پیار کیا جاتا ہے' جو ہمارے اپنے ہوتے ہیں۔ انہیں اپنی غلطی سنوارنے کا موقع دینا چاہیے۔ کیونکہ اسی میں تو ہماری اپنی بھی خوشی پوشیدہ ہوتی ہے۔

☼

سائرہ عارف

میری صبح کا ستارہ

غریب گھرانے میں پیدا ہونے والی سارا کو اپنی خوب صورتی پر بہت غرور ہے۔ بچپن کا منگیتر باوجود خوب صورت ہونے کے محض غریب ہونے کی بنا پر ٹھکرا دیا۔ اگرچہ نواز اکرم کا پورا خاندان اور وہ خود معمولی شکل کے تھے۔ لیکن سارا نے پورے خاندان سے ٹکر لے کر ان سے شادی کرلی۔ لیکن کبھی نواز اکرم کو وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ انہیں اپنی بڑی بیٹی ماہین سے صرف اس لیے نفرت ہے کہ وہ شکل و صورت میں ددھیال پر پڑی ہے، جبکہ چھوٹی بیٹی میرب بالکل ان کا پرتو ہے۔ سارا علوی اور میرب ہر وقت ماہین کو اس کی کم صورتی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔ جس نے ماہین اپنے رنگ کے معاملے میں حساس ہوگئی ہے۔ دونوں بہنوں میں بالکل نہیں بنتی۔ اس کی واحد دوست رفعت اسے نت نئی رنگ گورا کرنے والی کریمیں لا کر دیتی ہے اور پیسہ بٹورتی ہے۔ گھر میں وہ نواز اکرم کے قریب ہے، لیکن ہر وقت کی تنقید اور رشتوں سے انکار نے اسے نفسیاتی طور پر تنہا کر ڈالا ہے۔ نواز اکرم کی بہن ثروت بھی اس سے محبت کرتی ہے، لیکن سارا علوی کے ناروا سلوک کے باعث بھائی کے گھر آنے سے کتراتی ہے۔

میرب کے لیے نواز اکرم کے دوست رضا اپنے بیٹے کا رشتہ دیتے ہیں تو میرب اسے ٹھکرا دیتی ہے۔ سارا۔ کا ایک ذہنی طور پر کمزور بھائی شہزاد ہے۔ جس کی ذمہ داری ماں نے مرتے وقت سارا کے سپرد کی تھی۔ اسے آوارہ گردی کا اور مشورہ دینے کا شوق ہے۔ ماموں شہزاد کو ماہین سے خاصی انسیت ہے۔ جو دیگر لوگوں کی طرح انہیں ڈانٹنے کے بجائے ان کا خیال رکھتی ہے۔

ناولٹ

فاخرہ کی اپنے شوہر ریاض کے انتقال کے بعد دنیا اندھیر ہو گئی۔ اسے چند ماہ تک اپنے بیٹے کاشف کا ہوش بھی نہیں رہتا۔ میکے والے اس موقع پر اسے تنہا چھوڑ دیتے ہیں، جس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاض کے بچپن کا دوست اقبال، کاشف کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے متاثر کر لیتا ہے۔ حالات کی سنگینی کا احساس فاخرہ کو اس وقت ہوتا ہے جب کاشف ماں کو اقبال سے شادی کا مشورہ دیتا ہے۔ فاخرہ اسے احساس دلاتی ہے کہ وہ اقبال سے دُور رہے، لیکن کاشف، اقبال انکل کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں۔ بیٹے کو مجبور کرنے پر وہ اقبال سے عقدِ ثانی کر لیتی ہے۔

شادی کے فوراً بعد اقبال اچھائی کا لبادہ اتار پھینکتا ہے اور ماں، بیٹے کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ گھر کا پیسہ فاخرہ کی اسکول کی نوکری پر ہی چلتا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کاشف کو اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔ وہ نواز اکرم کے یہاں بطور اکاؤنٹ کلرک کام کرتا ہے اور کبھی کبھار ہی ماں سے ملتا ہے اور ہر وقت فاخرہ کو علیحدگی کا مشورہ دیتا ہے۔ اس عمر میں بدنامی کا خوف انہیں ایسے فیصلے سے روکے ہوئے ہے۔ فاخرہ کے لیے اقبال کی غیر اخلاقی سرگرمیاں ناقابلِ برداشت ہیں۔

(اب آگے پڑھیے)

۸
آٹھویں قسط

"میں نے اسے کیا کہا تھا؟"

احمد نے ذہن پر زور دے کر سوچنے کی کوشش کی مگر اسے کوئی بھی ایسی بات یاد نہیں آسکی کہ وہ ثروت کو ماہی کی بے ہوشی کی وجہ بتا سکتا۔ الٹا ماہین ہی اس پر برس پڑی تھی۔

"تو تم ہو وہ شخص جس نے مجھ سے شادی کی ہے۔"

اپنے تعارف کے جواب میں ایسی عزت افزائی اس نے ٹھٹک کر سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا، جواب اس کی بیوی تھی اور جس پر وہ ہر طرح سے حق رکھتا تھا۔

"جی..... جناب کو احمد ابراہیم کہتے ہیں اور اب آپ ماہین احمد ہیں۔"

"مجھے ماہین احمد بننے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ یہ اتفاقی حادثہ میرے لیے کاشف کے بچھڑنے سے بڑھ کر ہے۔ سمجھے تم! میرے دل، دماغ، زندگی اور خوابوں پر اسی کا قبضہ ہے اور وہی میرے لیے سب کچھ ہے۔"

وہ شدت جذبات سے کانپ رہی تھی۔ احمد نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اسے تھامنے کے لیے آگے بڑھایا تھا، جسے اس نے بڑی بے رحمی اور بے دردی سے جھٹک دیا تھا۔

"تم..... تم تو میری زندگی میں کہیں بھی نہیں تھے اور نہ ہو، میں کاشف سے محبت کرتی ہوں۔ اور وہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔"

"وہ آپ سے محبت نہیں کرتا۔ اس کی محبت محض دھوکا، فریب اور دکھاوا تھی۔ وہ آپ کا روپیہ پیسہ، زیور، گھر سب کچھ لوٹ کر بھاگ گیا ہے۔ اب آپ کو اسے بھول جانا چاہیے۔"

اس نے نرمی اور پیار سے اسے حقیقت سے آگاہ کرنا چاہا تھا مگر اس پر احمد کی تمام باتوں کا الٹا اثر ہوا تھا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم خود دھوکے باز اور فراڈیے ہو، تم نے میرے کاشف کو برا بھلا کہا، میں تمہیں مار ڈالوں گی۔ اس نے میرا کچھ نہیں چھینا۔ کچھ بھی نہیں۔ سب کچھ میرے پاس ہے۔ یہ زیور، کپڑے، یہ جوتے، یہ بیگ، یہ سب مجھے کاشف نے دلایا تھا۔ دیکھو..... دیکھو یہ سب میرے پاس ہیں۔ اس نے کچھ نہیں لیا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ پاگل بنا رہے ہو مجھے۔ میں تمہارا منہ نوچ لوں گی۔"

وہ مشتعل ہو کر اس کی جانب بڑھی تھی۔ احمد نے فوراً اپنا چہرہ پیچھے کیا اور ساتھ ہی سختی سے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے۔

"چھوڑو مجھے..... چھوڑو، میں تمہیں جان سے مار دوں گی۔ تم نے میرے کاشی کو مجھ سے جدا کر دیا ہے۔ میں..... میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

وہ بری طرح چیختی ہوئی، مچلتی ہوئی خود کو آزاد کرانے کی کوشش میں بے ہوش ہو کر، احمد کے بازوؤں میں جھول گئی تھی اور حواس باختہ احمد نے فوراً ثروت کو پکارا۔

وہ رات اس نے انتہائی نگہداشت یونٹ کے باہر ایک بینچ پر کبھی اٹھتے کبھی بیٹھتے گزاری تھی۔

کیسا عجیب موڑ تھا یہ زندگی میں اور کیسی حیرت انگیز تھی یہ رات۔ ماہین سے اتنا اچانک نکاح۔ وہ تو اس شادی میں شریک ہونے آیا تھا۔

ماہین کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا، شاید یہی کرتا۔ مگر اس کا یہ فعل محض ہمدردی نہیں تھا۔ وہ ثروت سے متاثر تھا اور ماہین بالکل ثروت کا پرتو تھی۔

"مجھے اس لڑکی کو محبت اور اعتماد دینا ہوگا تاکہ آدم زادوں پر سے اس کا اعتماد نہ اٹھ جائے۔"

اس نے آئی سی یو کے باہر بیٹھ کر فیصلہ کیا۔

☼ ☼ ☼

"ماہین! تمہیں اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا۔ ایسا کب تک چلے گا۔" ثروت نے ماہین کا ہاتھ تھام کر بے حد ملتجی انداز میں کہا تھا اور جواباً ماہین نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا، ثروت کا دل کپکپا اٹھا۔

"میری جان! تم....." ثروت کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

"پھپھو! جو سودے عزت بچانے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ وہ ہمارے لیے خوشیوں کے ضامن بھی بن جائیں۔" اس نے تیزی سے ثروت کی بات کاٹی۔

"کیوں ضروری نہیں..... اور تم بار بار اس مقدس رشتے کو سودے بازی کا نام کیوں دیتی ہو؟ یہ ایک پُرخلوص تعلق ہے، کوئی سودے بازی نہیں۔ احمد نے ہم سے کچھ نہیں لیا۔ الٹا ہمیں دیا ہی ہے۔"

"کیا دیا ہے؟" وہ تڑپ اٹھی، "مجھے تمام عمر اس احسان کے نیچے دب کر رہنا ہوگا پھپھو! کیا عزت رہے گی میری اس کے سامنے۔"

"تم اتنا غلط کیوں سوچتی ہو۔ اچھا سوچو گی تو اچھا ہی ہوگا۔" ثروت نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"اچھا....." اسے یکدم جیسے کرنٹ لگا تھا۔ "کیا اچھا ہوا ہے میرے ساتھ؟ کتنی مشکل سے میرے باپ نے میرے لیے ایک لڑکا خریدا تھا اور وہ بھی بھاگ نکلا۔ یہ اچھا ہوا....؟ پھر ایک اور مرد نے خود کو بہت ---- عظیم سمجھتے ہوئے مجھ سے شادی کر کے اپنے احسان تلے دبا دیا، یہ اچھا ہوا....؟ آپ مجھے کیوں بہلا رہی ہیں؟"

"کتنی غلط سوچ ہے تمہاری۔ ناشکری ہو تم۔ تمہیں اپنے ساتھ ہونے والے سارے حادثے یاد ہیں اور جو اللہ نے تمہیں دیا، اسے بھول گئی ہو۔ مانا تمہارے ساتھ برا ہوا ہے۔ مگر خدا کی قدرت سے تمہارے ساتھ اچھا بھی ہو گیا ہے۔ احمد کی قدر کرو ماہین! اسے پریشان مت کرو۔ میں نے نواز سے کہہ دیا ہے۔ تمہاری رخصتی کا جلد از جلد انتظام کرے تاکہ تم احمد کے ساتھ رہ کر اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ اسے جان لو گی تو ایسی باتیں نہیں کرو گی۔"

ثروت کے لیے اب ماہین کو مزید سمجھانا مشکل ہو گیا تھا۔ وہ دن بہ دن ضدی اور چڑچڑی ہوتی جا رہی تھی۔

اس کے ساتھ ہونے والا حادثہ بہت بڑا تھا۔ مگر اب رونے دھونے کی بجائے اسے اپنی زندگی کے نئے پہلو پر غور کرنا چاہیے تھا، جس پر اس نے اب تک نہیں سوچا تھا۔ وہ ابھی اسی لمحے میں گرفتار تھی، جب کاشف نے اسے چھوڑا تھا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں' کاشف کے بعد احمد بھی مجھے چھوڑ جائے؟"

"اللہ نہ کرے۔ کیوں چھوڑے گا وہ تمہیں؟" ثروت نے فوراً کہا۔

"میں کل پروفیسر صاحب سے بات کروں گی۔ نواز بھائی تمہارے بعد میرب کی شادی بھی کرنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ بھی زور دے رہے ہیں' ماہی! تمہیں سب کو دیکھنا ہو گا پلیز۔"

ثروت نے پیار بھرے انداز میں اس سے التجا کی تھی۔ ماہین نے جواباً "کچھ نہیں کہا' بس خاموشی سے سر جھکا لیا تھا اور ثروت کے لیے اس کی یہ خاموشی بھی بہت حوصلہ افزا تھی کہ وہ تو پچھلے ڈیڑھ ماہ سے ہر طرح سے سمجھانے کے باوجود کاشف والے حادثے کو بھول نہیں سکی تھی۔

اب سب کی یہی رائے تھی کہ اس کی جلد از جلد رخصتی کر دی جائے تاکہ اسے احمد کے ساتھ رہنے کا موقع ملے اور وہ دونوں ایک دوسرے کو سمجھ سکیں۔

☼ ☼ ☼

"تمہاری بہن' تمہارا مسئلہ ہے' میرا نہیں۔ اور کتنا انتظار کریں یار! تم اپنے بابا سے بات کرو نا۔ بلکہ ماما سے' کیوں کہ تمہاری ماما ہی تمہارے گھر میں آل ان آل ہیں۔"

آیان نے ہنستے ہوئے طنز کیا۔ میرب نے خفگی سے منہ بسورا۔ آیان کو طنز کرنے کی بہت عادت تھی۔ اس وقت اسے ماہین پر اور بھی غصہ آتا تھا کہ اس کی وجہ سے اسے آیان کے سامنے شرمندگی اٹھانا پڑتی تھی۔

"ڈونٹ وری..... بہت جلدی تمہاری دلی مراد پوری ہو جائے گی' کیونکہ آج ہی ماما نے بابا سے کہہ دیا ہے کہ اب اگلے ہفتے وہ تمہارے گھر جائیں گے۔"

"اللہ وہ وقت جلد لائے۔" آیان نے بظاہر ہنستے ہوئے کہا تھا' مگر درپردہ اس کے لہجے میں چھپا طنز میرب بخوبی سمجھ رہی تھی۔

"میں تمہاری بے تابی سمجھ سکتی ہوں۔ اور اب تمہیں زیادہ زحمت اٹھانا نہیں پڑے گی۔ ماما تک سارا معاملہ پہنچ گیا ہے۔"

سارا علوی کو آتے دیکھ کر اس نے جان بوجھ کر زور سے کہا تھا تاکہ اس تک یہ بات پہنچ جائے۔

"او کے آیان..... میں پھر بات کروں گی۔ بائے۔"

اس نے فون رکھ کر ماں کو دیکھا۔

"کیا کہہ رہا تھا آیان۔" سارا نے ہنستے ہوئے میگزین اٹھایا اور فیشن 2011ء کا جائزہ لینے لگی۔

"کہہ رہا تھا' ماہین کی وجہ سے ہماری شادی بہت لیٹ ہو گئی ہے۔ ہمیں یہ سزا کیوں دی جا رہی ہے۔"

"ہاہا....." سارا نے بے ساختہ قہقہہ لگایا تھا۔

"سزا؟ ارے بھئی یہ تو بڑا حسین انتظار ہوتا ہے۔ سزا نہیں ہے یہ۔"

"ماما! ساٹھ کی دہائی میں یہ انتظار حسین ہوتا ہو گا۔ آج کل تو زمانہ بہت فاسٹ ہے۔ انتظار سراسر زحمت لگتا ہے۔"

"توبہ ہے..... واقعی آج کل کے بچے تو بالکل نہیں شرماتے۔ ڈونٹ وری میری جان! ثروت ماہین کو لے کر جا رہی ہے۔ اس کے جاتے ہی میں شادی کی ڈیٹ رکھ دوں گی۔"

"یعنی ماہین اس شادی میں شامل نہیں ہو گی؟" وہ یکدم سیدھی ہو بیٹھی۔

"نہیں بھئی۔ تمہیں معلوم تو ہے' کتنی مشکل سے اس کا پاگل پن کچھ بہتر ہوا ہے' اب وہ شادی کا ہنگامہ اور رونق دیکھ کر کہیں دوبارہ نہ حواس کھو دے۔"

"تو ماما اب انتظار کس بات کا ہے۔ اس کی رخصتی کر دیں..... خود ہی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"میں تو خود یہی چاہتی ہوں مگر نواز اکرم کا لاڈ کم ہونے میں نہیں آ رہا۔ کہتا ہے' یہ مکمل صحت یاب ہو جائے پھر رخصتی کروں گا۔"

"اس کی صحت یابی یہاں ممکن نہیں ہو گی۔ جس

بے یقینی کا وہ شکار ہے۔ اسے احمد کے پاس جا کر ہی یقین آئے گا کہ اب اس کی زندگی میں کاشف کی کہیں جگہ نہیں ہے۔ بلکہ اب تو احمد ہی اس کا نصیب ہے۔"

"صحیح کہہ رہی ہو۔ ویسے بھی وہ بہت اچھا اور سمجھ دار لڑکا ہے۔ اس بے وقوف کو تو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اسے اتنا اچھا پڑھا لکھا بندہ مل گیا ہے اور وہ کاشف میٹرک پاس کلرک..... لالچی' گھٹیا انسان' شکر ہے جان چھوٹ گئی اس سے۔ خس کم جہاں پاک۔"

سارا علوی نے بے حد نفرت سے دونوں ہاتھ جھاڑ کر گویا کاشف کو بھی دھول سمجھ کر جھاڑا تھا۔

"ہاں..... ماہی کی تو لاٹری نکل آئی ہے۔ کہاں کاشف' کہاں احمد۔" میرب کے لہجے میں ہلکا سا حاسدانہ احساس تھا۔ سارا نے چونک کر اسے دیکھا۔

"تم جیلس ہو رہی ہو میرب! ارے بھئی وہ تمہارے آیان واسطی سے ابھی بھی مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔" سارا کی تعریف پر میرب بے ساختہ ہنسی تھی۔

"لو' نواز کا فون آ گیا۔ اللہ کرے احمد کا باپ بھی مان گیا ہو۔ پھر تو میں تمہاری رخصتی سے قبل ہی ماہی کو رخصت کر دوں گی۔" سارا نے سیل فون پر نمبر دیکھ کر اسے بتایا اور موبائل کان سے لگا لیا۔

"ہاں نواز..... ہو گئی ابراہیم صاحب سے بات؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"ہاں' ہو گئی ہے۔ وہ راضی ہیں۔ دس دن بعد وہ لوگ بارات لے کر آئیں گے۔"

"اوہ..... یہ تو بہت خوشی کی بات ہے' زبردست۔ مگر تم انہیں بتا دیتے کہ زیادہ شور شرابہ نہ ہو اور باراتی بھی بہت کم ہوں۔ بس دو چار بندے' رخصتی ہی تو کرنی ہے ہم نے۔" سارا کی بات پر نواز نے گہرا سانس لیا تھا۔

"ہاں وہ خود بھی زیادہ شور شرابے کے قائل نہیں ہیں۔ بے فکر رہو۔ چند لوگ ہی ہوں گے۔" نواز اکرم

نے سنجیدگی سے سارا کو جتایا تھا۔

"اوہو بھئی۔ سمجھا کرو نواز۔ نظر لگ جاتی ہے۔ زیادہ شوشا کی کیا ضرورت ہے۔ کاشف کی دفعہ میں تم نے پوری دنیا کو انوائٹ کرلیا تھا۔ پورے شہر کو اطلاع دے دی تھی اور نتیجہ کیا نکلا۔ بہتر ہے ابھی یہ کام چپ چاپ کرلو۔ کسی کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ باتیں بنائیں گے تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟"

سارا نے پل بھر میں نواز کے لہجے میں چھپی ناراضی کو پرکھ لیا تھا۔

"ہاں....." نواز اکرم نے گہرا سانس لیا۔ اس کے لیے سارا علوی کی ہر بات حرف آخر تھی، اور اب تو اس نے اسے بڑی تفصیل سے سمجھایا تھا، کیسے نہ مانتا۔

"تو بس ٹھیک ہے۔ ابھی وہ ثروت کے ساتھ رہ کر اپنی کچھ تیاری کرلے گی۔" سارا نے یہ مسئلہ بھی حل کردیا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ یہ آٹھ دس دن اپنی بیٹی کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا مگر سارا کی بات سے انکار کی اس میں جرأت نہ تھی۔

"اوکے بائے۔" سارا نے فون بند کرکے میرب کو دیکھا اور مسکرادی۔

"تھینکس گاڈ! یہ معاملہ تو نبٹا..... ورنہ مجھے، سچ پوچھو۔ مجھے ماہی کی بے انتہا فکر تھی۔ اب تم آیان کو مبارک باد دے سکتی ہو۔"

وہ خوف زدہ سی جھرجھری لے کر بولی تھی۔ میرب نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"ویسے اب تو ڈرنے والی بات نہیں ہے ناں ماما! ثروت پھپھو اس لڑکے کو ہرگز نہیں چھوڑیں گی۔ اگر وہ بھی بھاگ گیا تو....."

میرب کی بات پر سارا نے ہنستے ہوئے سر ہلایا۔

"اچھا میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔ خالد سے کہو، میری گاڑی صاف کردے۔ مجھے شام میں شہناز بھابھی کی طرف جانا ہے۔" سارا اپنے بال سمیٹتی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی اور میرب کچن کی جانب تاکہ خالد کو ماما کا پیغام دے سکے۔

☼ ☼ ☼

"جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے۔ وہ خود اسی میں جاگرتا ہے۔" ثروت نے بات کی تمہید باندھی۔ وہ سامنے سر جھکائے گم صم بیٹھی تھی۔

"بس، تیس لاکھ زندگی بھر کے لیے کافی نہیں ہوتے۔ کتنے دن عیش کرلے گا وہ۔ جب تک انسان خود نہ کمائے، برکت نہیں ہوتی بیٹھے بٹھائے قارون کا خزانہ بھی ختم کرلیتے ہیں لوگ اور لوٹ مار کا پیسہ تو اور بھی جلدی ختم ہوتا ہے۔ وہ خوش نہیں رہے گا۔ وہ کبھی بھی سکھ اور سکون کی زندگی نہیں گزار سکے گا۔ اور جو اس کے ساتھ اس جرم میں برابر کی شریک ہے، وہ بھی جب پیسہ ختم ہوجائے گا اسے چھوڑ کر چلی جائے گی۔ برائی کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔"

"پھپھو! اور کوئی نصیحت رہ گئی ہے تو وہ بھی کردیں۔"

اس نے بے حد سنجیدگی سے انہیں دیکھ کر کہا تھا۔ ثروت اس کی خفگی کو محسوس کرکے ہولے سے ہنسی تھی۔

"تو پھر تم میری بات کو سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ تمہاری اتری ہوئی صورت اور غم زدہ حالت ہمیں پریشان کردیتی ہے۔ احساس جرم میں مبتلا کردیتی ہے۔ تم ہمیں اس جرم سے نکالتی کیوں نہیں ہو۔ اگر تم سمجھتی ہو کہ کاشف اور رانی تمہارے مجرم ہیں، تو فکر مت کرو۔ انہیں سزا ملے گی اور ضرور ملے گی۔ نواز بھائی نے پولیس میں ایف آئی آر کٹوادی ہے۔ وہ پکڑا گیا تو اسے بہت سخت سزا دی جائے گی۔ تم.....!"

"پھپھو! اس کی سزا میری یہ سزا کم کرسکے گی؟"

ماہی نے یاسیت سے پوچھا تھا۔

"مجرم کو جرم کی سزا تو ملنی چاہیے نا۔" ثروت اسے ہر طرح سے مطمئن کرنا چاہتی تھی۔

"تم یہ بات چھوڑو، زندگی کسی ایک شخص پر ختم نہیں ہوجاتی ہے۔ آئندہ کے لیے سوچو ماہین! صرف ایک ہفتے بعد تمہاری رخصتی ہے اور تم نے ابھی کوئی شاپنگ نہیں کی ہے۔"

"میں کچھ نہیں کروں گی پھپھو! میں جیسی ہوں، ویسی ہی رہوں گی۔" اس نے ہٹ دھرمی سے کہہ کر رخ موڑ لیا۔

ثروت نے بے ساختہ ایک گہرا سانس لیا۔ یہ تو اس کا اپنا امتحان شروع ہوگیا تھا۔

"ماہی نے کبھی اسے اتنا تنگ نہیں کیا تھا، جتنا ان دنوں ستارہی تھی۔ وہ فکر مند سی بیٹھی ہوئی تھی، جب نواز اکرم کا فون آیا۔

"ہاں ثروت! ماہین کیسی ہے؟" سلام دعا کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"ٹھیک ہے، تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ تم آئے نہیں۔"

"ہاں میں نے آنا تھا۔ ایک ضروری کام کی وجہ سے نہ آسکا۔ صبح آؤں گا۔"

"نواز۔" اس نے خفگی سے اسے جتایا۔

"تمہیں یہاں آنے کے لیے اب وقت نکالنا پڑے گا؟ میرب اور ماہین دونوں تمہاری بیٹیاں ہیں اور ان دنوں ماہی کو تمہاری زیادہ ضرورت ہے۔ رخصتی سے پہلے ہی تم نے اسے سارا کے کہنے پر گھر سے نکال دیا ہے۔ جبکہ ان دنوں لڑکیاں اپنے والدین سے زیادہ قریب رہنا چاہتی ہیں۔ چھوڑنے کے تصور سے ہی ان کا دل کانپتا ہے اور رخصتی سے قبل کی ہی اس جدائی نے ماہی کو اور بھی اجنبیت کا احساس دلایا ہے کہ وہ والدین کے نزدیک اہم نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس سے محبت کرتے ہیں۔"

وہ بولتی ہی چلی گئی تھی۔

"ایسا نہیں ہے ثروت! ایسا بالکل نہیں ہے۔ میں نے اسے تمہارے ساتھ اس لیے بھیجا ہے کہ اسے کسی کمی کا احساس نہ ہو۔ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے اور تم اسے آنے والے وقت کے بارے میں زیادہ بہتر طریقے سے ذہنی طور پر تیار کرسکتی ہو۔ مجھے اپنی غلطی کا احساس ہے ثروت!"

نواز اکرم کے لہجے میں ازلی بے بسی اور لاچارگی تھی۔ ثروت نے بے ساختہ گہری سانس لی۔

"اوکے..... مگر اب کچھ ہی دن رہ گئے ہیں، روزانہ چکر لگالیا کرو۔"

"ٹھیک ہے ثروت! میں روزانہ آجایا کروں گا۔ وہ خوش تو ہے نا اب..... میرا مطلب۔"

"خوش تو نہیں، مگر بہتر ہے۔ سنبھل جائے گی تو ٹھیک ہوجائے گی اور خوش بھی رہے گی۔"

"ان شاءاللہ۔"

"ثروت نے فون رکھ دیا۔ اب وہ سوچ رہی تھی کہ ماہین کو کیسے آنے والے دنوں کے لیے تیار کرے۔

"رفعت کو اگر یہاں بلالوں تو وہ شاپنگ بھی کروا دے گی اور ماہین کا دل بھی بہل جائے گا۔" یکدم ہی اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور فوراً ہی اس نے اس پر عمل بھی کر ڈالا۔

"میں آجاؤں گی پھپھو۔" اس نے بڑی گرم جوشی سے جواب دیا تھا اور اس کے جواب سے وہ بہت مطمئن ہوئی تھی۔

☼ ☼ ☼

رفعت کے آنے سے بہت فائدہ ہوا تھا۔ دونوں اکٹھے کھانا کھاتی تھیں۔ اکٹھے سوتی تھیں۔ اکٹھے ہی شاپنگ پر جاتی تھیں۔ ثروت بہت مطمئن تھی۔

اب وہ سکون سے اپنے اسکول کا چکر لگالیتی تھی۔ نواز اکرم بھی روزانہ چکر لگالیتا تھا اور ماہین کو مطمئن اور بہتری کی طرف گامزن دیکھ کر خوش ہوتا تھا۔

البتہ سارا صرف ایک بار ہی آئی تھی، محض چند منٹوں کے لیے، وہ بھی شاید نواز اکرم کے بہت زور دینے پر۔ ثروت کے گھر وہ پہلے بھی بہت کم آتی تھی۔

میرب البتہ ایک بار بھی نہیں آئی تھی اور بقول سارا "وہ بھی تو اپنی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے وقت ہی کہاں ملتا ہے اسے۔"

ثروت نے دوبارہ میرب کے بارے میں سوال نہیں کیا تھا اور سوال کرنے کا فائدہ بھی کیا تھا۔ نہ تو میرب کے آنے سے ماہین کو فرق پڑتا تھا اور نہ ہی

اسے آنا تھا۔ اسی لیے ثروت نے دوبارہ اس موضوع پر بات ہی نہیں کی تھی۔ جمعرات کو احمد کا فون آگیا۔

"آنٹی! میں مہندی کا سوٹ اور مٹھائی لے کر آنا چاہتا ہوں۔" احمد کی معصوم سی فرمائش پر اسے بے ساختہ اس پر پیار آگیا تھا۔

"سوری آنٹی! آپ جانتی ہیں..... میری نہ تو کوئی بہن ہے' نہ ماں' نہ کوئی قریبی رشتے دار خاتون۔ اس لیے۔"

وہ اس کی خاموشی پر نہ جانے کیا سمجھ کر وضاحت دے رہا تھا۔ ثروت ہنس پڑی۔

"ارے بیٹا! تم بار بار مجھے وضاحتیں کیوں دیتے ہو۔ میں جانتی ہوں اور تم جب چاہو میرے پاس آسکتے ہو۔ یہ تمہارا اپنا گھر ہے۔"

اس نے بہت اپنائیت اور بے تکلفی سے اسے کہا' تاکہ اس کا ڈر اور خوف دور ہو سکے مگر جب اس نے یہی بات ماہین کے سامنے کی تو اس کا شدید رد عمل دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔

"میں مہندی کا جوڑا نہیں پہنوں گی۔ پیلا رنگ میرے لیے منحوس ہے۔ پہلے بھی تو میں نے پیلا جوڑا پہنا تھا نا..... ساری زندگی برباد ہو گئی۔"

"نہیں برباد ہوئی تمہاری زندگی۔ بھول جاؤ اس حادثے کو اور آئندہ آنے والے وقت کے بارے میں سوچو جو بہت اچھا اور خوشگوار ہوگا اور اب یہ رونا دھونا ختم کرو۔ تمہارے ساتھ جو ہوا' اس کی سزا تم احمد کو مت دو۔ مرد سب کچھ برداشت کر سکتا ہے مگر اپنے رقیب کا اپنی عورت کے دل و دماغ میں رہنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔" ثروت نے اسے سختی سے سمجھایا۔

"میں کیا کروں پھپھو! وہ میرے دل و دماغ سے نکلتا ہی نہیں ہے۔ ہر پل....."

"بس..... پلیز بس کرو۔ مزید نادانیاں اور حماقتیں مت کرو۔ اب ایسی باتیں مت کرو' جن سے اپنی ذات کو ہی نقصان ہو۔ رفعت! اسے تیار رکھنا۔ شام کو وہ لوگ مہندی کی رسم کے لیے آئیں گے تو میں اس کی کوئی حماقت یا بے وقوفی برداشت نہیں کروں گی۔" اس نے سختی سے کہہ کر باہر کا رخ کیا۔

"دیکھا..... دیکھا تم نے؟ یہ سب مجھے اپنے سر سے اتار کر دوسرے کے سر منڈھنا چاہتے ہیں۔ تنگ آگئے ہیں۔ برداشت نہیں کر سکتے مجھے۔"

"پاگل ہو ماہی! اپنے دماغ سے یہ منفی خیالات نکال دو۔ پلیز اچھا اچھا سوچو اور اچھا اچھا مانگو۔ ہم مسلمان ہیں۔ آزمائشیں' دکھ اور مصیبتیں آتی ہیں۔ بندے کو ہر طرح کے حالات کے لیے تیار رہنا چاہیے اور خدا پر بھروسا رکھنا چاہیے کہ وہ اگر دکھ دیتا ہے تو خوشی اور سکون بھی دیتا ہے۔ صبر' حوصلہ اور ہمت ہو تو برے سے برے اور کٹھن سے کٹھن دن بھی گزر جاتے ہیں۔ عورت تو بہت بہادر ہوتی ہے ہر طرح کے حالات میں گزارا کر لیتی ہے۔"

رفعت اسے سمجھا رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے سن رہی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری تھی۔ رفعت کو پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کچھ سن بھی رہی ہے یا نہیں۔ مگر اس نے اس کے سرد سپاٹ انداز اور چہرے کی پروا کیے بغیر اپنی بات پوری کی تھی۔

اب اس کے رد عمل کے لیے اسے شام کا انتظار تھا۔

☼ ☼ ☼

"میرب! مجھے شہزاد کا پتا نہیں مل رہا۔ وہ پچھلے مہینے سلمیٰ بھابھی کے پاس تھا۔ وہاں سے ان کے میکے چلا گیا تھا مگر کل میری سلمیٰ سے بات ہوئی تو وہ کہہ رہی تھی کہ شہزاد اس کی امی کے ہاں سے بھی چلا گیا ہے۔"

"افوہ ماما! آپ ایسے ہی پریشان ہوتی ہیں۔ ماموں خود ہی گھوم پھر کر آجائیں گے۔ پہلے بھی تو وہ ہفتوں غائب رہتے تھے نا۔"

میرب کے لیے ماموں کی گمشدگی کوئی خاص معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ ماموں کی فطرت سے اچھی طرح آگاہ تھی۔ انہیں گھر میں ٹکنا دشوار لگتا تھا اسی لیے یہاں وہاں' دور نزدیک کے تمام رشتے داروں کے ہاں وہ آتے جاتے رہتے تھے۔

"ہاں مگر اس کا اتا پتا تو معلوم ہوتا تھا نا..... ابھی تو پتا ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ ایک اکلوتا ماموں اور وہ بھی بھانجی کی شادی میں شریک نہ ہو۔"

"ماما اچھا ہے نا' وہ نہیں ہیں۔ انہوں نے کون سا کوئی کار خیر کرنا ہوتا ہے۔ الٹا اپنی بے وقوفی سے کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہی کرتے ہیں۔ رہنے دیں' جہاں بھی ہیں۔ جب تک میری شادی نہیں ہو جاتی' انہیں مت بلائیے۔ ابھی تو آیان اور اس کی فیملی کو صرف ماہین کے پاگل پن کا علم ہے' ماموں کو دیکھ تو وہ صاف کہہ دیں گے کہ یہ پورا خاندان ہی کھسکا ہوا ہے۔" میرب نے ہنستے ہوئے کہا تو سارا نے بڑی ناراضی سے اسے گھورا تھا۔

"بدتمیز! بہت خود غرض ہو تم۔ ہر وقت تمہیں آیان اور اس کی فیملی کی فکر پڑی رہتی ہے۔ سگے رشتوں کے لیے کتنا پتھر دل ہے تمہارا۔"

سارا کو آج پہلی بار اس کے بدصورت رویے اور سرد مہری کا احساس ہوا تھا۔ میرب کا منہ بن گیا۔

"افوہ ماما! رشتوں سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر ایسے رشتے داروں کو کیا کہیں جو ہمارے لیے شرمندگی اور خفت کا باعث بن جاتے ہیں۔"

"تم سے تو اچھی ماہی ہے۔ کل بھی ماموں کو یاد کر کے رو رہی تھی کہ....."

"ہاں' اسے ہاہا۔" وہ بات کرتے کرتے زور زور سے ہنسنے لگی تھی۔ "کیوں کہ ماموں اور وہ' دونوں ایک ہی جیسے تو ہیں۔ کھسکے ہوئے۔" ہاہا....."

وہ بدتمیزی سے کہہ کر زور زور سے ہنسنے لگی۔ سارا نے اسے گھورا۔

"اچھا! شام کو ہمیں ثروت کی طرف جانا ہے۔ یاد رکھنا۔ کہیں تم بھول جاؤ اور تمہارے بابا اور پھپھو مجھے باتیں سنائیں۔" سارا نے بے زاری سے جتایا۔

"کیوں' کیوں آپ کو باتیں سنائیں گے؟ میری مرضی میں جہاں چاہوں جاؤں' جہاں چاہوں نہ جاؤں کوئی زور زبردستی ہے؟"

"افوہ میرب! بات کو سمجھا کرو۔ ماہین تمہاری بڑی بہن ہے اور تمہیں اس کی شادی میں ایک دن پہلے تو جانا ہی چاہیے نا۔ اتنے دنوں سے تم نہیں جا رہی ہو۔ روزانہ نواز مجھے پوچھتے ہیں تو میں شادی کی تیاریوں کا بہانہ بنا دیتی ہوں مگر آج مہندی ہے۔"

"لو جی! پھر مہندی' نکاح ہو چکا ہے تو سیدھا سیدھا رخصتی کریں۔ اس سے پہلے کہ کچھ ہو جائے۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے بڑے طنزیہ انداز میں کچھ ہو جائے پر زور دے کر کہا تھا۔

"اللہ نہ کرے۔ مزید کسی جھٹکے کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔ خیریت کے ساتھ تم بھی اپنے گھر کی ہو جاؤ تو میں فارغ ہو کر لندن جاؤں گی۔ بڑے عرصے سے لندن کا وزٹ ملتوی ہو رہا ہے۔"

"ہمارے ساتھ چلیے ماما! میں اور آیان بھی لندن جانے کا پروگرام بنا رہے ہیں' فار ہنی مون....." میرب نے خوش ہو کر اسے اطلاع دی۔

"واؤ..... پھر تو ہم بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ تم لوگ ہنی مون انجوائے کرنا اور ہم اپنے بزنس ٹرپ پر ..... اللہ تمہارا اور آیان کا ساتھ ہمیشہ سلامت رکھے۔"

سارا نے دل سے اسے دعا دی۔

"آمین' تھینک یو ماما۔" میرب نے لاڈ سے اس کے گلے میں بانہیں ڈالیں۔ سارا نے بے ساختہ اس کا ماتھا چوما۔

"اچھا شام میں تیار رہنا' ہمیں ثروت کی طرف جانا ہے۔" اس نے میرب کا اچھا موڈ دیکھ کر "فوراً" کہا تھا۔ میرب کے چہرے پر پل بھر کو ناگواری پھیلی تھی' مگر دوسرے ہی پل اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گڈ' اچھا ہٹو پیچھے' مجھے پارلر جانا ہے۔ بے شک زیادہ لوگ نہیں ہوں گے شادی میں مگر مجھے تو تیار ہونا ہے نا۔"

"ضرور' ویسے ماما آپ اتنی بیوٹی فل ہیں' آپ کو سجنے سنورنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"مکھن مت لگاؤ۔ چلو جاؤ جا کر اپنا کوئی اچھا سا شلوار قمیص نکال کر خالد کو پریس کے لیے دے دو۔ وہاں یہ جینز شرٹ مت پہننا۔"

"اوہ..... مگر کیوں، میرے پاس موتیوں کے کام والی شرٹ ہے، میں وہ ہی جینز پر پہن لوں گی ماما۔"

"تو، سمجھا کرو۔ وہاں کا ماحول ایسا ماڈرن نہیں ہو گا۔ تم نے اپنی فرینڈ کی شادی پر جو سرخ اور سبز جوڑا سلوایا تھا نا۔ وہ پہن لینا۔" سارا نے اسے سمجھاتے ہوئے اپنا انتخاب بھی بتا دیا تھا۔ میرب نے منہ بنا کر ماں کو دیکھا، پھر کچھ سوچ کر سر ہلا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ارے واہ! بڑا شاندار سوٹ ہے یہ تو، اور بہت قیمتی بھی۔"

احمد کی طرف سے آئے نارنجی اور سرخ کم خواب کے بے حد نفیس اور خوب صورت کام والے سوٹ کو دیکھ کر رفعت نے بے ساختہ تعریف کی تھی۔ اس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

"ماہی! اس جوڑے کو سنبھال کر رکھنا۔ یہ بعد میں میں لے لوں گی۔" اس کی تو ہمیشہ کی طرح نیت خراب ہوئی۔

"ابھی لے لو۔" اس نے لاپروائی سے دوپٹے کا کونا اٹھا کر اس کی جانب پھینکا۔ رفعت نے لرز کر اسے دیکھا۔

"ہائے! اللہ نہ کرے۔ ابھی کیوں لے لوں۔ یہ تمہارا ہے۔ تمہاری مہندی کا۔ اللہ تمہارے نصیب اچھے کرے۔ میں تو فنکشن کے بعد کی بات کر رہی تھی۔ توبہ ہے ماہی! تم تو بہت ظالم ہو۔"

"مجھے نہیں پہننا یہ....." اس نے ضدی انداز میں منہ موڑ کر گویا اسے اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

"تم اب مجھ سے مار کھاؤ گی ماہی! اگر تم نے میری بات نہ مانی تو میں ابھی سارا آنٹی کو بلاتی ہوں۔" اس نے غصے اور جھنجلاہٹ سے اسے دھمکی دی۔

"تو..... تم کیا سمجھتی ہو۔ میں ان کی بات مان لوں گی؟ کبھی بھی نہیں۔ کیا کیا ہے انہوں نے میرے لیے جو میں ان کی بات مانوں گی۔ ہاں؟" وہ سارا کا نام سن کر مزید چراغ پا ہو گئی۔

"ماہی! تم نے ابھی تک کپڑے نہیں بدلے۔ سب باہر تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔" سارا علوی اپنی خوب صورت ہلکے سبز اور سنہرے بارڈر والی ساڑھی سنبھالتی اندر آئی اور تنقیدی نظروں سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔

"جی آنٹی بس..... ابھی آتے ہیں۔ ماہی یہ کپڑے....!" رفعت سارا کو دیکھ کر ہمیشہ کی طرح ہکلاہٹ کا شکار ہو گئی تھی۔ ماہین نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ پھر سارا کو دیکھا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں تیار ہوں، چلیں۔" سارا نے الجھ کر سرتاپا اسے دیکھا۔ سفید شلوار میلی اور مسلی ہوئی ہلکی آسمانی قمیص، اس کے ماتھے پر گہری شکنیں ابھر آئی تھیں۔

"اس حلیے میں؟ آئینہ دیکھا ہے تم نے چلو جلدی سے کپڑے بدلو اور رفعت اس کا منہ ٹھیک کرو۔ کریم پاؤڈر لگاؤ۔ ڈر لگ رہا ہے دیکھ کر۔ سر جھاڑ منہ پہاڑ یہ باہر آئے گی تو وہ..... چلو جلدی سے کپڑے بدلو اور تیار ہو کر باہر آجاؤ۔"

وہ بھی اپنے نام کی ایک تھی۔ اک تو اترے اس پر تنقید اور ڈانٹ ڈپٹ کر کے ساڑھی کا پلو سنبھالا اور باہر کی جانب بڑھ گئی۔ جاتے جاتے دروازے کے درمیان رک کر دوبارہ پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔

"تم بھی ابھی تک یونہی کھڑی ہو۔" سارا نے بت کی طرح ساکت کھڑی رفعت کو گھورا۔

"جی۔ جی وہ میں..." رفعت نے مارے بوکھلاہٹ کے ماہی کا پیلا دوپٹہ اپنے سر پر لے لیا تھا۔ سارا نے اسے گھورا۔

"میں نے تمہیں تیار ہونے کو نہیں کہا۔ اسے تیار کر کے باہر لے آؤ۔ اور تم جو بت کی طرح کھڑی ہو نا۔ عقل کرو۔ ورنہ روز روز معجزے نہیں ہوتے اور نہ ہی زندگی میں روزانہ ایسے چانس ملتے ہیں کہ ہم اپنی اصلاح کر سکیں۔"

"ماہین نے پھولوں کے گجرے اٹھا کر دور پھینک دیے۔

"زندگی میں روزانہ ایسے دکھ بھی تو نہیں ملتے کسی کو۔"

"ماہی! اللہ کے واسطے تیار ہو جاؤ۔ ورنہ تمہاری ماما مجھے بہت ڈر لگتا ہے ان سے۔ وہ مجھے بھوت بنا دیں گی۔"

"بھوت یا چڑیل....." اس نے رفعت کو گھورا۔ بے چاری گھبراہٹ میں مونث مذکر کا فرق بھی بھول گئی تھی۔

"بھوتنی، چڑیل، چڑیا، سب کچھ پہن لے میری ماں، ورنہ وہ ابھی دوبارہ....."

"تم ڈرتی رہو ان سے۔ میں نے ماما سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ بچپن سے ہی وہ مجھے ڈرا دھمکا رہی ہیں۔ ڈانٹ ڈپٹ کر رہی ہیں، مگر اب نہیں۔ انہوں نے جو کرنا ہے کر لیں۔ میں اسی حلیے میں۔ ان ہی کپڑوں میں باہر جا رہی ہوں۔"

وہ اٹل اور حتمی لہجے میں کہہ کر باہر کی جانب جا رہی تھی۔ رفعت نے لپک کر اسے پکڑ لیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہو تم... اس حلیے میں۔ اللہ کے لیے ماہی! تم....."

"چھوڑو مجھے۔" اس نے اپنا بازو ایک جھٹکے سے چھڑایا اور باہر نکل گئی تھی۔ راہداری عبور کر کے وہ باہر آئی تو لاؤنج سے نواز کے بولنے کی آواز آئی تھی۔

"پروفیسر صاحب! میں تو آپ کا یہ احسان عمر بھر نہیں اتار سکتا۔ آپ نے....."

اسی پل نواز اکرم کی نظر لاؤنج کے سفید جالی دار پردے کے پیچھے کھڑی ماہین پر پڑی۔ اور اس نے فوراً گھبراہٹ سے ثروت کو دیکھا۔ جو اتفاق سے اسی وقت اس کی جانب متوجہ ہوئی تھی۔ اور اس سے قبل کہ وہ پردے سے نکل کر آگے آتی، ثروت نے اسے وہیں دبوچ لیا تھا۔

"چلو یہاں سے....." اس نے ہلکی سی سرگوشی کرتے ہوئے اسے پیچھے کی جانب دھکیلا تھا، لاؤنج میں احمد اور اس کے دو تین کولیگ بھی موجود تھے۔

"کیا بدتمیزی ہے یہ۔ یہ کس حلیے میں منہ اٹھائے اکیلی چلی آ رہی ہو۔ تمہارا جوڑا..... اور وہ رفعت کہاں ہے؟" ثروت نے اِدھر اُدھر دیکھ کر اسے سختی سے ٹوکا تھا۔ اس پل اسے ماہی پر شدید غصہ آیا تھا۔

"آنٹی میں..... میں نے اسے بہت روکا تھا۔ مگر یہ اپنا جوڑا وہیں پھینک کر آگئی۔ سارا آنٹی بھی ابھی اسے ڈانٹ کر آئی ہیں۔"

رفعت فوراً ہی اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی۔ اس بے چاری پر الگ مصیبت ٹوٹی ہوئی تھی۔ ماہی کی ذمہ داری اس کے ناتواں کندھوں پر تھی اور یہ ذمہ داری نبھاتے نبھاتے وہ ہلکان ہوئے جا رہی تھی۔ ماہین کی ضد اور ہٹ دھرمی اس وقت پورے عروج پر تھی۔

"ماہی..... کیوں تم ہم سب کو ذلیل کروانا چاہتی ہو۔ کیا مسئلہ ہے تمہیں۔ جب سب ٹھیک ہونے لگتا ہے تو تم اس کو ٹھیک نہیں رہنے دیتیں۔ اپنا رویہ بدلو۔ ورنہ میں تم سے بہت سختی سے پیش آؤں گی سمجھیں؟"

وہ یکدم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ ثروت نے بے بسی سے اس کا بازو تھام لیا۔ دل کو بھی کچھ ہوا تھا، ہر عمل کا رد عمل ہوتا ہے اور ماہین کے ساتھ کی جانے والی سختی کا یہ رد عمل تھا کہ وہ بھی اب ضدی اور

ہٹ دھرم بن کر دوسروں کو ستانے لگی تھی۔

"سوری... سوری ماہی! میں نے تمہیں ڈانٹا، تمہیں برا لگا۔ جاؤ میری پیاری بیٹی، پھپھو کی بات مان لو اور تیار ہو کر جلدی سے آجاؤ۔"

اس نے بہت پیار سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ خاموشی سے سر جھکا کر اندر چلی گئی۔ ثروت نے گہرا سانس لے کر رفعت کو دیکھا اور اسے اشارہ کیا۔ وہ بھی فوراً اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی۔

"یا اللہ! خیریت کے ساتھ سارا کام ہو جائے۔"

اس نے دعا مانگ کر اطمینان بھرا سانس لیا اور کچن کی جانب آگئی۔

کک نے ٹیبل لگا دی تھی۔ کھانوں کی اشتہا انگیز خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی۔

"ثروت تم یہاں ہو۔ اور وہ ماہی ابھی تک تیار نہیں ہوئی؟" کچھ دیر بعد سارا پریشان سی اس کے پاس کچن میں آئی تھی۔

"ہو رہی ہے بھابھی۔ آپ فکر نہ کریں۔" اس نے مسکرا کر اسے تسلی دی۔

"کیا خاک ہو رہی ہے۔ پچھلے آدھے گھنٹے میں اسے سمجھا رہی تھی کہ تم۔"

"آپ فکر نہ کریں بھابھی۔ ابھی وہ تیار ہو رہی ہے۔ اور پلیز آپ اپنے غصے پر کنٹرول رکھیں۔ بلاوجہ کی ڈانٹ ڈپٹ سے بھی گریز کریں۔" ثروت کی بات پر سارا تپ گئی۔

"کیا مطلب! بلاوجہ کی ڈانٹ ڈپٹ۔ میں کیوں اسے بلاوجہ ڈانٹوں گی، اس کی حرکتوں پر مجھے غصہ آیا تو اسے ڈانٹا تھا نا۔ زیادہ سر پر چڑھ رہی تھی، جس حلیے میں وہ ڈرائنگ روم میں آ رہی تھی، وہ حلیہ سسرالیوں کے سامنے جانے کا نہیں تھا۔ کیا کہتے پروفیسر صاحب اسے دیکھ کر وہ اس سے پہلی مرتبہ مل رہے ہیں اور اگر وہ بھی ناپسند کر کے کاشف کی طرح بھاگ جائے تو...!"

"اللہ نہ کرے۔ وہ نہیں بھاگے گا، آپ اس بات کی ٹینشن مت لیں۔" ثروت نے تڑپ کر اسے ٹوکا تو ایک طنزیہ مسکراہٹ سارا کے لبوں پر پھیل گئی تھی۔

"ہاں... وہ کیوں بھاگے گا۔ رشتہ جو دہرا ہے تمہارے ساتھ۔ لحاظ داری بھی تو ہے نا۔" اس کا طنز پروفیسر ابراہیم کی جانب تھا۔ ثروت نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ بھی کہنے سے روکا تھا۔ اس وقت جواب در جواب سے بات طول پکڑتی تو گھر بیٹھے مہمانوں کے لیے یہ توہین کا باعث بن جاتی۔

"چلیں، کسی کی لحاظ داری کے سبب ہی سہی، ہماری بیٹی کی زندگی سنور جائے اور ہمیں کیا چاہیے۔" اس نے بڑے تحمل سے سارا کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ اس نازک رشتے کے سلسلے میں اسے محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اور سارا کو بھی اس بات کے لیے کوشش کرنی چاہیے کہ ماہین کے بارے میں کوئی بھی بات کرنے سے قبل وہ بہت محتاط رہے تاکہ اس کی آئندہ زندگی پر کوئی اثر نہ پڑے۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر تم ہی اسے لے کر آؤ۔" اس نے صاف دامن بچا لیا تھا۔

"میرب کہاں ہے؟ ایسے موقع پر تو بہنیں ساتھ ہوتی ہیں۔ وہی ساری رسموں میں آگے آگے ہوتی ہیں۔ لیکن میرب تو غیروں کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے کرسی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اسے بلائیں۔" ثروت نے سنجیدگی سے اسے جتایا تھا۔ سارا کے ماتھے پر بل بھر کو شکنیں ابھری تھیں، مگر وہ کچھ کہے بغیر باہر چلی گئی تھی۔ اس نے خانساماں کو کھانے کے متعلق کچھ مزید معلومات دیں اور خود بھی باہر آگئی۔

ماہین کو رفعت اور میرب دونوں لاؤنج میں لے آئی تھیں۔ ثروت کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ مہندی والے قیمتی خوب صورت سوٹ میں مکمل گھونگھٹ نکالے اور چہرہ چھپائے ہوئے تھی۔

"آؤ بیٹا! ادھر آجاؤ۔" اس نے احمد کو ماہین کے ساتھ بٹھا دیا۔

مختصر سی تقریب میں تھوڑے سے لوگ تھے۔ سارا، ثروت، اور میرب نے احمد اور ماہین کو مہندی لگائی تھی۔ احمد کے دو تین کولیگ تھے، جنھوں نے احمد کو مٹھائی کھلائی تھی۔ ایک گھنٹے کی اس تقریب میں مووی، فوٹو سیشن، مہندی کی تقریب اور کھانا سب کچھ ہو گیا تھا۔

"کل بھی ہم لوگ وقت پر آجائیں گے۔" پروفیسر ابراہیم نے مسکرا کر نواز اکرم سے کہا تھا۔

"ضرور سر! یہ تو بہت اچھا ہے کہ آپ وقت کے پابند ہیں۔" نواز اکرم نے بڑے عقیدت بھرے انداز میں اسے کہا تھا۔ ثروت نے اس پل چونک کر اسے دیکھا۔

برسوں پہلے کی وہ شام اس کی آنکھوں کے سامنے لہرائی تھی، جب اباجی نے ابراہیم کے رشتے سے انکار کیا تھا، تو نواز لاتعلقی اور اجنبیت سے کھڑا رہا تھا، اور آج... وہ مسکرائی۔ "اپنی اولاد کا معاملہ ہے نا۔"

"آپ کیا سوچ کر چپکے چپکے مسکرا رہی ہیں؟" یکدم اس کے کندھے کے قریب سرگوشی ہوئی تھی۔ وہ چونک کر پلٹی... احمد مسکرا رہا تھا۔

"آنے والے وقت کے بارے میں۔ جب تم اور ماہین ______ مجھ سے ملنے آیا کرو گے۔"

"اچھا۔ اگر وہ میرے ساتھ آنا چاہیں گی تو..." احمد کی بات پر وہ چونکیں۔

"احمد! جو حادثہ اس کے ساتھ ہوا ہے، وہ اتنی آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ کچھ وقت لگے گا مگر وہ سنبھل جائے گی۔ تمہاری محبت، اعتماد اور تمہارا رویہ اسے سنبھلنے میں بہت مدد دے گا بیٹا!"

"آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ میں آپ کے اعتماد پر پورا اتروں گا۔ مجھے بھی ساری صورت حال کا اندازہ ہے اور میں اسے فیس کرنے کے لیے تیار بھی ہوں۔" اس نے بڑی نرمی اور محبت سے ثروت کا ہاتھ تھام کر اسے یقین دلایا اس لمحے ثروت کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ اس بات کا ثبوت تھی کہ اسے یقین آگیا ہے۔

احمد مسکرا کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے ثروت کو تو یقین دلا دیا تھا، مگر خود وہ ماہین کے معاملے میں خاصی بے یقینی کا شکار تھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے ہوئے اسے سارا وقت یوں محسوس ہوا تھا، جیسے وہ کسی گلیشیر کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے کئی بار لمبے گھونگھٹ کے پار کچھ دیکھنے کی کوشش کی تھی، مگر بے سود۔ وہ اتنا سر جھکا کر بیٹھی تھی کہ اس کا سر اپنے گھٹنوں کو چھو رہا تھا، نجانے یہ شرم تھی یا وہ اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بہرحال اس سارے قصے میں اسے عجیب سے احساس نے گھیر رکھا تھا کہ یہ لڑکی جو ساتھ بیٹھی تھی، جس کے ساتھ اس کا عمر بھر کا رشتہ جڑا تھا، اس کے ساتھ زندگی شاید بہت مشکل میں گزرنے والی تھی۔ اس نے گہرا سانس لیا۔

"ماہین..." وہ مہمانوں کو رخصت کرنے کے فوراً بعد ماہین کے پاس کمرے میں آئی تھی۔ سارا وقت اس کے انتہائی سنجیدہ رویے اور سرد انداز کو دیکھ دیکھ کر پریشان ہوتی رہی تھی اور اب ثروت نے دیکھا ماہین رو رہی تھی اور رفعت بے بس سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا ہوا... ماہین بیٹا..." اس نے فکر مندی سے اس کا سر ہلایا۔

"پتا نہیں پھپھو، بس اندر آتے ہی رونے لگی۔" رفعت نے پریشانی سے اطلاع دی۔ اس نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے کندھوں پر اپنا بازو پھیلا لیا۔

"ماہی! جان رو نہیں بیٹا! اللہ سب بہتر کرے گا۔ بلکہ کر دیا ہے۔ شکر ہے میرے مالک کا، اس نے ایک دکھ دیا تو فوراً ہی اس کا ازالہ بھی کر دیا۔ بیٹا! کسی دکھ کو بھلانے کے لیے ایک ماہ کا عرصہ کافی ہوتا ہے۔ اور اگر نہ بھلایا جائے تو وہ دکھ عمر بھر کا روگ بن جاتا ہے، کسک اور ٹیس دینے والا... اس لیے خود کو روگی نہ بناؤ بیٹا! اسے بھول جاؤ۔"

"پھپھو! میں نے بہت کوشش کی ہے، مگر اسے بھول نہیں پا رہی ہوں۔ میں کیا کروں مجھے اس کی باتیں، اس کے دعوے، وعدے اور محبت یاد آتی ہے تو میں ڈگمگا جاتی ہوں۔ وہ مجھے ایک بار مل جائے، پھر اس سے پوچھوں گی کہ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا۔ میں نے اسے خود تو نہیں کہا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرے۔ میں تو اپنے بارے میں جانتی تھی کہ میں کیسی ہوں، مگر وہ میرے سوئے ہوئے جذبات جگا کر، مجھے

محبت کا جھانسہ دے کر لوٹ گیا۔"

وہ زور زور سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ثروت کا دل کٹ گیا۔ اس نے بے ساختہ اسے اپنے سینے میں چھپا لیا تھا۔

"رو لو! جتنا رونا ہے، آج رو۔ جی بھر کے اپنا غبار نکال لو۔ اس شخص کی ساری یادیں، باتیں، وعدے، دعوے سب ان آنسوؤں کی راہ اندر سے نکال دو۔ خالی ہو جاؤ، کورے برتن کی طرح، تاکہ احمد کی محبت کو اپنے اندر جذب کر سکو۔ یہ غبار دھل جائے گا تو تم خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرو گی۔"

اس کی ہچکیاں مزید تیز ہو گئی تھیں۔ رفعت بھی اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔

"ثروت میں..." نواز اکرم اسے پکارتا ہوا اندر آیا تھا، اور اسے ماہی کے ساتھ لپٹ کر روتے دیکھ کر ٹھٹھک گیا تھا۔ وہ ان دونوں کے قریب آ گیا۔

"ثروت..." اس نے ثروت کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک کر پلٹی۔

"جی... ہاں... ہاں... وہ میں..." جلدی جلدی اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے وہ ہکلائی۔

"ثروت تم تو بہت بہادر ہو، تم بھی ماہی کے ساتھ رو رہی ہو۔ ہمت کرو بھئی۔" نواز نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو ثروت کو لگا برسوں بعد آج اس لمحے کی زیادتی کا ازالہ ہو گیا ہے، جو نواز اکرم نے اس کے معاملے میں خاموشی اختیار کر کے کی تھی۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں بھر آئے تھے۔

"چلیں نواز..." سارا اور میرب یکے بعد دیگرے کمرے میں آئی تھیں۔

"بابا... آپ نہ جائیں... ماما! آپ بھی... آج رات میرے پاس رک جائیں نا۔" ماہین نے سرخ آنکھیں پونچھ کر سارا سے التجا کی تھی۔

"آں... وہ بھئی میں صبح صبح آ جاؤں گی نا۔ ابھی تو رات کافی ہو گئی ہے۔ سونا ہی ہے۔ یہاں یا وہاں کیا فرق پڑتا ہے۔" سارا کے رکھے سے لہجے پر اس نے تڑپ کر ماں کو دیکھا تھا۔

"کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ دھیرے سے بڑبڑائی تھی۔

"بہت فرق پڑتا ہے ماما!" کل میں یہاں نہیں ہوں گی۔ اور میں اس گھر میں اپنی آخری رات آپ سب کے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔" کیسی حسرت تھی ماہی کے لہجے میں نواز اکرم کا دل پگھل گیا۔

"نہیں... میں تمہارے پاس ہی ہوں ماہی! تمہارے ساتھ ہوں۔" اس نے بے ساختہ بیٹی کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے سارا کو دیکھا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ اور وہ خاصے شش انداز میں کھڑی تھی۔

"سارا! رک جاؤ نا آج یہاں۔" سے ماہی کی آنکھوں میں جلتے بجھتے امید کے دیے دیکھنا ہمیشہ ہی بہت تکلیف دہ لگتا تھا۔

وہ جب بھی سارا سے کوئی فرمائش کرتی تھی تو سارا کے انکار کے بعد جو دکھ اور اداسی کی دھند اس کے چہرے پر پھیلتی تھی۔ یہ ثروت کے لیے ایک کرب ناک کیفیت ہوتی تھی۔ اور اسی لیے وہ پہلے سے بھی بڑھ کر ماہین کو محبت دیتی تھی اور اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔

"بھئی! مجھے اپنے بیڈ کے علاوہ کہیں اور نیند نہیں آتی۔ اور تمہارے یہاں تو کتے بلیوں کی گندی سی اسمیل پھیلی ہوتی ہے۔ مجھے الرجی ہے اس اسمیل سے۔ میں تو رات بھر جاگتی ہی رہوں گی۔ ماہین! میں صبح آ جاؤں گی۔ تم فکر مت کرو۔"

وہ اپنے آرام میں کوئی کمی، کوئی خلل برداشت نہیں کرتی تھی، اسی لیے فوراً انکار کیا تھا۔ اور اس کی بات سن کر ہمیشہ کی طرح ماہین کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرایا تھا۔

"تم رک جاؤ میرب!" اب کے اس نے خاموش، لاتعلق سی کھڑی اپنی بہن سے کہا تھا۔ میرب بے ساختہ چونکی تھی۔

"میں... میں کیا کروں گی یہاں؟ اور تم اکیلی تو نہیں ہو۔ رفعت، تمہاری دوست بھی تو تمہارے پاس ہی ہے نا۔ میں بھی ماما کے ساتھ صبح آ جاؤں گی۔ چلیں ماما!"

ثروت کو پہلے سے میرب کے جواب کا اندازہ تھا، اس کے باوجود اس کے جواب نے اسے بہت تکلیف دی تھی۔ اس نے دانستہ ماہی کے چہرے کی طرف دیکھنے سے گریز کیا اور نواز کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے چہرے پر دنیا بھر کی ندامت پھیلائے بیٹھا تھا۔ سارا اور میرب کے جوابات نے خود انہیں تو کسی شرمندگی میں مبتلا نہیں کیا تھا، البتہ نواز اکرم ضرور شرمسار ہوا تھا۔ ثروت نے افسوس سے اسے دیکھا۔

"کمزور مرد کے کمزور فیصلوں سے کتنے لوگوں کی زندگی میں دکھ اور ندامت پھیلتی ہے۔ یہ اگر نواز اکرم کو معلوم ہو جاتا تو شاید آج صورت حال مختلف ہوتی۔" اس نے گہرا سانس لے کر سارا اور میرب کو جاتے دیکھا۔

"ماہین... تم پریشان مت ہونا، آج میں، ہم اور نواز خوب جی بھر کر باتیں کریں گے۔ کیوں نواز؟" اس نے پل بھر میں خود کو سنبھال کر بشاش لہجے میں کہا تھا۔ نواز چونکا۔ پل بھر میں وہ ساری صورت حال سمجھ گیا تھا۔

"ہاں... ہاں... ہم... ہم تینوں فرینڈز خوب باتیں کریں گے۔"

"میں رفعت کے ساتھ کچن سمیٹتی ہوں، تم لوگوں کے لیے چائے بناتی ہوں، تب تک تم دونوں باتیں کرو۔" اس نے رفعت کو اشارہ کیا اور باہر نکل گئی۔ ماہین نے باپ کو دیکھا۔

"بابا! آپ کو یاد ہے ہمیں جب چھوٹی سی تھی، تب رات کو آپ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی تھی اور آپ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے تھے تو مجھے بہت مزا آتا تھا۔"

"ہاں... ہاں یاد ہے مجھے۔ سب کچھ یاد ہے۔ تمہارے بچپن کی ایک ایک بات، تم جب بھی روتی ہوئی میرے پاس آتی تھیں تو میں تمہیں ٹافیاں دیتا تھا۔ چاکلیٹ کینڈی، وہ براؤن ریپر والی ہوتی تھی نا۔"

"ہاں۔ اور اس پر گولڈن کلر سے نام لکھا ہوا ہوتا تھا، ہے نا۔"

"ہاں، اور ایک بار میں نے تمہیں ایک باربی دلائی تھی جس کے تم نے بال کاٹ دیے تھے کہ اس کے لمبے لمبے بال تم سے سنبھالے نہیں جاتے تھے۔" نواز اکرم یادوں کے جنگل میں جا اترا تھا اور اس کا ہاتھ تھامے ساتھ ساتھ ماہین بھی گھوم رہی تھی۔

"بابا! میں آپ کی گود میں سر رکھ کر سونا چاہتی ہوں۔" وہ بولتے بولتے نواز کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

نواز نے پیار سے اس کے سر میں انگلیاں پھیریں۔ اس کی آنکھوں میں ڈھیر سارا پانی اتر آیا تھا۔

"بابا! مجھے وہی پری والی کہانی سنائیں نا جسے ایک کالا گلاب ملتا ہے اور جس میں جن کی جان ہوتی ہے۔" وہ آٹھ سالہ سہمی ہوئی ماں کی ڈانٹ پھٹکار کھا کر باپ کی گود میں پناہ لینے والی بچی تھی۔

"ٹھیک ہے! تم آنکھیں بند کر لو۔ ہاں جی، ایک پری تھی۔ بہت ہی پیاری اور معصوم، بالکل میری ماہین جیسی۔"

نواز اکرم نے آہستہ آہستہ کہانی شروع کی۔ ماہین بچپن سے ہی باپ کی اس بات پر کشمکش میں پڑ جاتی تھی کہ بابا جھوٹ بولتے ہیں یا ماما، کیونکہ ماما نے کبھی بھی اسے پیاری اور معصوم نہیں کہا تھا۔ ماما کے پکارنے کا انداز بالکل مختلف تھا۔ اور بابا کا بالکل الگ۔ بہت عرصہ وہ اسی کشمکش میں، کبھی بابا کو صحیح سمجھتی اور کبھی ماما کو۔ مگر یہ کشمکش زیادہ عرصہ نہیں چلی تھی۔ بہت جلد اسے اپنے ساتھ سب کے سلوک کا اندازہ ہو گیا تھا۔

"اور وہ جن جس کی جان کالے گلاب میں تھی، وہ..." کہانی سناتے سناتے نواز نے اپنی گود میں لیٹی ماہین کو دیکھا اور بے ساختہ مسکرا دیا۔ وہ سو چکی تھی۔

اسی وقت ثروت کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بھی اسے بچوں کی طرح نواز اکرم کی گود میں سوتے دیکھ مسکرائی تھی۔

"نواز نے جھلملاتی آنکھوں کے ساتھ تکیہ درست کر کے ماہین کا سر اس پر رکھا۔

"تم ادھر ساتھ والے کمرے میں آجاؤ نواز۔" ثروت نے گیسٹ روم کی جانب اشارہ کیا تو وہ سرہلا کر کمرے سے نکل گیا۔ ثروت نے پیار سے اس کا بازو جو پلنگ سے نیچے لٹک رہا تھا اٹھا کر اوپر کیا اور اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔

صبح ہونے میں محض چند گھنٹے باقی تھے۔ رفعت تو پہلے ہی ثروت کے کمرے میں لیٹ گئی تھی۔ ثروت نے سوئی ہوئی ماہین کو دیکھا۔ وہ سوتے ہوئے کتنی معصوم لگ رہی تھی۔ گہرے سانولے رنگ میں گھلی پیلاہٹ اور بھیگی جڑی پلکیں۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ خوش رکھے' جتنا دکھ تم نے اٹھایا ہے۔ اس سے بڑھ کر تمہیں خوشیاں ملیں۔"

ثروت نے دھیرے سے اس کے ماتھے کو بوسہ دیا تو وہ کسمسا کر کروٹ بدل کر دوبارہ سو گئی۔

☼ ☼ ☼

آج بھی وہ پارلر نہیں گئی تھی۔ رفعت نے سادگی سے اسے تیار کیا تھا۔ کیونکہ سادہ رکھنا اور کم میک اپ کرنا اس کی ہدایت تھی۔ اس کے باوجود وہ ثروت کو بہت پیاری لگ رہی تھی۔ کیونکہ اسے اس سے پیار تھا اور جس سے پیار ہوتا ہے' اس کی شکل و صورت یا عقل میں کمی نہیں دیکھی جاتی۔ اس کی ذات اور رشتہ زیادہ اہم ہوتا ہے۔ البتہ سارا اور میرب نے اسے دیکھ کر حسب توقع خوب تنقید کی تھی۔

"مائی گاڈ' ثروت! تم نے اسے پارلر نہیں بھیجا۔ اس کی حالت دیکھو' یہ... یہ دلہن ہے۔" سارا نے اسے سرتاپا دیکھ کر بے حد غصے میں کہا تھا۔

"ماہی... کم از کم میک اپ تو ڈھنگ سے کرنا تھا۔ توبہ... رفعت کے ہاتھوں مشق ستم بننے سے بہتر تھا کہ تم میرا انتظار کر لیتیں۔ نہ بیس لگائی ہے' نہ ہی فیس پاؤڈر۔' تمہارا رنگ تو اور بھی کالا کالا لگ رہا ہے۔"

میرب بھی تنقید کرنے میں اس سے بڑھ کر تھی۔

"کالا لگ رہا ہے تو بالکل ٹھیک ہے۔ میں جیسی ہوں' ٹھیک ہوں۔ مجھے نہ تو میک اپ کروانا ہے' نہ ہی بجنا سنورنا ہے۔"

ماہین نے دوبدو اسے جواب دیا تھا۔ وہ طنز سے ہنس کر کندھے اچکاتی باہر نکل گئی تھی اور سارا نے غصے سے اسے گھورا تھا۔

"اپنی حرکتیں صحیح کر لو۔ اپنا پاگل پن بھی درست کر لو' ورنہ دوسری بار اجڑ کر آئیں تو پھر تیسری دفعہ کوئی منہ نہیں لگائے گا۔"

سارا کے جملے نے اسے ساکت کر دیا تھا۔ کیسا بے رحم اور دل میں پیوست ہو جانے والا جملہ تھا' ماہین کے چہرے پر اذیت بھری چبھن پھیلی تھی۔ یہ ماں تھی جو بیٹی کو ایسی دعائیں دے رہی تھی۔

"ماں..." ماہین کے دل میں کچھ ٹوٹا تھا' اور آنکھیں لبالب بھر گئی تھیں۔ "اوفوہ ماما! جانے دیں' جب یہ خود ہی اپنی شکل سنوارنا نہیں چاہتی تو ہمیں کیا' بچپن سے ہی اس کی عادت ہے کہ یہ ہماری ہر بات کو انکار کرتی ہے۔ خواہ ہم اس کے بھلے کے لیے ہی کیوں نہ کہیں۔ اسے تو ہم سے خصوصی پرخاش ہے۔"

میرب نے منہ بنا کر اسے دیکھا' پھر دونوں ہی باہر نکل گئیں اور پھر رخصتی تک میرب اور سارا' ماہین کے قریب بھی نہیں آئی تھیں۔ رخصتی کے وقت بھی سارا نے بڑے رسمی سے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھا تھا اور میرب نے تو دو فٹ کے فاصلے سے خدا حافظ کہہ دیا تھا' البتہ رفعت اور ثروت دونوں کی آنکھوں سے چھاجوں برسات ہو رہی تھی۔ نواز اکرم نے بھی ڈبڈبائی آنکھوں سے بیٹی کو رخصت کیا تھا۔

"ماہی بیٹا! سنبھل کر میری جان' میری باتیں بھولنا مت۔ نئی جگہ' نئے لوگ ہیں' تمہیں بہت محتاط ہو کر اپنی زندگی کا یہ سفر شروع کرنا ہے۔ کوشش کرنا' احمد کو کبھی کسی شکایت کا موقع نہ دو۔" ثروت کی نصیحتیں آخری وقت تک جاری رہی تھیں۔ اب ماہین ان پر عمل کرتی ہے یا نہیں' یہ تو اسے یقین نہیں تھا بس' وہ دعا ہی کر سکتی تھی۔

"نواز! حوصلہ کرو' اور شکر کرو۔ خدا نے جتنا بڑا دکھ دیا تھا' اس سے بڑھ کر مداوا بھی کر دیا ہے۔"

رخصتی کے بعد وہ سب لاؤنج میں بیٹھے تھے۔ جب ثروت نے نواز کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا تھا۔ نواز کی آنکھیں اب بھی ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

"شکر ہے خدا کا..." نواز نے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ "بڑا کرم ہے اس مالک کا' میں کیا میری اوقات کیا۔ میں تو سمجھتا تھا' کاشف کے فرار کے بعد اب میری بیٹی شاید کبھی بھی دلہن نہیں بن سکے گی' مگر خدا کے بعد تمہارا شکر گزار ہوں ثروت! تمہاری مہربانی سے میری بیٹی کا گھر بسا ہے۔ اور آج شدت سے مجھے اپنی بے حسی کا دکھ بھی ہوا ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ اگر تب میں اباجی کے سامنے اسٹینڈ لیتا تو آج..."

"بس نواز بس..." ثروت کو لگا اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ یکدم اس کی بات کاٹ کر اپنے منہ پر ہاتھ رکھے وہاں سے بھاگی تھی۔ اور اپنے کمرے میں آکر بے تحاشا روئی تھی۔

"اب کیوں نواز! اب کیوں؟ تمہارے اس اعتراف نے میرے برسوں پرانے زخموں کو بے دردی سے ادھیڑ ڈالا ہے۔ میں نے تو نہ جانے کیا کیا تاویلیں دے کر خود کو سنبھالیا تھا' مگر تم نے تو کوئی راز رہنے ہی نہیں دیا۔" وہ اب خود سے بھی نظریں نہیں ملا سکتی تھی۔ سب کے سامنے نواز کا اعتراف اسے مزید شرمسار کر گیا تھا۔

"پھپھو پھپھو!" رفعت مسلسل دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی۔ اس نے جلدی سے اپنا چہرہ صاف کیا۔ وہ کیا بچوں کی طرح رونے لگی تھی۔ یکدم اسے احساس ہوا تو وہ جلدی سے دروازہ کھول کر باہر آگئی۔

"پھپھو! آپ... آپ ٹھیک ہیں نا؟" رفعت نے بے تابی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا تھا۔ وہ بے ساختہ مسکرائی۔ یہ لڑکی اسے ان چند دنوں میں ہی ماہی کی طرح عزیز ہو گئی تھی۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا! سب... سب لوگ..."

"چلے گئے۔ سارا آنٹی اور میرب تو اسی وقت چلی گئی تھیں۔ نواز انکل نے کچھ دیر آپ کے واپس آنے کا انتظار کیا' پھر وہ بھی چلے گئے۔ میں نے کہا بھی تھا کہ پھپھو کو بلا لیتی ہوں' مگر وہ بولے' نہیں رہنے دو۔ برسوں پرانے زخموں کی تکلیف اتنی آسانی سے کم نہیں ہوتی۔" رفعت کی بات پر اسے ایک بار پھر رونا آگیا تھا۔ اس نے بمشکل اپنے آنسو ضبط کیے۔

"آؤ... گھر کو سمیٹ لیں۔" گہرا سانس لے کر وہ اس کے ساتھ لاؤنج کی جانب چل دی تھی۔

☼ ☼ ☼

"وہ ماہین کے متوقع رد عمل کے بارے میں جیسا سوچ کر آیا تھا' شکر تھا کہ وہ سب نہیں ہوا تھا۔ سابقہ رویوں کے برعکس ماہین نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ جو گھونگھٹ اٹھاتے ہی دھنا دھن کی توقع کر رہا تھا' "سب خیریت ہے" کی صورت حال دیکھ کر خاصا مطمئن ہوا تھا۔

"آپ اپنا ڈریس بدل لیں۔ پھر ہم کھانا کھاتے ہیں۔" اس نے بڑے دھیمے نرم اور دوستانہ لہجے میں اسے کہا تھا۔ بالکل یوں جیسے وہ نہ جانے کب سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہوں' ماہین نے فوراً" اس کی بات پر عمل کیا تھا۔

"یا اللہ... یہ کیا ماجرا ہے۔ اتنی بڑی تبدیلی۔ اللہ خیر! یہ خاموشی کہیں کسی طوفان کی آمد کا اشارہ تو نہیں۔" وہ بیڈ پر آڑا لیٹا' دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھے سوچ رہا تھا کپڑے بدل کر سادہ کاٹن کے سوٹ میں وہ باہر آگئی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

"کیا کھاؤ گی؟"

ماہین نے چونک کر اسے دیکھا' پھر آہستہ سے نفی میں سر ہلا دیا۔ "کچھ نہیں۔"

"کیا؟ مجھے تو بھوک لگی ہے یار! تمہارے ہاں کھانا تو بہت مزیدار بنا ہوا تھا مگر میں شرماہٹ میں مارا گیا۔ شکر ہے ثروت آنٹی نے تمہارے لیے کھانا دیا تھا کہ تم نے کچھ نہیں کھایا۔ تمہارے کھانے میں سے میں بھی کچھ کھا سکتا ہوں؟"

اس نے بڑے ہی مسکین انداز میں اس سے پوچھا

تھا۔ ماہین بے ساختہ مسکرائی تھی۔
"آپ سارا کھالیں۔" اس نے آہستہ سے جواب دیا۔
"ارے واہ! جیو میری جان! تم تو بہت بڑے دل والی ہو' مگر میری ایک بات یاد رکھنا۔" اس نے چہرے کو خطرناک حد تک سنجیدہ بنا کر کہا تو ماہین نے ڈر کر اسے دیکھا۔
"جی...." اس کے لہجے میں کپکپاہٹ واضح تھی' احمد اٹھ کر اس کے قریب آگیا اور اس کا ہاتھ تھام کر اس کی طرف جھکا۔
"آئندہ..." وہ سنجیدہ لہجے میں کہتے کہتے رکا' ماہین کی سانس رک گئی۔
"مجھے یہ آفر کبھی مت دینا کہ آپ سارا کھانا کھالیں۔ تم بھوکی رہ جاؤ گی کیونکہ میں بہت زیادہ کھاتا ہوں۔"
احمد نے زبردست ڈرامائی سسپنس کے بعد یکدم جس طرح بے بس سے انداز میں کہا تھا' ماہین نے پہلے تو حیرت سے اسے دیکھا' پھر مسکرادی۔ اس کی یہ بے ساختہ معصوم سی ہنسی احمد کو بہت پیاری لگی۔ وہ اس کی تعریف کرنا چاہتا تھا۔ مگر خود کو کچھ بھی کہنے سے روک لیا تھا' وہ اس کے کچھ بہتر موڈ کو تعریف کرکے خراب کرنا نہیں چاہتا تھا' کیونکہ وہ اس تلخ تجربے سے گزر چکا تھا۔
"اوکے... خیر۔ ابھی تو ہم دونوں ہی بھوکے ہیں تو دونوں کھانا کھائیں گے۔ ٹھیک؟ چلو آؤ!" دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ اسے لے کر کمرے سے باہر آگیا۔ ڈائننگ ٹیبل پر پیک کھانا رکھا ہوا تھا۔ اس نے کھانا برتنوں میں ڈالا اور اوون میں رکھ دیا۔
"آپ کھڑی کیوں ہیں؟ بیٹھ جائیں نا۔" وہ کرسی کی پشت تھام کر کھڑی تھی اور اسے یہاں وہاں حرکت کرتے دیکھ رہی تھی۔
"آپ بیٹھیں! میں... کھانا لگاتی ہوں۔" اس نے پلیٹ اٹھائی۔
"ارے... ارے پلیز آپ... آپ کام نہ کریں۔ ابھی تو آپ کو یہاں میرے گھر میں آئے صرف ایک گھنٹا' سترہ منٹ اور پانچ سیکنڈ ہوئے ہیں اور آتے ہی گھر کے کام کرواؤں گا تو بابا جان مجھے بہت ڈانٹیں گے۔"
"وہ کہاں ہیں؟" ماہین یکدم چونکی۔ یہاں آنے کے فوراً بعد اس نے صرف چند منٹوں کے لیے انہیں دیکھا تھا' پھر احمد انہیں لے کر چلا گیا تھا اور وہ دوبارہ نظر نہیں آئے تھے۔
"اپنے کمرے میں۔ وہ بیمار رہتے ہیں نا۔ ان سے زیادہ دیر بیٹھا بھی نہیں جاتا' اسی لیے میں نے انہیں فوراً ان کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ وہ تو تمہارے ساتھ کچھ وقت اور بیٹھنا چاہتے تھے۔ مگر ان کے سینے میں درد بھی ہو رہا تھا۔"
"اوہ... اب وہ کیسے ہیں؟" اس نے فکرمندی سے پوچھا۔
"اب تو ٹھیک ہیں۔ سو رہے ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر ہی آرہا ہوں۔ آپ فکرمند نہ ہوں۔ آئیں۔"
احمد کو اس کے فکرمند انداز سے ایک طرح کا سکون ملا تھا کہ وہ گھر سے اور گھر کے معاملات سے اتنی لاتعلق بھی نہیں ہوگی۔
اس نے خود اس کی پلیٹ میں چاول ڈالے۔
"بس! نہیں نہیں میں اتنا نہیں کھا سکوں گی۔" وہ فوراً بولی تھی اور ساتھ ہی پلیٹ پیچھے ہٹالی تھی۔
"ارے بھئی تم! مت کھانا۔ میں کھالوں گا۔ دیکھو ایسے۔" دوسرے ہی پل اس نے ایک بڑا سا نوالہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا تھا۔ ماہین نے ایک نظر اسے دیکھا اور پھر مسکرا کر اپنے منہ میں بھی چمچ ڈال لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شکر ہے بھئی! ماہین کا بوجھ تو اترا۔ اب میں میرب کے سسرال والوں کو بھی ڈیٹ دے دوں گی۔" سارا علوی نے یوں کہا تھا جیسے اسی کے اوپر ماہین کا بوجھ تھا اور سارا کام اسی نے کیا ہو۔
"اتنی جلدی بھی کیا ہے سارا! میرب بھی چلی گئی تو

گھر بالکل خالی ہو جائے گا۔" نواز اس پل اسے یہ جتا سکتا تھا کہ ماہین کی شادی کی ساری تیاری تو ثروت نے کی تھی۔ اس کی رخصتی تک اس کے گھر سے ہوئی تھی تو پھر سارا پر کیا بوجھ۔ مگر وہ اس سے یہ نہیں کہہ سکا۔

"خالی ہوتا ہے تو ہو جائے۔ گھر کی رونق کے لیے بیٹی کو گھر میں تو نہیں رکھنا اور ویسے بھی مجھے لندن جانا ہے۔ اس لیے جتنی جلد میں ماہین کے فرض سے فارغ ہو جاؤں اچھا ہے۔"

"لندن؟ کس کے پاس؟ کس کے ساتھ؟" نواز اکرم بری طرح چونکا تھا۔

"عدیل کے پاس میں سوچ رہی ہوں' بزنس کو پاکستان سے نکال کر انٹرنیشنل لیول تک لے جایا جائے۔ میں نے عدیل سے بات کی ہے۔ وہ لندن میں بزنس رن کرتا ہے۔ ہمارے ساتھ بھی کام کرنے کو تیار ہے۔"

سارا کا پلان سن کر نواز کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ اسے بغیر بتائے وہ سب کچھ طے کیے بیٹھی تھی۔

"مگر تم نے مجھ سے تو کوئی ایسی بات نہیں کی۔ کم از کم پہلے مجھ سے تو مشورہ کر لیا ہوتا۔ اتنی بڑی بات تنہا ہی....."

نواز اکرم ہکلا گیا تھا۔ سارا بالا ہی بالا سارے کام کر لیتی تھی۔ اس کے باوجود کبھی نواز نے اسے نہیں جتایا تھا۔ وہ لاکھوں لٹاتی تھی اور جہاں چاہتی تھی' جاتی تھی۔ اس کے باوجود نواز نے کبھی اس سے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔

"بتا تو رہی ہوں تمہیں۔ میں کون سا جہاز پر چڑھ گئی ہوں۔ باقی تم سے مشورے کیا کرتی۔ تم تو کنوئیں کے مینڈک بنے ہوئے ہو۔ اتنے عرصے میں تو تم انٹرنیشنل لیول کے بزنس مین بن جاتے۔ مگر خیر اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ ہم اپنا ایکسپورٹ امپورٹ کا بزنس عدیل کے ساتھ مل کر کریں گے۔ تم دیکھنا۔ میں تمہیں کہاں لے جاتی ہوں۔"

سارا نے فخریہ لہجے میں یوں کہا تھا۔ جیسے اب تک وہی کاروبار کی الف ب نواز اکرم کو سکھاتی آئی ہو۔

"تم مجھے کہیں نہیں لے کر جاؤ گی۔ تم جہاں جانا چاہتی ہو' وہاں میں نہیں جانا چاہتا۔ عدیل علوی....." نواز اکرم نے دل میں سوچا۔

"تم پریشان کیوں ہو گئے ہو نواز؟ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ بس یہ میرب والا معاملہ بھی نبٹ جائے تو ہم دونوں اپنے بزنس کے لیے بہت کچھ سوچیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔" وہ اس کے محض ہم دونوں کہنے پر راضی ہو گیا تھا۔ بے چارہ نواز اکرم میری اک نظر کرم کا متلاشی۔ سارا مزید اکڑ گئی تھی۔

"او کے! میں ذرا عالیہ واسطی سے بات کر لوں۔" اس نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو نواز وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

"عدیل علوی' سارا کا کزن اور پرانا عاشق جس کے لندن جانے پر اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ اس سے جان چھوٹ گئی تھی اور اب سارا پھر سے اس سے رابطہ کرنا چاہ رہی تھی۔ تو کیا....." خوف کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔

"مگر اب اتنے عرصے بعد' کیا ستائیس سال بعد بھی سارا مجھے چھوڑ کر چلی جائے گی۔" اتنی طویل رفاقت کے بعد جدائی کا خیال بھی سوہان روح تھا اسے سارا سے بے تحاشا محبت تھی۔ بھلے سارا نے اس سے کبھی محبت کا دعوا نہیں کیا تھا' نہ ہی اس نے نواز اکرم کو کبھی محبوبہ بن کر دکھایا تھا۔ اس کے سرد انداز کے باوجود نواز اکرم اس کا وہ عاشق تھا جو اپنی نخریلی محبوبہ کے لیے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اب عدیل کے ذکر نے اس کے دل کو دہلا دیا تھا وہ گم صم سا بیٹھا تھا۔ جب اس کے موبائل کی بپ نے اسے چونکا دیا۔

"ایس پی تنویر جمال....." اس نے نام پڑھ کر ریسیور کان سے لگایا۔

"ہیلو۔ ایس پی صاحب! جناب کیسے ہیں آپ؟"

"بالکل ٹھیک نواز صاحب!" تنویر جمال کی آواز میں ایک کھنک سی تھی۔

"سر! میرے کام کا....." نواز کی بات درمیان میں ہی رہ گئی۔

"آپ کے کام کے سلسلے میں ہی میں نے فون کیا ہے۔ نواز صاحب! مبارک ہو' آپ کا مجرم پکڑا گیا ہے۔"

"کیا' کیا یعنی کاشف' کاشف پکڑا گیا؟" وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"جی ہاں! پکڑا گیا ہے۔ ہمارے اشتہار کی وجہ سے انعام کی لالچ میں وہ اپنے جس دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا' اسی نے اسے پکڑوا دیا۔"

"وہ..... اور وہ لڑکی' رانی جو اس کے ساتھ تھی؟"

"وہ نہیں ملی۔ وہ کہیں بھاگ گئی ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے اسی نے کاشف سے جان چھڑانے کو اسے پکڑوا دیا ہے۔ کیونکہ کاشف ہمیں بالکل خالی ہاتھ ملا ہے۔ اس کے پاس زیور' کپڑا' نقدی کچھ بھی نہیں تھا۔"

"خالی ہاتھ..... پھر وہ ساری دولت' فلیٹ کی لاکھوں مالیت کا پیسہ' وہ سب؟" نواز اکرم نے پریشانی سے پوچھا۔

"ہم تفتیش کر رہے ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ اس کے پاس ایک پائی بھی نہیں رہنے دیں گے۔ میں نے آپ کو اس لیے فون کیا تھا کہ اگر آپ اس سے ملنا چاہتے ہیں تو....."

"میں اس کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے نفرت ہے اس سے۔" نواز اکرم نے شدید نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے جناب!" ایس پی تنویر جمال نے گہری سانس لی۔

"بہت شکریہ ایس پی صاحب! آپ نے میرے زخموں پر مرہم لگا دیا ہے۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرنے خود آپ کے پاس آؤں گا۔ ان شاءاللہ۔"

نواز اکرم نے خوشی سے کپکپاتے لہجے میں کہا تو تنویر جمال نے قہقہہ لگا کر خدا حافظ کہا تھا۔

"کاشف۔" نواز نے دانت پیسے۔ "تجھے ساری عمر میں جیل میں رکھواؤں گا۔ تو نے میری بیٹی کے ساتھ جو کیا ہے' وہ ناقابل معافی ہے۔" اس نے غصے سے اپنی ہتھیلی پر مکا مارا۔

"کیا ہوا نواز! خیریت تو ہے؟ کس بات پر اتنا لال پیلے ہو رہے ہو؟" سارا نے کمرے میں آکر حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ بہت کم کسی بات پر غصہ میں آتا تھا' ورنہ وہ تو بقول سارا کے گلیشیر تھا۔

"سارا کاشف گرفتار ہو گیا ہے۔" اس نے خوشی سے کپکپاتے لہجے میں اسے اطلاع دی تو وہ بری طرح چونکی تھی۔

"کب؟ کہاں سے؟" اس نے بے ساختہ سوال کیے تھے۔

(باقی آئندہ ماہ)

سلویٰ علی بٹ

نماز مغرب کی ادائیگی کے بعد امام مسجد نے صرف قریبی رشتے دار کی موجودگی میں اس کا نکاح پڑھایا تھا۔ اس کا سسرال کوئی غیر نہیں ماموں کا ہی گھر تھا۔ اس کا ننھیال صرف اکلوتے ماموں پر مشتمل تھا۔ اس کی امی اور ماموں چونگے مونگے کے بہن' بھائی تھے' ددھیال میں البتہ جنجال پورہ — تھا' مگر اکثریت نے اس کی ڈیو قسم کی ماں کی اپنے بھائی کے گھر بیٹی بیاہنے کی دیدہ دلیری پہ اظہار ناراضگی کے طور پر خود ساختہ ناطقہ بندی کرلی تھی' چند ایک یوں ہی ساکت' منہ پھاڑے عالم مدہوشی میں تھے' باقی لوگوں کی اس شادی میں موجودگی محض تفریحاً" تھی۔ شادی بھی کیا؟ نہ کوئی ڈھولک' مہندی' غل غپاڑہ ہوا' نہ ابٹن اچھالی گئی۔ بینڈ باجے اور چھوہاروں کا تصور بھی محال تھا۔ اس سب کی وجہ دولہا اور دلہن تھے جو خود بھی بے چارے عالم استغراق میں گنگ تھے۔

بھئی' اتنی لمبی چوڑی تمہید کا قصہ مختصر یہ ہے کہ دولہا صاحب تقریباً" سولہ برس کے میٹرک کے رزلٹ کے کم اور اپنی شامت کے زیادہ منتظر تھے اور دلہن' دولہا سے پانچ سال..... جی پانچ سال چھوٹی نہیں' بڑی تھی۔ بی ایس سی کا رزلٹ آؤٹ ہوچکا تھا اور عمر اکیس برس۔ نکاح کے بعد کہیں پُرجوش اور کہیں سے مروتاً" مبارک سلامت کا شور گونجا تھا۔ اس کی ماں اور ممانی

ناولٹ

کی زیرک نگاہوں نے لوگوں کی چہ میگوئیاں اور ڈھکے چھپے طنزیہ تبصروں کے پیش نظر جلد ہی رخصتی کا کہہ دیا۔ ان دونوں کو ہی بڑی مشکلوں سے بہلا پھسلا کے اس بندھن میں باندھا گیا تھا۔ لوگوں کی بے رحم باتیں ان کا دل کھٹا بھی کر سکتی تھیں، حالانکہ یہ لوگ سب اپنے ہی تھے۔

یہ سسرال آج سے پہلے تک اس کا ننھیال تھا۔ ممانی کا میکا موجود تھا۔ وہ چند خواتین کے جھرمٹ میں گاڑی سے اتر کر دھیرے چلتی بیرونی گیٹ، ڈیوڑھی اور صحن پار کر کے ٹی وی لاؤنج میں آبیٹھی تھی۔

عشاء کی اذان ہو گئی تھی۔ ممانی نے جلدی جلدی مہمانوں کے لیے کھانے کا بندوبست کیا۔ جو اسی شہر کے تھے انہیں گھر لوٹنے کی پڑی تھی۔ تقریباً گھنٹہ بھر میں یہ گھر بھی مہمانوں سے خالی ہو تا گیا سوائے چند ایک کے۔

رات گیارہ بجے اسے یعنی کائنات عرف کایا کو اپنے شوہر یعنی کاشف عرف کاشی کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

آج سے پہلے یہ کمرا کاشی سے چھوٹے کامران عرف کامی کا اور اس کا مشترکہ تھا۔ وہ صرف دو ہی بھائی تھے، بہن کوئی نہیں تھی۔

اکیلی بیٹھی کایا نے سر اٹھا کے کمرے کا جائزہ لیا۔ کافی بدل چکی تھی۔ چھوٹی سی بک شیلف بھی غائب تھی۔ کارپٹ، پردے حتیٰ کہ جہازی سائز بیڈ بھی موجود تھا۔ وہ جہیز نہیں لائی تھی۔ یہ سب ماموں نے اس کے لیے سیٹ کیا تھا۔ اسے بے اختیار اپنی قسمت پہ رشک اور اپنے ماموں، ممانی پر پیار آیا۔ ڈریسنگ ٹیبل اور صوفہ سیٹ تک کمرے میں موجود تھے۔ کبھی وہ اس گھر اور خاص طور پر اس کمرے میں بہت استحقاق اور رعب سے آیا کرتی تھی۔ اب اسے عجیب سی گھبراہٹ گھیرے ہوئے تھی۔ وہ خود بھی اپنی اس کیفیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ لڑکیوں کے اس رات کے لیے بہت سے خواب ہوتے ہیں، مگر اس کی پلکوں کے کنارے کوئی خواب نہیں ٹھہرا تھا۔ آخر وہ ایک سولہ سال کے لڑکے سے کیا خواب وابستہ کرتی۔ اس کمرے میں وہ ہزاروں بار بڑے رعب اور دبدبے سے آئی تھی، مگر اب وہ خود کو ایک کمزور سی لڑکی محسوس کر رہی تھی۔

"دیکھو اب جلدی سے اندر چلے جاؤ، ورنہ میں ماما کو بلا لوں گا۔" اس سے دو برس چھوٹے کامی نے اسے دھمکی دی۔

ساجدہ نے اسے کام نبٹاتے ہوئے اندر جانے کا کہا تھا۔ وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے کامی کو ساتھ لے آیا اور اب دروازے کے باہر کھڑا تذبذب کا شکار تھا۔

"شکر ہے کہ میرے میٹرک کے پیپرز ہو گئے، ورنہ وہ یقیناً" مجھے الجبرا کروانے بیٹھ جاتی۔" کاشی نے اس کی سابقہ کارکردگی یاد کرتے ہوئے جل کر کہا۔ وہ اندر جانے سے ہچکچا رہا تھا۔ ہزار منتیں کامی کی کر ڈالی تھیں کہ آج رات اپنے کمرے میں چھپا لو، مگر اس نے ایک نہ مانی اور اسے ماما، پاپا کی دھمکیاں دیتا، دھکیلتا ہوا دروازے تک بمشکل لایا تھا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔" روہانسی سی شکل بنائے وہ آہستگی سے بولا۔ کامی نے دانت کچکچا کے اسے دیکھا تھا۔

"اچھا اچھا میں جا رہا ہوں، مگر تم یہیں کھڑے رہنا، جیسے ہی اندر سے بمباری کی آواز آئے فوراً" آجانا۔" وہ کامی کے چہرے سے اندازہ لگا سکتا تھا کہ عنقریب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے والا ہے۔

"یادحشت۔" کامی نے اپنے سر کے بال نوچ ڈالے۔ اس بے چارے کا بھی قصور نہیں تھا۔ کایا جب بھی ان کے گھر آتی، ان کے ساتھ کھیلنے یا ممانی سے گپ شپ لگانے کے بجائے انہیں پڑھانے بیٹھ جاتی۔ ان دونوں کی اچھی خاصی کلاس ہوتی۔ اس قدر انہماک سے پڑھاتی جیسے ابھی ساری کتابیں رٹوا کے ہی جان چھوڑے گی۔ وہ خود بھی پڑھائی میں اچھی تھی اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ اس کے ماموں کے بیدو لاڈلے سپوت تعلیم حاصل کریں۔ کامی تو پھر بھی

پڑھائی میں ٹھیک تھا، مگر کاشی... وہ تو کتابوں والی دکان کے پاس سے بھی نہیں گزرتا تھا۔ بقول اس کے مجھے "بکس فوبیا" ہے۔ کایا اپنے گھر میں بھی اور ننھیال میں بھی سب سے بڑی تھی۔ ان پر تو اس کی خاص نظر التفات رہتی تھی۔ کان مروڑنے اور کمر پہ ہاتھ جڑنے سے بھی نہیں چوکتی تھی۔ وہ اس سے خاصا دبتے تھے۔ اب بھی یہ ہی ڈر اس کے اعصاب پہ سوار تھا۔

بالآخر وہ ڈرتے ڈرتے اندر داخل ہوا تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے دروازہ مقفل کر کے مڑا اور اس جھکے سر والی کو دیکھا۔ جو اپنی طبیعت کے برعکس خاموش تھی۔ خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر کر تھوک نگلا۔ ہاتھ میں پکڑا کیس ہلا کر اس میں موجود شے کو محسوس کیا کہ کہیں کامی شرارت سے منہ دکھائی نہ اڑا لے گیا ہو۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا بیڈ کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"وہ... ما... ماما نے دیا... تھا، آپ کو دوں۔" بے ربط الفاظ کے ساتھ کیس اس کی طرف بڑھایا۔ ساتھ ہی وضاحت بھی کر دی۔ اس کے ہاتھ کی ہلکی سی لرزش کایا سے چھپی نہ رہ سکی۔ اس نے جھکا سر قدرے اٹھایا اور ڈبیا کھول کے دیکھنے لگی۔

تب ہی کاشی کی نظریں اس پہ جم سی گئیں تھیں۔ اس نے کبھی اسے میک اپ میں نہیں دیکھا تھا۔ آج وہ سولہ سنگھار کیے ہوئے تھی۔ ہر انداز ہی نرالا تھا۔ کیس کے اندر سونے کی چار چوڑیاں تھیں۔ وہ بے اختیار ہی چوڑیاں پہننے لگی۔

"وہ... ماما نے کہا تھا کہ خود پہنانا۔" بروقت ہی اسے ماں کی نصیحت یاد آگئی۔

"ماما نے یہ نہیں بتایا کہ تحفہ دینے سے قبل کچھ کہا بھی جاتا ہے؟" اس نے لہجہ کافی معنی خیز بنا کے پوچھا۔ اس بدھو کے لیے حیا کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

"کک... کک... کیا کہا جاتا ہے؟" کاشی کی جان ہی نکل گئی۔ وہ غیر ارادی طور پر تھوڑا سا پیچھے ہٹا۔

"اتنے بھولے مت بنو، بس اب جلدی سے شروع ہو جاؤ۔" کاشی کے حواس اڑے، چہرے سے وہ حظ اٹھا رہی تھی۔ چلو کسی طرح تو اس رات کو یادگار بنانا تھا۔

سارا قصور کاشی کا تھا۔ اسے رٹو طوطے کی طرح باور کروایا گیا تھا کہ ڈرنے کی بالکل ضرورت نہیں، وہ اب تمہاری بیوی ہے، ذرا مرد بنو۔ اس وقت پڑھائے گئے سارے سبق اسے بھول چکے تھے۔

"کیا کہوں؟" حلق سے پھنسی پھنسی آواز برآمد ہوئی۔

"وہ ہی جو سب کہتے ہیں، ٹی وی نہیں دیکھتے۔" اگلا جملہ کافی رازدرانہ انداز میں پوچھا گیا۔

"ق... ق... قسم لے لو، میں مووِیز نہیں دیکھتا۔" وہ اب واقعی رو دینے کو تھا۔ کایا سے ہنسی روکنا مشکل ہو گیا۔ وہ بے اختیار ہنستی چلی گئی۔ اس کے اوسان بھی ذرا بحال ہوئے تھے۔

"یار منہ دکھائی دینے سے پہلے تعریف کرتے ہیں،"

یہ تو بتادو میں کیسی لگ رہی ہوں۔" وہ نظروں میں شرارت لیے اسے دیکھ رہی تھی۔

"سیدھی طرح کہونا' ایویں میری جان نکال رہی تھی' تعریف ابھی کردیتا ہوں۔" وہ حوصلہ پاکرذرا قریب ہوا۔

"صرف تعریف...."

"کایا...." وہ روہانسا ساہوکر اٹھ کھڑا ہوا' اور کایا منہ پرہاتھ رکھے ہنستی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

نواز کریم انتہائی شریف اور کم گو آدمی تھے۔ ساجدہ ان کی زوجہ محترمہ اور دو بیٹے کاشی اور کامی تھے۔ ان کی صرف ایک ہمشیرہ خدیجہ تھیں جو کایا کی والدہ تھیں۔ کایا کی ایک چھوٹی بہن ماریہ اور اس سے چھوٹا بھائی تھا۔ نواز کریم کے والدین بھلے وقتوں میں ہی اپنی گاؤں کی زمین بیچ کر شہر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہیں گاؤں کا ماحول اور کچے مکان پسند نہیں تھے۔ نواز کریم کا ڈبل اسٹوری خوب صورت گھر ان کے ماں' باپ کی ہی نشانی تھا۔ خود وہ زیادہ تعلیم حاصل نہ کرسکے تھے' سو انہیں کہیں جاب نہ مل سکی۔ بالآخر نواز کریم نے الیکٹرک کا کام سیکھنا شروع کیا اور اس میں کمال حاصل کرلیا۔ والد کا بنایا ہوا خوب صورت سا گھر تھا۔ بھائی کوئی تھا نہیں کہ بٹوارے کا مسئلہ کھڑا ہوتا' بہن شادی شدہ تھی۔ انہوں نے اپنی الیکٹرک کی دکان کھول لی تو والدان پر شادی کے لیے زور دینے لگے۔ ساجدہ سے شادی سو فیصد ان کے والدین کی پسند اور رضامندی سے ہوئی۔ شادی کے تین سال بعد ان کی والدہ اور ساڑھے چار سال بعد والد صاحب آگے پیچھے چل بسے۔ تب نواز کریم کو اس دنیا میں اپنے واحد رہ جانے والے خون کے رشتے کا احساس ہوا۔ خدیجہ' ان کی بہن انٹر پاس تھیں۔ بیس سال کی عمر میں ہی اپنے گھر کی ہوچکی تھیں۔ نواز کریم ویسے بھی بڑے کم گو اور فرماں بردار اولاد تھے۔ والدین نے اکلوتا ہونے کی وجہ سے نہ کبھی گھر کا بوجھ ان پہ ڈالا' نہ رشتوں کا۔ وہ گھر اور باہر کی بہت سی پریشانیاں ان کے علم میں لائے بغیر ہی سلجھالیا کرتے تھے۔ انہیں کبھی پتا ہی نہ چل سکا کہ ان کی اکلوتی بہن اپنی گھریلو زندگی کے کن مسائل سے دوچار ہے۔ خدیجہ کے پاس ماں' باپ کے بعد یہ ہی ایک بھائی واحد سہارا تھا۔ وہ اپنا دکھ درد اور کس سے کہتیں۔ رفتہ رفتہ سب کھلتا گیا' خدیجہ کے شوہر کا نکھٹوپن' بھرا پرا سسرال' طعنے تشنے غرضیکہ چاروں اور مسائل۔

پہلے ماں' باپ تسلی دلاسوں کے ساتھ نقد مدد بھی کیا کرتے تھے' پھر بھائی نے یہ فریضہ سنبھال لیا۔ ماں' باپ کی بات اور تھی۔ خدیجہ بھائی سے لیتے ہوئے جھجکتی تھیں۔ حالانکہ ساجدہ بھابھی بہت اچھی اور ملنسار تھیں۔ وہ اپنی نند کی مجبوریوں کو سمجھتی تھیں۔ اس نے کبھی برا منایا' نہ ہی شوہر کو دینے دلانے سے منع کیا۔

کائنات شروع سے ماں کی رازدار اور سہارا تھی۔ اس سے چھوٹی ماریہ اور اس کی عمر میں آٹھ برس کا فاصلہ تھا۔ ان دونوں کے درمیان خدیجہ کا ایک بیٹا اور بیٹی پیدا ہوتے ہی دم توڑ گئے تھے۔ کائنات پڑھائی میں اچھی تھی۔ میٹرک کے بعد ٹیوشنز پڑھا پڑھا کے اس نے اپنا بی ایس سی مکمل کیا تھا۔ اس کا جاب کرنے کا ارادہ تھا۔ اس کے پھپھا جان ایک پرائیویٹ کمپنی میں جنرل مینیجر تھے۔ انہوں نے اسے نوکری دلوانے کا وعدہ کرر کھا تھا' مگر اس کے تایا نے اپنے رنڈوے بیٹے کے لیے اس کا رشتہ مانگ لیا۔ اس کا اپنی پہلی شادی سے ایک بیٹا تھا۔ دوسری دفعہ زچگی کے دوران بیوی اور بچہ دونوں ہی جانبر نہ ہوسکے' جس کی شاید بڑی وجہ اس کا ہر وقت بیوی پر چیخنا چلانا' مارنا پیٹنا اور اس بے چاری کا ڈپریشن تھا۔ باپ کو تو یہ رشتہ غنیمت لگ رہا تھا۔ اس کی نظر میں جوان بیٹی بوجھ تھی۔

"نواز بھائی نے کئی برسوں سے کائنات کو اپنے بڑے بیٹے کے لیے مانگ رکھا ہے۔" انہوں نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

اندر کمرے میں بیٹھی ماں' باپ کی گفتگو با آسانی سنتی کائنات کے اوسان خطا ہوگئے۔

"اچھا' تم نے کبھی ذکر نہیں کیا۔" تیکھے چتونوں سے پوچھا گیا۔

"کاشف عمر میں چھوٹا ہے' اسی لیے میں ٹال مٹول کرتی رہی' مگر اب تو اس نے ماشاءاللہ سے بہت قد کاٹھ نکال لیا ہے۔ کائنات سے بھی بڑا لگتا ہے' پھر مردوں کی عمر کا کیا ہے' مجھے اپنی بیٹی کا سکھ دیکھنا ہے' جبکہ بھابھی اور بھائی جان کی بھی یہ ہی خوشی ہے۔ اتنا بڑا گھر' کاروبار' لمبا چوڑا خاندان بھی نہیں۔ ہماری بیٹی وہاں خوش رہے گی۔" خدیجہ نے حتی الامکان خود کو نرم رکھا تھا۔

کائنات کی ماں ہونے کے ناتے بیٹی کے حق میں چیخنا چلانا' پرزور انکار کرنا خود ان کے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔

"بس لڑکا چھوٹا ہے اور.... اور کوئی خامی نہیں اس رشتے میں۔ تمہارے بھائی اور بھابھی بھی اچھے لوگ ہیں۔ زیادہ جھنجٹ بھی نہیں۔ اپنے بھائی سے کہو مجھ سے بات کرے۔" وہ بڑے پرسوچ انداز میں کہہ رہے تھے۔

خدیجہ کے ہاتھ پیر خوشی سے پھول گئے۔ اسے یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس شخص نے کبھی اس کی کوئی بات مانی ہو۔ خدیجہ کے دل و دماغ سے بوجھ سا اتر گیا۔

"ہاں' ہاں' آپ کائنات کے باپ ہیں' بھائی صاحب کو آپ ہی سے بات کرنی چاہیے۔" وہ مزید پرجوش ہوئیں۔

اگلے ہی روز وہ نواز کریم کے سامنے ہاتھ جوڑے روتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"بھائی جان! آپ کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ آپ کے ہی دیے پر میرا گھر بسا ہوا ہے۔ میرے جو حالات ہیں آپ سے ڈھکے چھپے نہیں۔ آپ نے ایک بھائی ہونے کے ناتے ہمیشہ مجھے ہر سرد و گرم سے بچانے کی کوشش کی۔ آج میری کائنات کی پوری عمر کا سوال ہے۔ بھائی جان! اسے بھی آپ ہی بچاسکتے ہیں۔ میری کائنات کا تو بھائی بھی ابھی بہت چھوٹا ہے۔ اس کا سہارا کون بنے گا؟ میری بیٹی کو دوسری خدیجہ بننے سے بچالیں بھائی جان!"

انہیں ساری روداد سنا کر وہ روتے ہوئے التجا کر رہی تھیں۔ نواز کریم نے دکھ سے بیوی کو دیکھا اور اس نے شوہر کو۔ اسی لمحے فیصلہ ہوگیا۔ ساجدہ اٹھیں اور انہوں نے نند کے جڑے ہوئے ہاتھ تھام لیے۔

☼ ☼ ☼

اس نے سلیقے سے بالوں کو بینڈ میں جکڑا اور بیگ اٹھا کر باہر آگئی۔ ٹی وی لاؤنج میں کاشی فون اسٹینڈ کے قریب ہی کھڑا پچھلے پانچ منٹ سے ہولڈ پر تھا۔ اس کا رزلٹ آؤٹ ہوچکا تھا اور وہ اپنے اسکول کال کرکے رزلٹ کا ہی پوچھ رہا تھا۔ اس نے ایک نظر کاشی اور پھر وال کلاک کو دیکھا۔ نو بج چکے تھے۔ اس کی آفس وین آنے والی تھی۔ نوکری کی اجازت اس نے شادی سے قبل ہی ماموں سے لے لی تھی۔ انہیں اس کے نوکری کرنے پہ "قطعاً" اعتراض نہیں تھا۔ شادی کے بیس روز بعد اس نے سب کی اجازت سے آفس جوائن کرلیا تھا۔ اسی وقت باہر وین کا ہارن بجا۔

"جی سر' یہ ہی رول نمبر ہے۔ نام بھی یہ ہی ہے۔" کاشی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے سے روکا۔

"کیا کہا سر' اور.... اور ڈویژن؟" اس کے چہرے پہ خوشیوں کے رنگ بکھر گئے۔ کایا نے بے اختیار خدا کا شکریہ ادا کیا ورنہ اس کی کارکردگی سے وہ بخوبی آگاہ تھی۔

"تھینک یو سر۔" وہ فون رکھ کے پلٹا۔

"کایا میں پاس ہوگیا۔" اس نے کایا کو پکڑ کے جھنجوڑ ڈالا۔

"ہاں' ہاں میں نے سن لیا۔ ڈویژن کون سی ہے؟" اس کی آنکھوں اور چہرے سے بھی خوشی عیاں تھی۔

"تھرڈ ڈویژن.... میں ابھی ماما' پاپا کو بتاکر آتا ہوں۔" وہ اسے پرے ہٹاتا اندر بھاگ گیا۔

"تھرڈ ڈویژن۔" وہ زیر لب بڑبڑاتی سر پہ دوپٹہ

جمانے لگی۔ اس کے ساتھ جو بھی ہوا تھا اس نے سمجھوتا کر لیا تھا۔ قسمت کے ساتھ لڑا نہیں جاتا' سمجھوتا کیا جاتا ہے' لیکن کاشی کے لیے وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی سمجھوتا کرنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اس کا مستقبل سنوارنا چاہتی تھی۔ اپنی عمر کے لڑکوں کی طرح وہ بھی غیر سنجیدہ اور کھلنڈرا سا تھا۔ ابھی اسے جینے کا ڈھنگ سکھانا تھا۔ اس نے اس کے مستقبل کے لیے بہت سے منصوبے بنا لیے تھے۔ مگر اس کے رزلٹ نے اسے مایوس سا کر دیا۔

شام کو پھر سے رزلٹ کا ذکر چھڑ گیا۔ ماموں کی کیفیت بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ انہیں بھی اس کے اتنے کم نمبر آنے پر افسوس تھا۔

"پرائیوٹ اسکول کی اتنی زیادہ فیس بھری اور ٹیوشن کی الگ۔"

"بس کریں آپ بھی نا.... شکر کریں پاس ہو گیا ہے۔ اس کی کلاس کے کتنے ہی لڑکوں کی سپلی آئی ہے۔" ساجدہ بیگم نے بیزاری سے بات کاٹ دی۔ ویسے بھی وہ اسے اب شادی شدہ ہونے کی وجہ سے رعایت دیتی رہتی تھیں۔

"خیر چھوڑو.... برخوردار! آگے کیا ارادے ہیں؟" نواز صاحب نے بیوی کا خراب ہوتا موڈ دیکھ کر بات بدل دی۔

"میں؟" وہ کامی سے ریموٹ چھیننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ فوراً" رخ موڑ کر متوجہ ہو گیا۔ "میں نے بتا تو دیا تھا کہ آپ کے ساتھ دکان پہ جاؤں گا۔"

اس خبر سے جہاں نواز صاحب نے سکون کا سانس لیا' وہیں کایا اپنی جگہ بے چین ہو گئی۔

"مگر ماموں جان! کاشی کو آگے پڑھنا ہے۔" اس نے جلدی سے مداخلت کی تھی۔ اسے ان دونوں کے ارادوں کی خبر نہیں تھی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ مجھے پڑھنا ہے؟" کاشی نے فوراً" تنک کر پوچھا۔

اسے اس وقت کایا کی مداخلت بہت بری لگی تھی۔ اتنی مشکل سے تو پڑھائی سے جان چھوٹی تھی۔

"دیکھو! ایک تو اس کے نمبر اتنے کم آئے ہیں' پھر اسے پڑھنے کی بھی بالکل لگن نہیں۔ ٹائم اور پیسہ برباد کرتا ہے۔ اسے میرے ساتھ کام ہی کرنا چاہیے' کیونکہ اب تم بھی اس کی ذمہ داری ہو۔" انہوں نے بڑی نرمی سے صورت حال واضح کی۔

"ماموں! آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک کاشی کسی قابل نہیں ہو جاتا' میں آپ پہ بھاری نہیں ہوں۔" سر جھکائے آنکھوں میں آنے والی نمی کو زبردستی روکا تھا۔

"بات تمہارے بھاری ہونے کی نہیں ہے بیٹا! اس نے رو دھو کے میٹرک کلیئر کیا ہے۔ میں مزید خرچے برداشت نہیں کر سکتا' جبکہ رزلٹ بھی تقریباً" زیرو۔" ان کا موقف بھی درست تھا۔

"آئی ڈونٹ نو بابا مجھ سے کیوں خوش نہیں ہوتے؟ حالانکہ میں نے 8th میں "D" گریڈ لیا تھا۔ اب تو کافی بہتری آئی ہے۔" اس نے باپ کے منہ سے اپنی "عزت افزائی" سن کے کامی کے کان میں سرگوشی کی۔

"پلیز ماموں! آپ اس کے پڑھائی کے خرچے کی فکر نہ کریں۔ میں بھی جاب کر رہی ہوں۔ صرف مجھے ایک موقع دیں۔ میں اس کا سارا خرچ اٹھالوں گی۔ آپ بس اجازت دے دیں۔" اس نے بولتے ہوئے ذرا پیچھے ہو کے بیٹھے کاشی کی مسلسل کھسر پھسر پہ اسے زور سے کہنی ماری۔

"ہمارے دو ہی تو بیٹے ہیں۔ میں خود اپنے بیٹوں کو بہت قابل دیکھنا چاہتی ہوں۔ اب کایا بھی ہے' دھیان دے گی۔" ساجدہ بیگم نے بھی اس کی طرف داری کی' جبکہ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں اور حیرت سے کھلا منہ لیے سب کو تک رہا تھا۔

"میں بھلا اس کا برا کیوں چاہوں گا؟ اب کائنات کے پیش نظر میں اسے رعایت دے رہا ہوں' ورنہ یہ اس قابل نہیں ہے۔ تم بھی بیٹی! ایک بار پھر سوچ لو یہ نہ ہو ساری محنت اور پیسہ برباد ہی جائے۔"

"کوئی مجھ سے کیوں نہیں پوچھتا؟ مجھے نہیں پڑھنا۔" وہ غصے سے کہتے ہوئے تیزی سے کمرے میں

چلا گیا۔

"تم فکر نہیں کرو۔ میں اس سے نبٹ لوں گا۔" انہوں نے کایا کا پریشان چہرہ دیکھ کر تسلی دی تھی۔

☼ ☼ ☼

اس نے شام کی چائے کے ساتھ کٹلس اور سموسے بنائے تھے۔ وہ جب سے گھر آئی تھی' کاشی غائب تھا۔ صبح بھی کاشی اور اس کی کافی بحث ہوئی تھی۔ ممانی نے بتایا تھا کہ کسی دوست کی طرف جانے کا کہہ کر گیا ہے۔ اس کی پریشان نگاہیں دروازے پر ٹک گئی تھیں۔ ممانی سے بار بار پوچھنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"پلیز کایا! اب لے بھی آؤ۔ بہت بھوک لگ رہی ہے۔" کامی نے تیسری بار کچن میں آکے دہائی دی۔

وہ جلدی سے چائے پیالیوں میں ڈال کر ٹرے اٹھائے باہر آگئی' جہاں ساجدہ بیگم اور کامی اس کے منتظر تھے۔ اسی پل کاشی بھی اندر داخل ہوا۔ سیٹی بجاتا ہشاش بشاش چہرہ لیے۔

"کہاں سے آرہے ہو؟" اس نے غصہ دبایا تھا۔

"فرینڈ کی طرف گیا تھا' خوشی کی خبر ہے۔" دھم سے کامی کے برابر بیٹھتے پورا کٹلس اٹھا کے منہ میں رکھ لیا۔

"کیوں تمہارا دوست بھی شادی شدہ ہو گیا؟" کامی نے فوراً" اس کی ٹانگ کھینچی' کیونکہ اس کے بہت سے دوست نہیں جانتے تھے کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔

"کیسی خوش خبری؟" کایا نے ناگواری سے پوچھا۔

"میرے دوست نے بتایا ہے کہ کسی بھی گورنمنٹ کالج کی میرٹ لسٹ پہ تھرڈ ڈویژن والوں کے لیے جگہ نہیں' سو تم مجھے آئی کام کروانے کا خواب دیکھنا چھوڑ دو' البتہ آرٹس کے سمپل مضمون رکھنے کا مطلب وقت اور پیسہ دونوں کا ضیاع۔" چائے کا گھونٹ بھر کے ایک کھوجتی نظر کایا پہ ڈالی۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں تمہارا ایڈمیشن گورنمنٹ کالج میں کرواؤں گی۔" اس کا خوشی سے دمکتا چہرہ یک دم پھیکا پڑ گیا۔

"مطلب؟" اس نے بھنویں اچکائیں۔

"مطلب یہ کہ میں نے پرائیوٹ کالج کا پراسپیکٹس منگوالیا ہے۔ فارم بھر دینا' اندر بیڈ روم میں سینٹر ٹیبل پہ رکھا ہے۔" اس نے بڑے اطمینان سے اس کا سکون غارت کیا۔ کاشی کا جی چاہا' چائے کا کپ دیوار پہ دے مارے۔

☼ ☼ ☼

وہ آج آفس سے آدھی چھٹی لے کر اس کے ساتھ کالج آئی تھی۔ فارم اس نے اپنی کولیگ سے منگوایا تھا' کیونکہ اس کا بھائی بھی اسی کالج میں ایڈمیشن لے رہا تھا۔ آج وہ باقاعدہ ساری تفصیل معلوم کرنے آئی تھی۔ ہیڈ کلرک کے آفس آگئی۔

"اتنے کم نمبروں میں آئی کام میں ایڈمیشن نہیں مل سکتا۔" کلرک نے رزلٹ کارڈ اور مارکس شیٹ دیکھتے پرسوچ انداز میں کہا۔

"اسی لیے سر! ہم آپ کے پاس آئے ہیں۔ آئی نو' پرائیوٹ کالجز میں مارکس کی اتنی امپورٹنس نہیں ہوتی۔" اس نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر صاف کہہ دیا۔

"اصل میں اتنے ٹف سبجیکٹ پڑھنا آسان نہیں' پھر اس کی سابقہ کارکردگی.... خیر!" اس نے تقریباً" نیم رضامندی دے دی۔

"شاباش' شاباش۔" کاشی نے دل ہی دل میں کلرک کو داد دی۔ اس جھنجٹ سے بچنے کی موہوم سی امید نظر آئی تھی۔

"چلیں جی! فیس کے معاملات طے کر لیں۔" اس نے دراز کھینچ کے رجسٹر نکالا۔ "پینتیس ہزار سالانہ فیس ہے ہمارے کالج کی۔"

کایا کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ اسے صرف یہ پتا تھا کہ یہ اچھا اور مہنگا کالج ہے' مگر اتنا مہنگا ہو گا یہ نہیں جانتی تھی۔ اس نے ست ہاتھوں سے سلپ پکڑی۔ کاشی نے ترچھی نظر اس پہ ڈالی۔ خود پہ یکایک حاوی ہونے والی خوشی کو چھپاتے ہوئے نارمل ہو گیا۔ وہ دل

میں بے شمار دعائیں مانگ رہا تھا کہ بات نہ ہی بنے۔

"اس کے علاوہ رجسٹریشن کے تین ہزار الگ سے ہوں گے اور جو سمسٹر اور ویکلی' منتھلی (ہفتہ' ماہانہ) ٹیسٹ وغیرہ لیتے ہیں ان کی شیٹس اور کچھ اوپری خرچ ڈال کے تین ہزار یہ بھی ہوں گے۔ کل ہوئے اکتالیس ہزار۔"

کلرک تیزی سے چارجز کی لسٹ بنا رہا تھا۔

"لو جی' ایک چیز رہ ہی گئی۔" اس کو لسٹ پکڑاتے ہی اس نے دوبارہ کھینچ لی۔

"یہ میں نے دس ہزار ڈونیشن کے بھی لکھ دیے ہیں۔" اب وہ تسلی سے قلم رکھ کے اس کی طرف متوجہ تھا۔

"دس ہزار ڈونیشن۔" صدمے سے بے حال اس سے بولا نہیں جا رہا تھا۔

"ہاں جی' تھرڈ ڈویژن وہ بھی جسٹ پاسنگ مارکس سے لی گئی' ہمارے پاس جگہ ہی نہیں تھی۔ ایسے اسٹوڈنٹ کو فٹ کرنے کے لیے ہم ڈونیشن لیتے ہیں' آخر ہمیں بھی خرچے نکالنے ہیں کہ نہیں۔" وہ نہایت پیشہ ورانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔

"جی! میں پھر رابطہ کروں گی۔" اس سے مزید بیٹھنا دوبھر ہو گیا تھا۔

"زبردست جھٹکے لگے ہیں۔ بڑے ہی زبردست۔" کاشی نے اپنے برابر چلتی پژمردہ سی کایا کو دیکھ کے سوچا۔ وہ اس کی حالت سے بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

"بڑی آئی میرا خرچہ اٹھانے والی۔" بھرپور مسکراہٹ لبوں پہ لیے اس نے بائیک اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

اس نے کاشی کو منع کر دیا تھا کہ گھر جا کے کچھ نہ بتائے۔ اسے کیا ضرورت پڑی تھی کہ ڈھنڈورا پیٹتا۔ اس کی تنخواہ اتنی تھی کہ وہ باآسانی اس کے تمام اخراجات اٹھا سکتی تھی' مگر اس کا ارادہ خود ایم ایس سی کرنے کا بھی تھا۔ اب اگر وہ اس کے کالج اور ٹیوشن کی تمام ذمہ داری اٹھا لیتی تو اسے اپنی پڑھائی چھوڑنا پڑتی۔

آخری تاریخ میں صرف پانچ روز تھے۔ اس نے فیصلہ کر کے کالج فون کیا اور پرنسپل سے اگلے روز کا وقت لے لیا۔ کاشی پوری طرح مطمئن و مسرور تھا اور چند روز مزید چھٹیاں گزارنے کے بعد پاپا کے ساتھ دکان پہ جانے کا پکا ارادہ تھا۔

☼ ☼ ☼

نواز کریم دوپہر میں ہی گھر آ گئے اور اب بچوں کے ساتھ ٹی وی لاؤنج میں براجمان تھے۔ وہ دونوں بھائی' باپ کی موجودگی کے لحاظ میں بڑے باادب ٹی وی کی طرف متوجہ تھے۔ کایا کافی لیٹ ہو گئی تھی۔ ساجدہ بیگم نے شام کی چائے خود ہی بنا لی۔ باہر بیل ہوئی' کامی فوراً" اٹھ کے گیا۔

"کہاں رہ گئی تھی بیٹی! ہم پریشان ہو رہے تھے۔" سب سے پہلے نواز کریم بولے۔

"ماموں جان بازار تک گئی تھی۔" وہ ان کے برابر ہی بیٹھ گئی۔ تھکن اس کے وجود سے عیاں تھی۔ کاشی نے ایک نظر میں بھانپ لیا۔

"یہ لو کاشی!" اس نے ایک بھاری بھرکم بیگ اس کی طرف بڑھایا۔

"کیا ہے یہ؟" ماں نے تجسس سے پوچھا۔

"آئی کام کی بکس ہیں۔ یہ ہی لینے گئی تھی۔" کاشی کو لگا منوں بوجھ اٹھا لیا ہو۔ اس نے ایک شکایتی نظر کایا پہ ڈالی۔

"ماموں! آپ کل دکان پہ جا کے بائیک ملازم کے ہاتھ بھجوا دیجئے گا۔ کاشی اپنا یونیفارم خرید لائے۔" نواز کریم ان دونوں کو اپنی بائیک دینے کے کبھی روادار نہیں ہوتے تھے۔ جب بھی ضرورت پڑتی تو وہ سفارش کر کے لیتی تھی۔

"ٹھیک ہے۔" انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ ریموٹ کامی کو پکڑا کے بیگ تھامے مرے مرے قدموں سے کمرے میں چلا گیا۔

اگلے دو دن اس نے بہت خاموشی سے کاٹے۔ وہ اپنی ساری خریداری کر آیا تھا۔ کایا کو اس کی خاموشی

سے بڑا دکھ ہو رہا تھا۔ وہ اس کے لیے کیا کچھ نہیں کر رہی تھی' حتی کہ اس نے اپنا ایم ایس سی اگلے سال تک کے لیے ٹال دیا تھا اور وہ الٹا ناراض ناراض سا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج اس کا کالج میں پہلا دن تھا۔ وہ جلدی اٹھ گئی۔ نماز پڑھ کے اس کی بھلائی کے لیے خصوصی دعا کی' پھر ناشتا تیار کر کے اس کے کمرے میں چلی آئی۔ جہاں وہ پھولے ہوئے منہ کے ساتھ کالج کی تیاری کر رہا تھا۔

کامی بھی اسکول کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ بیلٹ پکڑے وہ ادھر ہی آ گیا۔ وہ ان دونوں سے بے نیاز جوتے پہن رہا تھا۔ کامی کے اشارہ کرنے پہ وہ ٹرے میز پہ رکھ کے اس کے پاس نیچے کارپٹ پہ بیٹھ گئی۔

"کاشی میں جو بھی کر رہی ہوں' تمہاری آنے والی زندگی کی بہتری کے لیے کر رہی ہوں۔ تم دل لگا کے پڑھنا' سب آسان ہوتا جائے گا۔ میں بھی تمہاری ہیلپ کروں گی۔" وہ ذرا دیر کو رکی۔ "ماموں صبح کے گئے رات کو لوٹتے ہیں۔ سارا دن گاہکوں کا رستہ تکتے ہیں۔ ماہانہ خرچے کے ساتھ ساتھ انہیں آنے والے دنوں کی بھی فکر ہوتی ہے۔ ابھی تم ناسمجھ ہو۔ کل کو اچھا لگے گا جب اوروں کے گھر اے سی فٹ کرنے اور فریج ٹھیک کرنے جاؤ گے؟" اس نے اسے حقیقت سمجھائی تھی۔ اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑتے جا رہے تھے۔ کامی آنکھ دبا کے کایا کو وکٹری (فتح) کا اشارہ کرتے باہر چلا گیا۔

"بلیو می کایا! مجھ سے نہیں ہو گا' میں فیل ہو جاؤں گا' سب میری بہت انسلٹ کریں گے۔" وہ جھنجلایا۔

"او کے! صرف ایک سال کاشی! تم پرامس کرو' دل لگا کے پڑھو گے۔ میری ہر بات مانو گے۔ اسٹڈیز پہ پوری توجہ دو گے۔ اگر پھر بھی رزلٹ ہماری توقع کے برعکس آیا تو میں پرامس کرتی ہوں' تمہیں دوبارہ فورس نہیں کروں گی۔ تمہارے جو جی میں آئے' وہ کر لینا۔ بے شک نہ پڑھنا۔ میں نے تمہیں اپنی پوری زندگی دی ہے' تم مجھے اپنی زندگی سے ایک سال نہیں دو گے؟ کیا میرا اتنا حق بھی نہیں بنتا؟" یہ تھوڑا سا رومانس اس نے کاشی کو جذباتی کرنے کے لیے بگھارا تھا۔ اور پھر بعد کے مراحل خود بخود آسان ہو گئے۔

رفتہ رفتہ سب کچھ معمول پہ آنے لگا۔ کایا نے اس کے لیے گھر میں ٹیوشن کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ کالج بھی بہتر ہی تھا۔ کایا کے تعلیم کی افادیت پر لمبے لمبے لیکچر اور ٹیوٹر کی محنت کافی رنگ لا رہی تھی۔ اس میں اعتماد آنے لگا تھا۔ سال تقریباً" اختتام پر تھا' پھر انہیں کالج سے فارغ کر دیا جانا تھا۔ اس کی کارکردگی بہت تسلی بخش جا رہی تھی۔ کایا بے حد خوش تھی۔ لیکن سب سے زیادہ خوش کاشی تھا۔

☼ ☼ ☼

کایا کچن میں تھی' جب سارے گھر میں اسے تلاش کرتا کاشی ادھر ہی چلا آیا۔

"روٹیاں بنا رہی ہو؟" کچن میں نظر دوڑاتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"ہوں۔" روٹی بیل کے اس نے ہاتھوں پہ ڈال لی۔

"میں تمہاری ہیلپ کروں؟" وہ اس کے بالکل قریب کھڑا تھا۔ کایا اس کا کچن میں آنے کا مقصد اچھی طرح سمجھتی تھی۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں کوئی فرمائش کرنے والا تھا۔

"ہاں! تم اچھے جو بہت ہو۔" اس کا ارادہ بھانپ کے کایا نے پرات پرے کھسکا دی۔

"اب جیسا بھی ہوں' شوہر تو ہوں نا۔" اسے شرارت سے چھیڑتے پرات واپس کھینچ کر پیڑا بنانے لگا۔ کایا کے آنے سے پہلے وہ دونوں بھائی اپنی ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں مدد کروایا کرتے تھے۔ اب بھی جب کایا انہیں کبھی کبھار کوئی کام کہہ دیتی تو وہ بصد خوشی اس کی مدد کرتے۔

"پکایا کیا ہے؟" اس نے پریشر ککر کا ڈھکن اٹھایا۔

"دال۔" اگلے ہی پل وہ چیخا تھا۔ "مجھے نہیں کھانی دال وال۔"

"اچھا' پھر کیا کھانا ہے؟" وہ اطمینان سے پوچھ کے روٹی بیلنے لگی۔

"چکن پلاؤ۔" وہ فریزر کھولے کھڑا تھا۔ چکن کا پیکٹ نکال کے باؤل میں رکھ کر اس میں پانی ڈالا۔

"سبزیاں تمہارے حلق میں پھنستی ہیں۔ دالیں کھانے سے پیٹ میں مروڑ اٹھتا ہے۔ یہ پلاؤ' چکن بریانی' پیزا' برگر کھانے سے تکلیف نہیں ہوتی؟" اس نے تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔

"مجھے لذیذ غذائیں پسند ہیں۔" شیلف کے نیچے پڑے ڈرم میں سے وہ چاول نکالتے بڑی ڈھٹائی سے کہہ رہا تھا۔

"جو بھی ہے۔۔۔ آج تو تمہیں دال ہی کھانا پڑے گی۔" اس نے صاف انکار کر دیا۔

"تم مجھے پلاؤ بنا کے دے رہی ہو کہ نہیں؟" وہ ٹرے ہاتھ میں لیے خفگی سے پوچھ رہا تھا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ بھی قطعی لہجے میں بولی۔

"بس پھر ٹھیک ہے' میں بھی کھانا نہیں کھاؤں گا۔ رات کو بھی نہیں۔ کوئی مجھ سے نہ کہے اور تم مجھ سے آئندہ بات نہ کرنا۔ بھوکا مر جاؤں گا میں بھی۔" وہ غصے سے بولتا ٹرے پٹخ کے باہر چلا گیا اور وہ حیران سی کھڑی رہ گئی۔ اس کے الفاظ نہیں' مگر لہجہ بے حد سخت تھا۔

وہ ست ہاتھوں سے چاول صاف کرنے لگی۔ دوپہر کا کھانا بنانے میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ اس نے ناشتے میں صرف چائے کا کپ لیا تھا۔ اب بھوک ستا رہی تھی' مگر کاشی کی ناراضی نے اس کی بھوک اڑا دی۔ اس نے کبھی اتنی تیزی سے کام نہیں کیا تھا۔ ممانی اور کامی کو کھانا دے کے باقی کچن کے کام نبٹاتے نبٹاتے پلاؤ بھی پک گیا۔ بڑی سی پلیٹ بھر کے وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ہلکا سا ہینڈل گھمانے سے دروازہ کھل گیا تھا۔ وہ بیڈ کے وسط میں تکیے میں منہ گھسیڑے اوندھا لیٹا تھا۔

"کاشی!" اس نے آہستگی سے پکارا' مبادا چلانے نہ لگے۔

"کاشی!" دوسری بار اس نے کندھا بھی ہلایا۔

"جاؤ! چلی جاؤ یہاں سے۔ میں تمہارا کچھ نہیں لگتا۔" وہ یک دم چلایا تو وہ سہم کے پیچھے ہٹی۔

"پلیز آئی ایم سوری! مجھ سے غلطی ہو گئی۔" شرمندگی کے ساتھ اس کے لہجے میں بھی نمی در آئی۔

"نہیں' تم سے کیوں؟ مجھ سے ہو گئی غلطی جو ذرا سا کام کہہ دیا۔" وہ سیدھا ہوا۔ منہ ابھی بھی پھولا ہوا تھا۔

"میں آئندہ تمہیں کبھی انکار نہیں کروں گی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"بات انکار کی نہیں۔" وہ اٹھ بیٹھا۔ "تمہارا انداز اتنا سخت تھا' مجھے برا لگا' حالانکہ میں نے تمہیں کبھی انکار نہیں کیا۔ ماما' پاپا نے بھی کبھی مجھے اس طرح ٹریٹ نہیں کیا۔" وہ سر جھکائے آہستگی سے کہہ رہا تھا۔

"جب سے تم آئی ہو۔ میں نے ماما سے کوئی فرمائش حتیٰ کہ اپنا کام تک نہیں کہا۔ مجھے تم سے ضد کر کے اپنی بات منوانا اچھا لگتا ہے' کیونکہ تم۔۔۔ تم مجھے اچھی لگتی ہو۔ میں۔۔۔ میں تمہارا سخت رویہ برداشت نہیں کر سکتا۔" وہ سر جھکائے کہتا جا رہا تھا۔ وہ ششدر بیٹھی تھی۔

"اچھا! اب اپنے چہرے کے زاویے ٹھیک کرو۔ میرے بجائے تم بے وقوف لگ رہی ہو۔" وہ بھرپور انداز میں مسکرایا تھا۔ وہ ابھی بھی بے یقین تھی۔

"اب میں تمہیں اپنے جذبات سے مزید آگاہ نہیں کروں گا۔ ایویں سر چڑھ جاؤ گی۔" شرارت سے کہتے اس نے پلیٹ اٹھا کے اپنے آگے رکھی۔ پہلا چمچہ بھر کے کالیا کی طرف بڑھایا۔

"تم کھاؤ۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہرگز نہیں! تمہیں مجھ سے زیادہ بھوک لگی ہے۔"

یہ چھوٹا سا واقعہ بہت کچھ بدل گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

ان دونوں کے ایگزام میں اب صرف کچھ دن رہ گئے تھے۔ وہ نویں جماعت میں تھا۔ پڑھائی میں بھی ذرا بہتر تھا۔ باقی ماندہ کسر اچھے ٹیوٹر اور کالیا کی توجہ نے پوری

کر دی۔ وہ بہت پر اعتماد تھا۔ البتہ کاشی اپنے پچھلے ناقص ریکارڈ کو مدنظر رکھتے اب بھی خاصا بوکھلایا ہوا تھا۔ بالآخر امتحان شروع ہوا اور جوں جوں پرچے ہوتے گئے' اس کے چہرے پہ چھائی بدحواسی کم ہوتی گئی تھی۔ ہر پرچے کے بعد وہ بہت مسرور اور مطمئن لوٹتا تھا۔ اللہ اللہ کر کے ایگزامز ختم ہوئے اور چھٹیاں مناتے دونوں کی شرارتیں عروج پہ پہنچ گئیں۔

☼ ☼ ☼

وہ کافی دیر سے صحن میں چکراتی باہر کے گیٹ پہ نظریں جمائے ہوئے تھی۔ کاشی کا رزلٹ آنا تھا۔ ساجدہ الگ تسبیح ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں۔ نواز صاحب کی دو دفعہ کال آ چکی تھی۔ جب اس کی ٹانگیں انتظار میں چکر کاٹ کاٹ کر شل ہو گئیں' تب وہ دونوں لٹکے چہروں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ ان کے جھکے سر اور مرجھائے ہوئے انداز دیکھ کے وہ اپنی جگہ ساکت رہ گئی۔

"رزلٹ کا کیا بنا؟" ان کے قریب آنے پہ اس نے کھوکھلے سے لہجے میں پوچھا۔

کامی نے کاشی کو دیکھا جو مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔

"ظاہر ہے جتنی محنت کی تھی' صلہ بھی اتنا ہی ملنا تھا پر یہ مان ہی نہیں رہا۔" کامی نے اس کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔

"کیا کچھ غلط ہو گیا؟" پوچھتے ہوئے اس کا دل ڈوب سا گیا۔

"اس قدر غلط کہ مجھے یقین ہی نہیں آ رہا۔" کاشی کی آواز کانپ رہی تھی۔

"مجھے دکان کے باہر ایک دوست مل گیا۔ یہ رزلٹ چیک کرنے اندر چلا گیا۔ میں نے لاکھ بار پوچھا' بولتا ہی نہیں۔ سارے رستے اس کی یہ ہی کیفیت رہی ہے۔" کامی کے انداز میں اکتاہٹ سی تھی۔ وہ گھنٹہ بھر سے بڑے بھائی کو تسلیاں دیتا آ رہا تھا۔

"تم نے رول نمبر ٹھیک سے نوٹ کیا تھا؟" کالیا رو دینے کو تھی۔

"ایک بار نہیں' کئی بار رول نمبر چیک کیا۔ کالیا! میں نہیں جانتا یہ سب کیسے ہو گیا؟" وہ شکستہ لہجے میں کہہ رہا تھا۔

کامی نے اسے کندھوں سے تھام کے لاؤنج کے صوفے پہ لا بٹھایا۔ ساجدہ بیگم بھی تسبیح گھماتی باہر آ گئیں۔

"پاس ہو گیا نا کاشی؟" انہوں نے بے تابی سے پوچھا۔

"ممانی۔۔۔" کالیا ان کے گلے لگ کے رو دی۔

وہ حیران و پریشان رہ گئیں۔

"کالیا! پلیز رو مت' جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ کاشی کی طبیعت بھی مجھے ٹھیک نہیں لگ رہی۔" کامی سے کالیا کا رونا برداشت نہیں ہوا تھا۔ کالیا نے بمشکل اپنے آنسوؤں پہ قابو پایا تھا۔

"کاشی! تم دل پہ مت لو۔ تم پھر سے کوشش کرنا' کوئی تمہیں ٹیز نہیں کرے گا۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ صرف ایک سال ہی ضائع ہوا ہے' ابھی پوری زندگی پڑی ہے۔ تمہارے ساتھ اور بھی بہت سے لڑکے فیل ہوئے ہوں گے' کیا وہ۔۔۔"

"فیل۔۔۔" وہ جو اس پہ نظریں جمائے غور سے سن رہا تھا۔ اتنی زور سے چلایا کہ کامی اچھل پڑا۔

"کس نے کہا؟" وہ کڑے تیوروں سے اسے گھور رہا تھا۔

"جب سے رزلٹ دیکھ کے آئے ہو' صدمے سے برا حال ہے' بولا تک نہیں جا رہا۔" کامی نے جلدی سے بتایا۔

"اسٹوپڈ! میرا یہ حال خوشی سے ہوا ہے۔ اپنی کلاس کے اٹھاون لڑکوں میں سے میری نویں پوزیشن آئی ہے۔ میں نے دکان سے ہی پروفیسر صاحب کو کال کی تھی' انہوں نے خود مجھے بتایا اور مبارک باد بھی دی۔" اس کے انکشاف پر سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے۔

"او رئیلی کاشی۔" وہ خوشی کے مارے بے اختیار

اس سے لپٹ گئی۔ ممانی اور کامی کو بالکل نظر انداز کیے۔

"ہٹو پیچھے۔" ساجدہ نے کھینچ کے کلیا کو اس سے الگ کیا اور کاشی کو کرارا سا تھپڑ جڑ دیا۔

"نالائق! شرم نہیں آتی مسخرے بازی کرتے؟ صبح سے تسبیح پڑھ کے میرا گلا سوکھ گیا اور تو یوں منہ لٹکائے آیا جیسے تیری ماں مر گئی ہو۔" ساجدہ اس کے خوب لتے لیتی غصہ سے واپس مڑ گئیں۔

"شرم تو نہ آئی تجھے! سارے رستے تجھے تسلیاں دے دے کے حلق خشک ہو گیا' مجال ہے' جو ایک لفظ بھی بکا ہو۔ خبردار جو مجھ سے بات کی۔" کامی بھی کہہ کر یہ جا وہ جا۔

وہ ہونقوں کی طرح کلیا کے تاثرات جانچنے لگا۔

"صبح سے دعائیں مانگ مانگ کے سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ خبردار جو میرے قریب آئے۔" کلیا نے بھی ان دونوں کی تقلید کی تھی۔

وہ جلدی سے اٹھ کے فون اسٹینڈ تک آیا تاکہ نواز صاحب کو فون کر کے بتا سکے' پھر اپنے ان رشتوں کو بھی تو منانا تھا جن کی دعاؤں سے وہ یہاں تک پہنچا تھا۔

☼ ☼ ☼

وقت کا کام گزرنا تھا اور وہ اپنی رفتار سے اپنے نقش چھوڑے گزرتا چلا گیا۔ کاشی نے آئی کام کر لیا۔ کامی کالج میں آ گیا۔ کلیا دوسرے سال بھی اپنی پڑھائی شروع نہ کر سکی' مگر اسے اس کا افسوس نہیں تھا۔ شوہر کی کامیابی سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تھا۔ وقت اور بڑھتی عمر نے کاشی کے مزاج کو چھوا بھی نہیں تھا۔ وہ اب بھی کلیا پہ مکمل انحصار کرتا اور اپنی ضدیں منواتا۔ کامی سمجھ دار تھا۔ جب اس نے میٹرک کیا تو کلیا نے اسے بھی پرائیوٹ کالج کا مشورہ دیا' مگر وہ سہولت سے ٹال گیا۔

"نہیں میں بابا پہ زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔"

نواز صاحب کا کام گرمیوں میں خوب چلتا' اس لیے وہ گرمیوں میں بچت کر کے رقم آنے والے دنوں کے لیے بچا کے رکھتے۔

کاشی کی بے جا ضرورتیں پوری کرنے کے لیے وہ حاضر رہتی تھی۔ نواز کریم کبھی کبھی کلیا کا ہاتھ پکڑ کے اس میں ہزار' ہزار کے نوٹ زبردستی دبا دیتے۔ وہ ان سے کاشی کے معاملے میں ایک روپیہ مانگنے تک کی بھی روادار نہیں تھی۔ اس کی ساری تنخواہ اس پہ ہی اٹھ جاتی۔ کلیا کو ماموں کا بھی احساس تھا' جو ابھی تک اکثر و بیشتر اس کی ماں کو بھی رقم دیتے رہتے تھے۔ بی کام میں اس کی نئی ضد تھی۔

"کمپیوٹر لے کر دو اور نیٹ لگواؤ۔" اس نے چوں نہ کی۔ نواز کریم نے سنا تو اس پہ خوب برسے۔ ساجدہ بیگم نے بھی اس کے لتے لیے' مگر وہ ڈٹا رہا تو کلیا نے ہار مان لی۔

کاشی نے بی کام کر لیا تو نواز کریم نے اسے نوکری کرنے کو کہا' مگر اس نے صاف انکار کر دیا۔

"جہاں چار سال پڑھا ہے وہاں دو سال اور سہی۔"

اب وہ خاصا پر اعتماد ہو چکا تھا۔ پڑھائی کی لگن بھی بیدار ہو چکی تھی۔ وہ اپنا تعلیمی سلسلہ منسوخ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے ایم بی اے کا پہلا سال خاصا پر سکون گزارا۔ وہ خوب محنت کر رہا تھا۔ کلیا بڑی مطمئن تھی کہ موصوف نے کوئی نیا آرڈر پاس نہیں کیا۔ ان ہی دنوں اس نے کاشی کو ساجدہ بیگم سے کہتے سنا۔

"آپ بابا سے کہیں کہ وہ مجھے سمسٹر کی فیس دیں۔ میں کب تک کلیا کے سامنے ہاتھ پھیلاؤں گا؟ آخر میں ان کی ذمہ داری ہوں۔"

حالانکہ اس نے کبھی کاشی کو ہاتھ پھیلانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ وہ مقررہ وقت سے قبل ہی اس کے کہے بغیر رقم اسے تھما دیا کرتی تھی۔ اس کی تنخواہ اس کے اکاؤنٹ میں آتی تھی۔ اس نے اپنے ساتھ کاشی کا مشترکہ اکاؤنٹ کھلوا لیا تاکہ اسے کبھی مانگنا نہ پڑے۔

آخری سال اس نے پھر سے رٹ پکڑ لی۔

"اتنی گرمی میں بسوں میں دھکے نہیں کھائے جاتے۔ اتنی اتنی لوگ چڑھ جاتے ہیں۔ پاؤں رکھنے کو

جگہ نہیں ملتی' میرا سانس بند ہو جاتا ہے۔ مجھے شک ہے کہیں میں دمے کا مریض نہ بن جاؤں۔"

کلیا نے بے بسی سے ممانی اور کامی کو دیکھا۔ وہ دونوں شرمندہ سے ہو گئے۔ وہ اتنا بے وقوف تو نہیں تھے کہ اس کی قربانیاں نظر نہ آتیں۔

نواز کریم کو علم ہوا تو وہ خوب گرجے۔

"شرم نہیں آتی اسے یوں منہ پھاڑ کے مانگتے۔ میرے پاس کون سا خزانے دبے ہیں جو تم لوگوں سے چھپاؤں گا؟ جو ہے' جتنا ہے' شکر ادا کرو' آخری سال ہے اس کا' پھر نوکری لگے گی تو موٹر سائیکل چھوڑ گاڑی خرید لے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں' مگر میری استطاعت ساٹھ' ستر ہزار کی بائیک دلوانے کی نہیں ہے۔"

ان کی وضاحت بھی اسے ٹس سے مس نہ کر سکی۔ سب سمجھا سمجھا کے تھک گئے۔ اس کی پانچ سال کی انتھک محنت رائیگاں ہونے جا رہی تھی۔ وہ آفس سے قرضہ لے سکتی تھی' مگر پھر وہ ہر ماہ قسط لیتے اور اس کی تنخواہ میں اس کا ایم بی اے بمشکل پورا ہو رہا تھا۔ قسط کی اضافی رقم کہاں سے لاتی' لیکن ہمیشہ کی طرح ہار اسے ہی ماننا پڑی۔

گھر والوں کے لیے یہ مشکل تھا کہ برا بھلا کسے کہیں؟ ہٹ دھرم بیٹے کو یا خاموش' بے بسی سے عمل کرتی بہو کو۔

اس کے ایگزام ہو گئے۔ رزلٹ بھی آ گیا۔ اس نے بہترین نمبروں سے کامیابی حاصل کی تھی۔ کلیا کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ شکرانے کے نفل ادا کرتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

کاشی نے جاب کے لیے تگ و دو شروع کر دی۔ کلیا نے اسے اپنے آفس میں جاب دلوانے کو کہا' مگر اس نے انکار کر دیا۔ تھوڑی سی خواری کے بعد اسے نوکری مل ہی گئی۔ گھر بھر خوش تھا۔ ساجدہ بیگم نے دبے دبے لفظوں میں کلیا سے کہہ دیا۔

"اب تم نوکری چھوڑ کر گھر بیٹھو۔ گھر میں کوئی بچے وغیرہ ہوں' رونق لگے۔ اتنے سال گزر گئے ہیں۔ اب تو وہ بھی کمانے لگا ہے۔ تم اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ کم کرو۔" اس کی اپنی بھی یہ ہی خواہش تھی' مگر اتنی جلدی وہ نوکری چھوڑنے کا فیصلہ نہیں کر سکتی تھی۔ کم از کم چند مہینے اور۔ کاشی کے قدم اچھی طرح جم جاتے' اسے کسی بھی قسم کی معاشی تنگی نہ رہتی۔ اب جبکہ ہر کوئی اس سے مطمئن تھا' کیونکہ وہ اپنا کماتا تھا۔ اپنی بے جا ضروریات بھی اپنی محنت سے کمائے ہوئے پیسوں سے ہی پوری کیا کرے گا' اس کی فطرت نے نیا پلٹا کھایا۔ نوکری کے دوسرے مہینے وہ چڑچڑا سا ہو گیا اور اس کی چڑچڑاہٹ کے زیر عتاب زیادہ تر کلیا ہی آتی۔ اس کا بدلتا رویہ سب کی عقل سے بالاتر تھا۔ نواز کریم کو ابھی اس کے نئے تیوروں کی بھنک نہیں پڑی تھی۔

"کلیا کہاں جا چھپتی ہو' ادھر آؤ۔" اس نے زور سے ہانک لگائی۔ وہ اس سے آدھ گھنٹہ قبل آفس کے لیے نکلتا تھا۔ وہ کچن میں کھڑی ناشتا بنا رہی تھی۔ چولہے کی آنچ ہلکی کر کے وہ اس کی پکار پہ چلی آئی۔

"میرے براؤن شوز کہاں ہیں؟ مل نہیں رہے۔" لہجہ اکتاہٹ سے بھرپور تھا۔ وہ اس کی ہر چیز جگہ پہ رکھتی تھی' تاکہ اسے ڈھونڈنا نہ پڑے۔

"وہ کامی لے گیا ہے۔ آج اس کی یونیورسٹی میں کوئی فنکشن وغیرہ ہے۔" اس نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھتے بتایا۔ اس نے دو ہفتے پہلے ہی وہ جوتے خریدے تھے۔ کامی نے اس سے مانگے تو وہ انکار نہ کر سکی۔

"تم نے میری اجازت کے بغیر کیوں دیے اسے؟ زیادہ حاتم طائی نہ بنا کرو۔" وہ اس پہ بگڑتا ہوا کامی کے کمرے میں چلا آیا۔ وہ بھی پیچھے ہی تھی۔

"یونیورسٹی جا رہے ہو؟" کمرے کے بیچ میں رک کے اس نے پوچھا۔ کامی بھی مکمل تیار ہو کے اب جرابیں پہن رہا تھا۔ جوتے سامنے ہی دھرے تھے۔

"ہاں یار' مجھے بھی بہت جلدی ہے۔ تمہارے ساتھ بائیک پہ ہی جاؤں گا۔ بس میں بہت سا ٹائم ضائع ہو جائے گا۔" جرابیں پہن کے اس نے بوٹ اٹھا لیا۔

"ٹھہرو کامی! یونو میں یہ کتنے مہنگے فٹ ویئرز لے کر آیا ہوں۔ میں نے صرف دو بار استعمال کیے ہیں اور تم

میری اجازت کے بغیر ہی اٹھا لائے؟ میری بھی ضروری میٹنگ ہے۔ تم کوئی اور لے لو۔ یہ واپس کردو۔" اس کے اکھڑے انداز میں ذرا بھی نرمی نہیں تھی۔

کامی کا منہ حیرت سے کھل گیا اور ہاتھ تھم گئے۔ ان دونوں بھائیوں نے کبھی تیرا اور میرا نہیں کیا تھا۔ ان دونوں کے کپڑے اور جوتوں کا ناپ ایک سا تھا۔ جس کا جی چاہتا' وہ دوسرے کی چیزیں استعمال کرلیتا۔

اس نے مردہ ہوتے ہاتھوں سے جوتے اسے تھما دیے' جنہیں لیے وہ باہر نکل گیا۔ کالیا بھی وہیں کھڑی سب دیکھ رہی تھی۔ اس نے کامی کے چہرے پہ جو حزن وملال دیکھا تھا' اس کا دل کٹ کے رہ گیا۔

"کامی تم....."

"پلیز کالیا! کاشی سے کہو میں بس سے چلا جاؤں گا۔ میرا ویٹ نہ کرے۔" اس سے کہہ کر وہ بیڈ کے نیچے کچھ تلاش کرنے لگا۔

وہ آنکھوں میں نمی لیے پلٹ گئی۔

کامی نے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ تھرڈ ایئر میں اس نے گلی کے بچوں کو ڈرائنگ روم میں ٹیوشن پڑھانا شروع کردیا تھا۔ اس طرح وہ بسوں کے کرائے' نوٹس اور اپنے لنچ کا خرچہ نکال لیتا۔ بی سی ایس کے بعد اس نے پارٹ ٹائم جاب کرلی۔ اپنے سمسٹرز کی فیس وہ خود بھرتا تھا۔ نواز کریم جب اس کی طرف دیکھتے تو ان کی نگاہ میں بیٹے کے لیے فخر ہوتا۔ انہیں بڑے بیٹے کی بجائے اس سے بہت امیدیں تھیں جن کا وہ کبھی کبھار اظہار بھی کرتے رہتے تھے۔ جب اس کی چھٹی ہوتی یا فرصت ملتی تو وہ باپ کے ساتھ دکان پہ چلا جاتا۔ غیر سنجیدگی اور کھلنڈرا پن اس میں ابھی بھی تھا' مگر عقل کے ساتھ ساتھ۔

☼ ☼ ☼

وہ کاشی کے ہمراہ اپنے میکے جارہی تھی۔ وہ تیار ہو کے ساجدہ بیگم کے کمرے میں انہیں بتانے چلی آئی۔ چند اور ضروری باتیں کرکے وہ واپس کاشی کو دیکھنے آئی تو وہ نہا رہا تھا۔ بیڈ پہ ہلکے سبز رنگ کی قمیص نکال رکھی تھی۔ جب وہ یہ قمیص خرید کر لایا تھا' تب بھی اسے پسند نہیں آئی تھی۔

"اوں ہوں' یہ کدو' کریلے جیسا رنگ ہرگز نہیں چلے گا۔"

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے بڑبڑاتے اس نے وہ قمیص اٹھا کے واپس رکھی اور آسمانی رنگ کی سادہ قمیص نکال لی ..... جو اس کی پسندیدہ تھی۔ وہ اکثر عین وقت پہ اس کے ڈریسز میں ردوبدل کردیا کرتی تھی۔

وہ پینٹ اور بنیان چڑھائے' تولیے سے بال رگڑتا نکلا تھا۔ تولیہ ایک طرف اچھال کے ڈریسنگ ٹیبل سے باڈی اسپرے اٹھا کے خود پہ چھڑکاؤ کیا اور بیڈ سے قمیص اٹھاتے اس کا ہاتھ رک گیا۔

"یہ شرٹ تم نے چینج کی ہے؟"

تولیہ اسٹینڈ پہ ڈالتے اس کے لہجے کی ترشی واضح تھی۔

"تم پہ یہ رنگ سوٹ کرتا ہے' تمہیں بالکل بھی کلر سینس نہیں ہے' عجیب سے رنگوں کی شرٹس اٹھا کے لے آتے ہو' اپنی شاپنگ میرے ساتھ ہی کیا کرو۔ جب سے تمہاری جاب ہوئی ہے' تم نے خاصے پر پرزے نکال لیے ہیں۔ اپنا ہر کام خود سے کرلیتے ہو' پہلے تو تم ایسا نہیں کرتے تھے۔"

وہ یونہی سادگی سے مسکراتے ہوئے سب کہہ رہی تھی۔ اس کا مقصد طنز کرنا نہیں تھا۔ کاشی کا روکھا انداز اسے بہت تکلیف دیتا تھا۔ مگر وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ اس کے معاملے میں خاص احتیاط برتنے لگی تھی۔

"تمہارے نزدیک مجھے صرف کلر سینس ہی نہیں سرے سے سینس ہے ہی نہیں۔ تم مجھے ایک بیوقوف انسان سمجھتی ہو' جو تمہاری انگلی پکڑ کر چلتا ہے' جس میں خود انحصاری رتی بھر بھی نہیں۔ وہ اپنی زندگی کے چھوٹے چھوٹے سے معاملے میں تمہاری رائے کا محتاج ہے۔ میں اپنے لیے کوئی فیصلہ کروں' یہ تو تمہاری انا سے برداشت ہی نہیں ہوتا۔" وہ یکدم بھڑک اٹھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت سی اسے سن رہی تھی۔

کامی اور ساجدہ بیگم اس کی تیز آواز سن کر کمرے میں چلے آئے تھے مگر وہ انہیں دیکھ کے بھی چپ نہ ہوا تھا۔

"تم یہ کبھی چاہتی ہی نہیں کہ میں اپنے پیروں پہ کھڑا ہو کے کچھ کرسکوں۔ تم ایک کمپلیکس کی ماری ہوئی عورت ہو۔ مجھے ہمیشہ اپنا ہی محتاج دیکھنا چاہتی ہو میں تم سے ٹکا ٹکا مانگوں۔ اسی میں تمہاری انا کو تقویت ملتی ہے۔ میرے کیے ہر کام اور فیصلے پر نکتہ چینی کرتی ہو' میری عقل تو تم نے ماؤف کر رکھی تھی۔ پلیز اپنا سایہ مجھ سے دور رکھو' مجھے دنیا کو برتنا سیکھنے دو۔ میری زندگی میں دخل اندازی بند کردو بلکہ ..... بلکہ یہاں سے ..... میری زندگی سے کچھ عرصے کے لیے چلی جاؤ۔ سکون لینے دو مجھے' ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے بستر پر بیٹھ گیا۔

یہ الفاظ تھے یا پگھلا ہوا سیسہ' جو وہاں موجود ہر شخص کی سماعت میں انڈیلا گیا تھا۔ وہ بت بنی کھڑی تھی۔ آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کاشی نے ہی کہا ہے۔ وہ بھی اسے؟

وہ جس کے لیے اس نے ساڑھے چھ برس قربانیاں دیں۔ اس کے روشن مستقبل کی خاطر اپنی پڑھائی کی خواہش کو ختم کرلیا۔ اپنی بنیادی ضروریات کو بھی نظر انداز کرکے اس کی بے جا خواہشات پوری کیں۔ اس کی ذات کی تکمیل کے لیے تگ ودو کرتی کالیا آج اس پل کتنی خالی ہوگئی تھی۔

اس نے ہمیشہ اپنی آنکھوں اور چہرے کی پریشانی چھپا کر اسے خوش اور مطمئن رکھا تھا۔ وہ کالیا تھی' اسے کاشی کو انکار تو دور' ٹالنا بھی نہیں آتا تھا۔ اس کی بے جا ضدیں پوری کرنے والی کالیا نے اس بار بھی ہار مان لی تھی۔

☼ ☼ ☼

کالیا کو گئے تین روز ہوچکے تھے۔ سارا گھر سائیں سائیں کررہا تھا۔ ساجدہ بیگم اور کامی تے اسے مخاطب تک نہ کیا تھا۔ نواز کریم کو پتا چلا تو انہوں نے خوب شور مچایا۔ کاشی ان کے خوف سے پہلے ہی منظر سے غائب ہوگیا تھا۔ ساجدہ چپ چاپ سنتی رہیں۔ ایک عجیب سی اداسی اور ویرانی چھائی ہوئی تھی۔

"اب کیا ہوگا کامی! تمہارا باپ صاف صاف کہہ چکا ہے کہ اگر چند دنوں میں وہ کالیا کو واپس نہ لایا تو وہ اسے عاق کرکے یہاں سے بوریا بستر بھی گول کردیں گے۔ میں کیسے تمہاری پھپھی جان کا سامنا کروں گی۔ وہ بیچاری دکھوں کی ماری عورت..... ہم نے اس کی بیٹی کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔"

ساجدہ بے حد پریشان تھیں۔ انہوں نے اور کامی نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی' مگر وہ نہ مانی۔

"امی! اگر آپ میرا ساتھ دیں تو سب ٹھیک ہوسکتا ہے۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"غور سے میری بات سنیں! ہم ابھی کالیا کو لینے جائیں' وہ لوٹ آئے گی۔ آپ کو وہ کبھی انکار نہیں کرے گی مگر کیا ہوگا؟ چند دن کاشی چپ رہے گا پھر وہی بے مروتی۔ اسے جب تک اپنے رویے پر شرمندگی اور کالیا کے وجود کی اہمیت کا احساس نہیں ہوگا' وہ باز نہیں آئے گا۔ اگر خدانخواستہ کل کلاں ان کے رشتے میں مزید دراڑیں پیدا ہوئیں تو اس کے ذمے دار صرف ہم ہوں گے کیونکہ ہم ٹھیک سے اسٹینڈ نہیں لے سکے۔ کاشی کی عقل میں بات سمجھانے سے نہیں' عمل کرنے سے آئے گی۔ ابھی وہ صرف چیختا ہے' کل کو مارے گا اور پرسوں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گا۔ ابھی اس نے منہ سے نہیں کہا مگر وہ اس کی ذہانت اور صلاحیتوں سے خائف رہنے لگا ہے۔ شاید اس کے خیال میں عقلمندی کا تعلق عمر سے ہوتا ہے۔ وہ عنقریب کالیا کی عمر کو ایشو بنا کر ہمیں مشکلات میں ڈال سکتا ہے۔ آپ کو میں زیادہ تفصیل سے نہیں سمجھا سکتا' بس کاشی کے معاملے میں جیسا میں کہوں ویسا ہی کرنا ہے۔ رہ گئے ابو تو ان سے میں خود بات کرلوں گا۔"

اس نے بہت گہرائی سے ساری صورت حال کا

تجزیہ کر لیا تھا۔ وہ اب اسے دوسرے طریقے سے راہ راست پر لانا چاہتا تھا۔ اس سب میں کالیا کو اعتماد میں لینا بھی بہت ضروری تھا۔

"میں تیرے ساتھ ہوں، مجھے اپنے گھر کی خوشیاں واپس چاہئیں۔" وہ دل و جان سے راضی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ نک سک سے تیار ہو کے ناشتے کے لیے ٹیبل پر آیا تو نواز کریم دکان پہ جا چکے تھے۔ کامی اخبار پڑھتے ہوئے انڈا پراٹھا کھا رہا تھا۔ ساجدہ بیگم نے اس کے سامنے بھی ناشتہ لا کے رکھ دیا۔

"سلائس اور انڈا، مجھے نہیں کھانا۔ مجھے پراٹھا چاہیے۔" اس نے ناگواری سے پلیٹ پرے کھسکا دی۔

"یہی کھانا پڑے گا۔ گوندھا ہوا آٹا ختم ہو گیا۔" ساجدہ نے بھی ذرا لحاظ نہ رکھا۔

"آپ گوندھ لیتیں۔"

"تم رات کو بتا کے سوتے، ویسے بھی اب مجھ سے اتنے بھاگ بھاگ کر کام نہیں ہوتے۔" وہ اپنا چائے کا کپ لیے وہیں آ بیٹھیں۔

کامی اپنے ناشتے میں مگن تھا۔

"میں ناشتہ نہیں کروں گا۔" اس نے دھمکی دی۔

"نہ کرو، میں کالیا تھوڑی ہوں جو تمہاری منتیں کروں گی۔" انہوں نے لاپروائی سے کہا۔

وہ جھٹ بیگ اٹھا کے تن فن کرتا اپنی بائیک نکال لے گیا۔ کامی نے اس کے نکلتے ہی ماں کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا تھا۔

تقریباً رات کے ساڑھے گیارہ بجے کامی کو کچن سے برتنوں کی کھٹر پٹر کی آواز آئی۔ وہ دبے قدموں کچن تک آیا۔ کاشی اسٹول پہ بیٹھا، ٹھنڈی روٹی اور ٹھنڈا سالن کھا رہا تھا۔ وہ مطمئن ہو کے لوٹ گیا۔

☼ ☼ ☼

کامی اور ساجدہ مارے خوشی کے بے یقین تھے۔ پورا ہفتہ گزر گیا اور اس نے بنا ناک بھوں چڑھائے ہر سالن کھا لیا، کسی چیز میں نقص نہیں نکالا۔ انہیں اتنے فوری نتائج کی توقع نہیں تھی۔

اب ساجدہ کو بھی اس مشن میں مزا آنے لگا تھا۔

"امی! کام کرنے والی میرے بیڈ روم کی صفائی کیوں نہیں کرتی؟ ہر شے مٹی سے اٹی پڑی ہے۔" آج چھٹی تھی۔ وہ ان کے سر پہ کھڑا جھنجلا رہا تھا۔

"کام والی سے کمروں کی صفائی نہیں کرواتی۔ تمہاری گھڑیاں، موبائل، گلاسز اور اتنا کچھ پڑا ہوتا ہے۔ مجھے ان لوگوں پہ اعتبار نہیں، پھر تم اتنے لاپروا ہو بے دھیانی میں یونہی سب پھینک دیتے ہو۔ کوئی چیز اٹھا کر لے گئی تو کون ذمہ دار ہو گا؟ پھر یہ لوگ مانتے بھی نہیں، ہمارا ہی نقصان ہو گا۔"

انہوں نے نواز کریم کی قمیص پہ بٹن ٹانکتے لمبی تقریر جھاڑ دی۔

"پہلے بھی کام والی صفائی کرتی تھی۔" اس نے ذہن پہ ہلکا سا زور دے کے یاد کیا۔

"کک.... کب؟ کالیا صفائی کیا کرتی تھی۔ ہاں، کبھی کبھار میں سر پہ کھڑی رہ کے کام کروا لیتی تھی۔ اب تو مجھ میں ہمت ہی نہیں رہی۔ کہاں ان کی نگرانیاں کرتی پھروں۔ تم خود کر لو اپنے کمرے کی صفائی۔ کامی بھی اپنے کام خود ہی کرتا ہے۔"

آخر میں کامی کی مثال دے کے بڑے پیار سے کہا گیا۔

جب وہ سخت جھنجلایا ہوتا وہ نرم پڑ جاتیں۔ ماں کے لہجے میں اتنا لاڈ پا کر وہ چلا بھی نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی کامی کی ہدایت تھی۔

تن فن کرتا وہ مڑ گیا اور پھر ڈھائی گھنٹہ صرف کر کے کمرے کی صفائی مکمل کی اب اسے یہ سب خود ہی کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ آفس سے آ کے لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کامی صبح یونیورسٹی کے بعد جاب پر جاتا تھا اور رات آٹھ بجے اپنی جاب سے لوٹتا تھا۔ ساجدہ کچن میں

مصروف تھیں۔

"ہائے! درد ہو رہا ہے۔" ساجدہ اس کے ساتھ صوفے پہ آ کے بیٹھتے ہی کن انکھیوں سے اسے دیکھتی دہائی دینے لگیں۔ وہ شاید زیادہ ہی محو تھا، اس لیے توجہ نہ دی۔

"ہائے ربا، اس درد نے مجھے کسی قابل ہی نہیں چھوڑا۔" اب کے دہائی میں کرب بھی نمایاں تھا۔

وہ ٹی وی کی آواز کم کرتے فوراً متوجہ ہوا۔

کہاں درد ہو رہا ہے؟"

"ارے گھٹنوں میں، ایک قدم بھی چلا نہیں جاتا۔ یہ تکلیف روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ سارا دن ہائے ہائے کرتے کاموں میں جتی رہتی ہوں۔"

انہوں نے چہرے پر زبردستی کی نقاہت طاری کر کے دونوں ہاتھ گھٹنوں پر دھرے ہوئے تھے۔

"میں رات کو آپ کو ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے لے کر جاؤں گا۔" وہ فکر مندی سے بولا۔

"نن.... نہیں بیٹا! یہ درد ڈاکٹروں کی دوائیوں سے نہیں جانے والا.... تمہارے ابو ایک حکیم سے تیل بنوا کے لائے ہیں، اس کی مالش کروں گی۔" انہوں نے جلدی سے بہانہ گھڑا۔ مبادا وہ ابھی نہ اٹھ کھڑا ہو۔

"چلیں! جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے بھی زیادہ زور نہ دیا۔

ساجدہ بیگم نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔

"جا کاشی اٹھ! قیمہ بھون دے۔ تھوڑا ہی پانی تھا کہیں جل نہ جائے۔ مجھ سے تو کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔" یہی اصل بات تھی جس کے لیے وہ ڈرامہ کر رہی تھیں۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔ کبھی وہ اپنی مرضی سے کالیا اور ماں کے ساتھ کچن میں گھسا کرتا تھا۔ مگر اب اس بات کو تو عرصہ ہو چکا تھا۔

"جی!" ریموٹ رکھ کے اسے چار و ناچار اٹھنا ہی پڑا۔ ماں کی تکلیف دیکھ کے انہیں انکار کرنا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

دوسرے چولہے پہ اپنے اور میرے لیے چائے بھی بنا لے۔" کام یہ کام.... وہ سر ہلاتے ہوئے چلا گیا۔

ہانڈی سے آرام سے ہی ڈھکن اٹھایا تھا مگر اندر بھری ہوئی بھاپ اس کے منہ اور ہاتھ پہ پڑی۔ ساتھ ہی ڈھکن چھوٹ کے نیچے سیدھا اس کے پاؤں پہ گرا۔ ہاتھ، منہ اور اب گرم ڈھکن لگنے سے پاؤں بھی جل گیا۔ وہ تڑپ کے رہ گیا۔

"کیا توڑ دیا؟" وہ بے خیالی میں بھاگ کے جانے لگی تھیں مگر پھر وہیں سے ہانک لگائی۔

"ٹوٹا نہیں، میں جل گیا ہوں۔" اس کا انداز بھی جلا ہوا تھا۔

"آج کالیا ہوتی تو تمہیں یہ سب نہ کرنا پڑتا۔" یہ طعنہ دینا وہ نہیں بھولتی تھیں۔

"ہونہہ! کالیا۔" وہ سر جھٹک کے ڈوئی ہانڈی میں گھمانے لگا۔

چائے نے ابل کے سارا چولہا گندا کر دیا۔ ہانڈی بھونتے گرم گھی کے کتنے ہی چھینٹے اس کے بازو اور منہ پر پڑے۔ وہ اوئی کر کے رہ جاتا۔

چائے بدمزا تھی مگر پھر بھی ساجدہ بیگم نے تعریف کر دی۔ مکھن بھی تو لگانا تھا۔ چائے پی کے وہ کوئی اچھی سی مووی ڈھونڈنے لگا۔

"چل آ کاشی! میں روٹیاں پکاتی ہوں۔ تو سینکتا جا۔ کامی بھی نہیں آیا ورنہ وہی مدد کروا دیتا۔ چل اٹھ۔"

وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ اس کا جی چاہ رہا تھا اپنے سر کے بال نوچ ڈالے۔

☼ ☼ ☼

آج اتوار کا دن تھا۔ وہ دس بجے سو کر اٹھا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کے باہر آیا تو سامنے کے منظر نے اسے حیران کر دیا۔ کامی نے مشین لگائی ہوئی تھی۔ صحن میں میلے کپڑوں کا انبار جمع تھا۔

"یہ تم نے مشین لگائی ہے؟" اس نے دیکھنے کے باوجود حیرت سے استفسار کیا۔

"جی!" وہ بڑا ہی مودب ہوا۔ "کام والی نے چھٹی کر لی۔ اتوار کے روز وہ مشین لگاتی ہے۔ تمہاری ہفتے بھر

کی پینٹیں، شرٹیں پڑی تھیں، میں نے خود ہی زحمت کرلی ہے۔"

اس نے جان بوجھ کر کاشی کے کپڑوں کا ذکر بطور خاص کیا، حالانکہ میلے کپڑے سب کے ہی تھے۔

"اچھا، امی کہاں ہیں؟ ناشتہ نہیں ملے گا۔" اس نے ماں کی تلاش میں ادھرادھر دیکھا۔

"وہ تندرست ہوتیں تو میں تھوڑی جتا ہوتا۔ ان کے سر میں شدید درد ہے۔ پاپا کو اور انہیں بھی میں نے ناشتہ بنا کے دیا ہے۔ یہ تھوڑا سا کام کرلوں، تمہیں بھی بنا دیتا ہوں۔" اس نے کپڑے اٹھا کے مشین میں ڈالے۔

"نہیں یار! تم اپنا کام کرو، میں خود ہی ناشتہ بنا لیتا ہوں۔"

اب وہ اتنا بھی برا نہیں تھا کہ مزید پھیل ہی جاتا۔ اس میں احساس کا مادہ باقی تھا۔ ناشتہ کرکے اس نے سنک میں پڑے برتن خود ہی دھو کے اسٹینڈ میں رکھے۔ تھوڑا پھیلاوا تھا، وہ سمیٹا اور ساجدہ کے کمرے میں آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی وہ چوکنا ہو گئیں۔ ان سے حال احوال پوچھ کے کافی دیر سر دبا کے وہ اٹھا تھا۔

کامی سیڑھیوں پہ بیٹھا موبائل پہ مصروف تھا۔

"سوری یار! میری امی کی طبیعت ٹھیک نہیں میں نہیں آسکوں گا۔" تھوڑے توقف کے بعد وہ پھر بولا۔

"کچھ نہیں ہوتا، میں رات کو ٹیسٹ کی تیاری کر لوں گا۔ ہو گئی تو ٹھیک ورنہ میں کل یونیورسٹی نہیں آؤں گا۔ میں ٹیسٹ چھوڑ سکتا ہوں مگر اپنی ماں کو اس حال میں نہیں، ہاں..... او کے بائے۔" آخری جملہ کافی جذباتیت سے ادا کیا گیا۔ کاشی اس کے پاس ہی آ کھڑا ہوا تھا۔

"تمہارے دوست کا فون تھا؟ کل ٹیسٹ ہے اور تمہاری تیاری نہیں؟" وہ خاصی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

"تیاری ہے بس دو، تین بار Repeat کرنا پڑے گا، مگر میرے پاس ٹائم ہی نہیں۔ کپڑے دھوؤں کہ پڑھوں۔" اس نے بے بسی سے اپنی حالت زار واضح کی۔

"تم جا کے پڑھو۔ میں کپڑے دھولوں گا۔"

کامی کا دل بلیوں اچھلا تھا۔

"میں دوست کی طرف کمبائن اسٹڈی کے لیے جا رہا ہوں۔ دوپہر کا کھانا بازار سے لے آنا۔" مزید ہدایات دیتے وہ جلدی سے باہر بھاگ گیا، جبکہ کاشی سوچوں میں ڈوبا کھڑا تھا۔ کبھی کایا یونہی اسے سارے جھنجھٹوں سے آزاد کرکے پڑھنے کا وقت دیا کرتی تھی۔ اسے شدت سے وہ یاد آرہی تھی۔

☼ ☼ ☼

تب ہی رمضان المبارک کا مہینہ بھی آگیا۔ لمبے دنوں اور گرمی کے باوجود بھی اس ماہ مبارک کے تقدس کا جوش لوگوں میں پایا جا رہا تھا۔ بازاروں میں یکدم رش بڑھ گیا تھا۔ دکانوں پہ لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

کاشی نے کبھی روزہ نہیں رکھا تھا۔ کایا اسے ڈانٹ ڈپٹ اور منتیں وغیرہ کرکے جمعۃ المبارک کا روزہ بمشکل رکھوا پاتی۔ البتہ باقی سب باقاعدگی سے روزہ رکھتے تھے۔

کاشی اور کامی عشاء کی نماز پڑھنے گئے۔ نماز ادا کرکے کامی تراویح پڑھنے لگا، جبکہ وہ گھر لوٹ آیا۔ اسے کون سا روزہ رکھنا تھا جو تیاریاں کرتا۔ کامی نے سلام پھیر کر اپنے برابر اس کی خالی جگہ پا کر افسوس سے سر ہلایا۔

"کاشی! روزہ رکھو گے؟" ساجدہ بیگم نے دوپٹہ نماز کے انداز میں لپیٹا ہوا تھا، شاید کچھ پڑھتی ہوئی آگئی تھیں۔

"نہیں۔" اس نے یک لفظی جواب دے کے جلدی سے میوزک چینل سے QTV لگا دیا۔

"تمہاری مرضی ہے، مگر پورا مہینہ تم خود ہی اپنا ناشتہ بنانے کی زحمت اٹھاؤ گے۔ تین بجے اٹھ کے سحری بناؤ اور پھر سات بجے تمہارے لیے ناشتہ بنانا..... میں نہیں اٹھوں گی۔" انہوں نے صاف ہری جھنڈی

دکھادی تھی۔

وہ بنا کچھ کہے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

آج چوتھا روزہ تھا۔ آفس سے افطاری سے گھنٹہ بھر قبل ہی چھٹی ہو جاتی۔ آفس میں اب بریک ٹائم نہیں ہوتا تھا۔ دن بھر بھوکا رہنا پڑتا۔ کامی ماں کے ساتھ افطاری بنانے میں مصروف رہتا اور وہ لاؤنج میں بیٹھا ان کی باتیں، تبصرے، کبھی کبھار کایا کا ذکر اور بہت کچھ سنتا رہتا۔ وہ دونوں پکانے میں اتنے مصروف ہوتے کہ اس کی طرف ان کا دھیان ہی نہ جاتا۔ روزہ کھلنے سے پہلے دسترخوان لگتا۔ تب وہ سب کے ساتھ مل کر پیٹ پوجا کرتا۔ جب کایا ساجدہ بیگم کے ساتھ افطاری بنایا کرتی تھی۔ تب بھی ساجدہ اسے کچن میں پھٹکنے نہ دیتی تھیں۔ وہ اپنے طور پر اسے روزہ نہ رکھنے کی یہی سزا دیتی تھیں کہ بیٹھ کر دسترخوان لگنے کا انتظار کرو۔ کایا ان سے آنکھ بچا کر اسے کمرے میں جانے کا اشارہ کرتی اور ان سے چھپا کر پکوڑے، سموسے، کھجوریں اور چاٹ کی پلیٹیں اسے چپکے سے پکڑا جاتی۔ دوسری بار وہ بھرپوری ڈھٹائی سے سب کے ساتھ بیٹھ کر بھی کھاتا۔

وہ یونہی گم صم سا کچن کے دروازے میں آ کھڑا ہوا۔ کامی کباب تلنے کے ساتھ ماں کو اپنی یونیورسٹی کا کوئی قصہ بڑی دلچسپی سے سنا رہا تھا۔ وہ چاول بگھارتے ہوئے اسے ہوں، ہاں میں جواب دیتے گاہے بگاہے مسکرا بھی رہی تھیں۔ وہ کسی کو بنا مخاطب کیے کھڑا رہا۔ انہوں نے اس کی موجودگی کو ذرا اہمیت نہ دی۔ یہ وہ کافی عرصہ سے نوٹ کرتا آرہا تھا۔ باپ سے بھی اس کا سامنا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ کایا کے جانے کے بعد سے لے کر آج تک نواز کریم نے ایک بار بھی اسے مخاطب نہ کیا تھا۔

ساجدہ بیگم نے یونہی ذرا کی ذرا اسے دیکھا۔ جو شاید یہ کسی نادیدہ چیز کو گھور رہا تھا۔ جانے ان کے جی میں کیا سمائی، اسٹینڈ سے پلیٹ اٹھا کر اس میں دو سموسے، پکوڑے اور کباب رکھ دیے۔ چھوٹے سے پیالے میں دہی بڑے اور چٹنی نکال کے سب ٹرے میں رکھا

اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ لو۔" وہ یکدم چونکا۔ یہ انداز، یہ حرکت اسے بری طرح کسی کی یاد دلا گیا۔ وہ اب اسے اکثر ہی یاد آنے لگی تھی۔

"نہیں۔" اس کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا۔ آواز بھی بوجھل سی ہو گئی تھی۔ وہ "فوراً" سے پیشتر پلٹ گیا۔

ساجدہ زیرلب مسکرا رہی تھیں، کیونکہ انہوں نے یہ حرکت بھی اسے بطور خاص کسی کی یاد دلانے کے لیے ہی کی تھی۔

☼ ☼ ☼

نواز کریم دکان پہ جانے کے لیے نکلنے ہی والے تھے کہ انہیں کچن میں ہلکے شور کی آواز سنائی دی۔ سارے گھر میں خاموشی تھی۔ وہ سمجھے شاید بلی وغیرہ نہ ہو، یہی سوچ کر وہ کچن میں آئے۔

کاشی نک سک سے تیار، آفس بیگ اسٹول پہ دھرے، پلیٹ میں سیب کاٹ رہا تھا۔ دودھ کا ٹھنڈا گلاس بھرا پڑا تھا۔

"تم روزہ کیوں نہیں رکھتے؟" وہ یکدم اس آواز پہ پلٹا۔

"وہ..... مم..... میں۔" وہ ہکلا کے رہ گیا۔ باپ کا سامنا کرنے سے وہ کتراتا تھا۔

"کیا میں، میں؟ تم واقعی بیوقوف ہو یا ہم سب کو بناتے ہو؟ گدھے جتنے ہو گئے ہو، مذہب کی تمہیں شدبد نہیں۔ تم جیسوں کی بھرتی دوزخ میں ہوتی ہے، جنہیں نہ منہ زور خواہشات پہ بند باندھنا آتا ہے اور نہ زبان پہ قابو ہوتا ہے۔"

دوزخ کے نام پہ اس نے جھرجھری سی لی۔

"ماں باپ کی عزت کا خیال، نہ ہی رشتوں کی پاسداری کا، اور..... ہاں میری بھانجی کے بارے میں بھی کوئی فیصلہ کر دو۔ میں اس کے گلے میں تم جیسے احسان فراموش کا طوق مزید نہیں لٹکانا چاہتا۔ میری نیک سیرت بیٹی کو تم سے لاکھ درجے بہتر قدر دان مل جائے گا۔ ہونہہ!" نواز کریم کا لہجہ اٹل اور سخت تھا۔

اس کے دل پہ گھونسا سا پڑا تھا۔ اس نے کب اتنا آگے کا سوچا تھا؟ کلیا سے خود ساختہ ناراضی ضرور تھی، مگر اسے ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے نکال دینا.... وہ پلیٹ اور دودھ کا گلاس یونہی فریج میں رکھ کے نکل آیا۔

☼ ☼ ☼

اگلے روز وہ ساڑھے تین بجے کا الارم لگا کے سو گیا۔ نہ صرف اٹھ کے سحری کھائی بلکہ فجر کی نماز پڑھنے بھی گیا، جو وہ اکثر گول کر جایا کرتا تھا۔ کامی اور ساجدہ کی حیرانی بجا تھی کیونکہ آج جمعۃ المبارک نہیں تھا، البتہ نواز کریم مطمئن تھے۔ وہ کامی اور ساجدہ کی سازشوں سے بے خبر نہیں تھے۔ انہوں نے بھی موقع ملتے ہی حسب توفیق اپنا حصہ ڈال دیا تھا، پھر اس نے نہ صرف خاموشی سے سارے روزے رکھے بلکہ نمازیں بھی پڑھی اور اب کامی کی جگہ وہ افطاری میں ماں کی مدد کیا کرتا۔ اپنے سارے کام خود بخود انجام دے لیتا۔

آج اٹھائیسواں روزہ تھا۔ اتوار کے باعث وہ گھر پہ ہی تھا۔ اس نے سوچا، ہو سکتا ہے کل چاند رات ہو جائے، سو کمرے کی تفصیلی صفائی کرنی چاہیے۔

اس نے الماری سے سارے کپڑے نکال کر بیڈ پہ ڈھیر کر دیے۔ آدھا گھنٹہ لگا کے انہیں تہہ کیا اور ان کی جگہ پہ واپس رکھا۔ کئی خانوں میں اس نے یونہی چیزیں گھسا رکھی تھیں، وہ سب باہر نکالتے اس نے الماری کا اندرونی بند دروازہ کھول لیا۔ آگے ہی دو کیس پڑے تھے۔ ایک کیس میں سونے کی چار چوڑیاں تھیں، جو اس نے منہ دکھائی میں کلیا کو پہنائی تھیں اور دوسرے میں سونے کا سیٹ تھا، جو نواز کریم نے اس کے لیے اپنی کمائی سے خریدا تھا۔ وہ دونوں کیس نکال کے بیڈ پر آ بیٹھا۔ چوڑیوں پر انگلی پھیرتے اسے بے اختیار ہی پہلی رات یاد آنے لگی۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ رینگ گئی۔ چوڑیاں رکھ کے اس نے دوسرا ڈبہ کھولا اور حیران رہ گیا کیونکہ وہاں سونے کا سیٹ نہیں تھا۔ ڈبہ خالی تھا۔

"امی.... امی!" وہ ماں کو آوازیں دیتا باہر آیا تھا۔ کامی نیچے قالین پہ کتابیں پھیلائے کچھ لکھ رہا تھا۔ ساجدہ شربت پکڑے اس کی تیز پکار پہ دوڑتی آئی تھیں۔

"کیا طوفان آ گیا، جو اس طرح چلا رہے ہو۔"

"امی! یہ ڈبہ خالی ہے۔" اس نے ڈبہ ان کے سامنے کیا۔

"ہاں! مجھے بھی نظر آ رہا ہے۔" انہوں نے ناسمجھی سے کہا۔

"اس میں کلیا کا سونے کا سیٹ تھا، وہ کہاں گیا؟ کیا وہ ساتھ لے گئی ہے؟" اس نے ایک ہی سانس میں بتا کر پوچھ بھی لیا۔

کامی قلم رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہائے ہائے یہ کیا کہہ رہا ہے کاشی؟" اب انہوں نے خالی کیس اس سے جھپٹ لیا۔

"اس نے میرے اور کامی کے سامنے ہی بیگ میں صرف کپڑے رکھے تھے۔ ہم اسے مسلسل منع کر رہے تھے، پھر اس نے چابیاں مجھے پکڑا دیں۔ خدا گواہ ہے وہ صرف کپڑے لے کر گئی ہے اور زیور...." انہوں نے حواس باختہ ہو کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ زیور کی گمشدگی نے انہیں ہراساں کر دیا تھا۔

"پھر بھی آپ ایک بار اسے فون کر کے پوچھ لیں۔" وہ جیب سے موبائل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔

"کلیا نے زیور بیچ دیا تھا۔" کامی کے منہ سے نکلے الفاظ نے اسے ساکت کر دیا۔

"جب تم نے بائیک لینے کی ضد کی تو نہ بابا کے پاس اتنی رقم تھی، نہ ہی اس کے پاس۔ مروت کی ماری، رشتوں کو نبھانے والی، مجازی خدا کے ہر لفظ کو حرف آخر سمجھ کر حکم بجا لانے والی کلیا نے تمہاری خواہش کے لیے زیور بیچ ڈالا۔ اس کے نزدیک زیور کی اہمیت تم سے بڑھ کر نہیں تھی۔ اس نے مجھے اپنا شریک راز بنایا تھا۔ ماما، ابو سے یہ سب چھپانا ضروری تھا ورنہ وہ اسے یہ سب نہ کرنے دیتے۔ میرے ساتھ ہی وہ جیولر کے پاس گئی تھی۔" یہ وہ بات تھی، جو اتنا عرصہ میں اس نے بالکل سچ بتائی تھی۔

"تو بہت پچھتائے گا کاشی!" ساجدہ بیگم آنکھوں میں آنسو لیے پلٹ گئیں۔

کاشی کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ سر یکدم بہت بھاری ہو گیا تھا۔ اس کے اندر طوفان اٹھ رہا تھا۔ وہ اپنا آپ چھوٹے بھائی سے چھپاتا مڑ گیا۔ بیڈ کراؤن سے سر ٹکاتے چپکے سے دو آنسو اس کی پلکیں نم کر گئے۔

☼ ☼ ☼

آج انتیسواں روزہ تھا۔ کلیا کی برسوں کی محنت، ساجدہ بیگم اور کامی کی سازشوں نے وہ اثر نہیں کیا تھا جو اس واقعے نے کر دکھایا تھا۔ اب وہ اپنے اس مسئلے کے حل کے لیے کامی کے پاس آیا تھا، جو کب سے ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔

"نہیں یار! میں کلیا کو منانے نہیں جاؤں گا، پھر مجھے اسے منانا بھی نہیں آتا اور پھوپھو.... میں ان کا سامنا کیسے کر پاؤں گا۔ کوئی اور حل سوچ۔"

وہ آج ہی کی تاریخ میں کلیا کو واپس لانا چاہتا تھا مگر خود جانے سے ہچکچا رہا تھا۔

"میرے پاس مشوروں کا انبار ہے، مگر میں تم جیسے انسان پر اپنی صلاحیتیں نہیں کرنا چاہتا۔ آخری بار بتا دے نہیں جائے گا؟" وہ انگلی اٹھاتے ہوئے تیز ہوا۔

کاشی نے پر زور انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

"میں جاؤں گا کلیا کو لینے اور واپس لے کر آؤں گا مگر میرا ذمہ اسے یہاں تک لانا ہے۔ آگے روکنا تیرا ذمہ ہے۔"

"جیو میرے بھائی! بس ایک بار یہ معجزہ رونما ہو جائے۔" کامی کی اس پیشکش پہ اس کا دل باغ باغ ہو گیا تھا۔

"نکال دس ہزار روپے.... میرے مشورے اور تیری بیوی کو واپس لانے کی فیس۔"

"تو نے کوئی مشورہ سینٹر کھولا ہوا ہے، بھائی ہوں میں تیرا۔" کاشی نے آنکھیں پھیلا کر اس کی غیرت جگانا چاہی۔

"ہرگز نہیں۔ میں نے تھوڑی دیر کے لیے فرض کر لیا ہے کہ تو میرا بھائی نہیں اور میں اس دنیا کا سب سے برا اور آخری کمینہ ترین انسان ہوں۔ اب نکال پیسے، ورنہ میں جا رہا ہوں۔ تھوڑی بھی دیر کی تو فیس بڑھا دوں گا۔" ساتھ ہی دھمکی بھی دے دی تھی۔

"اپنی اور میری اتنی پرانی رشتے داری کا ہی لحاظ کر لے۔ پانچ ہزار کافی ہیں؟" وہ کامی کے ماتھے کے بل گن چکا تھا۔ اس لیے منتوں پہ اتر آیا۔

اس سلسلے میں اس نے ماں سے بھی رجوع کیا تھا، مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ عید میں وقت ہی کتنا رہ گیا تھا۔ کلیا کے بغیر ایک پل بھی کاٹنا دشوار ترین لگ رہا تھا۔

"تم رشتے داری کی آڑ میں میرا کاروبار ٹھپ کروانا چاہتے ہو نا ہنجار! چلو اب میں اتنا بھی بے حس نہیں۔ میں اس رشتے داری کو مدنظر رکھتے ہوئے تمہیں ایڈوانس میں ڈسکاؤنٹ دے دیتا ہوں۔ جب اگلی بار تو کلیا کو نکالے گا، میں تجھ سے ساڑھے نو ہزار وصولوں گا۔ اب خوش۔" وہ اس وقت اسے کوئی رعایت دینے کو تیار نہ تھا۔

"اگر تیری کمینگی یونہی سدا بہار رہی تو میں اس دنیا میں کیا، اگلے جہاں میں بھی اسے خود سے دور نہیں کروں گا۔" کاشی نے دانت کچکچاتے ہوئے والٹ نکال لیا۔

"وہ تمہاری مرضی، مگر میں ایک اچھے رہنما کے طور پر، تمہارے برے وقت کا منتظر رہوں گا۔" وہ مسکرایا تھا۔

کاشی ایک بار نوٹ گن کر پھر سے گن رہا تھا۔ اس نے فوراً جھپٹ لیے۔

☼ ☼ ☼

کلیا پہ شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ کامی نے اسے ہمیشہ اپنے ہر منصوبے سے باخبر رکھا تھا۔ کاشی کی خاموشی، بدلتی شخصیت، وہ اسے ہر رپورٹ پہنچاتا رہا تھا۔ کلیا واقعی سمجھدار تھی۔ اس نے یہ ایشو

نہیں کھڑا کیا تھا کہ وہ خود اسے لینے آئے‘ کیونکہ وہ اسے اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اس کے گھر آنے کی ہمت کرنے میں کم از کم دس‘ پندرہ دن لگا ہی دے گا۔ وہ اتنا لمبا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی اپنے گھر جانے‘ اسے دیکھنے اور اس کے ہمراہ عید کی خوشیاں منانے کو بے چین تھی۔ اسے لگتا تھا اس ستم گر سے بچھڑے صدیاں بیت گئی ہیں۔

”مگر کامی! اس طرح میں کم تر پڑ رہی ہوں۔ اس نے نکالا‘ میں آ گئی‘ وہ بلا رہا ہے میں جا رہی ہوں۔ ہمارے ماسٹر پلان کا اینڈ کچھ اچھا نہیں ہو رہا۔“ وہ پھر سے منہ پھلا کے بیٹھ گئی۔

”ہوں‘ یو آر رائٹ‘ اوں..... اوں..... آئیڈیا۔“ اس نے چٹکی بجائی۔ موبائل نکال کے کاشی کو کال کرنے لگا۔

”ہاں یار! غضب ہو گیا۔ کلیا پہلے ہی آنے کو تیار بیٹھی ہے۔ نہیں..... نہیں رہنے کے لیے نہیں۔ اس کے کچھ قیمتی کپڑے پڑے ہیں‘ وہ عید کے لیے لینے آ رہی ہے۔ میں نے تمہاری خواہش بتائی مگر وہ تو کچھ سن ہی نہیں رہی۔ یار تو ایسا کر‘ جلدی سے بیمار بن جانا۔ اتنی کٹھور نہیں ہے‘ تجھے دیکھتے ہی دل پسیج جائے گا۔ ہاں ہاں جلدی کر! میں اسے لے کر آ رہا ہوں۔“

کاشی کے ہاتھ پیر اچھے خاصے پھلا کے اس نے فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

وہ ہچکچاتے ہوئے اندر داخل ہوئی۔ اس کے کپڑوں کا بیگ کامی نے ڈرائنگ روم میں چھپا دیا تھا۔ ساجدہ سے وہ چپکے سے کمرے میں جا کے مل آئی تھی۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ اس نے ٹیوب لائٹ روشن کی۔ مریض نے آنکھوں سے بازو ہٹا کے بیوی کو دیکھا۔ دونوں کے دل ایک ہی تال پہ دھڑک اٹھے۔ دونوں نے فوراً“ نظریں چرا لیں۔ وجود میں ایک بے قراری سی دوڑ گئی تھی۔ اس نے الماری کے نچلے خانوں سے اپنی کیس نکال کر بیڈ پر دھرا اور اسے کھول کر کپڑے پھیلانے لگی سماعتیں کسی کی آواز کی شدت سے منتظر تھیں۔

اسے کپڑے اکٹھا کرتا دیکھ کر کاشی گھبرا گیا تھا۔ اسے اور کچھ نہ سوجھا تو کھانسنا شروع کر دیا۔ ایک بار تھوڑا سا‘ دوسری بار اور تیسری بار اس کی کھانسی کا دورانیہ اتنا بڑھ گیا کہ کلیا کپڑے چھوڑ چھاڑ اس کے پاس بھاگی گو کہ وہ اس کی چالاکی سمجھ رہی تھی۔

”کیا ہوا کاشی؟ تم ٹھیک تو ہو؟“

زبردستی کھانس کھانس کے خاصا برا حال کر لیا تھا۔ اب بجائے خوش ہونے کے ہانپ رہا تھا۔

”مجھے رات سے 105 بخار ہے مگر کسی نے مروتاً بھی جھانک کر حال نہیں پوچھا۔“ چہرے پہ انتہائی بیچارگی طاری کر لی گئی۔ ساتھ ہی غیر ارادی دونوں بازو کمر کے نیچے کر لیے۔

”تم خود ڈاکٹر کے پاس چلے جاتے۔“ وہ بھی مصنوعی پریشانی سے بولی۔

”روزے دار بندہ ہوں۔ یونو پانچ روزے چھوڑ باقی سارے رکھے ہیں۔“ اپنی تعریف کا موقع ہاتھ سے کیوں جانے دیتا۔ رعب جمانا بھی ضروری تھا۔

”چلو! میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتی ہوں۔ کم از کم دوا تو لے آئیں۔“

”چلو اٹھو بھی! پھر مجھے گھر بھی جانا ہے۔“ اس نے عجلت دکھائی۔

”کون سے گھر؟“ یہ سنتے ہی وہ چست ہوا۔

”اپنے گھر۔“ وہ جی کڑا کر کے بولی۔

”صرف یہ گھر تمہارا اپنا ہے‘ جس میں ‘میں رہتا ہوں اور کوئی بھی نہیں۔“ وہ یک ٹک اسے دیکھتی رہ گئی۔ وہ واقعی کتنا بدل گیا تھا۔

وہ اٹھ کے بیٹھ گیا اور کلیا کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی قریب بٹھا لیا۔

”آئی ایم سوری کلیا! رئیلی سوری۔“ کافی توقف کر کے بولا۔

”میں تمہیں اور تمہاری محبتوں کو فار گرانٹڈ لیتا رہا۔ میری سوچیں صرف میری ذات تک محدود تھیں۔ میں تم سے کچھ بھی نہیں کہوں گا۔ اپنی ساری زیادتیوں کے لیے کوئی دلیل‘ نہ ہی کوئی بھونڈی سی وضاحت کیونکہ تم جانتی ہو میں کتنا اسٹوپڈ ہوں۔ تم نے مجھے میرے پیروں پہ کھڑا کر کے مجھ پہ جو عظیم احسان کیا ہے میں کبھی بھی اس کا بدلہ چکا نہیں پاؤں گا اور اس سب کے لیے تھینکس بہت چھوٹا لفظ ہے۔ خود انحصاری اور بہادری کا شوق چرایا تھا مجھے‘ مگر میں جان گیا ہوں کہ میں ایک کمزور انسان ہوں یا..... یا پھر تمہارا اس قدر عادی ہو چکا ہوں کہ مجھ سے کوئی کام‘ کوئی فیصلہ تمہارے بغیر کیا نہیں جاتا۔ مجھے اپنی زندگی کے ہر موڑ پر تمہاری مدد درکار ہے۔ میں تمہارے بغیر کچھ بھی نہیں ہوں۔“ وہ اس کا ہاتھ تھامے آنکھوں میں محبت کے دیپ جلائے اسے تک رہا تھا۔

”میں بھٹک جاؤں گا۔ جی نہیں پاؤں گا تمہارے بغیر۔ میں بہت برا ہوں کلیا‘ بہت برا.....“ یکدم چہرے پہ ڈھیروں ندامت چھا گئی۔ وہ دنگ رہ گئی تھی۔ اسی قدر واضح اعتراف۔

”آئی نو تم بہت برے ہو مگر..... جیسے بھی ہو میرے تو ہو۔“ اس نے چونک کر سر اٹھایا تو وہ دھیرے سے مسکرا دی۔

”تم سیریسلی بہت اسٹوپڈ ہو کاشی! تم نے سوچا بھی کیسے میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟ یہ اتنا عرصہ تمہارے بغیر کیسے کاٹا ہے میں ہی جانتی ہوں‘ پھر تم جتنی محبت کون کرے گا مجھ سے؟ پہلے غلطیاں کرتے ہو پھر تسلیم کر کے معافی بھی مانگ لیتے ہو۔ مجھے یاد کر کے غمگین ہوتے ہو۔ روزے تک رکھ لیتے ہو۔ مجھے واپس لانے کے لیے کامی کی منتیں بھی کرتے ہو اور تو اور..... خود کو 105 بخار بھی چڑھا لیتے ہو۔“ چہرے پہ گہری سنجیدگی مگر آنکھوں میں بھرپور شرارت لیے وہ کہہ رہی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے سن رہا تھا۔

”آئی لو یو کلیا!“ وہ خفیف سا ہو کر مسکرا دیا۔

”آئی لو یوٹو.....“ اس کا اظہار بیچ میں ہی رہ گیا کیونکہ کامی دہاڑ سے دروازہ کھول کے اتنے رومانٹک ماحول کا ڈراپ سین کر چکا تھا۔

”تم باہر نہیں آ رہیں کلیا؟“ کب سے ویٹ کر رہا ہوں۔ پھپھو نے کہا تھا جلدی چھوڑ جانا اور ہاں..... کاشی! کلیا کہہ رہی تھی کہ یہ بائیک واپس لے جائے گی کیونکہ یہ امی نے تمہیں لے کر دی تھی۔ تم سے تو کوئی صلہ ملا نہیں‘ چلو بائیک تو ملے اور کلیا آئی تھنک یہ کمپیوٹر بھی لے جاؤ۔ یہ بھی تو تمہارے پیسوں کا ہے۔“

وہ ان دونوں کو بولنے کا موقع دیے بغیر اپنی ہانکے جا رہا تھا۔

”ذلیل‘ خبیث‘ فسادی ہمیں ملانے کے بجائے الگ کر رہا ہے۔ تو نے کلیا کو یہاں تک لانے کے مجھ سے دس ہزار بٹورے اب پھر سے جھگڑا ڈلوا رہا ہے۔“ کاشی جست لگا کے اس کے پیچھے لپکا تھا۔ وہ بھی کہاں قابو آنے والا تھا۔

بہت عرصہ بعد اس گھر کے در و دیوار نے ان دونوں کی اس طرح کی چیخ و پکار سنی تھی۔ ساجدہ بیگم مطمئن سی مسکراتی ہوئی باہر آئی تھیں۔

”ہائے کاشی! اس نے دس ہزار مجھ سے بھی اینٹھے ہیں۔“ کلیا نے بھی بروقت دہائی دی۔

”ہائیں!“ ..... اس نے دانت کچکچائے۔

کامی کو بس اتنی ہی مہلت چاہیے تھی۔ وہ لمبی چھلانگ لگاتا سیڑھیاں چڑھ گیا۔ کلیا پیٹ پہ ہاتھ رکھ کے ہنسے جا رہی تھی۔ ساجدہ بھی ہنس رہی تھیں۔ اوپر چھت پہ سے ان کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ زندگی اپنی پوری خوب صورتی اور مسکراہٹوں سمیت پھر سے اس گھر میں لوٹ آئی تھی۔

"ہائے اماں! اتنا اچھا سوٹ تھا وہ 'میری تو آنکھیں جم کر رہ گئیں اس پر 'دل چاہا کہ سوٹ اٹھا کر بھاگ جاؤں مگر دکان دار شاید میرا ارادہ بھانپ گیا تھا 'جب ہی تو مسلسل گھورے جا رہا تھا 'پھر میں نے ہمت کر کے قیمت پوچھ ہی لی۔ پھر تو بس 'مت پوچھیں ' دن میں تارے نظر آ گئے۔

دکان دار طنزیہ انداز میں مسکرانے لگا 'اماں! اس وقت میرا دل چاہا کاش! میرا پرس نوٹوں سے بھر جائے اور میں اس دکان سے ساری قیمتی چیزیں خرید لوں۔ مگر ہائے! یہ خوابوں کی خوب صورتی اور حقیقت کی بے رحمی۔ بھلا میرا پرس اور اس میں پیسے ناممکن... بالکل ناممکن۔"

اماں کا منگوایا ہوا سامان ان کے آگے ڈھیر کرنے کے بعد حسب عادت ارمہ اپنی خواہشات کا رونا رو رہی تھی اور اماں بظاہر اس سے غافل سامان کا جائزہ لے رہی تھیں مگر درحقیقت اس کا ایک ایک لفظ ان کے دل و دماغ پر رقم ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ پہلے سے جانتی تھیں کہ بازار کی چکاچوند دیکھ کر اس کا ضدی دل ضرور مچلے گا 'مگر وہ روکتیں بھی تو کیسے۔ اسے قیمتی چیزیں خرید کر تو نہیں دے سکتی تھیں 'اب دیکھنے پر بھی پہرے لگا دیتیں۔ وہ پورا سال خوشی خوشی گزارتی۔ مگر رمضان میں جب وہ سب کی عید کی تیاریاں دیکھتی اس کا دل بھی مچل جاتا اچھی اچھی اور بہت ساری شاپنگ کرنے کے لیے۔

اماں چونکہ اس کی اس عادت سے بخوبی واقف تھیں اس لیے خصوصاً" ماہ رمضان میں اسے باہر بھیجنے سے گریز کرتیں مگر آج ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور سامان منگوانا بھی ضروری تھا کہ کپڑے آج ہی سی کر دینے تھے 'سو اسے بھیج دیا تھا اور تب سے وہ شروع تھی۔

"اور ہاں اماں! ایک شوپیس بڑا اچھا لگا مجھے۔ تھا بھی وہ اتنا نازک اور خوب صورت کہ بس... اگر میرے پاس اتنے پیسے ہوتے ناں تو میں اسے ضرور خریدتی اور پھر وہاں اس ٹیبل پر رکھتی 'اتنا اچھا لگتا اور اماں! جیولری... اف میں تو دنگ رہ گئی "اور ہاں اماں! میں نے عید کے لیے دو سوٹ پسند کر لیے ہیں۔ ویسے تو سارے ہی کپڑے اچھے تھے 'مگر اب سارا بازار تو نہیں خرید سکتے نا۔"

"اچھا بابا! جیسے تمہاری مرضی 'مگر اب اٹھو 'عصر کی نماز نہیں پڑھنی کیا۔ پھر کچن بھی دیکھنا ہے۔ آج افطار میں کچھ بناؤ گی بھی یا ان کپڑے جوتوں کی تعریف سے ہی پیٹ بھرنا پڑے گا۔" بالآخر اماں کو ٹوکنا ہی پڑا۔

"ارے ہاں اماں! جوتوں سے یاد آیا۔ میں نے عید کے لیے اتنے اچھے شوز دیکھے ہیں۔ سیمی اور عابدہ کے جوتوں سے تو بہت اچھے ہیں۔ اماں! اگر میں وہ لے لوں ناں تو بس عید کا مزا آ جائے۔" وہ چشم تصور میں ان جوتوں کو دیکھنے لگی اور اماں جواب دیے بغیر اٹھ گئیں۔

"جا تو رہی ہوں اماں! ایک تو آپ بھی ناں 'اتنی جلدی ناراض ہو جاتی ہیں۔ اب آپ سے نہیں کہوں گی تو کیا دیواروں سے باتیں کروں گی۔" وہ ناراض

ناراض سی باتھ روم کی طرف بڑھ گئی تو اماں اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ ایک پھیکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر جاگ کر دم توڑ گئی۔

☼ ☼ ☼

پھر جب تک کہ اس کا دوبارہ مارکیٹ جانا نہ ہوا گھر میں سکون رہا لیکن جیسے ہی اسے یہ پتا چلتا کہ فلاں نے عید کے لیے یہ شاپنگ کی ہے اور فلاں کی اتنی تیاری ہو چکی ہے تب زندگی کی ساکت جھیل میں جیسے کوئی پتھر سا گر جاتا پھر اس کے بعد ایک گہری طویل خاموشی.... اس کی یہی خاموشی اماں کی تھکن بڑھا دیتی تھی۔ از خود ہی سلائی مشین کی ہتھی پر ان کا دباؤ بڑھ جاتا۔ نئی سوچ تھکتے ہوئے ہاتھوں میں نئے سرے سے جان ڈال دیتی۔

وہ اماں کی تھکن کے خیال سے ماہ رمضان میں گھر کا ہر کام اپنے ذمے لے لیتی تھی۔ سحری اور افطاری کا اہتمام، دیگر گھریلو امور، روزوں کی ادائیگی نماز اور تلاوت کے ساتھ ساتھ اماں کی ڈانٹ باقی ماندہ وقت میں اماں کا سلائی میں حسب استطاعت ہاتھ بٹانا، کبھی ضرور تا" سلائی کا سامان لینے بازار چلے جانا اور جس دن ایسا ہو جاتا اس دن اماں کے کانوں کی خیر نہ ہوتی۔

وہ اماں کی کیفیت سے بے خبر بس بولتی رہتی اور جب بول چکتی تو خیالوں میں نئے سرے سے سارے جہان کی شاپنگ شروع کر دیتی۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس نے آج تک اماں کو عملی طور پر پریشان نہیں کیا تھا۔ اچھی اچھی چیزیں دیکھ کر اس کا دل للچاتا ضرور تھا مگر وہ جلد ان کے سحر سے نکل بھی جاتی تھی۔

"ہائے اماں! اتنا خوب صورت سوٹ تھا آپ دیکھتیں تو بس دیکھتی ہی رہ جاتیں۔ میرا دل تو بس ٹھہر ہی گیا اس پر۔ ایسی ایسی چیزیں دنیا میں ہیں تو بھلا جنت میں پھر کیا کیا ہوگا۔" اس نے تصور میں پھر اس سوٹ کو چمکتی آنکھوں سے دیکھا جسے آج دوبارہ مارکیٹ میں دیکھ کر آئی تھی۔

"ہاں اور جنت صبر کرنے والوں کے لیے ہی ہے۔" موقع محل کے مطابق اماں نے اسے یہ احساس دلانا چاہا کہ یہ محرومیاں بے کار نہیں جائیں گی، ان کا بھی اجر ملے گا، مگر ارمہ کا اماں کی باتوں پر دھیان ہی کب تھا۔ وہ تو اپنے ہی خیالات کی رو میں بہہ رہی تھی۔

"اور ہاں اماں! اس بار آپ کچھ نہیں کہیں گی نہیں، اس بار میں اپنی پسند کا اچھا سا سوٹ لوں گی۔ سال میں ایک ہی تو ایسا موقع آتا ہے کہ جس کا اہتمام ہر چھوٹا بڑا مل کر کرتا ہے۔ کوئی تفریق نہیں ہوتی۔"

"حالانکہ عید تو روزے داروں کے لیے ہوتی ہے جبکہ یہاں تو ایسا لگتا ہے جیسے رمضان کا مہینہ آیا ہی درحقیقت عید کی تیاری کے لیے ہے بلکہ مجھے تو یوں لگتا ہے اگر رمضان کے نتیجے میں عید کا انعام نہ ہوتا تو شاید رمضان ویسا نہ ہوتا جیسا ہوتا ہے۔" اماں نے جتا کر کہا۔

"اماں! میری بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔ آپ نے جواب نہیں دیا، آپ مجھے وہ سوٹ دلا دیں گی نا۔ ہر بار آپ خاموش ہو جاتی ہیں۔"

"ہو سکا تو دلا دوں گی۔" دانستہ اسے زیادہ امید نہیں دلائی کہ اس کی خواہشات کے معیار سے واقف تھیں۔

"ہو سکا نہیں اماں! ہاں یا نہ کہیں۔" آج تو وہ بڑی ضدی بچی بنی ہوئی تھی شاید بازار کا سارا ارش اس کے سر میں سما گیا تھا۔

"بیٹا! تمہیں ریڈی میڈ لینے کی کیا ضرورت ہے تمہارے لیے تو میں نے بہت اچھا اور عمدہ ڈیزائن سوچ رکھا ہے۔" حسب عادت اسے پچکارنا چاہا۔

"یعنی پھر وہی گھر کا سلا سوٹ؟" اماں کے نرم لہجے سے اسے سخت مایوسی ہوئی۔

"بس اماں! آپ مجھے پیسے دے دیں میں اپنی پسند سے شاپنگ کروں گی۔ آخر ساری دنیا کرتی ہے۔ میرا کیا قصور ہے؟ اماں! اس سے پہلے میں نے کبھی ضد کی ہے۔ صرف رمضان میں ہی تو دل چاہتا ہے کہ محلے کی ساری لڑکیوں کی طرح میں بھی خوب شاپنگ کروں اور اب آپ کہہ رہی ہیں کہ گھر کا سوٹ پہن لینا۔"

"لیکن بیٹا! وہ کوئی عام جوڑا تو نہیں ہوگا۔ تمہاری ماں کی محنت سے بنا ہوگا۔ ریڈی میڈ سوٹ کے لیے ہاتھ کا کھلا ہونا بھی تو ضروری ہے۔"

بالآخر اماں نے اپنی کمزوری کا اظہار کر ہی دیا اور وہ ہمیشہ کی طرح خاموش ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ اماں اس سے کچھ اور کہتیں وہ اٹھ کر باہر آگئی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔

"عابدہ خاتون یہیں رہتی ہیں؟"

دروازہ کھولنے پر ایک خوش پوش نوجوان اس سے محو سوال تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے دائیں کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ اشارہ پاتے ہی وہ آگے بڑھ گیا جبکہ ارمہ کی آنکھیں خوب صورت چمچماتی ہوئی سفید شیراڈ پر جم گئیں۔

"جی اماں۔" اس نووارد کو مکمل طور پر بھلا کر اماں کی آواز پر جواب دیا۔

وہ آنے والے کو مکمل بھلائے بڑے بے نیازی سے مخاطب تھی۔

"ارمہ الماری کے اوپر والے خانے میں جو سلے ہوئے کپڑے رکھے ہیں۔ وہ لے آؤ۔"

"کون سے اماں! وہ جو بہت مہین کپڑا ہے۔ اطلس و دیبا اور کمخواب جیسا؟" اس کی بات پر کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے سرمد ضیاء نے بے ساختہ ارمہ پر نظر ڈالی اور یہ نظر صرف ایک پل کو اس پر ٹھہری تھی۔ بکھرے بالوں کو بہ مشکل بینڈ میں قید کیے اپنے تین رنگی لباس میں پر شوق لہجے میں۔ بولتی ہوئی ارمہ اسے سخت لاپروا اور ظاہری حسن کی دلدادہ محسوس ہوئی۔

"ہاں وہی۔" مختصر جواب دے کر اماں پھر اس کی طرف متوجہ ہو گئیں انہیں اس کا اس طرح بولنا بالکل اچھا نہیں لگا تھا۔

"اچھا اماں! وہ سل گیا، ہائے کتنا اچھا لگ رہا ہوگا سل کر، پہلے ہی اتنا اچھا۔" وہ بولتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گئی۔ جبکہ اماں کو سرمد ضیاء کے سامنے بلاوجہ شرمندگی ہونے لگی۔

"یہ لیں اماں!" کچھ دیر بعد وہ پھر چہکتی ہوئی حاضر تھی سرمد ضیاء سے بالکل غافل۔

اماں نے خاموشی سے سوٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا، تب ارمہ کی نظر اس پر پڑی۔

"اوہ تو اتنا اچھا سوٹ یہ لینے آئے ہیں۔ ظاہر ہے ایسا سوٹ تو ایسے ہی لوگ لینے آسکتے ہیں۔" وہ سوچ کر رہ گئی جبکہ اماں مشین چھوڑ کر اسے دروازے تک چھوڑنے جا چکی تھیں۔

دوسری طرف سرمد ضیاء اس وقت کو کوس رہا تھا، جب وہ بھابھی کے کہنے پر یہاں آنے پر آمادہ ہوا تھا۔ لیکن وہ انکار بھی کب تک کرتا۔ اتنے دنوں سے وہ اس کے پیچھے پڑی ہوئی تھیں اور کراچی کی تقریبا" آدھی کنواری لڑکیوں کو تو شادی کی غرض سے سرمد کو دکھا چکی تھیں۔

"ان کا تو بس نہیں چلتا تھا کہ کہیں سے بھی پکڑ کر کوئی لڑکی سرمد کے برابر بٹھا دیں اور جلد از جلد اس فرض سے نجات پائیں، لیکن سرمد بھی اڑا ہوا تھا۔ وجہ کیا تھی، وہ جاننے سے قاصر تھیں۔ اچھی خوب صورت سے خوب صورت لڑکیوں کو وہ "اوں ہوں" کہہ کر انکار کر چکا تھا، سو انہوں نے پھر بنا کوئی معیار بنائے دل کو اچھی لگنے والی ہر لڑکی اسے دکھانا شروع کر دی اور آج یہ ارمہ بی بی بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ بھابھی کے ارادوں کو سوچتے ہوئے اس نے مسکرا کر کیسٹ پلیئر آن کر دیا۔

☼ ☼ ☼

پھر کچھ دن کافی خاموشی اور سکون سے گزرے۔

بظاہر اماں اپنے کام میں منہمک اسے گھر کے کاموں میں مصروف دیکھتی رہتیں مگر اس کی غیر معمولی خاموشی پر اکثر انہیں دکھ ہونے لگتا، اس دن کے بعد اس نے پھر کسی شاپنگ کا ذکر نہیں کیا تھا۔

"ارمہ بیٹا اسے استری کر لو۔ پھر اسے بھجوانا بھی

ہے۔" اسے ظہر کی نماز سے فارغ ہوتے دیکھ کر اماں نے ایک نفیس سا کامدار جوڑا اس کی طرف بڑھایا اور ساتھ ہی احتیاط کی بھی ہدایت کی۔ سوٹ لے کر وہ خاموشی سے استری کرنے لگی۔

"اگر آپ جاگ رہی ہیں تو پلیز غور کریں اس کا کلر آدھا آؤٹ ہو چکا ہے۔" وہ جانے کن خیالوں میں کھوئی قمیص کی آستین پر استری رگڑ رہی تھی جب اچانک اپنے پیچھے سرمد کی آواز سنی۔ اس نے فوراً استری ہٹائی اور گردن موڑ کر اسے دیکھا' اسے اپنی طرف متاسفانہ نگاہوں سے دیکھتا پا کر وہ شرمندہ ہو گئی۔

"اوہ۔" شرمندہ ہوتے ہوئے اس نے استری کا پلگ نکال ڈالا۔ "دراصل خوب صورت بہت ہے نا' اس لیے زیادہ توجہ دے رہی تھی۔" اس نے گڑبڑا کر وضاحت دی۔

وہ بھابھی کا سوٹ لینے آیا تھا' اماں اسے اندر بلا کر الماری میں سے کپڑے لینے چلی گئیں۔ اس نے اندر جھانکا تو ارمہ کو مسلسل ایک ہی آستین پر استری کرتے دیکھ کر اس کے پاس چلا آیا۔

"ہم کیا آپ ہر خوب صورت چیز کو اتنی ہی توجہ دیتی ہیں؟" سوٹ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ بولا تو اس کی مسکراہٹ ارمہ کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر گئی جبکہ وہ اب سنجیدگی سے محو کلام تھا۔

"حالانکہ ہر خوب صورت چیز پائیدار نہیں ہوتی اور ایسی خوب صورتی کا کیا فائدہ جو پائیدار نہ ہو' فقط وقتی ہو۔ حسن مگر کھوکھلا' جو ساتھ بھی نہ دے پائے۔ اب اسے ہی دیکھیے۔"

کہتے ہوئے اس نے باریک کپڑے کے کونے سے ایک دھاگہ کھینچا تو کچھ دیر پہلے تک بہت خوب صورت نظر آنے والے سوٹ کا پل میں نقشہ ہی بدل گیا۔

وہ کچھ دیر رکا کہ شاید وہ کچھ کہے گی' مگر وہ کیا کہتی' وہ تو بس آنکھیں پھاڑے اسے کپڑا خراب کرتا دیکھتی رہی۔ اتنا خوب صورت سوٹ اور اس کا یہ حشر؟ اسے تو بس افسوس تھا خوب صورتی کے ضائع ہونے کا۔ وہ بھلا پائیداری کے چکر میں کب پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج چھبیسواں روزہ تھا اور عید قریب تھی' اس کا موڈ سخت خراب تھا۔ کیونکہ سیمی اور مونا کی ڈھیروں شاپنگ دیکھ کر حسب عادت اس کا دل مچلا تھا۔ عید اتنی قریب تھی اور عید کے حوالے سے اس کی کچھ بھی تو تیاری نہیں ہوئی تھی۔ ابھی دل کی کیفیت سنبھلی بھی نہ تھی کہ پھر ایک طوفان کا سامنا کرنا پڑ گیا۔

☼ ☼ ☼

"ارے تم ابھی تلاوت کر رہی ہو۔ اف میں تو اتنی تھک گئی ہوں بازاروں کے چکر لگا کر کہ اب تو فرض نماز کی ادائیگی کی بھی ہمت نہیں رہی' ہائے۔"

وہ اماں کے کمرے میں بیٹھی دکھی دل سے تلاوت کر رہی تھی جب بڑے بڑے شاپرز کے ساتھ عالیہ کی آمد ہوئی۔ اور ارمہ کا دل پھر سے بے قابو ہونے لگا۔

"تم بڑی لکی ہو ارمہ! تمہیں کم از کم ہماری طرح بازاروں میں اتنا خوار تو نہیں ہونا پڑتا۔ ابھی بھی ڈھیروں کام باقی ہیں' گھر میں اتنے افراد ہیں اور سب کی تیاری میرے ہی ذمے ہے۔" عالیہ نے تھکن سے چور لہجے میں شکوہ کیا۔

"تمہیں اس کا افسوس ہے اور یہاں تو چاہتے ہوئے بھی ایسا کچھ نہیں۔" ارمہ نے دل میں کہا۔

"یہ دیکھو ارمہ! کیسا لگ رہا ہے۔ مجھے تو اتنا خاص نہیں لگا مگر یہ سوچ کر خرید لیا کہ ایک کام تو نمٹ جائے۔" عالیہ نے ایک خوب صورت سا سوٹ پیس اس کی طرف بڑھایا تو وہ اس کی نرمی کو اپنے اندر تک محسوس کر کے رہ گئی۔ عالیہ کی تیاری ہو چکی تھی اس لیے اسے قدر نہیں رہی تھی۔ واقعی جسے بن مانگے مل جاتا ہے وہ کم ہی قدر کرتا ہے۔

سوچتے ہوئے اچانک ہی سرمد ضیاء کا تصور خیال کے پردے پر روشن ہو گیا۔ اس نے بھی تو کتنی بے دردی سے اتنے خوب صورت سوٹ کا ناس مار دیا تھا۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی جبکہ عالیہ' اماں کی طرف متوجہ ہو چکی تھی۔ اسے اپنا سوٹ سلوانا تھا اور اسی سلسلے میں وہ بات کرنے آئی تھی۔ حالانکہ عید میں اب بہت کم دن رہ گئے تھے۔

☼ ☼ ☼

چھبیسویں روزے کو اماں نے اس کے ہاتھ پر رقم رکھ دی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ رقم اس کی خواہش کی تکمیل کے لیے بہت تھوڑی ہے۔ مگر اس نے خاموشی سے رقم تھام لی تھی۔

بازاروں میں بے پناہ ہجوم تھا اسے اپنی کیفیت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ جس خوشی کے لیے وہ بے چین رہتی تھی وہ اسے حاصل ہو گئی تھی مگر آج دل خالی تھا۔

آج اس کے ہاتھ میں رقم تھی مگر اسے کچھ پسند نہیں آ رہا تھا۔ کسی چیز میں خوب صورتی نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ جب اماں اس کے لیے شاپنگ کرتی تھیں تب وہ خوب واویلا مچاتی کہ وہ اپنی پسند اور مرضی سے خود جا کر شاپنگ کرے گی۔ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی اماں نے اس کے لیے بہت خوب صورت جوڑا بنایا تھا' مگر اس کی وہی پرانی ضد۔ لیکن اچانک پتا نہیں کیا ہو گیا کہ اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل کے بعد بھی اسے کیوں سکون نہیں مل رہا تھا۔ بازار کی رونق میں اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔

بجھے دل سے اس نے ایک سادہ کاٹن کا جوڑا خریدا اور واپسی کے لیے قدم بڑھا دیے۔

"ارے ارمہ آ گئیں آپ' ہو گئی شاپنگ؟" اسے شاپر سمیت اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور ارمہ اس کی بے تکلفی پر اسے دیکھ کر رہ گئی۔ جانے اس شخص کے پاس اتنا فارغ وقت کیسے تھا کہ وہ وقت بے وقت چلا آتا تھا۔ تھکن سے نڈھال ہوتے ہوئے اس نے سوچا۔ حالانکہ وہ خود بھی اس بات سے بے خبر تھی کہ وہ اس معمولی کام میں اتنی دلچسپی کیوں لیتا تھا۔ ایک سوٹ کے لیے تین تین چکر کیوں لگاتا تھا۔

کوئی تو خاص بات تھی جو اسے محسوس ہوتی تھی مگر کچھ کہنے سے قاصر تھی۔

آج وہ ارمہ کے شاپنگ پر جانے کے بعد بھابھی کے کپڑے دینے آیا تھا۔ کپڑوں سے متعلق کچھ سمجھانا تھا' اس لیے اماں نے اسے نماز تک کے لیے روک لیا۔ اب وہ تخت پر بیٹھا اماں کی نماز ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا کہ ارمہ آ گئی۔

"ہاں بس یہی سمجھیں۔" اس نے شاپر درمیانی ٹیبل پر رکھا اور خود بھی قریبی کرسی پر بیٹھ گئی' اماں شاید نماز پڑھ رہی تھیں۔

"کیا میں آپ کی شاپنگ دیکھ سکتا ہوں؟" اس نے شاپر کی طرف نگاہ کی اور خاموشی سے اس کے آگے کر دیا۔

"واؤ۔ آپ کی پسند تو بہت اچھی ہے۔ بہت خوب صورت اور پائیدار بھی۔" اس نے سراہا۔ ارمہ نے سوٹ پر ایک واجبی سی نظر ڈالی۔

"حالانکہ مجھے آپ سے امید تھی نہیں۔" سوٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے اس نے شرارتاً کہا مگر وہ یوں خاموشی سے شاپر اٹھانے لگی جیسے سرمد سے اسی جملے کی توقع ہو۔

"خیر چھوڑیے یہ بتائیے یہ کیسا ہے؟" اس نے قریب پڑے شاپر سے ایک قیمتی سوٹ پیس نکالا۔

"ارے یہ تو بہت خوب صورت ہے۔" اس نے سبز سلک کے ملائم کپڑے کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔ اس کی اداسی پل میں غائب ہو گئی۔

"آپ کو پسند آیا؟"

"یہ ہے ہی اتنا خوب صورت......" بے دھیانی میں کہتے ہوئے اس نے سٹپٹا کر اسے دیکھا کہ اب وہ پھر پائیداری کا ذکر کرے گا۔ سرمد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔

"اچھا تو آپ کی نظر میں یہ خوب صورت ہے۔" اس نے کپڑے کا کونا ہاتھ میں لے کر جیسے کچھ جتانا چاہا۔

"ارے نہیں پلیز! اسے نہیں۔" وہ سمجھی کہ سرمد

اسے بھی بگاڑ دے گا سو بے اختیار بولی اور اپنی اس بے اختیاری پر سرمد ضیاء کی گہری ہوتی مسکراہٹ اسے مزید شرمندہ کر گئی۔

"اچھا تو آپ کو یہ اتنا اچھا لگا ہے، چلیں یہ آپ رکھ لیں۔" وہ جیسے احسان کرنے کے موڈ میں تھا۔

"میں؟" اس نے گہری سنجیدگی سے کپڑے کو دیکھا، دل میں خوشی کا کوئی تارا نہیں چمکا تھا۔ جبکہ اس کا گریز سرمد کو چونکا گیا تھا۔ ایک خوب صورت چیز جب اسے نوازی جا رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں سوچ کی پرچھائیں کیوں؟

"ہاں آپ لے لیجئے۔ آپ پر تو یہ کلر بہت سوٹ کرے گا۔" اس نے شوق کو ہوا دینا چاہی۔

"مگر میں اس کا کیا کروں گی؟" عجب الجھا سا لہجہ تھا اپنی یہ انجان کیفیت اسے بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

"چودہ اگست پر اس کے جھنڈے بنا کر مفت تقسیم کر دیجیے گا۔ حب الوطنی کا اس سے بہترین مظاہرہ اور کسی طرح نہیں ہو سکتا۔" وہ جل کر بولا تو پل میں اس کے حواس بھی بیدار ہو گئے۔

"اتنی سی نیکی کرنے کے لیے اتنا طویل انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیوں نہ میں یہ سوٹ آپ کی طرف سے کسی ضرورت مند کو دے دوں۔ جھنڈوں کے بارے میں پھر کسی دن سوچ لیں گے۔" وہ سنجیدگی سے بولی تو سرمد مسکرا کر رہ گیا۔

"اسے کہتے ہیں خوب صورت پائیداری۔" وہ جیسے خود سے گویا تھا۔ ادراک کا لمحہ آ چکا تھا اس پر واضح ہو گیا تھا کہ وہ کیوں اس دہلیز پر نہ چاہتے ہوئے بھی چلا آتا تھا کیونکہ کیونکہ یہیں تو اسے منزل ملنا تھی۔

"اچھا ایسا کریں فی الحال اسے گفٹ سمجھ کر رکھ لیں۔" اپنی دلی کیفیت کے تحت وہ بشاش لہجے میں بولا۔

"گفٹ؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"مگر مجھے تو کسی گفٹ کی ضرورت نہیں ہے۔" اسے قیمتی چیزوں کی طلب نہیں تھی۔ بس عید پر خوب جوش و خروش سے شاپنگ کرنے کا بچکانہ سا شوق تھا، ورنہ قیمتی کپڑوں اور زیورات جمع کرنے کا اسے قطعی شوق نہ تھا۔

"گفٹ ضرور تاً تو نہیں دیا جاتا۔ گفٹ تو بس گفٹ ہوتا ہے دوسروں کے جذبات کا کھلا ترجمان اور بس۔"

"سوری۔" اس کے جملے نے ارمہ پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔

"کیا یہ خوب صورت نہیں ہے؟" اس نے پینترا بدلا۔

"بہت خوب صورت ہے۔" وہ اب بھی اپنی بات پر قائم تھی۔

"تو پھر؟" وہ چڑ کر بولا۔

"میں اتنی سمجھ دار ہوں تو نہیں مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ ہر خوب صورت چیز آپ کی دسترس میں نہیں آ سکتی۔ اسی لیے میں نے آج تک ایسی کوئی خواہش کی ہی نہیں اور ویسے بھی کسی چیز کو پسند کرنا اور پھر اس کے حصول کی تمنا کرنا، درحقیقت دو مختلف باتیں ہیں۔"

"لیکن تمنا کرنے سے ہی کچھ حاصل ہوتا ہے۔" وہ نرم لہجے میں بولا۔

"کبھی دل نے اتنی شدید خواہش کی ہی نہیں، جو میں بے اختیار ہو جاؤں۔ میں یوں بھی بہت خوش ہوں۔" وہ مسکرائی۔

سرمد کو لگا اس کا ظاہر ہی نہیں باطن بھی بہت خوب صورت ہے۔ اور اس کے دل کے نہاں خانے میں کسی ایسے ہی پائیدار حسن کی تمنا تھی، وہ لڑکی جو روزانہ کئی خوب صورت جوڑے دیکھتی، مگر اس نے کبھی کسی خوب صورت چیز کو حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"جھوٹ... اگر ایسا ہوتا تو تم محض سامنے آنے والے کپڑوں پر کبھی نیت نہ خراب کرتیں۔ کبھی حسرت سے نہ دیکھتیں۔"

"لیکن میں نے کبھی کسی امانت پر غلط نگاہ نہیں ڈالی، خدا گواہ ہے۔"

"جھوٹ مت بولو۔ اس دن کیا کر رہی تھیں؟ قمیص پر یوں استری رگڑ رہی تھیں جیسے اسے لوٹانا ہی نہ ہو۔

دل بہک جائے تو بندہ بے اختیار ہو ہی جاتا ہے۔ اور تم اکثر بہک جاتی ہو۔" شوخ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے وہ اسے آزمانے پر مکمل طور پر آمادہ تھا۔

"جی نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ مجھے اپنے دل کو قابو میں رکھنا آتا ہے۔"

"اچھا؟" وہی اس کی شوخ جانچتی ہوئی نگاہیں جنہیں ارمہ یکسر نظر انداز کیے ہوئے تھی۔

"اور جہاں تک اس سوٹ کی بات ہے تو وہ مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ اور کسی اچھی چیز پر توجہ دینا گناہ ہے کیا؟"

"بالکل ہے ایسی صورت میں جب کہ وہ چیز آپ کی ہو بھی نہ۔ پھر بھی آپ اسے اپنے حصار میں لے لیں۔ اس پر اختیار حاصل کر لیں یوں کہ کسی کو احساس بھی نہ ہو۔" گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ ارمہ نے بمشکل خود کو نارمل رکھا۔

"اچھا تو اگر یہ گناہ ہے تو سوری۔ آئندہ میں اس سے باز رہوں گی۔" وہ اٹھ کر جانے لگی۔

اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، کمرے سے اماں کی آواز آئی۔ وہ نماز پڑھ چکی تھیں۔

"اماں بلا رہی ہیں آپ کو۔" وہ جیسے سب کچھ نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں آپ کی طرح اپنی پسند پر اتنا جبر بھی نہیں کر سکتا کہ اسے پانے کی بھی تمنا نہ کروں۔" آخری جملہ سنجیدگی سے کہتے ہوئے وہ آگے بڑھ گیا اور ارمہ اس کے لفظوں کے گھنے جنگل میں ہی بھٹکتی رہی۔

سرمد کے الفاظ اتنے بھی مشکل نہ تھے کہ وہ سمجھ نہ پاتی مگر جانے کیوں خود سے اعتراف کرنا اسے خوف میں مبتلا کر رہا تھا۔

اپنی سوچوں سے گھبرا کر اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی جیسے ذہن کی گھٹن کا اخراج چاہتی ہو۔ کھڑکی کھلتے ہی ٹھنڈی ہوا کا تیز جھونکا بڑے بے تاب انداز میں اس سے لپٹ گیا۔ ایک پل کو اس پر کپکپی سی طاری ہو گئی، مگر وہ کھڑکی سے ہٹی نہیں۔ آج جانے کیوں ہواؤں کے سنگ رہنے کو جی چاہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج چاند رات تھی۔ اماں اسے پچھلے چند دنوں سے خاموش دیکھ کر حیران ہو رہی تھیں۔ کہاں تو وہ اتنا واویلا مچاتی تھی اور اب کل عید تھی اور اس کی خاموشی۔

"ارمہ! عید کے لیے کچھ خریدنا نہیں ہے۔ آج ہی کا دن ہے، جو چیزیں رہ گئی ہیں، لے آؤ۔" بالآخر اس کے مطمئن اور روشن چہرے کو دیکھتے ہوئے اماں نے گویا اسے یاد دلایا۔

"اماں! اور کچھ نہیں خریدنا، سب کچھ ہے میرے پاس۔" اس نے اماں کے ہاتھ پر دھیرے سے دباؤ ڈالا تو اماں اس کے نکھرے اجلے چہرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ یعنی کہ ان کی بیٹی نے وقت کے سمندر سے فہم کے وہ موتی چن لیے تھے جو بہت خوب صورت و پائیدار تھے۔

وہ احساس تشکر کے ساتھ سوچ کر رہ گئیں جبکہ ارمہ دستک پر دروازہ کھولنے چلی گئی اور دروازہ کھلنے پر جو چہرہ اس کے سامنے تھا، اسے تو اس نے کتنی بار دعاؤں میں مانگنا چاہا تھا مگر ہر بار ایک خوف سا آڑے آجاتا، سو وہ ہمیشہ ذہن کے پردے پر نمودار ہو جانے والی سرمد کی تصویر کو ہر بار جھٹک دیتی اور پھر مزید خشوع و خضوع سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگتی اللہ سے...... فقط اپنی رحمت کے سائے میں رکھنے کی دعا مانگتی اور وہ تو رب ہے، دلوں کے حال جانتا ہے۔

سرمد کے ساتھ ایک پیاری سی خاتون بھی تھیں۔

"ارمہ یہ میری بھابھی ہیں اور بھابھی یہ...." سرمد فوراً تعارف کرانے لگا۔

"جانتی ہوں، جانتی ہوں یہ وہی ہیں جنہوں نے تمہیں کچھ ایسا جکڑا ہے کہ کہیں کا نہیں چھوڑا۔" بھابھی نے ہنستے ہوئے اس پر نگاہ کی اس نے فوراً سلام پیش کر دیا۔

"کیا ہمیں اندر نہیں آنے دو گی؟" سرمد کی بھابی نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

وہ دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی تھی، سٹپٹا کر ان کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔

"اچھا تو اتنے پیارے پیارے قیمتی کپڑے ان کے ہوتے تھے۔ اس وقت بھی کتنا پیارا جوڑا پہنے ہوئے ہیں۔"

"ارمہ! چائے بنالو۔" اماں نے کہا تو وہ باورچی خانے میں چلی آئی۔

تین کپ چائے بنا کر وہ کمرے میں گئی تو تینوں ہی کسی بات پر ہنس رہے تھے۔ سامنے ہی ان کے سلے ہوئے کپڑے رکھے تھے، ان میں وہ سبز سلک کا سوٹ بھی نظر آرہا تھا، اتفاق کی بات ہے، وہ سوٹ سیتے ہوئے اس نے اماں کو دیکھا نہیں تھا، مگر اب سلا ہوا نظر آرہا تھا۔

وہ ٹرے رکھ کر جانے لگی تو سرمد کی بھابھی نے روک لیا۔

"ارے ارمہ! بیٹھو ناں ہمارے پاس۔" انہوں نے اتنے پیار سے کہا کہ وہ بیٹھ گئی حالانکہ چاند رات کی وجہ سے اسے کافی کام کرنے تھے۔ تھوڑی دیر تک اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ اٹھ گئیں، جاتے ہوئے وہ اپنے سارے کپڑے لے گئیں مگر وہ سبز سلک والا چھوڑ گئیں۔ ارمہ نے انہیں بتانا چاہا مگر اماں اور بھابھی باتوں میں اتنی مگن تھیں کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا جبکہ سرمد مستقل اسے اپنی نظروں کے حصار میں لیے ہوئے تھا۔ وہ اتنی نروس ہو رہی تھی کہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد وہ گھر کے مختلف کاموں میں مصروف ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج عید تھی۔ اس نے نہا کر اماں کا بنایا ہوا جوڑا پہنا اور آئینے میں اپنے سراپے پر نظر ڈالی تو چند لمحوں تک ہٹا نہ سکی۔ عالیہ اور فائزہ کے بڑی بڑی دکانوں سے خریدے گئے مہنگے کپڑوں سے کہیں زیادہ اماں کے ہاتھ کا سلا ہوا جوڑا خوب صورت لگ رہا تھا۔

وہ ہر سال اماں کے ہاتھ کا سلا ہوا جوڑا ہی پہنتی تھی اور خوش نہ ہوتی تھی جبکہ اماں ہر عید پر پہلے سے شان دار جوڑا تیار کرتی تھیں۔ سستا ہوتا تھا مگر اس میں محنت کے ساتھ ساتھ اماں کی محبت کے بھی ٹانکے لگے ہوتے تھے اور وہ جتنی آج خوب صورت لگ رہی ہے ہمیشہ ہی اتنی خوب صورت لگتی تھی۔ اس کو اپنی سوچ پر شرمندگی ہونے لگی۔ اس نے جلدی جلدی بالوں میں کیچر لگایا اور اماں کے پاس گئی۔ اماں کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہ جھول بھی گئی۔

"میری پیاری اماں!" اس نے ان کے گال پر چٹ سے پیار کیا۔

اماں مسکرانے لگیں۔ وہ کافی دنوں سے اس میں تبدیلی محسوس کر رہی تھیں اور اس وقت بھی آئینے کے سامنے کھڑے اپنا جائزہ لیتے ہوئے اسے دیکھ چکی تھیں۔ ماں تھیں آخر، سمجھ گئیں کہ ان کی بیٹی کوئی ٹھوکر کھائے بغیر متوازن اور ہموار راستے پر چل پڑی ہے۔

انہوں نے اسے بہت سی دعائیں دے ڈالیں اور وہی سبز سلک کا سوٹ پکڑاتے ہوئے کہا۔ "اب یہ پہن لو، سرمد اور اس کی بھابھی آنے والی ہیں۔"

اس نے حیرانی سے اماں کو دیکھا تو وہ مسکرا کر کہنے لگیں۔

"کل سرمد کی بھابھی سرمد کے لیے تمہیں مانگنے آئی تھیں۔ میں نے ہاں کر دی۔ تم سے اس لیے نہیں پوچھا کہ تم میری بہت فرماں بردار بچی ہو اور پھر مجھے تمہارے دل کا حال معلوم تھا۔"

اس نے آنکھیں بند کر کے اس خوشی کو اپنے اندر تک اتار لینا چاہا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی اصل عید اب ہوئی ہے، بہت اچھی، بہت خوب صورت اور بے حد پائیدار......

☼

عالیہ بخاری

عہدِ الست

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دلدار نانی نے اس کی پرورش بے حد ناز و نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ گئی آزادی چڑیل دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایماندار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پرتو وفاشی کامول میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعاگو ہیں۔

دوسرا گھرانہ اظہار چچا کا ہے جو ظاہری نمود و نمائش اور پیسے کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ سرکاری محکمے میں کلرک ہونے کے باوجود وہ اوپر کی کمائی سے اچھا خاصا کما چکے ہیں۔ خاندان بھر میں ان کی امارات کی دھوم ہے۔ بچپن میں بڑے بیٹے سلمان کی نسبت ربیعہ جبکہ جویا کی بات معاذ سے طے ہوئی تھی لیکن بدلے حالات نے اس فیصلے پر خاک ڈال ہے۔ چچا نے سلمان کی منگنی شہر کے مقبول بزنس مین یوسف کمال کی بیٹی زوبیہ کمال سے کر دی، جس پر سب کو صدمہ ہوتا ہے۔ ربیعہ اس اقدام پر نسبتاً مطمئن ہے۔ جویا اور معاذ دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں لیکن حالات موافق نہیں ہیں۔

زرتاج بیگم کے بنگلے کو شہر بھر میں خصوصی شہرت حاصل ہے۔ مہینے کی پہلی جمعرات کو یہاں سے غریب عورتوں کو امداد دی جاتی ہے۔ خالہ افروز، سعیدہ اور بتول جیسی کتنی ہی عورتوں کے گھر اس امداد کے سہارے چل رہے ہیں۔ بوا عظمت، زرتاج بیگم کی خاص ملازمہ ہے، جو عرصہ دراز سے اس کام کو سنبھالے ہوئے ہے۔ وہ طبعاً سخت مزاج ہے۔

سلمان رفتہ رفتہ زوبیہ کی امارت سے متاثر ہو کر اس کے زیر اثر آجاتا ہے۔ زوبیہ اپنی من مانیوں سے ہر جائز و ناجائز ہر طرح کی خواہشات منوالیتی ہے۔ اظہار چچا، شاکرہ بیگم اور آپا گل سوائے تلملانے کے کچھ نہیں کرپاتے۔ ان کی تمام امیدیں زوبیہ کو ملنے والے بنگلے اور پیسے سے وابستہ ہیں۔

اسکول کے بچے ساجد کے معاملے پر معاذ پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے، جس سے وہ شدید زخمی ہوجاتا ہے۔ سلام صاحب کی پوری فیملی شدید کوفت اور پریشانی کا شکار ہوتی ہے۔ ربیعہ اس معاملے کے بعد معاذ سے اسکول کے معاملات سے علیحدگی چاہتی ہے۔ اظہار چچا خاندان مع سوائے جویا اور زوہا کے اس حادثے سے خوب حظ اٹھاتا ہے۔ جویا چاہتے ہوئے بھی معاذ کے لیے کچھ کر نہیں پاتی۔

دلدار نانی کے چوبارے کی رونق دن بدن بڑھتی جارہی ہے جس پر نگینہ آئے دن جلتی کڑھتی رہتی ہے۔ شاما ہر موقع پر اس کی اشک شوئی کرتی ہے۔ نگینہ کی تمام امیدیں اپنی بڑی بیٹی صندل سے وابستہ ہیں۔ گیتی زیادہ تر پڑھائی کی وجہ سے معاملات سے الگ ہی رہتی ہے۔ لیکن خیام کی یاد اس کے خیالوں کی دنیا کو آباد رکھتی ہے۔ ستارہ نانی کے یہاں سالار کی آمد و رفت اسے قدرے بے چین کرنے لگتی ہے۔

خیام کچھ عرصے بعد ہی ایک بس سروس کمپنی میں معمولی نوکری کرلیتا ہے۔ دن رات اپنوں سے دوری اسے بھی ستاتی ہے۔ خاص کر گیتی کی چوڑی اسے ملال کی کیفیت سے دوچار رکھتی ہے۔ بدنامی کا خوف اسے کسی کے قریب نہیں ہونے دیتا۔ صرف بابو شوکت سے اس کی اچھی دعا سلام ہے کہ اچانک تمام تر احتیاط کے باوجود گھر سے لائے زیورات کی چوری ہوجاتی ہے۔ یہ زیورات اس کے مستقبل کی ضمانت تھے۔ اس کے بعد مستقبل پر ایک سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

زرتاج بیگم اپنے کلاس کی دیگر عورتوں کی طرح خود نمائی اور خود ستائشی کا شکار ہیں۔ بیٹا عرصے سے باہر مقیم ہے۔ انہیں لباس کی طرح سیکریٹریز بدلنے کی عادت ہے۔ حالیہ سیکریٹری نبیل سے ان کا "تعلق" ہر کسی کی نظر میں ہے۔ نبیل جسے ڈرائیور راجو کی مدد سے یہ نوکری ملی ہے۔ زرتاج بیگم کی دی مراعات سے بھرپور استفادہ کررہا ہے۔ بوا عظمت اسے کڑے تیوروں کی زد میں رکھتی ہے، جس پر وہ خاصا جز بز ہوتا ہے۔ زرتاج بیگم کے بھائی یوسف کمال، نبیل کی عیار فطرت کو پہچان کر انہیں محتاط رہنے کا مشورہ دیتے ہیں جسے زرتاج بیگم چٹکیوں میں اڑا دیتی ہے۔

زیورات کی چوری کے بعد سے خیام کے برے دن شروع ہوجاتے ہیں۔ ساتھ ہی نوکری ختم ہونے سے وہ پیسے پیسے کو محتاج ہونے لگتا ہے۔ بابو شوکت کا بیٹا خیام کے ساتھ نوکروں جیسا سلوک کرتا ہے۔ ایسے وقت میں بابو شوکت اس کی ہمت بندھاتے ہیں۔ لیکن گھر کی یاد اسے بے چین رکھتی ہے۔ خاص طور پر گیتی کی چوڑیاں اسے یاد کی ڈور سے باندھے ہوئے ہیں۔

گھر میں جویا کے رشتے کی بات چل رہی ہے جس پر جویا، آپا گل سے بحث کرتی ہے۔ آپا گل کی لایعنی باتوں پر وہ براہ راست اپنے ماں باپ سے بات کرنے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اسے معاذ کے ارادوں کی سچائی کا پختہ یقین ہے۔ دوسری طرف آپا گل کے شوہر اکبر اپنے اثر و رسوخ سے معاذ کو ملنے والی نوکری کسی اور کو دلوادیتے ہیں۔ معاذ اس بات کا تذکرہ اپنے والد سے کرتا ہے تو وہ اسے معاذ کا وہم سمجھتے ہیں۔

سلمان، زوبیہ کے گھر میں شفٹ ہوچکا ہے اور شاذ و نادر ہی ماں باپ کو شکل دکھاتا ہے۔ جس پر شاکرہ بیگم اور اظہار صاحب پریشان رہتے ہیں۔

جویا کا رشتہ آناً فاناً طے ہوجاتا ہے جس میں اظہار چچا، آپا گل اور شاکرہ بیگم کی "کوششیں" شامل ہیں۔ شاکرہ بیگم کو طلاق کی دھمکی اپنا کام دکھاتی ہے۔ جویا کی تمام مزاحمت دم توڑ جاتی ہے۔ معاذ کی نوکری اور جویا کے رشتے کی خبر ایک ساتھ ملتی ہے۔ وہ گم صم سا ہوجاتا ہے۔ جویا کے رشتے پر دادی، چچا اظہار کے خاندان سے قطع تعلق کا اعلان کردیتی ہیں۔ زوبیہ، جویا کو اکساتی ہے کہ اگر وہ چاہے تو رشتہ ختم کروانے میں مدد کرسکتی ہے۔ زوبیہ، آپا گل اور شاکرہ بیگم کو نیچا دکھانا چاہتی ہے۔ تاہم جویا ایسا کرنے سے منع کردیتی ہے۔

صندل کو بالی صاحب کی فلم دنوں میں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیتی ہے۔ ایسے میں اسے ماں نگینہ کے طور طریقے کھٹکتے ہیں۔ وہ اسے ساتھ لے جانے سے انکار کردیتی ہے تو نگینہ کو دھچکا لگتا ہے تاہم وہ نانی ستارہ کو اس کا علم نہیں ہونے دیتی۔

۴۵
پینتالیسویں قسط

ایک کے اوپر ایک سی بنی تنگ سی بالکونیاں، گیلریاں، نیچے کو جھکتے ہوئے چھجے، گلی کے دونوں اطراف تقریباً ایک سے نظر آتے تھے، اور ان اونچے چوباروں کے بیچ کہیں سے تنگ اور کہیں سے چوڑی ہوتی گلیوں میں ہمہ وقت شام ٹھہرتی تھی۔

نانی ستارہ کے چوبارے کے محرابی بر آمدے میں کھڑی نگینہ نے بے قراری سے نگاہ وہاں تک دوڑائی، جہاں سے گلی اگلے موڑ میں گم ہوتی تھی۔

سامنے کمرے میں دیوان غالب پڑھتی ہوئی نانی ستارہ بڑی دیر سے اس کی بے قراری کو نوٹ کررہی تھیں۔ عموماً اس کی یہ بے چینی صندل کی آمد پر ہوا کرتی تھی، مگر اب گیتی کے لیے پروٹوکول بڑھتا جارہا تھا۔

"اماں!"

وہ بے آواز قدموں سے چلتی ہوئی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

"ہوں!" بغیر نگاہ اٹھائے انہوں نے بڑی سرسری سی توجہ عطا کی۔

"گیتی آرہی ہے ملنے۔"

"ہوں!" ان کے انداز میں وہی بے نیازی تھی، نگینہ کو تھوڑی سی مایوسی بھی ہوئی، مانا وہ خفا تھیں، مگر خون کا جوش بھی تو آخر کچھ معنی رکھتا ہے۔

"رات کی فلائٹ سے وہ کراچی جارہی ہے سالار کے ساتھ، پھر پتا نہیں کب آنا ہوگا، کراچی کون سا یہاں رکھا ہے، آج ٹرین میں بیٹھو تو کل پہنچو۔"

وہ مڑ کر الماری کے آگے جا کھڑی ہوئی، بظاہر کوئی مخاطب بھی نہیں مگر، تبصرہ جاری۔

"گئی تھی ایک بار میں، بہت چھوٹی سی تھی، اس زمانے میں جب انڈسٹری کراچی میں ہوا کرتی تھی، خواجہ خورشید انور اور نثار بزمی صاحب کے رسیلے گیت، وحید مراد کے عروج کا زمانہ..... ہائے!"

حسب عادت وہ لمحوں میں کہیں سے کہیں پہنچی، شاما نے داخل ہوتے ہوئے آدھی ادھوری بات ہی سنی تھی۔

"کتاب لکھیں باجی! وہ کیا ہوتی ہیں "یادداشتیں" بچی بڑی ہٹ جائے گی، آپ کے پاس تو ایک سے ایک قصہ ہے چٹ پٹا، یوں بکے گی منٹوں میں۔"

ہاتھ میں تھامے ہوئے دھلے ہوئے کپڑے اس نے بیڈ پر رکھ کر چٹکی بجائی۔

"رہنے دے بس!" نگینہ الماری بند کرکے واپس پلٹ آئی، یہاں تو لکھنے کے نام پر کبھی دھوبی کا حساب بھی نہیں لکھا، کبھی دو چار جملوں کا کوئی ڈائیلاگ ملا بھی فلموں میں تو وہ بھی رٹ رٹ کر بے زار ہوجاتی تھی تب کہیں جاکر منہ پر آتا تھا، کوئی گن ہوتے تو آج میں بھی کوئی ملکہ جذبات، ملکہ احساسات ٹائپ شے ہوتی۔"

وہ اپنی قسمت پر طنز کرنا اب بڑی حد تک کم کرچکی تھی۔ مگر عادتاً کبھی کچھ منہ سے نکل ہی جاتا، شاما ہمہ وقت دل جوئی کے لیے تھی۔

"ایسی کیا بات ہے، آپ ہٹ ہوتیں یا صندل، بات تو ایک ہی ہے نا، اب دیکھ لیں اپنی صندل کا کوئی مقابلہ ہے ساری انڈسٹری میں، جل کر خاک ہوئی جارہی ہیں باجی گل ناز اور الماس، بس نہیں چل رہا ہے کہ.....!"

"چھوڑ بھی دے اب گل ناز کا پیچھا، الماس بھی اپنی ہی بچی ہے، خدا اس کی بھی سن لے۔"

شاما کی بات کاٹتے ہوئے وہ بڑے رسان سے بولی۔

آہستہ آہستہ اس کی وسیع القلبی بڑھتی جارہی تھی۔ نانی ستارہ ابھی غالب کے دیوان کے پیچھے چھپی تھیں۔ نگینہ کو ان کا مصلحت بھرا تغافل مایوس بھی کرتا تھا اور افسردہ بھی۔

"گیتی کی پسند کی کوئی چیز پکالے شاما شاید وہ دونوں کھانا یہیں کھائیں، تیرے ہاتھ کی تو ہر شے اسے اچھی لگتی ہے

پھر پتا نہیں میری بچی کب واپس آئے خیریت کے ساتھ۔" ایک ٹھنڈی سانس لے کر وہ پھر سے شاما کی طرف متوجہ ہوئی "دعا کر شاما! وہ جہاں بھی رہے خوش رہے، پھلے پھولے۔ گرم ہوا چھوئے بھی نہیں میری گیتی کو۔"

"آمین!" قدموں میں بیٹھی شاما نے پورے خلوص دل کے ساتھ کہا "بہت خوش رہے گی گیتی، ماسٹر صاحب بہت ہی شریف آدمی ہیں اور گیتی سے پیار بھی بہت کرتے ہیں، مجھے تو پہلے ہی شک پڑنے لگا تھا، جب گیتی کو پڑھانے آتے تھے، کیوں نانی! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

شاما عادتاً "اونچی آواز میں بولتی تھی، سو نا ممکن تھا کہ اب بھی نانی ستارہ توجہ نہ دیتیں۔

"مجھے کیا پتا، ہو گی دونوں کی ایک دوسرے میں دلچسپی، گیتی جانے یا پھر اس کی ماں۔"

وہ آج کل یوں ہی اجنبیت کی انتہا کرتی تھیں، نگینہ نے بے اختیار ہی ماتھے کو چھوا۔

"ماں غریب کون سے اندازے لگانے یہاں بیٹھی رہتی تھی۔ اماں! انصاف سے کہیں، صبح کی نکلی رات گئے تک گھر میں واپس داخل ہوتی تھی، گیتی کے ساتھ تو آپ ہی رہی ہیں ہمیشہ۔ مجھ سے زیادہ آپ کے قریب تھی۔"

"یہی تو رونا ہے سارا۔" نانی کا دیوان بند ہوا اور لہجہ مزید سرد "ہر ایک اپنی پلاننگ میرے ہی زیر سایہ کرتا ہے اور... اور ہوا تک نہیں لگنے دیتا، ایسی چوٹ دے کر جاتا ہے کہ پھر دوا ہی نہیں۔"

انہوں نے خاص طور پر کسی کو بھی مخاطب نہیں کیا تھا۔ لیکن نگینہ نے اس کھلے طنز کو سیدھا دل پر لیا تھا۔

"میری گیتی کو خیام اور فیروزہ سے مت ملائیں اماں! وہ دونوں ماں بیٹا تو ایک سے انداز میں بھاگے تھے یہاں سے، آپ کی ساری امیدوں کو خاک میں ملا کر۔ پر میری گیتی تو پورے صبر کے ساتھ بیٹھی رہی تھی، اگر سالار نہ آتا تو میرے منہ میں خاک، اس ملک سے نکاح ہو ہی جانا تھا نا۔"

"کیسے ہو جاتا نکاح، جب اس نے سالار کو بلالیا تھا کراچی سے، تم سب کی ملی بھگت تھی، جس سے میں ساری برادری میں ذلیل ہو کر رہ گئی، ہمارے ہاں ساری بات زبان کی ہی ہے، اور ساری زندگی میں ایک بار بھی ستارہ جان زبان دے کر نہیں پھری اپنی بات سے۔"

وہ اتنی خفا تھیں کہ بات کرتے ہوئے، نگینہ کی طرف محض ایک بار دیکھ کر انہوں نے منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔

"کوئی محل نہیں لکھوالیا تھا ہم نے گیتی کے نام ملک سے۔ اور آگے سے اتنا بڑا چیک دیا اسے سالار نے، تب ہی تو منہ بند کر کے اتر گیا تھا سیڑھیاں، مگر آپ نے تو ایک بات کے ضد سی پکڑلی ہے۔ ورنہ سالار سب سے پہلے تو اس گھر میں آپ ہی کا چہیتا بنا تھا، میں تو بے چارے سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔"

شاما اس بحث کے دوران ہی کمرے سے جان بچا کر نکل آئی تھی، سو اب یہاں مخل ہونے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ نانی ستارہ نے بے زاری سے سر کو جھٹکا۔

"بے کار کے جواز اور دلیلیں، گیتی نے بھی اپنی مرضی ہی چلائی، سو اب کراچی جائے یا کوئٹہ... اپنی مرضی کی مالک ہے۔ ہمارا کیا لینا دینا۔"

"ذرا بھی افسوس نہیں ہے آپ کو اس کے جانے کا؟" پتا نہیں کیوں مگر نگینہ نے بڑی شدت سے اس سوال کا جواب جاننا چاہا۔

"نہیں، مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔" وہ بے تاثر سے انداز میں کہتی ہوئی اٹھ کر باہر جانے لگیں۔

"مگر اس خیام کا تو بڑا رنج کیا تھا آپ نے، جسے دل سے لگا کر پالا تھا، رو رو کر بستر سے لگ گئی تھیں، حالانکہ وہ تو جاتے جاتے آپ کے زیور تک لے گیا تھا۔"

نگینہ کے پاس حساب برابر کرنے کے لیے ابھی بہت کچھ تھا۔ نانی ستارہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

"وہ میرا نہیں اپنی ماں کا زیور لے کر گیا تھا اور اس پر کسی کو بھی اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔"

نگینہ کے چہرے پر تلخ سی مسکراہٹ ابھری۔

"تو یہ کہیے نا کہ فیروزہ کی اولاد کے لیے آپ کے پاس ساری رعایت ہے، پر میری بچیوں کے لیے نہ کل تھی، نہ آج ہے۔"

نگینہ کی بات بڑی غیر متوقع تھی۔ نانی ستارہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بات کو غلط رنگ مت دو نگینہ! میرے لیے، خیام اور گیتی میں کوئی فرق نہ پہلے تھا اور نہ آج ہے۔" نگینہ نے ہلکے سے نفی میں سر ہلایا۔

"فرق تو ہے اماں! وہی جو ہمیشہ مجھ میں اور فیروزہ میں رہا۔" وہ چلتی ہوئی ان کے قریب آ کھڑی ہوئی۔ "فیروزہ حسین تھی، ماہر فن تھی، آپ کی کاپی ——— سو آپ کی ساری توجہ، ساری محبت اس کے لیے وقف ہوتی رہی۔ میں تو نہ شکل اور نہ ہنر، کیسے برابری کر سکتی تھی اس کی، وہ ذرا کہنا نہیں مانتی تھی آپ کا، پھر بھی لاڈ اٹھواتی رہی۔ بغاوت کر کے ڈنکے کی چوٹ پر، آپ کی مرضی کے خلاف شادی کر لی اس نے، اور پھر واپس آئی تب بھی ایک لفظ کہے بغیر گلے سے لگالیا آپ نے، اور میں ساری عمر آپ کے پیچھے ہاتھ جوڑے چلتی رہی، پھر بھی فیروزہ نہ بن سکی اماں!"

آج اس کے لہجے میں نہ غصہ تھا، نہ تلخی۔

صرف درد کا دل توڑتا احساس تھا۔

نانی ستارہ کے لیے آج پہلی بار نگینہ کے آگے کچھ کہنا محال ہوا۔

"تمہارا وہم ہے نگینہ! کوئی ماں اپنی اولاد میں فرق نہیں کرتی ہے۔"

"کرتی ہے اماں! ضرور کرتی ہے۔" نگینہ نے تیزی سے بات کاٹی۔ "دل سے نہ سہی، "مصلحتاً" ہی سہی، میں نے بھی کیا، گیتی اور صندل میں فرق، دونوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ صندل میرے خوابوں کی تعبیر تھی، اور گیتی..."

وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ آنسو کا ایک قطرہ آنکھ کے گوشے سے ٹپکا تھا۔

"میں گیتی کو نگینہ نہیں بننے دے سکتی تھی اماں! اس کی ساری زندگی تاریک رات میں ڈوب جاتی اس ملک سے شادی کر کے، میں نے اپنی بچی کی ہنسی کو بچالیا تو کیا برا کیا جس پر آپ اتنی خفا ہیں؟"

"یہ تو وقت ہی بتائے گا نگینہ! لیکن یاد رکھنا، ہمارے ہاں مصلحت کا سکہ تو چل بھی جاتا ہے، پر خود سری کا سودا ہمیشہ گھاٹے میں رہا ہے۔ پہلے فیروزہ اور خیام اور اب یہ گیتی۔"

نانی کی طنزیہ نگاہیں، نگینہ کے چہرے پر جمیں عموماً "ایسے موقعوں پر وہ خائف ہو کر نگاہ چرا جاتی تھی، مگر آج یوں ہی انہیں دیکھے گئی۔

"آپ ایک بار پھر ناانصافی کر رہی ہیں اماں! فیروزہ اور خیام تو آپ کی ایسی محفوظ مامون سرکار پر نقب لگا کر گئے۔ کبھی واپس نہ آنے کی نیت سے۔ گیتی تو سب کی اجازت سے وداع ہوئی ہے۔ کتنی بار ان چند دنوں میں اس نے آپ سے معافی بھی مانگی، مگر آپ کی سخت دلی..." حلق میں پھنستے آنسو، نگینہ کو اب مزید بولنے کی اجازت بھی نہیں دے رہے تھے، دل میں پلتے ہوئے گلے، مایوسیاں، محرومیاں، سب ہی گڈمڈ ہونے لگے۔

چند لمحوں کے لیے وہی ساری کڑواہٹ، جو گئے دنوں کا خاصہ تھی۔

"آج بھی اگر وہ بدبخت خیام پلٹ کر آجائے، تو آپ ایک لمحے میں اسے گلے لگالیں گی۔ اس لیے کہ وہ فیروزہ اور اس کروڑپتی کی اولاد ہے اور میری گیتی اس ایکسٹرا ڈانسر نگینہ جان اور باجے ٹھیک کرنے والے فیض علی کی اولاد

ہے۔ پھر انصاف ہو بھی تو کیسے ہو اماں! جب رتبے میں ہی برابری نہیں ہے۔"

ماحول میں نگینہ کے لہجے کا زہر پھیلا۔ تب ہی دروازے کی چوکھٹ پر شاما آکر کھڑی ہوئی۔

"گیتی آگئی ہے نگینہ باجی! ماشاء اللہ اپنی گاڑی سے اتر رہی ہے۔" حالات کی سنگینی کو اس نے اپنی ایکسائٹمنٹ میں نظرانداز کیا اور اطلاع دے کر فوراً ہی سیڑھیوں کی طرف بھاگ لی۔

نگینہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ صاف کیا اور نانی ستارہ کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھے، قریب سے گزرتی چلی گئی۔

ایک دبی دبی سی سانس ان کے لبوں سے نکلی اور آگے بڑھ کر انہوں نے وہ بھاری منقش دروازہ بند کیا جو بیرونی دروازے میں کھلتا تھا۔

سیڑھیوں سے اوپر آتی گیتی کے چہرے پر بڑی پیاری سی چمک تھی۔ اور شاما اسے نظر لگنے کے خدشے سے کچھ بدحواس ہو کر، پتا نہیں فوری طور پر کیا ٹوٹکا کر رہی تھی۔

"السلام علیکم نگینہ آنٹی!"

"وعلیکم السلام! جیتے رہو بہت سی خوشیاں، مرتبے..."

نگینہ کے پاس دعاؤں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ سالار ہلکے سے مسکرا دیا۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں، ہاں بالکل!" خوش دلی سے فوراً ہی بولی تھی مگر گیتی اور سالار دونوں نے اس کی آنکھوں پر آئی ہلکی سی سوجن کو نوٹ کیا تھا۔

"بے چاری امی!" گیتی کا دل دکھ سے بھرتا چلا گیا۔ سالار نگینہ سے مل کر استاد فراغت بیگ کے کمرے میں جا چکا تھا۔ سیڑھیوں کے ساتھ والا کمرہ ان ہی کا تھا۔

"ابھی گیتی کو چھوڑنے آیا تھا، تھوڑی دیر بعد آکر لے جاؤں گا، آج شام کراچی روانگی ہے فراغت چچا! دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔"

نگینہ نے باہر ہی سے اسے کہتے سنا، وہ یوں ہی بلا تکلف کسی سے بھی محبت بھرا رشتہ باندھ لیتا تھا۔

استاد فراغت بیگ کا ہاتھ سالار کے سر پر تھا۔

"بس تھوڑی سی دیر کے لیے آئی ہوں امی! شام کو تو ایئرپورٹ کے لیے نکلنا ہوگا۔" گیتی نے برآمدے سے گزرتے ہوئے نگینہ کو پروگرام کی تفصیل دی۔ "سالار کہہ تو رہے ہیں کہ جب بھی میرا دل چاہے، یہاں آسکتی ہوں، مگر دور کا معاملہ ہے، روز روز تو آنا بھی اچھا نہیں لگے گا نا۔"

نگینہ نے بہت فخر سے اس کی طرف دیکھا۔

"میری چھوٹی سی بچی کتنی سمجھدار ہو گئی ہے۔ کیوں شاما؟"

"اپنی گیتی تو ہمیشہ سے ہی عقل والی ہے، مگر لوگوں کی سمجھ میں اس کی بات ذرا دیر سے آئی ہے۔" شاما کی طرف سے فوراً ہی وثوق بھرا دعوا آیا۔

گیتی، نانی ستارہ کے کمرے کے بند دروازے کے سامنے کھڑی تھی۔

"وہ نانی تو سو رہی ہیں گیتی! انہیں ڈسٹرب مت کرو۔" شاما نے گڑبڑا کر وفاداری کا ایک اور حق ادا کیا۔ گیتی نے کچھ حیرت سے اس کی اور پھر نگینہ کی طرف دیکھا۔

"اس وقت تو وہ کبھی نہیں سوتیں، طبیعت خراب ہے کیا؟"

"ہاں بس، وہ سر میں درد تھا، کہنے لگیں آرام کروں گی!" گیتی کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔

"میرے آنے کا پتا چل گیا ہوگا، اس لیے اپنا کمرہ بند کر لیا، ہے نا؟"

نگینہ اور شاما دونوں ہی اس بار خاموش رہیں۔ ذہانت بھرے اس تجزیہ کی داد بھی نہیں دی جا سکتی تھی۔

"میں چلتا ہوں نگینہ آنٹی! واپسی میں نانی سے بھی مل لوں گا۔" سالار پیچھے آ کھڑا ہوا تھا۔

پتا نہیں اس نے گیتی کی بات سنی بھی تھی یا نہیں۔ نگینہ نے بڑی شرمندگی محسوس کی، مگر سالار کے چہرے پر ایسا کچھ نہیں تھا جو جتانے والا ہو۔ سو کچھ سکون سا ہوا۔

"دوپہر کا کھانا، یہیں کھانا۔ شاما خاص گیتی کی پسند کی چیزیں بنا رہی ہے۔"

"ضرور، مگر زیادہ تکلف مت کیجیے گا شاما باجی! ہمیں جلدی نکلنا ہے، جو سب سے جلدی پک جائے، بس وہ ہی ایک چیز بنا لیں اور آپ کا کھانا تو ہمیں ویسے بھی جلدی کھینچ کر لائے گا واپس۔"

اتنی عزت، اتنا مان!

شاما سے صرف سر ہی ہلایا گیا۔ سالار مسکرا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ چکا تھا۔

"اللہ ہمیشہ خوش رکھے ماسٹر صاحب کو، میرا تو رواں رواں ان کے اور گیتی کے لیے دعا کرتا ہے، یہاں تو اتنی زندگی گزری پر کسی نے ایسی عزت سے بات نہیں کی، مگر ماسٹر صاحب۔"

چولہے پر پکتا کھانا چھوڑ کر وہ بار بار گیتی کے کمرے میں بھی آکر بیٹھ جاتی اور بات کا ٹوٹا ہوا سرا اس ایک موضوع سے پھر سے جوڑ لیتی۔

آج گیتی کے ساتھ جو بڑے بڑے شاپرز آئے تھے۔ ان میں سب کے لیے، بہت سے قیمتی تحفے تھے۔

"شادی کے بعد دے چکی ہو تم سب کو۔ اب یہ بار بار کا دینا اچھا نہیں لگتا۔" گیتی کے معاملے میں نگینہ کی پروفیشنل اپروچ زیرو ہوئی جا رہی تھی۔ خالص گھریلو عورتوں والی سوچ اور فکریں۔ اور تو اور شاما بھی مکمل طور پر ہم نوا۔

"دامادوں سے اس طرح لیا جاتا ہے کیا بھلا؟"

"سالار کہتے ہیں کہ داماد اور بیٹے میں کوئی فرق نہیں ہوتا اور سالار تو واقعی بہترین انسان ہیں امی! مجھے تو پتا ہی نہیں تھا کہ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں دنیا میں۔" گیتی خوش تھی، بہت خوش اور بہت پُراعتماد بھی۔

اور یہ کیا کم خوش نصیبی ہے!

نگینہ نے اپنے اندر اترتے سکون کے گہرے ٹھنڈے، میٹھے احساس کا ذائقہ اس ایک بات کو سوچ کر بار بار چکھا تھا۔

"ایک بات کہنی تھی آپ سے؟" گیتی کچھ کہتے کہتے رکی تھی۔

نگینہ کی ساری توجہ گیتی کے لائے ہوئے تحفوں پر جا چکی تھی۔

بے حد قیمتی کپڑے، پرفیوم، گولڈ کی کچھ جیولری۔

شاما تک کے لیے ایک لاکٹ اور ائیر رنگز کا سیٹ۔

نیچے سیڑھیوں پر بیٹھے بخت سے لے کر استاد فراغت بیگ تک۔

وہ ایک بار بھی کسی کو نہیں بھولا تھا۔

نگینہ بہت دھیان سے سب کچھ الگ الگ کر رہی تھی، ایک سوائے نانی ستارہ کے لیے لائے گئے تحائف کے باقی سب ہی کچھ ابھی بٹ جانا تھا۔ ان کے لیے لایا ہوا شاپر نگینہ نے بے دلی سے اپنی الماری میں رکھا تھا۔

"ہاں، تو کیا کہہ رہی تھیں؟" وہ الماری بند کر کے واپس پلٹی۔

"نانی میری لائی ہوئی کوئی چیز قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں نا امی!" اتنی دیر میں پہلی بار گیتی کی مسکراہٹ گم

ہوئی تھی۔

"یوں ہی ضدی ہو رہی ہیں۔ کچھ دنوں میں غصہ اتر جائے گا۔ تم اپنا دل برا نہ کرو۔"

ایک ایسی تسلی جس پہ اسے خود بھی یقین نہیں تھا۔ وہ یوں ہی خاموش سی اس کا چہرہ تکے گئی۔

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ نانی مجھ سے اتنا زیادہ ناراض ہو جائیں گی تو شاید پھر یہ شادی ہوتی ہی نہیں، مجھے ان کی اس قدر ناراضی کا اندازہ نہیں تھا امی!"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو تم، سمجھیں۔ اللہ نے جتنا بڑا کرم کیا ہے، ساری زندگی بھی شکر کا سجدہ کرتی رہوں، تب بھی کم ہے۔ خبردار جو آئندہ ایسی بات منہ سے نکالی۔ اپنے شوہر کے ساتھ ہنسی خوشی، محبت کے ساتھ رہو، اسے کوئی شکایت کا موقع نہ دو، یہی بہت ہے۔" بہت دن بعد وہ اس طرح اس پر بگڑی تھی۔

گیتی نے چپ چاپ سر جھکا لیا۔ خاموشی کی یہی ادا، ہر بات کو ختم کر دیتی تھی، نگینہ کو بھی موڈ ٹھیک کرنا پڑا۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم مجھے ابھی؟" پیچھے چھوڑی گئی ایک ادھوری بات نگینہ کو یاد آگئی۔

"امی! وہ سالار کہہ رہے تھے کہ آپ لوگ اس گھر میں شفٹ ہو جائیں تو انہیں بہت خوشی..."

دھیمی آواز میں، بڑی امید کے ساتھ اس نے جو کہنا چاہا تھا نگینہ کو سننا گوارا نہیں ہوا۔

"کیوں؟ چار دن میں اسے بھی چبھنے لگا ہمارا گھر، ہمارا محلہ۔ آنے لگی شرم اسے بھی یہاں آنے میں، جو ہمیں بنگلوں کوٹھیوں میں لے جانے کی بات کرنے لگا۔"

"یہ بات نہیں ہے امی! سالار کا تو مطلب تھا کہ..."

نگینہ کے غصے کے آگے، کسی کا بھی ٹھہرنا مشکل ہوتا تھا۔ گیتی بھی بوکھلائی تھی۔

"میں سب مطلب سمجھتی ہوں، کہہ دینا کہ ہم جہاں ہیں، بہت اچھے ہیں، اور اگر نہیں بھی ہیں۔ تب بھی جیسے ہیں، خوش ہیں۔"

سارے قیمتی تحفے جن میں سے کئی اب بھی بیڈ پر رکھے تھے ایک طرف کرتے ہوئے وہ غصے سے بولتی چلی گئی۔

گیتی سے ایک بھی لفظ کہنا محال ہوا۔

"واہ، ایسے دعوت دی جا رہی ہے، جیسے ہم کوئی سڑک پر بیٹھے ہیں۔ ارے آج بھی کروڑ سے اوپر کی مالیت ہے اس گھر کی، وہ تو یہ کہو کہ کوئی خریدار نہیں ملتا۔ دوسرا یہ کہ اماں اور خالہ دلدار دونوں ہی بیچنے پر راضی نہیں ہیں۔ کہہ دینا سالار سے کہ ایسے گرے پڑے نہیں کہ داماد کے گھر جا کر رہنے لگیں۔" وہ اضطراب کے عالم میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

گیتی اس کے ساتھ ہی اٹھی۔

"سالار نے وہ گھر میرے نام کر دیا ہے امی! کاغذات وکیل کے پاس چلے گئے ہیں۔ کچھ قانونی کارروائی ہے جو تھوڑا وقت لے گی۔" گیتی کے لہجے میں وہی نرمی اور انکساری تھی۔

مگر نگینہ کے لیے اس بریکنگ نیوز میں بڑا دم تھا۔

حیرت سے اس کا منہ تھوڑا سا کھلا اور چہرے پر بڑا ناقابل فہم سا تاثر ابھرا۔

گیتی نے خائف سی ہو کر نگاہ جھکائی۔

نگینہ امی کا کچھ بھروسہ نہیں، پتا نہیں کچھ غلط ہی ہوا ہو!

"سچ کہہ رہی ہے گیتی! وہ گھر...... تیرے نام۔"

نگینہ تیزی سے اس کے قریب آئی۔ اس کا چہرہ، آنکھیں ابھی بھی حیرت میں ڈوبی تھیں۔

وہ شاندار خاندانی سی جھلک دکھلاتا گھر، جسے وہ گیتی اور سالار کے اصرار پر، تھوڑی دیر کے لیے دیکھنے گئی تھی۔

جس کے لیے وہ آج بھی شک میں تھی کہ وہ سالار کی ملکیت ہے بھی یا نہیں۔

"میں نے انہیں منع بھی کیا تھا امی! حالانکہ صندل نے پہلے ہی دن مجھے کہا تھا کہ میں اپنے نام جائیداد لکھوانے کی بات کروں، اسے یقین تھا کہ سالار صرف فراڈ ہیں اور یہ گھر وغیرہ کچھ بھی ان کا نہیں، مگر میرے لیے صرف سالار ہی اہم ہیں۔ چاہے ان کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو۔" بات ختم کرتے ہوئے اس کی نگاہ جھکی تھی۔

نگینہ نے دھیرے سے اس کے چہرے کو چھوا۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، مجھے یقین آگیا ہے کہ میری گیتی کو ایک بہت سچے اور خوددار شخص کی ہمراہی حاصل ہو گئی ہے، اللہ سالار کو تمہارے سر پر سلامت رکھے۔"

"آمین!" کسی نے پورے خلوص سے کہا۔

نگینہ اور گیتی نے ایک ساتھ ہی اس طرف دیکھا۔

دروازے میں نانی ستارہ کھڑی تھیں۔

گیتی آرا دوڑ کر نانی ستارہ کے کھلے ہوئے بازوؤں میں جا سمائی تھی۔

☼ ☼ ☼

کمال ہاؤس میں رات، بہت سست رفتار تھی۔

لمحہ لمحہ، قطرہ قطرہ۔

سیکنڈوں کو منٹ بننے اور منٹوں کو گھنٹہ بننے کا دورانیہ کچھ زیادہ ہی طویل ہوا تھا۔

وہ ٹیرس پر کب سے کرسی ڈال کر بیٹھے ہوئے تھے۔

تنہا، مضطرب، فکرمند۔

جو دیکھا، سچ تھا یا محض نگاہ کا دھوکا۔

اتنی مشابہت کہ سالوں بعد بھی ٹھٹکنے پر مجبور کر دے۔

انہوں نے ایک بار پھر بے چین ہو کر پہلو بدلا، شام سے وہی ایک منظر آنکھوں میں ٹھہرا تھا۔

سنہری رنگت والا وہ لڑکا اپنے گلے میں خوانچہ ڈالے گاڑیوں کے بیچ سے گزرتا ہوا۔

وہاں موجود سینکڑوں لوگوں نے شاید اسے نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا ہوگا۔

کاش وہ اسے روک پاتے، سڑک پر، جے ٹریفک کے بیچ اپنی گاڑی چھوڑ کر، جیسے بھی سہی!

زندگی سے جکڑے، بہت سے پچھتاووں میں ایک اور اضافہ، جسے برداشت کرنا بھی ناممکن ہوا جا رہا تھا۔

حالانکہ خاصی دور جا کر جو پہلا یوٹرن ملا تھا، اس پر سے گھوم کر وہ واپس اس جگہ دوبارہ آئے بھی مگر......

گاڑی ایک طرف پارک کر کے، خاصا پیدل چل کر اسے ڈھونڈنا بھی چاہا، کچھ اسٹریٹ ورکر بچوں سے بھی جاننا چاہا، مگر کوئی اتا پتا نہیں۔

وہ تو جیسے صرف انہیں ہی اپنی جھلک دکھانے کے لیے چند لمحوں کے لیے اس سڑک پر نمودار ہوا تھا اور پھر کسی سحر بھرے اسم کے ورد پر گم!

وقت کی دھول میں دبا، سال خوردہ ایک مقفل در، اسی ایک جھلک کے زور پر کھلا تھا۔

ماضی سے جڑا ہوا، اور دل کے کسی بہت ہی خفیہ حصے کی حفاظت کرتا ہوا، جس سے وہ خود بھی نگاہ چرا کر چلتے رہے تھے۔

کامیاب، رنگا رنگ زندگی میں بھی کئی کہانیاں رقم تھیں۔

خوشی اور مسرت کی بھی' دکھ اور تنہائی کی بھی۔
ہر نارمل انسان کی زندگی ان ہی کہانیوں سے بھری ہوئی ہے' کچھ ان ہی بھولے بسرے قصوں کو زندگی کا عنوان بناتے ہیں اور کچھ......

یوسف کمال کے لیے زندگی رک رک کر چلنے کا نام کبھی نہیں رہی تھی۔
"جو پیچھے دیکھنے کے لیے رکا' وہ پتھر کا بنے نہ بنے "تیزی سے گزرتا وقت اسے ضرور روندتا ہوا نکل جاتا ہے۔"
ان کی کامیاب زندگی کا فلسفہ یہی تھا اور اس پر انہیں بجا طور پر فخر بھی۔ مگر آج اپنے بارے میں یہ خوش فہمی پوری طرح دور ہوئی تھی۔
اپنی تیز رفتاری میں وہ خود کہیں سے کہیں ضرور نکل آئے تھے مگر دل بہت پیچھے کہیں دور' ایک بہت ہی تکلیف دہ موڑ پر اب بھی ٹھہرا ہوا تھا۔
ایک گہری سانس لیتے ہوئے' یوسف کمال نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا۔
اوپر ستاروں بھرا آسمان مسکرا رہا تھا۔
گہری ہوتی راتوں میں' تاحد نظر' روپہلا غبار۔
ایک مدت بعد' سب ہی کچھ نیا نیا سا محسوس ہوا... ایک مدت بعد' سب ہی کچھ نیا نیا سا بیچ میں آئے اتنے سالوں میں آسمان پر تارے چمکے بھی تھے یا نہیں' کبھی دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی۔
وہ تھکے تھکے سے انداز میں یوں ہی آسمان کو تکے گئے تب ہی ایک مدھم سی ہنسی' فضاؤں میں گونجی۔
ستاروں کے بیچ سے جھانکتا ہوا' وہی مسکراتا ہوا چہرہ۔
اور پھر اس کے عقب سے نظر آتا ایک اور چہرہ سنہری رنگت' براؤن بال' وہی آنکھیں۔
"کون تھا یہ لڑکا؟"
یوسف کمال نے اپنے اعصاب کمزور پڑتے محسوس کیے' نگاہ کا دھوکا یا کھلا سچ!

☼ ☼ ☼

بنویا نے فکر مندی سے بیڈ پر لیٹی شاکرہ امی کو دیکھا۔
ابھی ابھی وہ انہیں محلے کے ایک پرائیویٹ کلینک میں دکھا کر لائی تھی۔ ڈاکٹر نے دوائیں دے کر آرام کرنے کی ہدایت کی تھی' مگر واپس آنے تک آپا گل کی آمد ہو چکی تھی۔
"امی کا بی پی بڑی مشکل سے کنٹرول ہوا ہے آپا! سو جائیں گی تو اچھا ہے' آپ لوگ دوسرے کمرے میں بیٹھ جائیں۔"
وہ محض اتنا ہی کہہ سکی' مگر آپا گل اور خود شاکرہ امی دونوں ہی کو نامنظور ہوا تھا۔

"اتنی دور سے صرف امی کی محبت میں ہی آتی ہوں' رکشہ کا کرایہ خرچ کر کے' پتا ہے نا کہ تم میں سے کوئی بھی اس طرح خیال نہیں رکھ سکتا جیسا کہ میں۔ تم لوگ تو انہیں یوں ہی اکیلے کمرے میں رکھ کر اور بھی بیمار ڈال دو گے۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہے گل' ان ڈاکٹروں کے کہنے پر چلے تو کل کے مرتے آج ہی مر جائیں گے۔ آدمی ہے بولے گا نہیں تو ٹھیک کیسے ہو گا۔"
گزری رات کی ساری تکلیف بھلا کر' وہ آپا گل کی ہاں میں ہاں ملانے کے لیے تیار تھیں۔
جویا نے بے بسی سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔

"رات بہت زیادہ طبیعت خراب رہی ہے۔ آج صبح میں اسکول بھی نہیں جا سکی ہوں۔"

"بس جتا دیا نا احسان!" آپا گل نے معنی خیز انداز میں شاکرہ امی کو متوجہ کیا۔ "ایک رات ماں کے لیے جاگنا بھی گوارا نہیں ہے۔"

سلمان قریب ہی صوفے پر بڑی کاہلی سے آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا اور آج دانستہ آپا گل کو پوری طرح نظر انداز کرنے کا ارادہ بھی تھا، مگر اس روز میلاد کا کھانا نہ بھیجنے کا دبا دبا سا غصہ آپا گل پر ابھی تک ادھار تھا۔

"اتنی فکر ہو رہی ہے آپ کو، تو امی کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ اب تو الگ بڑا پورشن بھی ہے آپ کے پاس اور ہمارا دیا ہوا لاکھوں کا سامان بھی، تو آپ کیوں نہیں خدمت کر دیتیں ان کی، ٹھیک ہو جائیں گی تو چھوڑ جایئے گا۔"

مشورہ ایک نئی لڑائی اٹھانے کی غرض سے ہی تھا، جو کامیاب رہا۔

آپا گل کے پاس جواباً "سلمان کی کاہلی، نافرمانی اور بے حسی پر مشتمل اتنا مواد تھا کہ اگر تین دن اور تین رات بھی بولنے کے لیے دیے جاتے تو ذرا وقفہ نہ آتا۔

ایک ٹھنڈی سانس لے کر جویا نے گھر کے ان دو بڑوں کو دیکھا، جن کی فطرت میں انیس بیس کا بھی فرق نہیں تھا۔ یہاں رکنا بے کار ہی تھا، سو وہ خاموشی سے باہر نکل آئی۔

زویا کے آنے میں تھوڑا وقت تھا، عموماً وہ کالج سے اس وقت آتی تھی، جب خود جویا کوچنگ سینٹر کے لیے نکل رہی ہوتی تھی یا پھر جا چکی ہوتی تھی۔

پچھلی رات سے لے کر اب تک بڑا افراتفری کا عالم رہا تھا۔

جویا نے دل ہی دل میں وقت کا کچھ حساب کتاب لگایا تقریباً ڈھائی بجے تھے۔

آج صبح اسکول سے چھٹی نہ کی ہوتی تو ضرور ہی کوچنگ سینٹر سے ناغہ کر لیا جاتا۔

نیند اور تھکن سے جلتی ہوئی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے، دل میں بڑی شدت سے خواہش ابھری، جس سے فوری منہ موڑ لینا ہی بہتر تھا۔

اسکول اور کوچنگ سینٹر دونوں کی ہیڈ ایک ہی تھیں۔ جویا کی ایک پرانی کلاس فیلو کی بہن، مگر اصول ضابطے کسی جان پہچان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

"اسکول اور کوچنگ سینٹر کا اسٹاف میں الگ الگ رکھنا پسند کرتی ہوں، مجھے لگتا ہے کہ دو جگہ ایک سا ہی کام کرنا کسی کو بھی آسانی سے تھکا سکتا ہے، لیکن تمہاری مجبوری کو دیکھ کر میں تمہیں دونوں جگہ جاب دے رہی ہوں، اب مجھے شکایت کا موقع نہ دینا تمہاری ذمہ داری ہے۔"

انہوں نے واضح لفظوں میں اسے تنبیہہ کی تھی اور وہ بھی چار اسٹاف ممبرز کے سامنے ..... اس طرح جیسے نوکری اسے نہیں، اس کی مجبوری کو دے رہی ہیں۔

سو وہ اب ان کے پاس چپ چاپ غلامی بھی کر رہی تھی اور جواباً "خود پر ان کے ترس کھانے کو برداشت بھی کر رہی تھی۔

"کیا کریں، خدا خوفی ہی بہت ہے۔" اپنا مطلب نکالنے کو بھی کار ثواب قرار دینے کا بڑھتا ہوا رجحان!

"یہاں کون بچا ہوا تھا!" وہ واش بیسن کے قریب لگے ہوئے شیشے میں اپنا بے رونق چہرہ دیکھ کر تلخی سے مسکرائی۔

آپا گل اور سلمان کی آوازیں یہاں تک بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔ سلمان کو میلاد کے عمدہ لذیذ کھانے کا غم ایک بار پھر ستا رہا تھا۔

"ارے تم کیا کسی کا ساتھ دو گی آپا! تم سے تو یہ بھی نہ ہوا کبھی باپ بھائی کے لیے ایک وقت کا کھانا ہی بھجوا دیتیں۔ پتا بھی تھا کہ یہاں کچھ اچھا پکنا محال ہو رہا ہے۔"

جویا کا بے ساختہ ہی دل چاہا کہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر، اندر جا کر سلمان کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش کر دے۔

"اگر انسان اپنے نفس پر تھوڑا سا بھی قابو پا لے تو چھوٹی بڑی کتنی ذلتوں سے بچ جائے۔" اپنے کمرے میں جاتے ہوئے اس نے سوچا۔

کپڑے استری کیے ہوئے تھے، سو وہ شکر کا کلمہ پڑھ کر، جلد ہی تیار کھڑی تھی۔

کل ساتھ لائے ہوئے رجسٹر اٹھاتے ہوئے، اسے یاد آیا کہ صبح سے پریشانی میں سوائے ایک کپ چائے کے کچھ بھی نہیں کھایا ہے اور اب یوں ہی نکل جانے کا مطلب، اگلے ساڑھے چار گھنٹے کم از کم مزید۔ سو وہ تیزی سے کچن میں چلی آئی۔

تھوڑا سا سالن، آدھی روٹی، وہیں سلیب کے پاس رکھے چھوٹے سے اسٹول پر بیٹھ کر اس نے جلدی جلدی دو نوالے منہ میں ڈالے ہی تھے کہ وہ آ موجود ہوئیں۔

"شاباش! سب ابھی بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں اور تمہیں اپنے کھانے کی لگ گئی اور کسی کا نہیں تو امی کا ہی خیال کر لیتیں۔"

"میں امی کو کھانا کھلا کر لے گئی تھی آپا! اب وہ جوس پئیں گی، جو زویا انہیں چار بجے تک پلا دے گی۔ آپ فکر مت کریں۔" بہت ضبط سے اس نے انہیں ٹالنا چاہا۔

"اور میں اور سلمان؟"

"سلمان بھائی بھی کھا چکے ہیں۔" اس نے پلیٹ اپنے آگے سے کھسکائی اور بچی ہوئی روٹی کا ٹکڑا ہاٹ پاٹ میں رکھا اور کھڑی ہو گئی۔ "اور آپ اتنی دیر میں آئی ہیں تو میں سمجھی کہ کھانا اپنے گھر سے کھا کر آئی ہوں گی۔"

وہ کہتے ہوئے ان کے پاس سے گزرتی واش بیسن کی طرف چلی گئی۔ واپس آئی تو آپا گل اپنے لیے کھانا نکال چکی تھیں۔ جویا نے انہیں اپنی ٹرے لیے واپس شاکرہ امی کے کمرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

آج وہ ذرا جلدی گھر سے نکلی تھی۔

آپا گل کی موجودگی اعصاب کے لیے دن بہ دن امتحان بنتی جا رہی تھی، سو ان کے ساتھ جتنا کم وقت گزرے اتنی ہی عافیت تھی۔

"شاید میں اپنی قوت برداشت کھوتی جا رہی ہوں۔"

دھوپ بھری گلیوں سے گزرتے ہوئے، اس نے ایک دیانت داری بھرا تجزیہ خود اپنے لیے بھی کیا تھا۔

اسکول پلس کوچنگ سینٹر، چند گلی پیچھے ہی تھا۔ لمبی لمبی نہ ختم ہونے والی گلیاں، پیدل چلنا، اتنا آسان نہیں تھا اس نے ایک آدھ بار رکشہ کرنا چاہا تو کرایہ اتنا زیادہ تھا کہ اس نے بہتر سمجھا کہ اپنی عادت نہ ہی بگاڑی جائے۔

گھر میں ابتری کا وہ عالم تھا کہ، ایک ایک پیسہ اہمیت اختیار کر چکا تھا اور آئندہ دنوں کا منظر نامہ اور بھی تاریکی میں۔ کبھی کسی وقت تو ذہن اتنا ماؤف ہوتا کہ سارا حوصلہ جواب دیتا محسوس ہوتا۔

اور حوصلہ بھی کیا، محض بھرم قائم رکھنے کی سر توڑ کوشش۔

موسم بدل رہا تھا، مگر دن کا یہ پہر اب بھی سخت گرم تھا۔

ہاتھ میں بھاری رجسٹروں کا بوجھ، چہرے پر گہری سنجیدگی اور وہ تپتی ہوئی سڑک، جس پر سے وہ اسے دور سے آتی دکھائی دی۔

معاذ نے اسکول کے آگے والے کٹ میں کب سے گاڑی کھڑی کی ہوئی تھی اور ایک منٹ کے لیے بھی اسے بند نہیں کیا تھا، موسم کی ساری تمازت، اس ٹھنڈی یخ ہوتی گاڑی کے باہر ہی ٹھہری تھی۔

جویا اس تپتے ہوئے ماحول کا حصہ تھی، قدم بہ قدم قریب آتی ہوئی۔
وہ اس طرح گاڑی کھڑی کیے ہوئے تھا کہ جویا کی نظر پڑنے کا امکان کم تھا اور ویسے بھی جس طرح وہ بے دھیانی کے عالم میں چلتی تھی' پرانی عادت تھی۔
معاذ نے دور سے ہی اس کے دھوپ سے تپتے ہوئے چہرے اور قدموں سے لپٹی تھکن کو دیکھا تھا۔
اس کی رفتار آہستہ تھی۔
تھک چکی تھی یا موسم کی سختی اور رجسٹروں کا بوجھ اس کے لیے ناقابل برداشت ہوا تھا۔
معاذ نے بے ساختہ ہی گاڑی کا انجن آف کیا تھا۔
اس ٹھنڈے پُرسکون ماحول میں بیٹھ کر کیا وہ صرف اس کی بے بسی کا تماشا دیکھنے کا منتظر تھا۔ دھت!
وہ خود اپنی نظر میں اس بری طرح پہلے کبھی نہیں گرا تھا۔ نیچے اور نیچے' پاتال سے بھی گہری کوئی جگہ۔
وہ سامنے نظر آرہی تھی' مگر معاذ کے لیے اس کی طرف دیکھنا بھی محال ہوا۔
سارے زمانے کی فکریں پالنے کے بعد بھی' خود اس سے بڑا بے حس اور کون ہے بھلا؟ ایک بار بھی نہ اس کی مجبوری جاننے کی کوشش' نہ اسے حالات کی بے رحمی سے بچانے کی جستجو۔
باقی رہی تو صرف ضد اور خفگی۔
وہ اس کی طرف دیکھنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکا۔
جویا اب اسکول کے گیٹ کے قریب آچکی تھی۔ گاڑیوں' موٹر سائیکلوں کے بیچ میں سے نکلتے ہوئے' وہ اپنے ہاتھ میں تھامی سب چیزیں احتیاط سے سنبھالنے کی کوشش کررہی تھی' تب ہی وہ کسی چیز سے ٹکرائی تھی۔
معاذ بے ساختہ ہی گاڑی سے اترا تھا۔
مگر وہ سنبھل چکی تھی اِدھر اُدھر دیکھے بغیر اسکول کے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے' شاید اسے کوئی تکلیف محسوس ہوئی تھی۔
معاذ نے دیکھا' جویا نے اپنے نچلے لب کو دانتوں تلے دبایا تھا۔
"پتا نہیں کتنی تکلیف؟" وہ تیزی سے آگے بڑھا' مگر وہ بڑے سے آہنی گیٹ کے دوسری طرف غائب ہوچکی تھی۔
اور اس کے بعد کیا باقی رہ جاتا ہے؟ کسی بھی منظر میں یا خود اس کی اپنی زندگی میں۔
وہ آہستگی سے واپس گاڑی میں آبیٹھا۔
آس پاس' طالبعلموں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ معاذ نے اپنی گاڑی آگے بڑھالی۔
اس روز آپا گل کے گھر کے باہر ہونے والی چھوٹی سی ملاقات جسے ملاقات کہنا بھی چاہیے تھا یا نہیں۔
خود بخود کٹہرے میں لاکر کھڑا کررہی تھی۔
"شاید مجھے ایک بار پھر جویا کو دیکھنے کے لیے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" معاذ نے اپنی آنکھوں کو گیلا ہوتا ہوا محسوس کیا۔
مگر نہیں اسے یہاں آنا ہی تھا۔ لبوں کو سختی سے بھینچتے ہوئے اس نے خود سے کہا۔
گاڑی کی رفتار بڑھ رہی تھی اور اس بار اس نے اے سی آف ہی رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ربیعہ نے دادی کے کمرے میں قدم ہی رکھا تھا کہ پیچھے سے امی نے پکار لیا۔

"آرہی ہوں امی! بس دو منٹ۔" اس نے ذرا رک کر ان کی تسلی کروائی اور اندر چلی آئی۔
"پہلے اپنی ماں کی بات سن لو' پھر تسلی سے آنا!" دادی بیٹھی ہوئی تھیں اور قریب ہی زری کھڑی ان کے کپڑوں پر استری کررہی تھی۔
"سن لوں گی' لیکن پہلے آپ بتایئے!" ربیعہ نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے محبت سے ان کا ہاتھ تھاما۔
"میری کیا بات ہونی ہے بیٹا! بس وہی معاذ کی فکر!" دادی نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔
استری کرتی ہوئی زری کی ساری توجہ اسی طرف ہوئی۔
"بالکل خاموش ہوگیا ہے' اپنے دل کی بات تو وہ پہلے بھی کسی سے نہیں کرتا تھا اب تو بالکل ہی الگ تھلگ رہنے لگا ہے۔ کبھی کبھی تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید ہم سب سے خفا ہے اور شاید اپنے آپ سے بھی۔"
ایک بار پھر' معاذ کے بارے میں ان کی رائے سو فیصد درست تھی۔
ربیعہ نے تعریفی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔
"معاذ کو آپ سے اور ابا سے زیادہ کوئی نہیں جانتا دادی! جویا کے بارے میں بھی سب سے پہلے آپ نے ہی معاذ کی پسندیدگی کا اندازہ لگایا تھا' حالانکہ اس وقت وہ کتنا نظرانداز کرتا تھا جویا کو۔"
استری کرتی زری کے دل میں ایک بڑی ہی بے ساختہ قسم کی خوش فہمی جاگی۔
"اگر نظرانداز کرنے کا مطلب پسند کرنا ہی ہے تو پھر' وہ تو کب سے معاذ کے آگے سخت ترین نظرانداز ہے۔ تو پھر کیا وہ اسے بھی..." ایک شرمیلی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی۔
دادی اور ربیعہ دونوں ہی کا دھیان اس کی طرف نہیں تھا۔
"اظہار اور شاکرہ نے بہت برا کیا میرے بچے کے ساتھ۔ کبھی معاف نہیں کروں گی' لیکن اب تو انہیں بھی کچھ کہتے ہوئے خوف آتا ہے' غلطیاں کس سے نہیں ہوتیں' لیکن پکڑ......!"
انہوں نے ذرا رک کر استغفار کی۔ "اللہ ہر ایک کو بری گھڑی سے بچائے' کسی کسی وقت تو دل چاہتا ہے کہ ان کی تسلی کے لیے ان دونوں کے پاس ہو کر آؤں مگر اس عمر میں' اپنی بے عزتی کروانے کی ہمت بھی نہیں ہے۔"
انہوں نے افسردگی سے بات مکمل کی۔
ربیعہ چند لمحوں کے لیے خاموش رہی۔
زری کے کپڑے استری ہوچکے تھے' سو وہ ہینگر نکالنے کے لیے الماری کی طرف مڑ گئی۔ ابھی کچھ دیر وہ یہاں رکے رہنا چاہتی تھی۔ بظاہر منہ اور کان بند کرکے' سب کچھ سننا اور جاننا' اس کی من پسند مصروفیت بن چکی تھی اور باتیں اگر معاذ کے بارے میں ہوتیں تو پھر کیا ہی بات تھی۔
"رحم تو بے چاری جویا پر آتا ہے دادی! اس کی تو کوئی خطا بھی نہیں تھی' پھر بھی سزا اس کے حصے میں آئی' میں تو بہت دعا کرتی ہوں اس کے لیے۔" اس نے ربیعہ کو کہتے سنا اور پھر دادی کو۔
"ضرور کیا کرو اور یہ بھی کہ اگر وہ میرے معاذ کی خوشی ہے تو اس کا مقدر بنے' اللہ اگر چاہے تو کیا نہیں ہوسکتا اور میرا دل کہتا ہے کہ......"
زری کا دل جل کر خاک ہوا تھا۔
اور ابھی ابھی کی ہوئی خوش فہمی' منہ کے بل گری تھی۔
"اس جویا کا قصہ ختم ہونے والا نہیں تھا' کم از کم دادی اور ربیعہ تو چھیڑ چھیڑ کر تازہ کیے رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے تھیں۔" اسے پورا یقین ہوا۔
کپڑے ہینگ کرتے ہوئے' وہ اس ان دیکھی لڑکی سے دل بھر کر جلی تھی۔

اس وقت شائستہ ہاتھ میں کچھ لیے اندر چلی آئیں۔

"چلو اچھا ہوا تم یہاں بیٹھی ہو۔" انہوں نے ربیعہ کی طرف دیکھ کر کہا اور قریبی کرسی کھینچ کر وہیں بیٹھ گئیں۔

"یہ کیا ہے امی!" ربیعہ کی توجہ ان کے ہاتھ میں پکڑے لفافے کی طرف گئی تو زری کی نگاہ بھی اس طرف اٹھی۔

"ہاں یہ..." وہ کھولنے لگی تھیں کہ زری کو اپنی ہی طرف دیکھتا پا کر رک سی گئیں۔

"زری! تم جا کر باہر ٹی وی دیکھو، ہمیں کچھ بات کرنی ہے۔" وہ اسے خود سے بہت کم ہی کوئی کام کہتی تھیں سو اس وقت بھی سیدھی سادی مصروفیت تھمائی۔

"وہ یہ کپڑے... کچھ کپڑے رہ گئے تھے" اس نے رکے رہنے کے لیے ان ہی کا عذر تراشنا چاہا۔

"وہ ربیعہ کر لے گی، تم جاؤ۔" نہ سختی نہ نرمی، شائستہ بیگم کا انداز اس سے بات کرتے ہوئے زیادہ تر بے تاثر رہنے لگا تھا۔ اور گھر میں ایک وہ اور ایک معاذ، وہی تھے، جن کے آگے وہ واقعی محتاط رہنے کی کوشش کرتی تھی۔

نہ چاہتے ہوئے بھی باہر نکلنا پڑا تھا۔

"اس لڑکی سے مجھے خوف آتا ہے اماں! صرف معاذ کی وجہ سے مجبور ہوں، ورنہ کب کا بھجوا چکی ہوتی اسے سکھر، اس کی بھابھی کے پاس۔"

وہی پرانی مجبوری، مگر اب اس میں ٹھیک ٹھاک خوف شامل ہوتا جا رہا تھا۔

پچھلی بار معاذ کا فائنل ہوتا ہوا رشتہ اچانک ختم ہوا تھا۔ لڑکی والوں نے سلیقے سے معذرت کر لی تھی، لیکن شائستہ پُریقین تھیں کہ بات بگڑوانے میں سو فیصد زری کا ہاتھ تھا۔

"بہت گھل مل کر بیٹھی تھی یہ لڑکی ان لوگوں کے ساتھ، آخری بار جب وہ آئے تھے تو اتفاق سے نہ میں تھی اور نہ ربیعہ، اسی کے بعد وہاں سے انکار آیا تھا۔ پتا نہیں کیا بکواس کی تھی اس نے ان لوگوں کے سامنے۔"

اتنے ماہ بعد بھی نہ پچھتاوا ختم ہوتا تھا اور نہ بدگمانی۔

"قسمت کا بھی جوڑ ہے شائستہ! نہیں ہوگی وہاں معاذ کی شادی قسمت میں۔ اب تم بار بار ایک ہی بات کو لے کر مت بیٹھو اور زری کو بھی تم نے کچھ کہتے تو نہیں سنا، تو پھر کیوں گناہ گار ہو رہی ہو۔" دادی کو نہ اس رشتے کے ٹوٹنے پر ایسا کوئی رنج ہوا تھا اور نہ ہی انہیں فی الحال معاذ کی شادی کی ایسی کوئی جلدی تھی، جیسی کہ شائستہ بیگم کو۔ بلکہ وہ تو زری کی بھی تھوڑی سی شکر گزار ہی تھیں۔

"صاف بات ہے اماں! میں آپ جیسی نہیں ہو سکتی۔ مجھے تو چوٹ لگتی ہے اور تکلیف بھی ہوتی ہے اور مجھ سے اتنی آسانی سے معاف بھی نہیں کیا جاتا۔"

دادی اور ربیعہ دونوں مسکرا دیں۔

"اچھا یہ دیکھیں! یہ لڑکی۔" انہوں نے احتیاط سے ایک تصویر لفافے میں سے برآمد کی۔ "کیسی ہے معاذ کے لیے؟ بہت اچھے لوگ ہیں۔ لڑکی ایم بی اے کیے ہوئے ہے۔ میں جا کر دیکھ بھی آئی ہوں، تصویر سے کہیں زیادہ حسین ہے۔"

ربیعہ اور دادی دونوں ہی نے تصویر پر سے نگاہ اٹھا کر شائستہ بیگم کی طرف دیکھا۔

"میں نے سوچا پہلے خود مل لوں، لوگ صحیح ہوئے تو پھر آپ سب کو لے چلوں گی، پہلے سے شور مچانا بے کار تھا، اب آپ بتائیں کیسی ہے، پسند آئی؟"

ان کے لہجے میں دبا دبا سا جوش تھا۔ ربیعہ کو ان کے کچھ بھولنے پر حیرت ہوئی تھی۔

"آپ نے سنا نہیں تھا امی! اس روز صاف انکار کیا تھا معاذ نے، کتنے غصے میں آ گیا تھا وہ، ابھی تو اس کے سامنے یہ بات چھیڑیے گا بھی نہیں۔"

"کرنے دو اسے منع، شادی تو مجھے اس کی جلد ہی کرنی ہے۔" انہوں نے سرسری سے انداز میں ہاتھ ہلایا "اور اماں! اس بار آپ اسے راضی کریں گی، اگر آپ کو میرا ذرا بھی خیال ہے۔ ساری زندگی میں پہلی بار آپ کو اپنے لیے کچھ کرنے کے لیے کہہ رہی ہوں، صرف آپ منا سکتی ہیں معاذ کو یا پھر اس کے ابا کو، کیونکہ وہ میری سنیں گے نہیں، اس لیے۔"

ان کی امید بھری نگاہیں دادی کے چہرے پر جمی تھیں۔

"ہاں یار؟" دادی نے لمحوں میں خود کو مشکل میں پڑتا محسوس کیا۔ سامنے رکھی وہ خوب صورت تصویر بے معنی تھی۔

"میں کیسے اس پر زور دے سکتی ہوں، اس کی زندگی کا سوال ہے شائستہ!"

"ٹھیک ہے، تو پھر صاف کہہ دیجیے گا معاذ سے، جویا سے اس کی شادی پر میں کبھی راضی نہیں ہوں گی۔ چاہے بیٹھا رہے وہ ساری عمر کنوارا۔" ان کا لہجہ سخت ہوا تھا۔

ربیعہ اور دادی دونوں ہی نے بے بسی سے انہیں دیکھا تھا۔

"کیسی باتیں کرتی ہو شائستہ! اولاد سے ضد باندھو گی؟"

"ہاں، جب وہ ضد باندھ سکتا ہے تو پھر یہی سہی۔"

باہر سے اندر آتے معاذ نے دروازے سے ذرا پیچھے رک کر انہیں کہتے سنا تھا۔

ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ابھری اور دوسرے لمحے وہ دادی کے کمرے میں جانے کے بجائے مخالف سمت والے برآمدے کی طرف چلا گیا۔

زری نے بہت غور سے، اس کا رکنا، مسکرانا اور جانا تینوں ہی نوٹ کیے تھے۔

☼ ☼ ☼

زرتاج نے ایک گہری نظر ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں نظر آتے اپنے عکس پر ڈالی۔

جدید طرز کا قیمتی لباس، بہت احتیاط کے ساتھ کیا ہوا میک اپ، بیش قیمت جیولری، لیکن سب کچھ بھی مل ملا کے اطمینان بخش نتیجہ نہیں دے رہا تھا۔

تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی عمر، اب اپنے نقوش چھوڑنے لگی تھی، حالانکہ اب وہ سب سے ایڈوانس اسکن ٹریٹمنٹ بھی لے رہی تھیں، پھر بھی گلابی رنگت اور خوب صورت نقوش پر بڑا عجیب سا تاثر پھیل رہا تھا۔ زرتاج کی نگاہ صرف اپنے چہرے پر جمی تھی۔

ایک کرخت، چالاک اور غیر مطمئن چہرہ، جسے دیکھتے رہنے سے عجیب سی گھبراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ خود انہوں نے بھی اپنے آپ سے نگاہ چرائی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کیسا عجیب سا بدلاؤ تھا۔

ٹشو پیپر سے چہرہ تھپکتے ہوئے انہوں نے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ لا کر پلکیں جھپکائیں، اس توقع پر کہ شاید چہرے پر نرمی کا کوئی تاثر جاگا ہو، مگر مڑ کر دیکھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔

دروازے پر دستک دے کر ملازمہ اندر آئی تھی، اب گھر اور باہر کا تقریباً سارا ہی اسٹاف نیا تھا۔ پختہ عمر کی یہ عورت کچن کی ذمہ داری سنبھال رہی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر جوس وغیرہ کے کچھ گلاس رکھے تھے۔ وہ انہیں اٹھانے اس طرف مڑ گئی، مگر زرتاج کی نظر اس پر جمی رہی۔

سادہ سا کاٹن کا سوٹ پہنے سانولی رنگت والی موٹی سی یہ عورت، خود زرتاج کی ہی ہم عمر تھی۔ محنت اور مجبوریوں میں گھری ہوئی، اتنی معمولی کہ نگاہ اٹھا کر دیکھنے کے بھی قابل نہیں، پھر بھی زرتاج کی ساری توجہ اسی پر تھی۔ اس

کے سانولے چہرے پر پھیلا سکون اور بڑھتی عمر کا وقار دل کو چھو رہا تھا۔ اس کے چہرے نے معلوم نہیں کب سے کسی سستی سی کریم یا پاؤڈر کے لمس کو بھی محسوس نہیں کیا تھا' پھر بھی نگاہ اس کے چہرے پر رک رہی تھی۔ نقوش کی نرمی' سکون قلب کی دین تھی۔ مگر یہ سب زرتاج کے فلسفہ حیات سے کہیں پرے کی باتیں تھیں۔

وہ برتن لے کر واپس پلٹنے لگی تو زرتاج کو بھی جیسے ہوش سا آیا۔

"اتنی دیر سے یہ برتن پڑے ہیں یہاں' تمہیں اب ہوش آیا اٹھانے کا' ڈھٹائی کی بھی انتہا ہوتی ہے' اس طرح کام کیا تو نکال باہر کروں گی' سمجھیں۔" سختی' حقارت' غرور بھرا مخصوص لہجہ۔

انہیں پتا بھی نہیں چلا کہ ان کے چہرے کا بدنما تاثر اور بھی گہرا ہوا ہے۔ ابھی ابھی جس احساس کمتری نے سر اٹھایا تھا۔ وہ جھنجلائے دے رہا تھا۔

"آیندہ خیال رکھوں گی بیگم صاحب! معذرت چاہتی ہوں۔" وہ عورت مہذب تھی' نگاہیں جھکائے' جس طرح وہ معذرت کر رہی تھی' چہرے پر آئی افسردگی' اس کی معصومیت کو اور بھی بڑھا رہی تھی۔ زرتاج کا غصہ اور بھی بڑھنے لگا۔

"بکواس نہیں چاہیے مجھے' کام چاہیے کام اور سنو! صاحب کے گیسٹ آگئے ہیں یا نہیں؟"

"آچکے ہیں' سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔"

"ٹھیک ہے اور کھانے کی سرونگ وغیرہ ٹھیک سے کرنا' کسی چیز کی شکایت نہ ملے مجھے۔"

زرتاج کی سخت مزاجی کے آگے کھڑے رہنا اچھے اچھوں کے لیے محال ہوتا تھا' وہ عورت بھی چپ چاپ سر جھکائے ان کی دی گئی ہدایتیں سنے گئی۔ اور پھر ان کا اشارہ ملتے ہی فوراً" باہر بھی نکل گئی۔ زرتاج نے بے زاری سے سر کو ملکے سے جنبش دی۔

"کیا ہو گیا ہے' جو میں خود کو ایک معمولی سی ملازمہ کے ساتھ کمپیئر کر رہی ہوں' میں جو شہر کے سب سے ہائی کلاس سرکل میں بہت نمایاں مقام پر ہوں اور جس کے حسن و جمال کے ایک مدت سے چرچے ہیں اسے یہ معمولی عورت احساس کمتری میں مبتلا کر سکتی ہے.... ہشت۔" ایک غرور بھری تنبیہہ اپنے آپ کو کرتے ہوئے وہ کمرے سے نکل آئیں۔

وسیع و عریض شان دار گھر کے کوریڈور اور سیڑھیوں سے وہ کسی ملکہ کی سی شان سے گزرتی ہوئی لاؤنج میں آئیں' تب ہی دوسری طرف سے نبیل چلا آیا۔

"تم کہیں جا رہی ہو کیا؟" وہ ان کی خصوصی تیاری دیکھ کر چونکا تھا۔

"نہیں تو' جب گھر میں ہی مہمان ہوں تو پھر میں کیسے باہر جا سکتی ہوں' مہمان آگئے ہیں نا؟" وہ اپنے بالوں کو درست کرتے ہوئے پوچھ رہی تھیں' تب ہی نبیل کے چہرے پر کچھ ہچکچاہٹ سی در آئی۔

"تم کیا کرو گی' ایسے ہی بور ہوتی رہو گی' وہ سب تمہارے ٹیسٹ کے لوگ نہیں ہیں زرتاج! رہنے دو تم' بلکہ اپنی کسی فرینڈ سے مل آؤ' یہاں سب ملازم دیکھ لیں گے۔" وہ جو ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ چکی تھیں ٹھٹھک سی گئیں۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ اپنے گھر کی کسی دعوت میں ہمیں خود شامل نہ ہوں؟ اور جبکہ تمہارے دوست اپنی بیویوں کو بھی لے کر آرہے ہیں۔"

"بیوی نہیں' گرل فرینڈ' میرے دوستوں میں سے زیادہ تر کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے۔" اس کے لہجے میں اکتاہٹ نمایاں تھی۔

"تو کیا ہوا' میں اور تم بھی تو پہلے کبھی صرف دوست ہی تھے نا' کتنے فنکشنز میں ایک ساتھ جاتے تھے۔"

زرتاج کا موڈ خوش گوار ہوتا جا رہا تھا' نبیل جیسے خوش شکل اور اسمارٹ شخص کی بیوی ہونا' اس کے اعتماد کو خود بخود سپورٹ دیتا تھا۔

"اور لوگ یہاں اس گھر میں جب آتے ہیں تو سب سے زیادہ وہ مجھ سے ملنے کے خواہش مند ہوتے ہیں' تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ تم زرتاج جیسی شان دار عورت کے شوہر ہو۔" وہ نبیل کے قریب تر ہوئی۔

بہت مشکل سے وہ خود پر قابو رکھ سکا۔ کسی کسی وقت تو دل چاہتا کہ اس عورت کی ساری خوش گمانیوں کو حقیقت کا آئینہ دکھا ہی دے' مگر اس کے بعد خود اس کے اپنے لیے کوئی جائے پناہ نہ بچتی۔

سامنے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس کے دوستوں میں کوئی بھی اتنا مہذب نہیں ہے کہ اِدھر اُدھر جھانکنے سے پرہیز کرے۔

"لوگ بیٹھے ہیں' ذرا خیال کرو زرتاج۔" اسے خود سے الگ کرتے ہوئے وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

"تو چلو پھر!" وہ اس کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھ گئیں۔ سامنے لاؤنج کی دیوار پر لگے منقش فریم والے بڑے سے شیشے میں نبیل نے خود کو ان کے ساتھ ہمیشہ سے زیادہ مضحکہ خیز سا محسوس کیا۔

بہت زیادہ دن مزید اب اس عورت کو برداشت کرنا اس کے لیے ناممکن ہوا جا رہا تھا۔

"جو کچھ بھی وصول کرنا ہے جلد سے جلد کر اور کہیں من پسند زندگی....." اس نے دل ہی دل میں کچھ اہم باتوں کو ترتیب دیا۔

اندر اپنے ان سارے دوستوں کی مذاق اڑاتی نگاہوں کا سامنا کرنے کا خیال ہی اس کے قدم بوجھل کر رہا تھا جو ذہنی اور اخلاقی طور پر خود اس کے معیار کے تھے۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" ڈرائنگ روم سے محض دو قدم پیچھے رک کر زرتاج نے دفعتاً" پوچھا۔

"کچھ' کچھ نہیں۔" وہ گڑبڑایا۔

زرتاج کی نگاہ اس کے چہرے پر جمی تھی۔ اور جب وہ اس طرح دیکھتی تھیں تو ان کی نظر سامنے والے کو کہیں اپنے اندر اترتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ نبیل کو ان کی نگاہوں کا تلخ تجربہ تھا' اور ان کی طاقت کا بھی۔ بہت کچھ اگلوا سکتی تھیں وہ۔

"چلو!" وہ جواب دینے کے بجائے اندر داخل ہوا۔

ساری مذاق اڑاتی نگاہیں ایک ساتھ ہی ان کی طرف اٹھیں۔ نبیل نے جھینپ کر نگاہ چرائی تھی۔

☼ ☼ ☼

"سو' نانی نے آخر کار ہمیں معاف کر ہی دیا۔" سالار کے لہجے میں بڑا ہی گہرا سکون تھا۔

"اگر وہ ایسا نہیں کرتیں تو بڑا بوجھ رہتا میرے دل پر۔ میں ان سے بہت محبت کرتی ہوں سالار! میں نے پہلی بار ان کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی۔ سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ اتنی ہمت کہاں سے آگئی تھی۔" اپنی بات کے اختتام پر اس کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ ابھری۔

سالار نے بہت محبت سے اسے دیکھا۔ آج کا دن اتنا مصروفیت بھرا تھا کہ ٹک کر کوئی بات ہو ہی نہیں پائی تھی۔ نانی ستارہ کے گھر کا الوداعی کھانا' پھر بھاگم بھاگ گھر اور پھر وہاں سے ایئرپورٹ....

جہاز میں سوار ہونے سے پہلے کے کچھ لمحات میں تھوڑی سی فرصت تھی' تب گیتی نے اسے مختصراً" نانی ستارہ کی ناراضی دور ہونے کا مختصر سا قصہ سنایا تھا' جس کا اندازہ وہ خود بھی کر چکا تھا۔

"ہماری شادی کے بعد پہلی بار وہ آج ہمارے ساتھ کھانے پر بیٹھیں' مجھے گلے لگا کر دعا دی ....

تب ہی میں سمجھ گیا تھا کہ کسی بھی طرح سہی، مگر وہ اب مجھے معاف کر چکی ہیں' انہوں نے مجھے کچھ پیسے بھی دیے.... مجھے بڑا اچھا لگا۔"

گیتی نرمی سے مسکرادی۔

کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا راجوان دونوں کو مسکراتی ہوئی نظروں سے دیکھے گیا۔

اس وقت وہ لوگ کراچی روانہ ہو رہے تھے۔

"وہاں رہنا تمہارے لیے بہت آسان نہیں ہوگا۔ زرتاج بیگم کے بارے میں' میں تمہیں بتا چکا ہوں گیتی! انہوں نے آج تک مجھے قبول نہیں کیا' سو تمہیں کیا کریں گی' لیکن تمہیں ان سے خائف ہونے کی ضرورت نہیں' بلکہ کسی سے گھبرانے کی ضرورت نہیں' وہ میرا گھر ہے اور اب تمہارا۔" اس کے ساتھ بیٹھا ہوا سالار دھیرے دھیرے اسے سمجھا رہا تھا۔

گیتی اس کی داستان حیات مکمل نہ سہی جزوی طور پر سن چکی تھی اور اس درد بھری کہانی کے چند باب بھی سالار کے مقام کو اور اونچا کرتے تھے۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی کہ اسے اب کچھ فرق نہیں پڑتا کہ آس پاس کی دنیا اور لوگ کیسے ہیں' کیونکہ اس کی ساری دنیا اب صرف اور صرف خود سالار ہے۔

مگر شاید یہ جگہ ان انتہائی ذاتی خیالات کے اظہار کے لیے ٹھیک نہیں تھی۔ گیتی نے ایک جھنپی ہوئی نظر لوگوں سے بھرے ٹرمینل پر ڈالی۔ کراچی کے لیے فلائٹ اناؤنس ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کھانا لذیذ تھا اور ورائٹی اتنی کہ کھانے والے مستقل کنفیوز ہی رہے۔

اوپر تک بار بار پلیٹیں بھری جاتی رہیں اور جس بدتہذیبی کے ساتھ کھایا گیا' زرتاج کے لیے قطعی ناقابل برداشت ثابت ہو رہا تھا۔ سب کے اصرار کے باوجود بھی' وہ کھانے میں شامل نہ ہو سکیں۔

"میں رات کو عموماً" نہیں کھاتی ہوں' آپ لوگ خیال مت کریں۔" محض نبیل کی خاطر وہ ان سب کو گوارا کر رہی تھیں' جو گھر میں گھسنے دینے کے بھی قابل نہیں تھے' ان کے نزدیک۔

"ٹھیک کرتی ہیں آپ' ایج بڑھنے کے ساتھ اس طرح کی احتیاط ضروری ہو جاتی ہے' کئی پرابلم ہیں میری امی کے ساتھ بھی۔" ان میں سے کسی کے ساتھ آئی ایک پٹاخہ قسم کی لڑکی نے بظاہر بڑی ہمدردی سے کہا تھا۔

دبی دبی سی کئی مسکراہٹیں ایک ساتھ ابھریں۔

زرتاج کی زندگی میں اس طرح کے توہین آمیز لمحات کی گنجائش نہ ہونے کے برابر تھی۔

"مجھے کوئی بیماری نہیں ہے' اور نہ ہی میں تمہاری امی کی ہم عمر ہوں' سمجھیں۔" زرتاج کی آواز اونچی تھی اور لہجہ اتنا تلخ کہ چند لمحوں کے لیے تو سب ہی خاموش ہوئے تھے۔ نبیل کو زرتاج سے اس درجہ بداخلاقی کی ہرگز امید نہیں تھی' ابھی تک وہ صرف اپنے دوستوں کے سامنے زرتاج کی وجہ سے شرمندہ تھا' لیکن اب ٹھیک ٹھاک ذلیل ہوا تھا۔

"اس میں غصے کی کیا بات ہے زرتاج؟ دوستوں میں اس طرح کا بی ہیویر نہیں ہوتا' اور خاص طور پر جب وہ آپ کے گھر آئے ہوں۔" خود پر جھنجھتی بہت سی نگاہوں کے جواب میں اسے زرتاج کو ٹوکنا ہی پڑا۔ وہ بھی آنے والے وقت کا اندازہ کیے بغیر۔

"میرے گھر میں کھڑے ہو کر تم اپنے اصول مت لاگو کرو نبیل!" زرتاج نے بمشکل خود پر قابو پایا۔ "اور اب جب یہ سب کھانا کھا چکے ہیں تو ان کو رخصت کرو' بہت دیر یہ ساری بے ہودگی میں نے برداشت کر لی' سمجھے' ختم

کرواب یہ سب۔" سرد سے انداز میں بات کہہ کر وہ کسی کی بھی طرف دیکھے بغیر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئیں۔

پیچھے سارا ماحول سخت بوجھل ہوا تھا۔

"یہ بڑھیا تو بڑی بدمزاج ہے یار' بڑی ہمت ہے تیری جو تو اُسے جھیل رہا ہے۔" جو اس کا سب سے قریبی دوست تھا' اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر طنزیہ انداز میں ہنس پڑا۔

کمرے کی خاموشی اس نے توڑی اور پھر فوراً ہی جیسے وہ سب ہی ہوش میں آئے۔

"چلو بھئی' بہت ہو گئی پارٹی' اب بے عزتی کروا کر نکل رہے ہیں' میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ گھر پر پروگرام مت رکھو' کسی گیسٹ ہاؤس وغیرہ میں سکون سے ہی سب ہو جاتا۔" بات کرتے ہوئے اس کی نگاہ پینے پلانے کے اس سارے اہتمام پر گئی' جس کی ابھی صرف شروعات ہوئی تھی۔

"آنا ہی نہیں چاہیے تھا' سارے زمانے کو پتا ہے زرتاج بیگم کی بدمزاجی کا عالم۔" ایک ساتھ سب ہی بولتے ہوئے نکلنا شروع ہو گئے۔

نبیل یوں ہی چور سا بنا ان سب کے بیچ کھڑا رہا۔ وہ سب کوئی عزت دار لوگ نہیں تھے' پھر بھی ان سب کے سامنے نبیل نے خود کو بہت عزت دار ثابت کیا ہوا تھا' سو بے عزتی بھی ان کی نہیں' اس کی تھی۔

"تیرا حال دیکھ کر بہت افسوس ہوا ہے نبیل یار! جان چھڑا' اس بدمزاج بڑھیا سے' پیسہ ویسہ کچھ نہیں دے گی یہ تجھے' یوں ہی زندگی خراب مت کر اپنی' پیسہ کمانے کے تو ہزار اور بھی راستے ہیں' ہم بھی تو کما ہی رہے ہیں۔" وہ ہی جو سب سے قریب تھا' سب سے آخر میں کمرے سے نکلا۔

ہمدردی کے ساتھ دیا گیا مشورہ زخموں پر نمک چھڑک گیا۔

سجے سجائے شان دار ہال میں اکیلے کھڑے نبیل نے ایک گہری سانس لے کر خود کو کمپوز رکھنے کی بھرپور کوشش کی۔

جو ہونا تھا سو ہوا۔

زرتاج سے حساب برابر کرنے کے لیے' سمجھ داری اور تحمل کی ضرورت تھی۔ جذباتی ہو کر کیے کرائے پر پانی پھیرنے کی ہرگز بھی ضرورت نہیں۔ آرام طلبی اور عیش پرستی' دونوں ہی پھر سے سڑک پر آجانے سے خوف زدہ کرتی تھیں۔

"بھلا یہ سب کچھ چھوڑ کر۔" اس نے خود سے کہا تھا اور جواباً" بڑی تکلیف دہ کیفیت بھی محسوس کی تھی۔ اب جبکہ سب کچھ تقریباً" اس کے ہاتھ میں بھی آچکا تھا' یوں ہی کیسے چھوڑا جا سکتا تھا۔ آگے نہ پیسے کی کمی تھی اور نہ بیویوں کی۔

"چلو زرتاج بیگم' کچھ عرصہ اور تمہاری چاپلوسی کیے لیتے ہیں۔" لاؤنج تک جاتے ہوئے وہ سوچ کر دل ہی دل میں مسکرا دیا تھا۔

اندر لاؤنج میں زرتاج دور سامنے بیٹھی کسی سے بات کر رہی تھیں۔

نبیل جب تک ان کے پاس پہنچا وہ فون بند کر چکی تھیں۔

"کس کا فون تھا؟" اس نے اس طرح نارمل انداز میں سوال کیا جیسے ابھی تھوڑی دیر پہلے کچھ نہ ہوا تھا۔

مگر زرتاج ابھی بھی خفا تھیں' سو مختصر ترین جواب۔

"مانی کا۔"

"اچھا۔" وہ اس طرح خوش ہوا جیسے بہت دن سے منتظر تھا۔ "ٹھیک تو ہے نا' مجھ سے بھی بات کروا دیتیں۔"

"تمہاری وہ تھرڈ کلاس پارٹی ختم ہو جاتی تو تم کسی سے بات کرنے کے قابل ہوتے نا' میرے گھر کو کوئی تھرڈ

کلاس چور اہا سمجھ لیا ہے تم نے' جو ہر راہ چلتے کو کھڑا کر لیا اندر۔" وہ حلق کے بل چلائیں۔

صورت حال سنگین تھی اور وہ کسی صورت بھی زرتاج کی خفگی کو بڑھنے نہیں دے سکتا تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی' وہ اسے بولنے کا موقع بھی نہیں دے رہی تھیں۔

"وہ دو ٹکے کی گھٹیا..... لڑکیاں مجھے عمر کا طعنہ دے رہی تھیں' مذاق اڑا رہی تھیں میرا اور تم میرا تماشا دیکھ رہے تھے؟ کاش میں اس کے منہ پر تھپڑ مارتی اور دھکے دے کر گھر سے نکالتی' پتا نہیں کیوں میں کمرے سے باہر نکل آئی' ملازموں کو کیوں آواز نہیں دی۔" ان کے لہجے میں پچھتاوا تھا۔

اور نبیل جانتا تھا کہ وہ جو کہہ رہی ہیں اسے کر لینا بھی کوئی بڑی بات نہیں تھی ان کے لیے۔ سو شکر تھا کہ یہ نادر خیال ان کے ذہن میں ذرا دیر سے آیا۔ ورنہ منظر اور بھی مختلف ہو سکتا تھا۔

"اس بار معاف کر دو زری! میں آئندہ ان لوگوں کی شکل بھی نہیں دیکھوں گا' یقین کرو میرا۔"

نبیل کے لیے اس بپھری ہوئی عورت کو قابو میں کرنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جناح ٹرمینل سے باہر آتے ہوئے گیتی نے پہلی بار کراچی میں قدم رکھا تھا۔ راجو قدم بڑھا کر سالار کے قریب آیا۔

"گھر سے گاڑی منگوا لیتے سالار بھائی! بھابھی پہلی بار یہاں اپنے گھر جا رہی ہیں' وہ بھی ٹیکسی میں۔"

"تو پھر۔" سالار نے بے تاثر سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ راجو کو لگا جیسے وہ اس کی بات سمجھا نہیں تھا۔

"اچھا نہیں لگے گا نا' آپ کے پاس ماشاء اللہ گاڑیوں کی کیا کمی ہے۔"

"اہمیت چیزوں کی نہیں' انسانوں کی ہوتی ہے اور مجھے تو ویسے بھی ٹیکسی ہی راس آئی ہے۔ ساری عمر ایک ٹیکسی والے کا ہی شکر گزار رہوں گا' جس نے وقت پر مجھے صحیح مقام پر پہنچا دیا' کیوں گیتی؟"

جواباً" وہ عموماً" صرف مسکراتی ہی تھی' سو اس وقت بھی.....

"یہ تو ہے۔" راجو ہلکے سے ہنس پڑا۔ "وہ دن بھی بڑے کمال کا تھا اور مجھے بہت خوشی ہے کہ میں اس دن کا حصہ بنا رہا' آپ کی خوشی میں شریک ہوا۔" کہتے ہوئے وہ ٹیکسی والے کے لیے آگے چلا گیا۔

سالار نے گیتی کی طرف دیکھا۔

اس کی نظر اطراف میں تھی۔

نیا شہر' نئی زندگی' نیا موسم۔

"یہ شہر بہت بڑا ہے' تمہاری امید سے بھی زیادہ' رہو گی تو خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔" وہ یوں ہی سرسری سے انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے اس کا بازو تھام کر سامنے کھڑی ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔

روشنیوں سے چمکتا دمکتا ایئر پورٹ' رونقوں سے پُر تھا' پھر بھی وہ لمحے بھر کے لیے اداس ہوئی۔

نگینہ امی' نانی' صندل' شاما اور بھی بہت سے دوسرے۔

"سنیں!" ٹیکسی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے سالار کو متوجہ کیا۔ وہ بیگ ٹیکسی میں رکھ رہا تھا۔ چونک اس کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے بتا دیجیے کہ اپنے تعارف میں مجھے نانی یا نگینہ امی کا حوالہ دینا ہے یا نہیں؟" اسے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے وہ ضروری بات یاد آئی۔

سالار نے چونک کر گیتی کو دیکھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ام ثمامہ

ارسلان! اس بار تو میں نے سوچ لیا ہے' چاہے کچھ ہو جائے اگلے سال ہم بھی قربانی کریں گے۔"

سدرہ ابھی ابھی منجھلی بھابی کے یہاں سے عید ملن پارٹی میں تکے کباب' کلیجی' قورمہ اور سری پائے کھا کر آئی تھی اور اب اپنے میاں کا مغز کھا رہی تھی۔

"ارے بیگم صاحبہ! اس قدر مہنگائی میں مجھ جیسے تنخواہ دار آدمی کے لیے قربانی کرنا ایسا ہی ناممکن ہے' جیسے سورج کا مغرب سے نکلنا' عورتوں کا اسٹار پلس کے ڈرامے نہ دیکھنا اور اوباما کا گورا ہو جانا......" ارسلان نے ہمیشہ کی طرح بات کو چٹکیوں میں اڑانے کی کوشش کی۔

"مجھے کچھ نہیں پتا' عید سے پہلے ان کی گائے اور بکرے کی فیشن پریڈ اور عید پر کی جانے والی دعوتوں اور طعنوں تشنوں سے میں اب تنگ آچکی ہوں۔ میں نے آپ سے کبھی کوئی بے جا فرمائش نہیں کی مگر اب تو اگلے سال مجھے بھی "بکرے والی" کہلانا ہے۔" سدرہ نے روہانسی ہوتے ہوئے ضد کی۔

"ارے بیگم! بات کو سمجھو' قربانی صاحبِ نصاب پر فرض ہے' اور نہ تو تمہارے پاس سونا چاندی ہے نہ میرے پاس پیسہ تو پھر ہم ظاہری نمود و نمائش کے لیے قربانی کے اصل فلسفے کو کیوں نظرانداز کریں؟"

اس نے رسان سے سدرہ کو سمجھانے کی کوشش کی مگر اس دفعہ تو سدرہ کچھ اور ہی ٹھانے بیٹھی تھی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ ہر ممکن بچت کرے گی اور خود ارسلان کو قربانی کا جانور خریدنے کے لیے پیسے جمع کر کے دے گی۔

اور پھر اس نے ارسلان سے ایک منی بکس منگایا اور سب سے پہلے میکے سے آنے والی وہ خرچی اس میں ڈالی جو اماں نے اسے عید پر بھیجی تھی' ورنہ اس سے پہلے وہ یہ پیسے بڑے کروفر سے فقط اپنی ذات پہ خرچ کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

ارسلان کے تین بڑے بھائی اور دو بڑی بہنیں تھیں۔ ارسلان سب سے چھوٹا تھا۔ یعنی وہ اماں ابا کی اولاد میں کھرچن تھا۔

بڑے پانچ بچوں کی تعلیم و تربیت اور شادی بیاہ کے چکروں میں ابا اور اماں کی عمر اور پیسہ دونوں خرچ ہو گئے۔ اماں ابا جب اللہ کو پیارے ہوئے تو ارسلان اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ بھائیوں بہنوں نے ابا کے بنائے گھر میں حصے کر لیے۔ ارسلان کے بارے میں سب کا خیال تھا کہ وہ ابھی چھوٹا تھا اور پھر اسے ان سب نے ہی پالنا تھا۔

یوں ارسلان کبھی ایک بھائی کے در پر کبھی دوسری بھابھی کے دروازے پر اور کبھی باہر دوستوں کی چوپال پر۔

وقت گزرتا گیا۔ وہ پڑھائی میں اچھا تھا۔ اس نے ٹیوشن پڑھا کر محنت اور لگن سے اپنا ایم بی اے مکمل کیا اور قسمت سے اسے ایک بینک میں اچھی نوکری مل گئی اور وہ یکدم سب کی آنکھوں کا تارا بن گیا۔

بڑی بھابھی بالائی سے بھرا دودھ کا گلاس لیے سرہانے کھڑی رہتیں تاکہ وہ کسی طرح رام ہو جائے اور ان کی اس بہن سے شادی خانہ آبادی کر لے' جس کے مست مست دو نین آپس میں ملتے ہی نہیں تھے مگر وہ بھی بڑا سیانا تھا۔ صبح دودھ کا خالی گلاس بڑی بھابھی کو تھماتا اور منجھلی بھابھی کی طرف چلا جاتا۔

منجھلی بھابھی دیسی گھی کے گرم گرم پراٹھے بنا کر اس کی پلیٹ میں رکھتی جاتیں ان کی کوئی بہن یا بھانجی تو نہیں تھی مگر وہ اس مفروضے کی قائل تھیں کہ بھابھی ماں برابر ہوتی ہے تب جب دیور کو اچھی سی نوکری لگ جائے۔

چھوٹی بھابھی سب سے زیادہ چالاک تھیں۔ انہیں تو کچھ خوف خدا نہیں تھا' وہ اپنے بالشت بھر دیور کے لیے اس سے دس گنا بڑی آپا کا رشتہ کروانے کے چکروں میں تھیں جنہیں رشتے والوں کے سامنے چیزیں بنا بنا کر سرو کرنے کی اتنی پریکٹس ہو چکی تھی کہ آج کل وہ ایک کوکنگ چینل پر میزبانی کر رہی تھیں۔

اور رہی دونوں آپائیں... تو وہ بھی کم نہیں تھیں۔ انہوں نے ارسلان کو بھائی ہونے کا فرض یاد دلایا کہ کس طرح اباں کے مرنے کے بعد وہ مہینوں بعد اسے پوچھنے آتی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ ان کی چنڈال اور پھاپھا کٹنی ٹائپ نندوں میں سے کسی ۔۔ ایک سے شادی کر لے تاکہ سسرال کی طرف سے ہونے والے ڈرون حملوں میں کچھ کمی آسکے۔

مگر ارسلان اب بڑا ہو چکا تھا۔

اس نے اپنے لیے اپنی کالج فیلو سدرہ کا انتخاب کیا جو اسے بہت پسند تھی۔

وہ متوسط گھرانے کی پڑھی لکھی، خوش اخلاق اور سمجھ دار لڑکی تھی بھابھیاں اور بہنیں ناک بھوں چڑھاتی سدرہ کو بیاہ تو لائیں مگر تیسرے ہی دن اعلان کر دیا کہ اب ارسلان اپنی بیگم کی ذمہ داری خود اٹھائے ہم نے اب تک بہت کچھ کر دیا۔

اور یوں ارسلان سدرہ کے ساتھ ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگا۔ اگلے سال ان کے یہاں شزا خدا کی رحمت بن کر آگئی —— افراد میں اضافہ ہوا تو خرچے میں بھی اضافہ ہو گیا۔ مکان کا کرایہ، بل وغیرہ مگر پھر بھی دونوں اپنی زندگی سے مطمئن اور مسرور تھے مگر ہر سال ان کی پرسکون زندگی میں ایک بڑا سا پتھر آ گرتا جس کی وجہ سے پیدا ہونے والا ارتعاش کم از کم سدرہ کو دو مہینے تک بے چین رکھتا تھا۔

دراصل بڑے بھائیوں کے سب کام ابا مرحوم اپنے ہاتھوں سے کر گئے تھے۔ دو کا چلتا ہوا کاروبار تھا۔ ایک ایکس گریڈ کا افسر تھا۔ ابا کا آبائی گھر بیچ کر اپنے اپنے حصے کی رقم سے سب نے اپنے لیے پلاٹ خرید لیے یا مکان کی تعمیر کر لی۔ سستا زمانہ تھا اس لیے جلد ہی سب جم گئے۔ ہر سال عید قرباں پر تینوں بھائیوں کے ہاں دھوم دھام سے قربانی کی جاتی۔ قربانی سے قبل جانوروں کی کیٹ واک ہوتی اور خوبیوں اور قیمتوں کو خوب بڑھا چڑھا کر بیان کیا جاتا۔ دکھاوے کو بڑی بڑی دعوتیں کی جاتیں۔ سدرہ یہ سب دیکھتی تو کلس کر رہ جاتی۔ جٹھانیوں کی دیکھا دیکھی اس کے دل میں بھی قربانی کرنے کی خواہش تناور درخت بن گئی۔

☼ ☼ ☼

”یہ کیا بھئی! میں نے تمہیں گرمیوں کے لیے چار سوٹ کے پیسے دیے تھے اور تم ایک ہی سوٹ اٹھا لائیں......“

ارسلان ابھی آفس سے لوٹا تھا اور سدرہ عادت کے مطابق اپنی شاپنگ دکھا رہی تھی۔

”باقی تین جوڑوں کے پیسے میں نے قربانی ڈبے میں ڈال دیے ہیں، پچھلے سال کے تین جوڑے رکھے ہیں، وہی پہن لوں گی گرمی میں پرانے کپڑوں میں جو سکون ملتا ہے وہ نئے کپڑے میں کہاں۔“

اطمینان سے جواب دیا اور کھانا لینے باورچی خانے کی طرف چل دی۔

لائٹ جانے کی وجہ سے سوتا ہوا ارسلان اٹھ کر برآمدے میں بچھی چارپائی پر آ کر لیٹ گیا۔

تخت پر سدرہ پسینے پسینے سلائی مشین پر جھکی اللہ جانے کیا سینے میں اتنی مگن تھی کہ اسے ارسلان کے آنے کا احساس بھی نہیں ہوا۔

”بیگم صاحبہ! آپ اور سوئی سلائی؟ یہ انقلاب کب سے؟“ ارسلان نے قدرے حیران ہو کر پوچھا۔

”شزا کی فراک سی رہی ہوں۔ کل ساتھ والی بھابھی اپنی بیٹی کے لیے ریڈی میڈ فراک لائی تھیں، وہ ڈیزائن میں نے نوٹ کر لیا تھا اب ویسی ہی اپنی شہزادی کے لیے سی رہی ہوں۔“ اس نے بٹن ٹانکتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر کیوں، ابھی کچھ دن پہلے تو میں نے تمہیں شزا کی شاپنگ کے لیے پیسے دیے تھے اور کافی سارے دیے تھے تاکہ تم زیادہ اچھے کپڑے خرید سکو، مجھے یاد ہے پچھلے سال تم نے چھوٹی بھابھی کی مہرکی برانڈڈ فراک کو کس قدر حسرت سے دیکھا تھا اور پھر تمہیں تو بچوں پر گھر کے سلے کپڑے اچھے ہی نہیں لگتے۔“

بہت خیال رکھنے والا شوہر تھا وہ۔

”ارسلان! آپ بھی ناں میں اپنی بیٹی کے لیے اتنی اچھی فراک سیوں گی کہ وہ کسی طرح گھر کی سلی ہوئی نہیں لگے گی۔ بچی ہی تو ہے۔“ اب وہ اسے کیا بتاتی کہ وہ سارے پیسے تو قربانی ڈبے میں جا چکے ہیں۔

وہ کبھی امی کی طرف جاتی تو شزا کو ملنے والی خرچی بھی ڈبے میں ڈال دیتی اس نے ارسلان کو بتائے بغیر کام والی ماسی بھی ہٹا دی تھی۔ اسے پوری امید تھی کہ اس دفعہ عید قرباں پر خاندان کی سب سے اچھی دعوت

اس کے گھر پر ہی ہوگی۔

☼ ☼ ☼

”یار! آج بھی ماش کی بھنی ہوئی دال؟“ ارسلان آفس سے لوٹا تھا اور منہ ہاتھ دھو کر جیسے ہی دستر خوان پر بیٹھا تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

آج جمعے کا دن تھا اور اس دن سدرہ گوشت کی کوئی اچھی سی ڈش بناتی تھی۔

”ارسلان! آپ کو نہیں پتا، آج کل مرغی میں بیماری آ رہی ہے۔ بکرے لوگوں نے بقر عید کے لیے سنبھال کر رکھ لیے ہیں اور گائے کا گوشت آج کل آپ کو الرجی کی وجہ سے منع ہے اور پھر دال کے ساتھ سلاد، اچار اور راتنے لوازمات تو ہیں ناں۔“

وہ جانتا تھا سدرہ کی ان معصومانہ تاویلوں کے پیچھے قربانی ڈبے والی کہانی ہی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ قربانی صاحب نصاب پر فرض ہے مگر ارسلان کی بھابھیوں اور بہنوں جیسے لوگ نمود نمائش کا وہ بازار گرم کرتے ہیں کہ سدرہ جیسی صابر اور سمجھ دار لڑکیاں بھی قربانی کو زندگی موت کا مسئلہ بنا لیتی ہیں تاکہ وہ بھی اپنے خاندان والوں میں نام بنا سکیں۔

☼ ☼ ☼

”ارسلان! عید الاضحیٰ قریب آ رہی ہے، آپ آج کل میں آفس سے چھٹی کریں تاکہ بکرا پیڑی جا کر قربانی کے لیے بکرا لایا جا سکے ورنہ جانور مہنگے ہوتے جائیں گے اور پھر قربانی کے جانور کی تھوڑی خدمت کر کے ثواب بھی کما لیا جائے تو اچھا ہے۔“ سدرہ نے سونے سے قبل ارسلان کو تاکید کی۔

”ہاں ہاں، کل کی کل دیکھی جائے گی ابھی تو سونے دو۔“ اس نے گرمی سے بے حال ہوتے ہوئے کروٹ بدلی۔

ارسلان......!“ وہ ابھی نیند کی وادی میں سیر کرنے ہی لگا تھا کہ سدرہ نے پھر آواز دی۔

”اور ہاں بکرا سفید ہو اور اس پر کتھئی رنگ کی دھاریاں ہوں، آنکھیں سیاہ، بھنورا سی ہوں۔ قد کاٹھ پنجابی فلموں کے ہیرو جیسا ہو مگر اطوار شریفانہ ہوں اور نسل بھی اعلا ہو بکرا ایسا شاندار ہونا چاہیے کہ منجھلی بھابھی کی گائے بھی شرما جائے۔“ وہ اپنی ترنگ میں بولتی چلی گئی۔

”اور یہ بھی بتا دو کہ بکرا ڈاکٹر ہو، انجینئر ہو یا بینکر؟“ ارسلان نے نیند سے بے حال ہوتے ہوئے جل کر پوچھا۔ ”تم تو ایسے خوبیاں گنوا رہی ہو، جیسے میں بکرا نہیں شزا کے لیے دولہا ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔“

☼ ☼ ☼

آج ارسلان نے آفس سے آدھی چھٹی کر لی۔

آج اس نے سدرہ کی وہ خواہش پوری کرنی تھی، جس کی تکمیل کے لیے اس نے پورا سال اپنا دل مار کر اچھی خاصی رقم جمع کی تھی، رقم تو تھوڑی ارسلان نے بھی جوڑ رکھی تھی کہ —— کمی بیشی ہو تو شامل کر لی جائے چھ مہینے پہلے اس کی تنخواہ میں تھوڑا سا اضافہ ہوا تھا جو وہ چپ چاپ بس انداز کرتا رہا تھا۔

”لائیں بیگم! اپنا قربانی ڈبہ لائیں آج ہم آپ کے لیے آپ کے خوابوں کا شہزادہ لے ہی آتے ہیں۔“ وہ ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے گھر میں داخل ہوا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا سدرہ برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھی تھی ساتھ ہی قربانی ڈبہ رکھا تھا۔

ارسلان نے قریب جا کر دیکھا تو اس کا ڈھکن کھلا تھا اور وہ خالی تھا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ اس کے دل میں پہلا خیال چوری کا ہی آیا۔ اس نے سدرہ کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے کندھوں سے تھام کر رقم کے بارے میں دریافت کیا۔ اسے بہت گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

”ارے، آپ اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہیں۔ آپ منہ ہاتھ دھو کر آئیے پھر میں سب کچھ تفصیل سے بتاتی ہوں۔“

اس کے چہرے پر اطمینان کے رنگ دیکھ کر وہ متذبذب ہوا وہ جلدی سے منہ دھو کر آیا اور اس کا بازو تھام کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ وہ جلد از جلد قربانی ڈبے

کی حقیقت سے آشنا ہونا چاہتا تھا۔

"ہمارے گھر سے دو گھر آگے فضیلت آپا رہتی ہیں ناں..." سدرہ نے بات شروع کی۔ "وہ ہی جو قرآن پاک کا درس وغیرہ بھی دیتی ہیں۔ آج وہ محلے کے ہر گھر میں جا کر عورتوں سے کہتی پھر رہی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ اس ریلیف کیمپ کا دورہ کریں، جہاں سندھ کے سیلاب زدہ علاقوں سے متاثرین آ کر رہ رہے ہیں ہم چل کر ان کی دل جوئی کرتے ہیں اور اگر کوئی ان کی مدد کرنا چاہے تو ضرور کرے۔ اس وقت ہمارے ان معصوم اور محنت کش بہن بھائیوں کو ہماری مالی اور اخلاقی مدد کی انتہائی ضرورت ہے۔

میں شہ اکو ساتھ والی بھابھی کے یہاں چھوڑ کر ان کے ساتھ چلی گئی ایک فلاحی تنظیم نے اس ٹرپ کا تمام انتظام کیا تھا تاکہ لوگوں کو پتا چل سکے کہ سیلاب ٹی وی پر دکھائی جانے والی رپوٹوں سے کہیں زیادہ تباہی اور دکھ ان لوگوں کی جھولی میں ڈال گیا ہے۔

ریلیف کیمپ کیا تھا ارسلان! اک کسمپرسی کا جہان آباد تھا۔" سدرہ نم آنکھوں سے کوئی اور ہی کہانی سنا رہی تھی اور وہ چپ چاپ سن رہا تھا۔ "صحیح بات ہے کہ ہم لوگ اپنے کاموں میں کبھی کبھی اس قدر مگن ہو جاتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وطن عزیز کے کسی حصے میں قیامت برپا ہو گئی ہے۔

"ارسلان میں ایک خیمے کے آگے سے گزری تو مجھے ایک عورت کے رونے اور ایک بچے کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے آواز دے کر خیمے کا پھٹا ہوا پردہ ہٹایا تو اندر اک ٹوٹی چارپائی پر ایک بارہ تیرہ سال کا بچہ درد سے کراہ رہا تھا درد کی شدت سے وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا اور اس کے سرہانے کرب سے آنسو بہانے والی بلاشبہ اس کی ماں ہی ہو سکتی تھی۔

اس کے بیٹے کے گردے میں پتھری تھی۔ ڈاکٹر نے اسے جلد آپریشن کا کہا تھا، ڈاکٹر نے اپنی فیس اور اسپتال کی فیس معاف کر دی مگر آپریشن کے لیے دس پندرہ ہزار لازمی چاہئیں شہر میں ڈاکٹر سے مل کر گاؤں واپس آئے تو سیلاب نے اس کا سب کچھ برباد کر دیا تھا۔

اس کا بڑا بیٹا منشی سے پندرہ ہزار لینے گیا۔ بند ٹوٹ جانے کی وجہ سے ہر جگہ پانی ہی پانی تھا، ایک خطرناک سانپ نے اسے ڈس لیا اور وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا۔ نوٹوں کی صورت اس کے ہاتھ میں اس کے دوسرے بیٹے کی زندگی تھی۔ بوڈ (سیلاب) وہ بھی اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ اس کا دوسرا بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے لب دم ہے مگر اس کو دو وقت کی روٹی میسر نہیں، وہ آپریشن کے لیے اتنے پیسے کہاں سے لائے....

ارسلان! سوچو ایک ماں اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والی اولاد کو اپنے سامنے مرتا دیکھے تو....."

آنسو سدرہ کی آنکھوں سے تواتر سے بہہ رہے تھے وہ اک لمحے کے لیے رکی پھر بولنے لگی۔

"ارسلان! میں نے سوچا کہ بکرے کی نمائش کر کے، ایک اچھی سی دعوت کھلا کے مجھے خوشی تو حاصل ہو گی مگر وہ لاچار اور مجبور ماں کی اس خوشی سے بڑھ کر نہیں ہو گی، جو اسے اپنی اولاد کو ٹھیک ٹھاک اور زندہ دیکھ کر ہو گی۔ میں نے گھر آ کر قربانی ڈبہ کھولا، اس میں پندرہ ہزار کی رقم تھی۔ میں نے وہ فضیلت آپا کو دے دی کہ وہ اس عورت کو دے آئے۔ میں نے ٹھیک کیا ناں ارسلان!"

سدرہ کی آنکھوں سے بہنے والے ان آنسوؤں میں خوشی اور سچی قربانی کا رنگ جھلک رہا تھا۔ ارسلان فخر سے کبھی اپنی بیوی کو دیکھتا کبھی خالی قربانی ڈبے کو۔

"ارے کہاں کھو گئے اب اٹھیے بھی، آج ہم لنچ باہر کریں گے اور پھر عید کی شاپنگ بھی کرنی ہے۔" آخر سدرہ نے مسکراتے ہوئے ارسلان سے کہا اور تیار ہونے چل دی۔

ارسلان نے جیب میں ہاتھ ڈالا، اس کے پاس جو آٹھ دس ہزار روپے موجود تھے۔ سدرہ کے لنچ اور شاپنگ کے بعد بھی اس کے پاس اتنے پیسے ضرور بچ جاتے کہ وہ بھی کیمپ جاتا اور کسی روتے ہوئے کے آنسو پونچھ کر تھوڑی سی خوشیاں بانٹ کر آ سکتا تھا۔

☆

گرد گرد مسافتیں

عائشہ خان

آج کتنے دنوں کے بعد وہ گھر سے نکلی تھی۔ بلکہ نکلی کہاں تھی، رشنا آپی زبردستی اسے نکال لائی تھیں۔ ورنہ اس کا تو دل چاہتا تھا ساری دنیا سے چھپ کر گھر میں بند ہو جائے، جہاں نہ وہ کسی کو نظر آئے، نہ کوئی اسے دکھائی دے۔

"رائمہ!" رشنا آپی نے فکرمندی سے اسے دیکھتے ہوئے آہستگی سے آواز دی تھی۔

اردگرد سے بے نیاز وہ کسی روبوٹ کی مانند ان کے پیچھے چلتی آ رہی تھی۔

"کیا بات ہے رائمہ! مجھے تمہاری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی۔"

"نہیں آپی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" اس نے بمشکل لبوں پر مسکراہٹ پھیلائی تھی۔

"اچھا تم بیٹھو، میں ان شیطانوں کو کینٹین سے کچھ دلوالاؤں۔"

انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے انہیں جاتے دیکھا اور پھر دھیرے دھیرے چلتی بینچ پر بیٹھ گئی تھی۔

سورج غروب ہونے کو تھا اور اس کی نارنجی شعاعیں درختوں کے زرد پتوں پر پڑتی ان کی زردی کو بڑھا رہی تھیں۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کے ایک جھونکے نے شاخوں کو ہلایا تھا اور چند زرد لرزتے کانپتے پتے زمین پر آگرے تھے۔ سامنے سے بھاگ کر آتے بچے نے ان پر پاؤں رکھا تھا اور آگے بڑھ گیا تھا۔

رائمہ نے دل کی دیواروں سے لپٹی اداسی کو کچھ اور گہرا ہوتا محسوس کیا تھا۔

چند لمحے قبل شاخوں پر لہراتے اور اب ایک کے بعد دوسرے شخص کے پاؤں تلے روندے جاتے پتوں کو دیکھ کر اسے اپنے وجود میں اذیت کی ایک لہر سی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی۔

ایسی حساس تو وہ کبھی بھی نہیں تھی۔ پھر اب اسے کیا ہوا تھا۔

یہ تبدیلی اس میں کب آئی تھی اُسے پتا نہیں چلا تھا۔ لیکن کیوں آئی تھی یہ وہ بخوبی جانتی تھی۔

"رائمہ!"

رشنا جو کب سے خاموش کھڑی اس کے چہرے پر کچھ کھوج رہی تھیں۔ دھیرے سے آگے بڑھی تھیں اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ یوں جیسے اسے تسلی دینا چاہتی ہوں۔

اس نے چونک کر انہیں دیکھا، پھر خود کو سنبھالتے ہوئے ہولے سے مسکرائی۔

"رائمہ! کیا تم زیاد کے ساتھ خوش نہیں ہو؟" بغور اسے دیکھتے انہوں نے فکرمندی سے پوچھا تھا۔

"اُفوہ آپی! آپ کو جانے کون کون سے وہم ستا رہے ہیں۔ میں زیاد کے ساتھ بہت خوش ہوں، آخر آپ کو یقین کیوں نہیں آتا۔"

لہجے کے کھوکھلے پن کو اس نے آواز کی بلندی سے چھپانا چاہا تھا۔

"نہیں رائمہ۔" نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ اداس ہو گئی تھیں۔

"خوشی کا یقین نہیں دلانا پڑتا، نہ ہی اسے دکھانا پڑتا ہے۔ یہ تو خود ہی نظر آتی ہے چہرے پر، آنکھوں میں، باتوں میں۔"

"آپ ہر فکر کو دل سے نکال دیں آپی۔ میں زیاد کے ساتھ بے حد خوش ہوں اور بھلا کیوں نہ ہوں، وہ مجھ سے بے حد محبت کرتا ہے۔"

"محبت تو مصعب بھی کم نہیں کرتا تھا، تو کیا تم اس کے ساتھ خوش تھیں؟ نہیں نا۔"

"آپی پلیز۔" بے اختیار اس کی آنکھوں میں نمی جھلملائی تھی۔ جسے ان سے چھپانے کے لیے اس نے رخ موڑ لیا تھا۔ اور پھر چونک کر سامنے دیکھنے لگی تھی۔

چونکنے کی وجہ چند قدم کے فاصلے پر کھڑی بغور اسے تکتی وہ لڑکی تھی جس کا چہرہ بے حد جانا پہچانا سا تھا، لیکن کہاں دیکھا تھا، فوراً یاد نہیں آیا تھا۔

"آپ رائمہ ہیں، آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں، میں نورین ہوں، نورین حیدر، ہم لوگ.....۔"

"آپ لوگ ہماری شادی پر آئے تھے۔ آپ نے مجھے بلو ساڑھی گفٹ کی تھی جو مجھے بے حد پسند آئی تھی۔"

رائمہ نے اسے پہچان لیا تھا اور اسے یہ یقین دلانے کے لیے کہ اس نے اسے پہچان لیا ہے، اس نے تفصیلی جواب دیا تھا اور گرم جوشی سے اس سے ملنے لگی تھی۔

"آپ ٹھیک تو ہیں، میں نے تو ایک دم آپ کو پہچانا ہی نہیں، بہت کمزور لگ رہی ہیں، فیس کمپلیکشن بھی خاصا خراب لگ رہا ہے۔ میرا تو خیال تھا، زیاد بھائی کی بے تحاشا محبتوں نے آپ کو پہلے سے بھی خوب

صورت کر دیا ہوگا۔ مگر آپ تو.....۔" بے تکلفی سے کہتے کہتے وہ یک دم جھجک کر خاموش ہوئی تھی۔

رائمہ نے چور نگاہوں سے رشنا آپی کو دیکھا۔ وہ بغور اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ زیاد مجھ سے بے تحاشا محبت کرتے ہیں۔" بمشکل خود کو کمپوز کرتے ہوئے اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"کیسے پتا چلا، آپ بھی کمال کرتی ہیں رائمہ جی، محبت کا بھی بھلا پتا چلانا پڑتا ہے۔ یہ تو انسان کی ہر ادا میں نظر آتی ہے، بالکل خوشی کی طرح۔"

"بالکل صحیح کہہ رہی ہیں آپ۔"

نورین سے ایک قدم پیچھے کھڑی رشنا آپی نے برابر آتے ہوئے کہا تھا۔ نورین نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھا تھا اور وہ مسکراتے ہوئے اپنا تعارف کروانے لگی تھیں۔

رائمہ نے سکون کی سانس لی تھی کہ ان دونوں کی توجہ اس پر سے ہٹی۔

تب ہی نورین کے موبائل کی بیپ بجی تھی۔

"او کے جی۔ میں چلتی ہوں۔ ایک منٹ کا کہہ کر آئی تھی حیدر کو۔" رشنا آپی سے ہاتھ ملاتی وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔

"اور رائمہ! آپ اپنا خیال رکھیں، تاکہ پہلے کی طرح کھلی کھلی نظر آئیں۔ پتا ہے شادی والے دن آپ کو دیکھ کر میں نے حیدر سے کیا کہا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی۔ رائمہ نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"آپ اتنی خوب صورت لگ رہی تھیں کہ میں نے بے اختیار کہا تھا۔ یہ لڑکی اس قابل ہے حیدر! اسے دیکھ کر کوئی بھی پاگل ہو جائے۔ آپ کے دوست بے چارے کا کیا قصور۔" نورین کہنا آدھا جملہ چاہتی تھی اور کہہ پورا گئی تھی اور اب نچلا لب دانتوں تلے دبائے پچھتا رہی تھی۔

"آپ کسی دن آئیں نا حیدر بھائی کے ساتھ۔"

اسے نادم دیکھ کر رائمہ نے جلدی سے کہا تھا۔

"ضرور۔" نادم سے لہجے میں کہتی وہ تیز تیز قدموں سے آگے بڑھ گئی۔

"توبہ..... کس قدر تیز بولتے ہیں کچھ لوگ، لگتا ہے جیسے تیز گام کو مات کر رہے ہوں۔" رشنا آپی کے سوال و جواب سے بچنے کے لیے اس نے جلدی سے بات شروع کی۔

"جیسے اس وقت تم کر رہی ہو۔" رشنا آپی نے بے حد سنجیدگی سے کہا اور وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی۔

کس قدر خالی پن تھا اس کی ان بے بسی سے تکتی نگاہوں میں، رشنا کے دل کو ایک دم جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا۔ انہوں نے بے اختیار اس کے کندھے پر ہاتھ پھیلاتے ہوئے اسے ساتھ لگا لیا۔

کئی لمحے دبے پاؤں گزر گئے تھے۔

دونوں بہنیں خاموش تھیں، لیکن دونوں ایک دوسرے کی کیفیت کو سمجھ رہی تھیں۔

"ممی!" دونوں کے درمیان حائل خاموشی کی اس دبیز چادر کو احرم کی تیز آواز نے تار تار کر دیا تھا۔

رشنا آپی تیزی سے اٹھیں، اس نے گہری سانس لیتے ہوئے سر بینچ کی پشت سے ٹکایا اور آنکھیں موند لی تھیں۔

اب وہ اپنی زندگی پر غور کر رہی تھی۔

اس کی زندگی جو ایک پہیلی تھی یا خود اس نے اسے پہیلی بنا لیا تھا۔ صاف و شفاف اجلی راہوں پر چلتے چلتے جانے کیسے وہ راہ بھٹک گئی تھی۔ کیسے ان دھندلے اور خاردار رستوں پر آنکلی تھی۔ جہاں ہر طرف بس بھول بھلیاں تھیں۔ اور وہ پاگلوں کی طرح ان بھول بھلیوں میں بھٹک رہی تھی۔

وہ حسین خواب جو اس نے بڑے شوق سے پلکوں پر سجائے تھے ریزہ ریزہ ہو کر اس کی راہوں میں بکھر گئے تھے اور ٹوٹے خوابوں کی ان کرچیوں پر چلنا کس قدر دشوار تھا، یہ وہ جان چکی تھی، لیکن اسے چلنا تھا، کیونکہ واپسی کا راستہ وہ کھو چکی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو۔" کئی لمحے خاموشی سے اس کا جائزہ لینے کے بعد رشنا آپی دھیرے سے اس کے برابر بیٹھ گئی تھیں۔

"کچھ بھی نہیں آپی۔"

"دل کا درد اگر کسی اپنے سے بانٹ لیا جائے تو من بہت ہلکا ہو جاتا ہے رائمہ..... کہہ دو وہ سب کچھ جو اندر ہی اندر برداشت کرتی تم گھلتی جا رہی ہو، جس نے تمہارے چہرے کی ساری چمک کو، تمہاری آنکھوں کی ساری دمک کو ایک دم ماند کر کے رکھ دیا ہے۔"

بوجھل سے لہجے میں کہتی وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔

"بس میری طبیعت کچھ دنوں سے ٹھیک نہیں ہے آپی ورنہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

"بات تو کوئی نہ کوئی ہے رائمہ..... تم بتانا نہ چاہو تو تمہاری مرضی۔" رشنا آپی نے سنجیدگی سے کہا تھا اور خاموش ہو کر دور کھیلتے اپنے بچوں کو دیکھنے لگی تھیں۔

"آپی! اب کیسی طبیعت ہے مصعب کی؟"

کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا تھا اور رشنا آپی چونک کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔ وہ سر جھکائے پاؤں سے گھاس مسل رہی تھی۔

ان کی جانب سے جواب نہ پا کر سر اٹھایا تھا، پھر فوراً ہی جھکا لیا تھا۔ چند لمحے اضطراری انداز میں انگلیوں کو چٹخاتی رہی تھی، پھر سر اٹھا کر سنجیدگی سے انہیں دیکھنے لگی تھی۔

"آپ ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں آپی! اس سے میرا صرف ایک رشتہ تو نہیں تھا۔"

"ہاں!" انہوں نے گہری سانس لی تھی۔ "مگر کاش تم یہ بات اسے چھوڑتے ہوئے سوچتیں۔"

"آپی! آپ۔"

"ایک بات سچ بتاؤ رائمہ، تم مصعب کو چھوڑنے پر پچھتا رہی ہو یا زیاد سے تعلق جوڑنے پر۔" اس کی بات کاٹتے ہوئے انہوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

"آپی! آخر آپ کیا اعتراف کروانا چاہتی ہیں مجھ سے، اور کیوں۔" بے بسی سے کہتی وہ یک دم بے حد روہانسی نظر آنے لگی تھی۔ رشنا آپی نے تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا اور ایک گہرا ملال ان کے دل میں گھر کرنے لگا تھا۔

"مصعب جیسے مخلص اور چاہنے والے شخص کو چھوڑ کر رائمہ کیسے خوش رہے گی۔" مصعب کی اداس آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کئی مرتبہ انہیں اس وہم نے ستایا تھا۔ جو آج حقیقت کا روپ دھارے ان کے سامنے تھا۔

☆ ☆ ☆

"سوری حیدر..... میں نے زیادہ دیر لگا دی۔" حفظ ماتقدم کے طور پر حیدر کے کچھ کہنے سے پہلے ہی نورین نے معصوم سا چہرہ بناتے ہوئے معذرت کر لی تھی۔

حیدر نے گھور کر اسے دیکھا تھا۔ لیکن پھر بے اختیار مسکراہٹ اس کے لبوں پر در آئی تھی۔ اس نے چہرے پر مسکینیت ہی ایسی طاری کر رکھی تھی۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں..... سنا تو تھا کہ عورتیں بہت بولتی ہیں، لیکن اتنا زیادہ، یہ خبر نہیں تھی۔"

"اب اتنا زیادہ بھی نہیں بولتی میں۔" اسے جیسے برا لگا تھا۔

"اچھا..... پورا ایک گھنٹہ تم نے فون پر آنٹی کا دماغ کھایا ہے۔ سارے راستے میرا اور پورے پندرہ منٹ ان محترمہ کا..... اور جہاں تک میرا خیال ہے، ابھی بھی تم کچھ بولنے کے لیے بری طرح بے تاب ہو۔"

نورین جو مصنوعی خفگی کا مظاہرہ کرتی اسے دیکھ رہی تھی، اس کا آخری فقرہ سن کر ایک دم جیسے کھل اٹھی تھی۔

"حیدر کتنے اچھے ہیں آپ، کتنا سمجھتے ہیں مجھے، میں واقعی آپ کے خاموش ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔"

"ہا..... بے چارے شوہروں کی قسمت میں ہی خاموش رہنا ہے، چلو بھئی ہو جاؤ اسٹارٹ۔"

"جانتے ہیں ہمیں ابھی کس سے مل کر آ رہی ہوں۔"

"ملکہ الزبتھ سے۔" وہ شرارت سے اسے دیکھتا مسکرایا تھا۔

"حیدر! آپ۔"

"بھئی۔ بتاؤ گی تو پتا چلے گا نا، مجھے الہام تو ہوتے نہیں ہیں۔"

"وہ آپ کا مجنوں کا جانشین قسم کا دوست تھا نا۔"

"زیاد....." حیدر نے سمجھا شاید اسے نام یاد نہیں آ رہا۔

"ہاں وہ ہی..... اس کی بیوی رائمہ سے مل کر آ رہی ہوں میں، مگر حیدر! وہ تو بالکل پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ مرجھایا ہوا چہرہ، آنکھوں کے نیچے حلقے، میں تو اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔"

"بیمار و بیمار ہو گی۔"

"نہیں..... بیمار تو نہیں لگ رہی تھی، ہاں کچھ اداس، اداس سی لگ رہی تھی، میرا تو خیال ہے کہ وہ خوش نہیں ہے۔ شاید اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ کر پچھتا رہی ہو۔"

"فار گاڈ سیک نورین، بہت ہو گیا، ختم کرو اب یہ رائمہ نامہ..... وہ خوش ہے یا ناخوش..... پچھتا رہی ہے یا نہیں پچھتا رہی، ہم سے مطلب۔"

حیدر نے ایک دم اسے ٹوکتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا تھا۔ اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہو گئی تھی۔

صبح سگنل پر زیاد کو بے حد سنجیدہ چہرے اور تھکے تھکے سے انداز میں گاڑی کی پشت سے سر ٹکائے دیکھ کر جس سوچ کو حیدر نے اپنا وہم سمجھ کر سر جھٹک دیا تھا، اب پھر وہ اس کے دماغ میں چکرانے لگی تھی۔ اب وہ سر جھٹک کر اس سے پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا۔

وہ دونوں ایک دوسرے کی سنگت میں بجائے سرشار نظر آنے کے، بیمار نظر آ رہے تھے۔ آخر کیوں..... جبکہ ایک دوسرے کو پا کر وہ بے تحاشا خوش تھے۔

اپنی شادی والے دن زیاد کے تو قدم جیسے زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ اس قدر مسرور تھا کہ حیدر جو پچھلے کئی دنوں سے اس سے کھنچا ہوا تھا اس نے بھی بے اختیار دل سے اس کی خوشیوں کے ہمیشہ قائم رہنے کی دعا کی تھی۔

مگر وہ خوش نہیں تھا۔

ایک دم حیدر کے دل کو عجیب سی بے چینی نے آ گھیرا۔ کئی ماہ سے دونوں کے درمیان کوئی رابطہ نہیں تھا، لیکن دل کا ناتا رابطے کا محتاج نہیں ہوتا۔

دونوں کالج کے زمانے سے دوست تھے۔

حیدر کو یاد تھا کہ جب وہ رائمہ کے پیچھے پاگلوں کی طرح اس کے ڈیپارٹمنٹ کے چکر لگایا کرتا تھا تو وہ اور اسد اکثر اس کے ساتھ ہوتے تھے۔

وہ ایک دن اسے نظر نہیں آتی تھی، تو وہ جیسے دیوانہ ہونے لگتا تھا۔ وہ دونوں اس کی اس دیوانگی پر ہنسا کرتے، اس کا مذاق اڑاتے تو کبھی تو وہ مجنوں بنا چپ سادھے رہتا، کبھی منہ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا۔

تمہارا پالا پڑے گا تو پوچھوں گا بچو، یہ عشق کیسی ظالم چیز ہے، تم نہیں جانتے، جانو گے تو سب کس بل نکل جائیں گے۔"

جس دن وہ اور اسد اسے اپنے جنوں کی یہ داستان رائمہ کو کہہ سنانے کے لیے اکسا رہے تھے، اس سے اگلے دن انہیں یہ اندوہناک خبر ملی تھی کہ رائمہ کے پاپا کو بے حد سیریس ہارٹ اٹیک ہوا تھا اور ان کی خواہش پر رائمہ کا نکاح اس کے چچازاد سے کر کے سادگی سے رخصت کر دیا گیا تھا۔

زیاد تو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا۔

اسے اس دیوانگی سے نکالنے کے لیے اور دوبارہ سے زندگی کی گہما گہمی کی طرف لانے کے لیے اس نے اور اسد نے کیسے کیسے جتن کیے تھے وہ دونوں ہی جانتے تھے۔

امتحانات تک انہوں نے اسے بے شمار حیلوں اور حربوں سے دلوائے تھے۔ اور جب وہ سمجھے تھے کہ وہ اس دیوانگی سے نکل آیا تھا تو وہ اپنی دیوانگی کا ثبوت دینے چلا آیا تھا۔

"حیدر آئی ایم سو ہیپی، میں نے رائمہ کو دل کی ہر بات بتا دی ہے، ہر جذبے سے آگاہ کر دیا ہے۔"

کھلے کھلے چہرے کے ساتھ ' بے حد شاداں و فرحاں سے انداز میں اس کے آفس میں بیٹھا وہ اسے بتا رہا تھا اور حیدر حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں اب ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا زیاد۔" کئی لمحوں کے توقف کے بعد اس نے خاصی ناگواری سے کہا تھا۔

"کیوں.... اب کیا ہوا ہے؟"

"اب وہ کسی کی بیوی ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔" اسے جیسے پروا ہی نہیں تھی۔

"فرق کیوں نہیں پڑتا' ایک شادی شدہ عورت سے محبت کا اظہار کرکے تم اسے ورغلا رہے ہو' اس کا گھر برباد کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"میں تو بس یہ جانتا ہوں کہ وہ میری محبت ہے اور میں اسے ہر حال میں پانا چاہتا ہوں۔"

"اب یہ ممکن نہیں ہے زیاد! ٹرائے ٹو انڈر اسٹینڈ!" حیدر زچ ہوا تھا۔

"ممکن کیوں نہیں ہے' میں اسے پروپوز کرچکا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ مجھے چند دن لگیں گے اسے منانے میں۔" اس نے چیئر کی پشت سے سر ٹکاتے ہوئے اتنے مزے سے کہا تھا کہ حیدر اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

"تم بہت غلط کر رہے ہو زیاد۔" یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا' وہ کہے بنا نہیں رہ سکا تھا۔

"محبت میں کچھ بھی غلط نہیں ہوتا میرے دوست۔"

"غلط غلط ہی رہتا ہے' محبت میں ہو یا نفرت میں۔" حیدر نے تلخی سے کہا تھا۔

"کیسے دوست ہو تم' میری خوشی میں خوش ہونے کے بجائے اسے ملیامیٹ کرنا چاہتے ہو۔" ناراضی سے کہتا ہوا وہ اٹھا تھا اور لٹھ مار انداز میں خدا حافظ کہتا تیز تیز قدموں سے آفس سے نکل گیا تھا۔

اگلے دن آفس کے کسی کام سے حیدر اسلام آباد چلا گیا تھا۔ واپس آیا تو پتا چلا کہ رائمہ نے ڈائیورس لے لی تھی اور جلد ہی وہ دونوں شادی کرنے والے تھے۔

حیدر کا دل بے حد برا ہوا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ لڑکی اس قدر کمزور کردار کی مالک تھی۔

اس نے انتہائی بے دلی کے ساتھ ان کی شادی میں شرکت کی تھی۔

اس دن وہ دونوں بے حد خوب صورت لگ رہے تھے اور خوش تو یوں تھے جیسے انہیں ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

شرافت اور کردار کو بے حد اہمیت دینے والے حیدر کو ان دونوں کا یہ عمل قطعاً" پسند نہیں آیا تھا' خاص طور پر رائمہ کے کردار کے کچے پن پر تو اسے بے حد غصہ آیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان دونوں کو اس قدر خوش دیکھ کر اس نے ان کی خوشیوں کے ہمیشہ قائم رہنے کی دعا کی تھی۔

اس کے بعد اس کی زیاد سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ کمپنی کی طرف سے وہ دبئی چلا گیا تھا۔ شروع میں چند ایک بار فون کیا تو اس کا نمبر بند ملا۔ پھر مصروفیات میں وہ بھی بھول بھال گیا۔ لیکن صبح ریڈ سگنل پر اسے دیکھ کر حیدر کا دل چاہا تھا فوراً" اس سے ملے' لیکن وہ آفس سے پہلے ہی بہت لیٹ ہو چکا تھا۔ اس لیے ارادہ بدل دیا تھا۔

"مجھے خاموش کروا کر اب خود کس مراقبے میں چلے گئے ہیں آپ۔"

نورین ناراضی کا مظاہرہ کرتی چند لمحے خاموش رہی تھی۔ مگر زیادہ دیر خاموش رہنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

"زیاد کے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"کیا؟"

"کچھ خاص نہیں۔"

"میرا خیال ہے' کافی عرصے سے آپ کی بات چیت بھی نہیں ہوئی۔"

"ہاں یار! کافی عرصے سے کوئی رابطہ نہیں ہے کیا خیال ہے کسی دن ان کی طرف چلنے کا پروگرام نہ بنائیں۔"

"کل ہی چلیں۔" نورین نے فوراً" پوچھا تھا۔ ملنے ملانے کی تو وہ ویسے بھی شوقین تھی اور رائمہ کو دیکھ کر اس کی زندگی کے بارے میں جاننے کا تجسس بھی جاگ اٹھا تھا۔

"کل...." حیدر نے جیسے کچھ سوچا تھا۔ "ہوں' ٹھیک ہے۔"

"تو پھر ابھی فون کرلیں۔"

نورین نے جلدی سے کہا تھا' پھر نچلا لب دانتوں تلے دباتے ہوئے حیدر کو دیکھا تھا۔ لیکن وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھا۔

"اس نے اپنا موبائل نمبر تو شاید چینج کرلیا ہے مگر جاکر یاد کروانا لینڈ لائن پر فون کروں گا۔ بلکہ تم خود ہی اس کی مسز سے بات کرلینا۔"

میرا خیال ہے حیدر! پہلے فون کرنے کے بجائے ہم کل ہی فون کریں کہ ہم ادھر قریب ہی کسی کی طرف آئے ہوئے ہیں تو۔"

"او کے' جیسے دل چاہے کرلینا' اب کچھ دیر خاموش رہنا پلیز! مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔"

حیدر نے کہا اور فون کرنے لگا۔

نورین کل پہننے والے کپڑوں کے بارے میں سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"آپی! اب واپس چلیں' زیاد گھر آئے اور میں نہ ہوں تو اسے اچھا نہیں لگتا۔" مضطرب سی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے میں الجھاتی وہ کہہ رہی تھی۔

رشنا نے تاسف بھری نگاہوں سے اسے دیکھا۔

یہ رائمہ تھی' جو مصعب کے ساتھ رہتے ہوئے ایک ایک بات میں اپنی مرضی چلاتی تھی۔ چمکتی سیاہ مرسڈیز میں باوردی ڈرائیور کے ساتھ جہاں دل چاہتا جاتی' جب دل چاہتا واپس آتی۔ نہ کوئی پابندی' نہ کوئی روک ٹوک' ہر چیز' ہر معاملے میں مکمل آزاد.... اور کتنی محبت کرتا تھا مصعب اس سے۔ اسی محبت کی خاطر اس نے سارے عذر اپنے اوپر لے کر اسے آزاد کردیا تھا۔

انہیں یاد تھا' جب انہوں نے اس سے کہا تھا۔

"مصعب! مت ڈائیورس دو اسے' کچھ عرصہ بیٹھا رہنے دو امی کی طرف' بس صبر کا گھونٹ بھر کر بالکل خاموش ہو جاؤ۔ مجھے یقین ہے اسے بہت جلد اپنی نادانی کا احساس ہو جائے گا۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا آپا!" اس نے اداس نگاہوں سے انہیں دیکھتے ہوئے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"جس سے آپ محبت کرتے ہوں وہ آپ سے محبت نہ کرے تو آپ کسی نہ کسی طرح برداشت کرلیتے ہیں' لیکن وہ آپ سے نفرت کرے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ میں رائمہ کو ڈائیورس کر رہا ہوں' کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے ایسا نہ کیا تو وہ مجھ سے نفرت کرنے لگے گی۔"

وہ اس کی بات کو جھٹلا نہیں سکی تھیں کیونکہ جانتی تھیں کہ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"کس کا فون ہے رائمہ!"

اس کے موبائل کی مسلسل بجتی بیل اور اس کے ٹکر ٹکر فون کو گھورنے پر رشنا نے الجھ کر پوچھا تھا۔

"زیاد کا ہے آپی!"

"تو سنو نا۔" حیرانی سے اسے دیکھتے ہوئے انہوں نے کہا تھا۔

"جی۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے گود میں پڑا موبائل اٹھا لیا تھا۔

"السلام علیکم۔" یہ سوچ کر کہ وہ گھر پہنچ چکا ہوگا اور اب پیچ و تاب کھاتے ہوئے فون کر رہا ہوگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سلام کیا تھا۔

"وعلیکم السلام.... رائمہ' میری جان' میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے بہت خفا ہو' تمہیں ہونا بھی چاہیے' میں اپنے بی ہیویئر پر کس قدر شرمندہ ہوں' تمہیں بتا نہیں سکتا۔ پتا نہیں مجھے ایک دم کیا ہو جاتا ہے۔ سوری میری جان! میں بہت شرمندہ ہوں' معاف کردو پلیز۔"

وہ ہی محبتوں اور چاہتوں سے گندھا دلکش لہجہ جو اس کی دھڑکنوں میں ہلچل مچا دیتا تھا۔ اس کی سماعت سے ٹکرا رہا تھا اور درد جیسے رگ رگ میں پھیلتا جارہا تھا۔

"رائمہ میری جان! کچھ بولو نا۔" وہ بے قراری سے کہہ رہا تھا۔

"معاف کردیا نا تم نے مجھے۔"

"ہوں۔" پھنسی پھنسی آواز میں کہتے ہوئے اس نے فون بند کردیا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے بیل پھر بجی تھی۔ رشنا آپی کے سوالوں سے بچنے کے لیے اس نے فوراً" کال ریسیو کی تھی۔

"تھینک یو جان! صبح سے ایک کام ٹھیک نہیں ہوا، لیکن اب سب ٹھیک ہے میں تھوڑا لیٹ آؤں گا تم تیار ہوجانا کھانا باہر کھائیں گے او کے مائی لو۔"

بے حد مطمئن لہجے میں کہتے ہوئے اس نے فون بند کردیا تھا اور وہ کتنی ہی دیر موبائل یوں ہی کان سے لگائے گم صم سی بیٹھی رہی تھی۔

پھر رشنا آپی کا خیال آتے ہی چونک کر انہیں دیکھا تھا اور انہیں خود پر نگاہ جمائے دیکھ کر خجل سے انداز میں مسکرا دی تھی۔ رشنا آپی نے گہری سانس لیتے ہوئے گردن موڑی تھی اور خاموشی سے ڈرائیو کرنے لگی تھیں۔ پھر سارا راستہ دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں کھوئی ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"آپ اتنی خوب صورت لگ رہی تھیں کہ میں نے بے اختیار کہا تھا۔ یہ لڑکی اتنی خوب صورت ہے کہ اسے دیکھ کر کوئی بھی پاگل ہوجائے۔ آپ کے دوست بے چارے کا کیا قصور۔"

گہرے سکوت میں یہ آواز اس کے بہت قریب سے ابھری تھی۔

اس نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولی تھیں۔

کھوئے کھوئے سے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس کی نگاہیں سائیڈ ٹیبل پر رکھی اپنی تصویر پر جا ٹھہری تھیں۔

کئی لمحے خالی خالی نگاہوں سے وہ تصویر کو دیکھتی رہی تھی پھر اٹھ کر فریم اٹھالیا تھا۔

سرخ ساڑھی میں اس کا حسن جیسے پھوٹا پڑ رہا تھا اور اس کے ساتھ کھڑا زیاد، بلاشبہ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ چاند سورج کو شرمارہے تھے۔

اسے یاد تھا کہ شادی کے اولین دنوں میں وہ دن میں کئی کئی بار اس تصویر کو دیکھتی تھی اور کتنی کتنی دیر دیکھتی رہتی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں کھڑے اس قدر مکمل اور خوب صورت لگ رہے تھے کہ خوشی سے اس کا دل بھر جاتا تھا۔ بے اختیار اپنے نصیب پر رشک آتا تھا مگر وہ خوشی جیسے ریت پر لکھی کوئی تحریر تھی کہ وہ دن بھی اپنا وجود برقرار نہیں رکھ پائی تھی۔

"تو کیا واقعی زیاد کو صرف میرے حسن نے پاگل کردیا تھا۔ اسے مجھ سے محبت نہیں تھی بلکہ بس اس حسن کو حاصل کرلینے کی طلب تھی۔"

اس نے آہستگی سے فریم واپس رکھتے ہوئے انتہائی آزردگی سے خود سے پوچھا تھا۔ یوں جیسے وہ پہلے اس بات کو نہیں جانتی تھی۔ حالانکہ وہ شادی کے اولین دنوں میں ہی اس حقیقت کو جان گئی تھی۔ اور حقیقت تو یہ بھی تھی کہ اسے بھی زیاد سے محبت نہیں تھی، ہاں یہ غلط فہمی ضرور تھی، جو اب دور ہوگئی تھی اور اس کی زندگی کی ہر خوشی کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

وہ جو محبت کو ایک ثانوی چیز سمجھتی تھی، اب اسے ادراک ہوا تھا کہ محبت بھی ہوا، پانی اور خوراک کی طرح زندگی کی ایک اہم ضرورت تھی۔

اب اسے پتا چلا تھا کہ ایک ایسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنا جو آپ سے محبت کرتا ہو، نہ آپ اس سے محبت کرتے ہوں، دنیا کا مشکل ترین کام تھا اور وہ آج کل اسی مشکل سے دوچار تھی۔

مصعب کو چھوڑتے ہوئے اس نے ایک لمحہ سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی لیکن زیاد کو چھوڑنے کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی

کیونکہ اسے اسی دنیا میں رہنا تھا جو پہلے ہی اسے معاف کرنے کو تیار نہیں تھی۔

کاش زیاد اس کی زندگی میں نہ آتا۔ کاش وہ مصعب کو نہ چھوڑتی۔ وہ اس سے کس قدر محبت کرتا تھا۔ سب کچھ جاننے کے بعد بھی اس نے کیسے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں رائمہ!"

"لیکن مجھے آپ کی محبت کی ضرورت نہیں، میں تو بس یہ چاہتی ہوں کہ میرا شوہر میرے ساتھ کھڑا ہو تو شوہر لگے نوکر نہیں۔"

کتنے سخت اور نخوت بھرے لہجے میں اس نے کہا تھا۔ عرق ندامت سے اس کی پیشانی نم ہوگئی تھی۔

"مصعب جیسے اچھے انسان کے ساتھ ایسامت کرو رائمہ! وہ تم سے بہت محبت کرتا ہے۔" رشنا آپی نے کہا تھا۔

"میں اس قابل ہوں کہ مجھ سے محبت کی جائے، مصعب کی جگہ پر کوئی اور شخص بھی ہوتا تو مجھ سے اتنی ہی محبت کرتا۔"

بڑا غرور تھا اسے اپنے حسن پر، اور اسی حسن نے اسے برباد کردیا تھا۔

تھکے تھکے انداز میں وہ الماری کی جانب بڑھی تھی تب ہی مسلسل بجتی فون کی بیل نے اسے چونکا دیا تھا۔ بے دلی سے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا تھا۔

"السلام علیکم رائمہ جی! کیسی ہیں آپ۔"

"میں..... بالکل ٹھیک ٹھاک، آپ سنائیں۔"

اس نے حتی المقدور لہجے کو ہشاش بشاش بنانے کی سعی کی تھی۔

"میں..... ایک دم فرسٹ کلاس، ابھی آپ خود دیکھ لیجیے گا، مصروف تو نہیں ہیں، ایکچوئیلی ہم لوگ ادھر قریب ہی آئے ہوئے ہیں تو چاہ رہے ہیں آپ سے ملتے چلیں۔"

اس نے بے حد دوستانہ انداز میں کہا تھا۔ وہ حیران و پریشان سی سوچ رہی تھی کہ اسے کیا جواب دے کہ اس کی آواز آئی تھی۔

"آپ نے کسی بھی قسم کا تکلف نہیں کرنا، بالکل گنجائش نہیں ہے، بلکہ میرا پیٹ بے چارہ تو کل سے ہائے وائے کررہا ہے، او کے رائمہ جی سی یو سون۔"

فون بند ہوگیا تھا اور وہ ہونقوں کی طرح ریسیور کو دیکھ رہی تھی۔

اب کیا کرے، پریشانی سے سوچتے ہوئے ڈرتے ڈرتے زیاد کا نمبر ملایا تھا۔ کافی دیر بیل جاتی رہی تھی، لیکن اس نے کال ریسیو نہیں کی تھی۔

کوفت کے عالم میں اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور اک طائرانہ سی نگاہ ڈرائنگ روم پر ڈالی۔ کل ہی اس نے ڈرائنگ روم کی تفصیلی صفائی کروائی تھی، اس لیے وہاں ٹائم لگانے کی ضرورت نہیں تھی۔

اطمینان کی سانس لیتے ہوئے وہ کچن کی جانب بڑھی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ وہ دس، پندرہ منٹ میں پہنچ جائیں گے، لیکن انہیں آنے میں گھنٹہ لگا تھا۔

وہ کچن سے فارغ ہو کر آرام سے تیار ہوگئی تھی۔

موسم خاصا خوش گوار تھا۔ اس نے سیاہ اور فیروزی امتزاج کا شیفون کا جدید تراش خراش کا سوٹ پہنا تھا اور مہارت سے ہلکا ہلکا میک اپ کرتے ہوئے آنکھوں کے حلقوں کو خاصی حد تک چھپالیا تھا۔

"آج تو آپ بہت پیاری لگ رہی ہیں۔"

نورین نے اس کے گلے لگتے ہوئے کھلے دل سے تعریف کی تھی اور وہ دھیرے سے مسکرادی تھی۔

"بھابھی! زیاد نہیں آیا ابھی۔"

"نہیں..... لیکن بس آنے والے ہیں۔"

"موبائل نمبر کیوں چینج کرلیا اس نے، اس نے تو بڑی تلاش کے بعد وہ نمبر لیا تھا۔"

پتا نہیں حیدر بھائی!" پھیکے پڑتے چہرے کے ساتھ اس نے دھیمی سی آواز میں کہا تھا اور انہیں بیٹھنے کا کہتی کچن کی جانب بڑھ گئی تھی۔

چند ہی لمحوں میں نورین بھی اس کے پیچھے چلی آئی تھی۔

"رائمہ! کسی بھی قسم کا تکلف کرنے کی ضرورت

نہیں ہے۔ بس اسٹرونگ سی چائے بنائیں اور ڈرائنگ روم میں آجائیں۔"

"ٹھیک ہے آپ چلیں، میں پانچ منٹ میں آرہی ہوں۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ وہ چلی گئی تھی، لیکن جاتے جاتے بھی کچھ نہ — کرنے پر اصرار تھا۔

رائمہ نے شکر کیا تھا کہ اس نے سب کچھ پہلے ہی تیار کرلیا تھا۔ ورنہ تو اس نے اسے واقعی چائے کے علاوہ کچھ اور بنانے کا موقع نہیں دیا تھا، کیونکہ ٹھیک پانچ منٹ بعد وہ پھر کچن میں موجود تھی اور اسے ٹرالی لگاتے دیکھ کر ناراض ہورہی تھی۔

یوں تو وہ دونوں میاں، بیوی ہی بے حد خوش مزاج تھے۔ لیکن نورین کے انداز میں اک عجیب سی بے ساختگی تھی۔ اسے باتیں کرنے کا، گھلنے ملنے کا فن آتا تھا۔ وہ کچھ ہی دیر میں رائمہ سے یوں بے تکلف ہوگئی تھی جیسے وہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی تھیں۔

کچھ حیدر کے سنائے گئے یونیورسٹی کے قصوں نے بھی بے تکلفی کی فضا پیدا کردی تھی۔

اس وقت بھی وہ زیاد کی کوئی بات بے حد دلچسپ پیرائے میں بتا رہا تھا اور وہ بے اختیار ہنس رہی تھی، جب اس کی نگاہ اٹھی تھی اور اس کا خون خشک ہوگیا تھا۔

زیاد ڈرائنگ روم کے دروازے پر کھڑا خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ پڑتے ہی وہ تیزی سے دروازے سے ہٹ گیا تھا۔

"میں ابھی آئی حیدر بھائی!" جلدی سے اٹھتے ہوئے اس نے کہا تھا اور تیز تیز قدموں سے اس کے پیچھے آئی تھی۔

بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی زیاد نے دھڑ سے دروازہ بند کردیا تھا اور رائمہ کا رنگ اڑ گیا تھا۔

کس قدر مشکل صورت حال تھی۔ نورین واش روم میں تھی اور زیاد نے دروازہ بند کردیا تھا۔ بوکھلائے ہوئے انداز میں اس نے ہینڈل گھمایا تھا۔ اور پھر سکون کی سانس لی تھی۔ دروازہ اندر سے مقفل نہیں تھا۔

وہ دھڑکتے دل کے ساتھ آہستگی سے دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر داخل ہوئی تھی اور پھر صدمے سے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

زیاد نے اس کے اندر داخل ہوتے ہی اس کے بال ہاتھوں میں جکڑ لیے تھے۔

"کب سے چل رہا ہے یہ چکر، سچ سچ بتاؤ۔" بالوں کو جھٹکا دیتے ہوئے اس نے خونخوار لہجے میں پوچھا تھا۔

رائمہ نے بولنا چاہا تھا، کچھ کہنا چاہا تھا، لیکن بہت کوشش کے باوجود ایک لفظ اس کی زبان سے نہیں نکل سکا تھا۔ قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

تم کیا سمجھتی ہو، اس الو کے پٹھے مصعب کی طرح بے وقوف اور بے غیرت ہوں میں، ہرگز نہیں، ٹکڑے ٹکڑے کردوں گا مگر یوں گل چھرے نہیں اڑانے دوں گا۔ بولو، جلدی بولو کب سے آرہا ہے یہ۔"

خونخوار لہجے میں کہتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ پھر اس کے بالوں کو جھٹکا دیا تھا۔ رائمہ کو لگا تھا اس کے بال جلد سمیت سر سے اکھڑ گئے ہیں۔ مارے تکلیف کے اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ دکھ اور رنج سے دل جیسے پھٹنے کو تھا۔ یہ زیاد تھا۔

اس قدر ظالم، ایسا شقی القلب، اسے جیسے یقین ہی نہیں آرہا تھا لیکن ایک بات کا یقین اسے سو فیصد آگیا تھا کہ کچھ گناہ ایسے ہوتے ہیں جن کی معافی کبھی نہیں ملتی اور مصعب جیسے اچھے اور بے لوث چاہنے والے شخص کا دل توڑنا ایک ایسا ہی گناہ تھا، جس کی معافی اسے ملنے والی نہیں تھی۔ وہ جتنا بھی روتی، چلاتی یا گڑگڑاتی، عزت اور محبت کو ٹھوکر مار کر اس نے ذلت کو چنا تھا اور یہ ذلت اب تا زیست اس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔

اس کی نگاہیں واش روم کے دروازے پر ایستادہ منہ پر ہاتھ رکھے حیران و پریشان کھڑی نورین پر تھیں اور اس کا وجود جیسے کسی گہرے پاتال میں گرتا جارہا تھا، نیچے ہی نیچے بہت نیچے۔

بھر جی اُٹھے ہیں جس سے وہ امکان تم نہیں
اب جو بھی کر رہا ہے یہ احسان، تم نہیں

مجھ میں بدل رہا ہے جو اک عالمِ خیال
اُس لمحۂ جنوں کے نگہبان تم نہیں

بجھتے ہوئے چراغ کی لَو جس نے تیز کی
وہ اور ہی ہوا ہے مری جان، تم نہیں

پھر یوں ہوا کہ جیسے گرہ کھُل گئی کوئی
مشکل تو بس یہی تھی کہ آسان تم نہیں

تم نے سُنی نہیں ہے صدائے شکستِ دل
ہم جھیلتے رہے ہیں یہ نقصان، تم نہیں

یہ عالمِ ظہور ہے ہجرت زدہ سلیمؔ
ہم بھی دُکھی ہیں صرف پریشان تم نہیں

سلیم کوثر

ہوا تلاش کریں، روشنی تلاش کریں
ہم آس پاس کہیں زندگی تلاش کریں

ہم اپنی اپنی خوشی تو گنوا چکے ہیں سبھی
سو دوسروں کی خوشی میں خوشی تلاش کریں

یہ منظروں کی کہانی بہت پرانی ہے
نیا زمانہ، نئی شاعری تلاش کریں

اُداسیوں کا سبب ڈھونڈنے سے کیا ہوگا
جو ہم سے روٹھ گئی، وہ ہنسی تلاش کریں

پرائے شہر میں پھرنے سے کچھ نہیں ہوگا
ہم اپنا راستہ، اپنی گلی تلاش کریں

یہاں کے لوگ تو اپنی طرح کے ہیں مظہرؔ
جو اپنے جیسا نہ ہو، وہ آدمی تلاش کریں

مظہر نیازی

تجھ کو شاید نہیں خبر سائیں
عشق کرتا ہے معتبر سائیں

تیرے قدموں میں رکھ دیا خود کو
اب جو چاہے سلوک کر سائیں

اپنے صدمے سے مار دیتا ہے
عشق ملتا نہیں اگر سائیں

تجھ کو چاہا نہیں، خدا کی قسم
تجھ کو پوجا ہے عمر بھر سائیں

بھول جاؤں میں کس طرح سب کچھ
زور چلتا ہے عشق پر سائیں؟

ساحلوں کی ہوا ہوں، آج مجھے
اپنی مٹھی میں قید کر سائیں

عکاشہ سحر

کاش بادل کی طرح پیار کا سایہ ہوتا
پھر میں دن رات تیرے شہر پہ چھایا ہوتا

مجھ سی تخلیق کا الزام نہ آتا تجھ پر
میں اگر نقش غلط ہوں، نہ بنایا ہوتا

خواب ٹوٹے تھے اگر تیرے بھی میری ہی طرح
بوجھ کچھ تیری بھی پلکوں نے اُٹھایا ہوتا

لمس ہاتھوں کا بھی کافی تھا پگھلنے کے لیے
موم کے بت کو زمیں پر نہ گرایا ہوتا

راہ میں آگ کے دریا سے گزرنا تھا اگر
تُونے خوابوں کا جزیرہ نہ دکھایا ہوتا

مُرتضیٰ برلاس

اس ماہ کی مسکراہٹیں

سائرہ غلام نبی

تمہارے خط

اردو کے پروفیسر سے اس کی محبوبہ نے دل لگی کرنے کے لیے اٹھلاتے ہوئے کہا۔
"میں تم جیسے کتابی کیڑے سے شادی تو دور کی بات ہے، بات کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ نہ تمہارے دل میں کوئی اُمنگ ہے نہ ترنگ... اس لیے میرے خط واپس کر دو۔"
پروفیسر نے فوراً جواب دیا۔ "مجھے بھی تمہارے لکھے ہوئے خط رکھنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمہاری اردو کی لکھائی بہت خراب ہے۔ تمہارا خط پڑھنے کے لیے اگر میں صبح بیٹھوں تو شام ہو جاتی ہے اور اللہ کی پناہ! تم ایک پیرے میں چھ سات غلطیاں کرتی ہو۔ تم بے فکر رہو۔ میں ابھی تمہارے نقشے نما خطوط لے کر آتا ہوں..."

صائمہ۔ اوکاڑہ

تلاش

ایک جلسے میں ایک مقرر کافی دیر سے تقریر کر رہا تھا۔ خاصی دیر ہوگئی تھی۔ دوسرے مقررین کو بولنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ لوگ اٹھ کر جانے لگے تب ہی اس مقرر نے اپنی تقریر جاری رکھی۔ اچانک ہال میں سے ایک موٹا آدمی لاٹھی لے کر اٹھا۔ مقرر نے گھبرا کر کہا۔
"آپ تشریف رکھیں۔ میں بس ختم کرنے والا ہوں۔"
موٹے آدمی نے کہا۔ "آپ اپنی تقریر جاری رکھیں میں تو اس شخص کو ڈھونڈ رہا ہوں، جو آپ کو یہاں لے کر آیا تھا۔"

حمیرا امجد۔ کراچی

سبق

ایک بوڑھا استاد اپنے شہر کے دو آدمیوں کا ذکر اپنی بیوی کے سامنے لے بیٹھا۔ "ان دونوں کو میں بچپن سے جانتا ہوں۔ ان میں ایک شوخ، کھلنڈرا اور حرجی تھا۔ دوسرا معمولی شکل و صورت کا تھا مگر بلا کا سنجیدہ اور محنتی تھا۔ زندگی کی دوڑ میں کھلنڈرا پیچھے رہ گیا۔ محنتی کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ اس نے اپنی بیوی کے لیے دس لاکھ روپے چھوڑے ہیں۔ اس سے یقیناً ایک سبق ملتا ہے۔" استاد کی بیوی نے ان کی بات کاٹی
"سبق تو بلاشبہ ملتا ہے۔ آج ہی میں نے سُنا ہے کہ کھلنڈرا آدمی، محنتی کی بیوی سے شادی کرنے والا ہے۔"

فرح مغل۔ اٹک

بہترین دوست

پانچ سال پہلے میرا بہترین دوست میری بیوی کو بھگا کر لے گیا تھا۔ اسے نہیں معلوم کہ... اس کی اس حرکت کے بعد ہی میں نے اسے اپنا بہترین دوست سمجھا تھا۔"

انیلا شاہین۔ لاہور

تحفہ

ایک شخص نے بک اسٹال سے ایک کتاب کے بارے میں دریافت کیا۔
"لطیفوں کے اس مجموعے کی کیا قیمت ہے؟"
"صرف سو روپے جناب! لطیفے اس قدر دلچسپ ہیں کہ آپ کا ہنستے ہنستے دم نکل جائے گا۔" دکان دار نے خوش اخلاقی سے کہا۔
"واقعی! تو پھر مجھے دو کتابیں دے دو۔ ایک میری بیوی کے لیے اور دوسری میری ساس کے لیے۔"

توبیہ کاشف۔ ڈیفنس کراچی

نئی تبدیلی

پڑوسن نے نئی نویلی دلہن سے پوچھا۔ "شادی سے

پہلے تم کیا کرتی تھیں؟"
"میں ایمن صاحب کے ہاں کپڑے، برتن اور فرش دھونے اور کھانا پکانے پر مامور تھی۔"
پڑوسن بولی۔ "تب تو تمہیں نئی تبدیلی بہت پسند آئے گی۔"
دلہن ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔ "جی! اب وہی سارے کام بغیر تنخواہ کے کرتے پڑتے ہیں۔"
عائشہ ساجد۔ فیصل آباد

احساسِ کمتری

ایک نودولتیے کی بیوی ایک سرجن کے پاس پہنچی اور کہنے لگی۔
"ڈاکٹر صاحب! میرا آپریشن کر دیجیے۔"
"کس چیز کا آپریشن؟" سرجن نے حیرانی سے پوچھا۔
"کسی بھی چیز کا۔" خاتون نے بے فکری سے کہا۔ "دراصل میرا کسی بھی مرض کے سلسلے میں آپریشن نہیں ہوا۔ اسی وجہ سے مجھے اپنی سہیلیوں کے درمیان بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں مشکل پیش آتی ہے اور احساسِ کمتری بڑھنے لگتا ہے۔"
سمیرا وحید۔ پنڈی بھٹیاں

میں سمجھا

ایک ماہرِ ازدواجیات شوہروں کو لیکچر دے رہے تھے۔ آخر میں انہوں نے کہا۔
"اگر کسی صاحب کی بیوی سیدھی سادی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بیوی چالاک ہوجائے، وہ ہاتھ کھڑا کریں۔"
سامنے بیٹھے آدمیوں میں سے ایک معصوم شوہر نے ہاتھ کھڑا کر دیا۔ ماہرِ ازدواجیات نے مسکراتے ہوئے عینک کے اوپر سے انہیں دیکھا اور پوچھا۔
"اچھا! تو آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی بیوی چالاک ہوجائے؟"
اس آدمی نے اپنا ہاتھ نیچے کرلیا اور مایوسی سے بولا۔
"اوہ! میں سمجھا، آپ نے 'بلاک ہوجائے' کہا ہے۔"
کومل عدنان۔ کراچی

خواب

اس دن پارٹی میں میرے باس کی بیگم کس قدر خوبصورت لگ رہی تھیں۔ تب سے مسلسل میرے خوابوں میں آرہی ہیں۔" شوہر نے بیوی سے ازراہِ مذاق کہا۔
بیوی نے شوہر کے خلافِ توقع سوال کیا۔
"اکیلے آتی ہیں؟"
"ہاں.... لیکن تمہیں کیسے معلوم؟" شوہر نے حیرانی سے پوچھا۔
"کیونکہ تمہارے باس میرے خوابوں میں آرہے ہیں۔"
بیوی نے مسکرا کر جواب دیا۔
سمیرا علی۔ کراچی

صحیح طریقہ

دو سہیلیاں اپنی اپنی پریشانیوں کے بارے میں بات کر رہی تھیں۔ ایک کو شکایت تھی کہ اس کے رشتے دار بے وقت آکر اسے پریشان کرتے ہیں۔ دوسری نے ایک مشورہ دے کر اس کا مسئلہ حل کرنا چاہا۔
"اس کا آسان حل یہ ہے کہ جوں ہی دروازے کی گھنٹی بجے، تم فوراً برقع اوڑھ لیا کرو۔ اگر ملاقاتی سے ملنے کا جی نہ چاہے تو کہہ دو "معاف کرنا، میں ضروری کام سے باہر جارہی ہوں۔" اور اگر کسی سے ملنے کا ارادہ بن جائے تو کہہ دو "ہائے! کتنی خوشی کی بات ہے۔ میں ابھی ابھی باہر سے آرہی ہوں۔"
نسرین اختر۔ کراچی

احتیاط

ایک صاحب نے اپنے دوست کو بتایا۔ "پندرہ سال سے میری گرم جوشِ محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔"
دوست نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے راز دریافت کیا۔
"بس مجھے یہ احتیاط کرنا پڑتی ہے کہ میری بیوی کو میری پرسنل مصروفیات کے بارے میں کچھ پتا نہ چل سکے۔" دوست نے اطمینان سے جواب دیا۔

کوثر سرفراز۔ لاہور

ناانصافی

جیل میں ایک قیدی نے دوسرے قیدی سے کہا۔
"کیسی ناانصافی کی بات ہے۔ میں پچھلی بار یہاں آیا تھا تو مجھے پڑھنا لکھنا سکھایا گیا۔ دستخط کرنے سکھائے گئے اور اب مجھے جعلی چیک پر دستخط کے الزام میں پکڑ لیا گیا۔"
مدیحہ احمد۔ رحیم یار خان

آزادیٔ نسواں

ایک کاسمیٹکس کی دکان پر ایک شخص پہنچا اور دکان دار سے کہنے لگا۔
"اگر تم برا نہ مانو تو پلیز لپ اسٹک کا ایک چھوٹا سا دھبہ میرے کالر پر لگادو۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی آزادیٔ نسواں کے منفی رخ سے بھی آگاہ ہوجائے۔"
نسیم اختر۔ کراچی

اطمینان

سردار جی کو اپنی بیٹی کے کمرے سے ایک دن سگریٹ ملی تو وہ پریشان ہوگئے۔ دوسرے دن شراب کی بوتل ملی تو وہ اور زیادہ پریشان ہوگئے۔ پھر اگلے دن اس کے کمرے سے ایک نوجوان برآمد ہوا تو سردار جی اطمینان سے بولے۔
"شکر ہے، یہ سب اس لڑکے کا تھا۔"
ثمرہ رزاق۔ کراچی

نقصان

گاؤں کے ایک کنجوس زمیندار کا ملازم روزانہ اپنی محبوبہ سے ملنے جاتا تو لالٹین بھی ساتھ لے جاتا۔ زمیندار کو بڑا غصہ آتا کہ مٹی کا تیل خرچ ہوجاتا ہے۔ ایک دن اس نے اپنے ملازم کو ڈانٹا۔
"ایک تو تم نئی نسل کے لوگوں میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ محبوبہ سے ملنے کے لیے لالٹین لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ خوامخواہ فضول خرچی ہوتی ہے۔ جب میں تمہاری عمر کا تھا تو محبوبہ سے ملنے بغیر لالٹین کے جاتا تھا۔"
"بتانے کی ضرورت نہیں۔" ملازم نے چڑ کر کہا۔ "مالکن کو دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا تھا۔ اندھیرے میں ایسی چیزیں ہی ہاتھ آتی ہیں۔"
فریال صلاح الدین۔ کراچی

پرانی کہانی

پرانی کہانی ہے کہ ایک دفعہ ٹوپیاں بیچنے والا ایک آدمی سستانے کے لیے ایک درخت کے نیچے لیٹا تو درخت کے اوپر موجود بندروں نے اس کی ساری ٹوپیاں اٹھا کر پہن لیں۔ آدمی کو معلوم تھا کہ بندر انسانوں کی نقل کرتے ہیں۔ سو اس نے اپنے سر کی ٹوپی اتار کر زمین پر پھینکی۔ حسبِ توقع بندروں نے بھی اپنی اپنی ٹوپی زمین پر پھینک دی۔ آدمی نے اپنی ٹوپیاں اکٹھی کیں اور مسکراتا ہوا چل پڑا۔ گھر پہنچ کر اس نے یہ کہانی اپنے پوتے کو سنائی۔
وقت گزرتا گیا۔ پھر یوں ہوا کہ پوتا بڑا ہو کر ٹوپیاں بیچنے لگا۔ ایک دفعہ وہ بھی اپنی ٹوپیاں رکھ کر درخت کے نیچے سستانے لیٹا تو اس درخت کے بندر اس کی ٹوپیاں اٹھا کر درخت پر چڑھ گئے۔ لڑکے کو اپنے دادا کی کہانی یاد آگئی۔ اس نے بھی اپنی ٹوپی اتار کر زمین پر پھینکی۔ ایک بندر درخت سے اتر کر نیچے آیا۔ لڑکے کی ٹوپی اٹھائی دوبارہ درخت پر چڑھا اور لڑکے سے بولا۔
"تمہارا کیا خیال ہے، کیا ہمارا دادا ہمیں کہانی نہیں سناتا ہوگا؟"
لبنیٰ اسلم۔ راولپنڈی

شگفتہ جاہ

ہاتھوں سے خوشبو آئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا۔

"میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو بخار تھا۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر ہاتھ رکھا تو لحاف کے اوپر رکھے ہوئے ہاتھ کو حرارت ہوئی۔ میں نے کہا۔

"یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ کو اتنا سخت بخار ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "ہم (انبیاء) اسی طرح ہوتے ہیں کہ ہمیں مصیبت (یا آزمائش) بھی دگنی آتی ہے اور ثواب بھی دگنا ملتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! سب سے زیادہ آزمائش کن لوگوں کو آتی ہے؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "نبیوں کو۔"

میں نے کہا۔ "ان کے بعد؟"

فرمایا۔ "نیک لوگوں کو۔ انہیں فقر کے ذریعے آزمایا جاتا ہے حتیٰ کہ (بعض اوقات) ایک آدمی کو صرف ایک چادر میسر ہوتی ہے جسے وہ جسم پر لپیٹ لیتا ہے۔ اور وہ اپنی مصیبت پر خوش ہوتا ہے جس طرح تم اپنی راحت پر خوش ہوتے ہو۔"

(سنن ابن ماجہ)

رشتے کے بغیر محبت،

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

"بے شک اللہ عزوجل کے کچھ بندے ایسے ہیں، نہ وہ نبی ہیں نہ شہید مگر قیامت کے روز انبیاء اور شہید بھی ان پر رشک کریں گے۔"

پوچھا گیا کہ وہ کون لوگ ہیں تو فرمایا۔ "یہ وہ لوگ ہیں جو بغیر کسی لین دین اور رشتے کے ایک دوسرے سے محبت کریں۔"

سدرہ تحسین گوراثیہ۔ لیہ

فرق،

اگر اندھیرے میں سایہ ساتھ چھوڑ دیتا ہے تو زیادہ روشنی میں بھی سایہ ساتھ نہیں رہتا۔ فرق تھوڑا سا ہے۔ غریبی میں لوگ ہمیں چھوڑ دیتے ہیں۔ امیری میں ہم لوگوں کو چھوڑ دیتے ہیں۔

عطیہ افضل۔ جہلم

موتی مالا،

- ہمیشہ سچ اور حق بات کہو اگرچہ ناخوش گوار اور کڑوی ہو۔
- مظلوم کی بددعا سے بچو کیونکہ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی چیز حائل نہیں ہوتی۔
- غافلوں میں ذکر خدا کرنے والوں کی مثال سوکھے گھاس میں سبز پودے کی طرح ہے۔
- برے لوگوں کی ہم نشینی سے تنہائی بہتر ہے۔
- زندگی کی گردش عجیب امر ہے لیکن اس سے غفلت عجیب تر ہے۔
- فتح امید سے نہیں علم اور خدا پر اعتماد سے حاصل ہوتی ہے۔
- اگر آنکھیں روشن ہیں تو ہر روز روز حشر ہے۔
- تم بڑوں کی عزت کرو چھوٹے تمہاری عزت خود بخود کریں گے۔
- کلام میں نرمی اختیار کرو کیونکہ الفاظ کی نسبت لہجے کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔

- جو اچھی بات سنو لکھ لو اور جو لکھو اسے حفظ کر لو اور جو حفظ کر لو، اسے بیان کرو۔
- جدوجہد نہ کرنا محتاجی کا باعث ہے۔
- نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرو کہ صحبت میں بڑا اثر ہوتا ہے۔

آمنہ امتیاز مغل۔ گجرات

ایک سجدہ،

ایک شخص کہیں جا رہا تھا کہ شیطان اس کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں اس نے نہ فجر کی نماز پڑھی، نہ ظہر، نہ عصر اور نہ مغرب نہ عشاء کی۔ یہ دیکھ کر شیطان بولا۔

"میرے اور تیرے راستے اب سے جدا ہیں۔"

اس آدمی نے وجہ پوچھی تو شیطان بولا۔

"میں نے آدم کو ایک سجدہ نہیں کیا تھا تو اللہ نے مجھ پر لعنت بھیجی۔ تو نے تو کئی سجدے نہیں کیے وہ بھی آدم کے رب کو۔ مجھے تیرے انجام سے ڈر لگ رہا ہے۔"

ساجدہ زید۔ ویرووالہ چیمہ

دعا،

دعا کے بارے میں مجھے کامل یقین ہے کہ خلوص دل سے نکلی دعا ہمیشہ قبول ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ قبولیت انسان کی مرضی کے مطابق یا اللہ کی رضا کے مطابق ہو۔ خوش قسمت لوگ اپنی خواہشات کو اللہ کے تابع رکھتے ہیں اور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کی دعا اپنی مرضی کے مطابق پوری ہو یا نہ ہو، ان کے نزدیک دونوں صورتیں برابر ہوتی ہیں۔ عبدیت کی یہ شان اگر مستحکم ہو کر ترقی پاتی رہے تو رفتہ رفتہ انسان کی رسائی کسی حد تک مقام مرادیت تک بھی ممکن ہو سکتی ہے۔

(قدرت اللہ شہاب کے "شہاب نامہ" سے اقتباس)

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

درود پاک

ایک دن حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا اللہ پاک نے مجھے اتنی طاقت دی ہے کہ میں ساری دنیا کے درختوں کے پتے گن سکتا ہوں اور پانی کے قطرے گن سکتا ہوں۔ ریت کے ذرے گن سکتا ہوں لیکن اس آدمی پر اللہ کی رحمت کی تعداد نہیں گن سکتا جو صرف ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پاک بھیجے گا۔

ناصرہ۔ نامعلوم جگہ

تحفہ،

جب انسان اداس ہوتا ہے تو یادوں کے صحرا کی طرف نکل جاتا ہے۔ دکھوں کی بوسیدہ کتاب کھول لیتا ہے تو یادوں کے سنگریزے اس کی آنکھوں میں چبھنے لگتے ہیں لیکن کچھ دیر بعد وہ اداسی کے رومال سے آرزوؤں کے آنسو خشک کر کے دنیا کی رنگینیوں میں شامل ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے خدا نے اسے اشرف المخلوقات کا درجہ دیا ہے۔ تم بھی اداسی کی تہہ کھرچ کر آرزوؤں کو پس پشت ڈال کر عید کی خوشیاں مناؤ کہ یہ رب کی طرف سے تحفہ ہے۔"

آمنہ اجالا۔ ڈہرکی

پرمغز باتیں،

حجاج بن یوسف ثقفی نے ایک طبیب سے فرمائش کی۔

"مجھے طب کی پرمغز باتیں بتاؤ۔"

اس نے کہا۔ "گوشت صرف جوان جانور کا کھاؤ۔ جب دوپہر کا کھانا کھاؤ تو سو جاؤ، اور جب شام کا کھانا کھاؤ تو چلو، اگرچہ تمہیں کانٹوں پر چلنا پڑے۔ جب تک پیٹ کی پہلی غذا ہضم نہ کر لو، دوسرا کھانا نہ کھاؤ۔ جب تک بیت الخلا نہ جاؤ، سونے کے لیے بستر پر نہ آؤ۔ پھلوں کے نئے موسم میں پھل کھاؤ۔ جب ان کا موسم جانے لگے، اس وقت پھل کھانا چھوڑ دو۔"

اقوال زریں،

- جو انسان جتنا خاموش ہے، اتنا ہی پوشیدہ ہے۔

- وقت کو استعمال کرو ورنہ تم ضائع ہو جاؤ گے۔
- جو دوسروں کو اپنے راز میں شریک کرتا ہے وہ خود کو تباہ کر لیتا ہے۔
- کسی کو اتنا مت چاہو کہ اس کی جدائی برداشت نہ کر سکو۔
- مصروف رہیں تاکہ مایوسی آپ پر حاوی نہ ہو۔
- اگر تم لوگوں کے قصور معاف نہ کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے قصور معاف نہ کرے گا۔
- دوستی اور رشتے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ دوست ٹوٹنے بھی بن جاتے ہیں مگر رشتے نہیں۔
- انسانیت کا دوسرا نام "محبت" ہے۔
- دوستی کی قیمت صرف ایک اچھا دوست ہی جان سکتا ہے۔

دیا جلائے جاؤ

ماضی کی سوگواری سے انسان کو اتنی گہری وابستگی نہیں ہونی چاہیے۔ انسان کو پیچھے نہیں آگے دیکھنا چاہیے۔ ایک دیا بجھ گیا تو اسے مقدر کیوں سمجھا جائے۔ آگے ہر قدم پہ دیا جلایا جا سکتا ہے۔ جب منزل ڈھونڈنے کے اتنے مواقع موجود ہوں تو کوئی اتنا احمق کیوں بنے کہ کولہو کے بیل کی طرح ساری زندگی بجھے ہوئے دیے کا طواف کرتا رہے۔

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

اللہ کے قلیل بندے

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ بیت الحرام پر طواف کر رہے تھے اتنے میں انہوں نے دیکھا کہ ایک اعرابی اپنے رب کو مخاطب کر کے کہہ رہا تھا۔

"یا اللہ! مجھے اپنے قلیل بندوں میں سے بنا دے۔"

یہ سن کر حضرت عمرؓ حیران ہوئے اور فرمایا۔

"اے اعرابی! ایسی نرالی دعا آج تک میں نے نہیں سنی۔ آخر اس کا مطلب کیا ہے؟"

"آپ کو نہیں معلوم یا امیر المومنین؟" اعرابی نے حیرت سے پوچھا تو آپ اور زیادہ حیران ہوئے۔ آپ نے فرمایا۔

"نہیں مجھے نہیں معلوم۔"

اعرابی نے کہا۔ "کیا آپ نے قرآن شریف کی یہ آیات نہیں پڑھیں کہ

ترجمہ: "میرے بندوں میں سے بہت کم شکر گزار بندے ہیں" لہٰذا میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے شکر گزار بندوں میں شامل کر دے اور چونکہ شکر گزار بندے کم ہیں لہٰذا ان ہی کم یعنی قلیل بندوں میں سے ایک فرد مجھے بھی بنا دے۔"

یہ سن کر آپ نے فرمایا "بے شک تو نے ٹھیک کہا ہے اور یہ شخص عمرؓ سے زیادہ عالم اور واقف ہے۔"

شبانہ ستار۔ شجو اہین

مہکتی کلیاں

- دوستی ایک ایسا پودا ہے جس میں سچ کی مٹی، احساس کا پانی، انسانیت کی ہوا اور اعتبار کی دھوپ اس کو ایک مضبوط درخت بنا دیتی ہے۔
- ہم چہرہ تو خوبصورت رکھتے ہیں، جس پر لوگوں کی نظر ہوتی ہے لیکن دل کو صاف نہیں رکھتے، جس پر اللہ کی نظر ہوتی ہے۔
- ہمیشہ سمجھوتا کرنا سیکھو، کیونکہ تھوڑا سا جھک جانا، کسی رشتے کو ہمیشہ کے لیے توڑ دینے سے بہت بہتر ہے۔
- لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر صرف بولنے سے پہلے تک۔ بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ہے۔
- دکھ انسان کے مرنے سے نہیں ہوتا بلکہ اپنائیت محبت اور خلوص کے رشتوں کے ٹوٹ جانے کا ہوتا ہے۔

نمرہ، اقراء۔ کراچی

مہندی کے ڈیزائن

ادارہ

بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرنا

بیگمات کے آنسو

مصنف: خواجہ حسن نظامی

تبصرہ: آمنہ ذریں

تاریخ اور ادب کا امتزاج اپنی نوعیت کا ایک منفرد امتزاج ہے۔ تاریخ کے مضمون کا تصور محض تجربات، نتائج اور ان کے تجزیے پر مبنی سمجھا جاتا ہے۔

لیکن ایک ادبی شہ پارہ جو تاریخی واقعات سے مزین ہو اور حقیقت نگاری کو سادہ اسلوب میں ڈھال دے، وہ اپنی اثر انگیزی میں تاریخ نگاری پر سبقت لے جاتا ہے۔

"بیگمات کے آنسو" خواجہ حسن نظامی کا وہ شاہکار ہے، جس نے 1857ء کی جنگ آزادی کے بعد حکمران خاندان کو پیش آنے والے زوال کی کرب ناک حقیقتوں کو ہمیشہ کے لیے تاریخ اور ادب کا حصہ بنا دیا۔

یہ کہانیاں آپ بیتیوں کی صورت میں بیان کی گئی ہیں اور ہر ایک آپ بیتی "دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو" کی عکاسی کرتی ہے۔ کتاب کا امتیازی وصف یہ ہے کہ مصنف نے کردار نگاری سے لے کر کہانی بیان کرنے تک... کسی بھی چیز پر اپنی رائے مسلط نہیں کی، بلکہ یہ ہی ان کے اسلوب بیان کی ندرت ہے کہ پڑھنے والا خود بخود حقیقت کے سوز سے آشنا ہوتا ہے۔

ہر کہانی آزمائش سے متعلق ہے، لیکن پیش کرنے کا طریقہ ہر مرتبہ منفرد... مثلاً "دکھیا شہزادی" میں لیڈی وائسرائے کی تصویر سے باتیں ملاحظہ کیجیے۔

"تم نے ہم کو ہزار روپے دیے ہیں۔ میں ہزار بار اپنے ہاتھوں سے تمہاری چیٹ چیٹ بلا میں لوں۔ اماں کہتی ہیں ایک زمانہ ہمارا بھی تھا۔ ہم بھی ہزاروں روپے غریبوں، محتاجوں کو بانٹا کرتے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی اونی قالین اور مخملی فرش تھے۔ سونے چاندی کی جڑاؤ چھتیں تھیں۔ شال، دو شالے تھے۔ ہمارے گھروں میں بھی کافوری شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ ہمارے سر پر بھی تاج تھا۔ خدا نے ہم کو نعمت دی، جب تک اس کے قابل رہے، نعمت پاس رہی اور جب ہمارے عمل خراب ہوئے، عیش و عشرت میں پڑ گئے، ملک سے بے خبر ہو گئے، مظلوموں کو بھول گئے، ظالموں کی چرب زبانی پر پھول گئے۔ خدا نے وہ دولت چھین لی اور دوسروں کو دے دی۔ ہم کو اس میں کسی سے شکوہ نہیں، جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

بیگم! تم نے دیکھا ہوگا، دلی شہر میں ایک جامع مسجد ہے، جس کو ہمارے دادا نے بنایا تھا۔ دور، دور کی خلقت اس کو دیکھنے آتی ہے، مگر اس کو کوئی نہیں دیکھتا کہ مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے پھٹے ہوئے برقعے کے اندر ناتواں بچے کو گود میں لیے ہوئے پیوند لگا پاجامہ اور گھٹی ہوئی کنے لگی جوتی پہنے کون غریب عورت بھیک مانگتی ہے، بیگم! یہ غریب دکھیا بیوہ شہزادی ہے، جس کا کوئی وارث نہیں رہا۔"

یہ کتاب ہمیں بتاتی ہے کہ خدا نے حکمرانوں سے صرف اقتدار نہیں چھینا، بلکہ آسمان ان پر نامہربان اور زمین تنگ کر دی گئی۔ صرف عیش و عشرت نہیں چھینی، بلکہ دو وقت کی روٹی کے لیے بھی انہیں ذلت، مشقت سہنی پڑی۔

گل بانو کی کہانی سنیے! گل بانو بہادر شاہ ظفر کی پوتی ہیں اور باپ کی بے حد لاڈلی۔ بارہ سال کی عمر میں یتیم

ہو گئیں اور لاڈ پیار' ناز و نعم اور بھی بڑھ گیا۔

"جب گل بانو نے پندرہویں سال میں قدم رکھا تو شباب نے بچپن کی ضد اور شرارتیں تو رخصت کر دیں' مگر دل ربائی کی شوخیاں اس ستم کی پیدا کیں کہ محل کا بچہ بچہ پناہ مانگتا تھا۔ سونے کے چھپر کھٹ میں دوشالہ تانے سویا کرتی تھیں۔ شام کو چراغ جلے اور بانو چھپر کھٹ پر پہنچیں۔ دن چڑھے تک سوتی رہتیں' لونڈیوں کی مجال نہ تھی کہ کھٹکا کرتیں۔ سنہری چھپر کھٹ' سفید پھولوں کی سیج پر پاؤں پھیلائے بے خبر پڑی سوتی رہتیں۔"

یہ جنگ آزادی سے پہلے کا منظر تھا اور اب بعد کا قیامت خیز منظر دیکھیے۔

"درگاہ حضرت چراغ دہلی کے ایک گوشے میں ایک قبول صورت عورت پھٹا ہوا کمبل اوڑھے رات کے وقت' ہائے ہائے کر رہی تھی۔ سردی کا مینہہ دھواں دھار برس رہا تھا۔ تیز ہوا کے جھونکوں سے بوچھاڑ اس جگہ کو تر کر رہی تھی' جہاں اس عورت کا بستر تھا۔ یہ عورت سخت بیمار تھی۔ پسلی کے درد' بخار اور بے کسی میں اکیلی پڑی تڑپتی تھی۔ بخار کی بے ہوشی میں اس نے آواز دی۔

"گلبدن.... اری او گلبدن.... جلدی آ اور مجھ کو دوشالہ اوڑھا دے.... دیکھ بوچھاڑ اندر آتی ہے' گلبدن تو کہاں غارت ہو گئی.... میرے پاس کوئلوں کی انگیٹھی لا.... پسلی پر تیل مل.... درد سے میرا سانس رکا جاتا ہے۔"

جب کوئی آواز پر بھی اس کے پاس نہ آیا تو اس نے کمبل چہرے سے ہٹایا اور چاروں طرف دیکھا۔ اندھیرے دالان میں خاک کے بچھونے پر تنہا پڑی تھی۔ چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ مینہہ زناٹے سے برس رہا تھا۔ بجلی چمکتی تھی تو ایک سفید قبر کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ (جو اس کے باپ کی تھی) یہ حالت دیکھ کر اس عورت نے ایک نعرہ مارا اور کہا۔

"بابا.... میں تمہاری گل بانو ہوں' دیکھو اکیلی ہوں' مجھے سردی لگ رہی ہے' میری اماں مجھ سے بچھڑ گئیں' میں محلوں سے جلا وطن ہو گئی' دیکھو میں نے پرسوں سے کچھ نہیں کھایا۔ میرے بدن میں اس گیلی زمین کے کنکر چبھتے ہیں' میں اینٹ پر سر رکھے لیٹی ہوں۔"

اسی حالت میں ایڑیاں رگڑنے لگی.... سکرات کا وقت شروع ہو گیا اور وہ تنہا' لاوارث شہزادی آہ و زاریاں کرتی.... اللہ کو پیاری ہو گئی۔"

مغل خاندان پر یہ وقت کیوں آیا؟ یہ ایک الگ بحث ہے۔ لیکن انہیں اس وقت سے بہرحال گزرنا پڑا.... جس کے لیے وہ قطعی تیار نہیں تھے۔ نہ ہی کبھی انہوں نے ایسا برا خواب بھی دیکھا ہو گا۔

شہزادی نرگس بہادر شاہ ظفر کی پوتی تھیں۔ جنگ آزادی کے وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ ان کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا' اس لیے والد صاحب کی لاڈلی تھیں۔

نرگس نظر "جل محل" میں رہتی تھیں۔ ان کا محل تالاب کے وسط میں واقع تھا' جہاں سے نہر کا پانی گزرتا تھا۔ نرگس کی طبیعت میں نفاست و نزاکت بہت زیادہ تھی۔ باذوق بھی تھیں۔ ان کے محل میں آسائش تو تھی' آرائش بھی تھی۔ سرہانے کے تکیوں کے پاس دو چھوٹے چھوٹے گول گول تکیے ہوتے تھے جن کو "گال تکیہ" کہا جاتا تھا۔ یہ تکیے رخسار کی ٹیک کے لیے تھے کہ اگر شہزادی کا سر تکیوں سے نیچے آ جائے تو گال تکیے ان کے رخسار کو تکلیف سے بچائیں۔ دو تکیے ذرا بڑے بڑے دونوں پہلوؤں میں ہوتے تھے کہ ان سے شہزادی اپنے گھٹنے کو سہارا دے سکیں۔ غرض مولسری' جوہی' چمپا کے پھولوں کی خوشبو ان کی رات کو سہانا کرتی تھی اور کنیزیں ہلکے سروں میں گاتی تھیں۔ صبح اسی لاڈ اور دلار سے کنیزیں نیند سے جگاتیں۔

محل میں آخری رات کا منظر بھی مفصل بیان کیا گیا ہے' جس میں زمانے کی بے ثباتی واضح نظر آتی ہے۔

"ان کے والد سائیس کے کپڑے پہن کر قلعے سے باہر نکل گئے اور اپنے ہمراہ ہونے سے بہتر جانا کہ نرگس کسی وفادار کے ساتھ محفوظ مقام کی طرف نکل جائیں۔ محل خالی پڑا تھا۔ تمام ملازمین بھاگ چکے تھے۔ فقط ایک خواجہ سرا کے آسرے جواہرات اور چند کپڑے لے کر محل سے نکلیں اور دیر تک جل محل اور اس کی آرائش کو دیکھتی رہیں اور کہا۔

"خبر نہیں تجھ کو' دیکھنا پھر نصیب ہو یا آج تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا ہو رہا ہے۔"

اب ان کی مصیبت کے دن شروع ہوئے۔ خواجہ سرا نے ان کی انا کے گھر چھوڑا.... لیکن چونکہ معاملہ گردش ایام کا تھا۔ مخبری ہو گئی' قید ہو گئیں' قیدی بنا کر لے جائی جا رہی تھیں کہ سفر کے دوران لوٹ مار ہو گئی۔ حملہ آوروں نے قیمتی زیور اور کپڑے تک اتروا لیے اور پہننے کو پھٹے ہوئے میلے کپڑے دیے۔ بیچی گئیں' خریدی گئیں' کسی گنوار سے بیاہ دی گئیں اور پھر سے معتوب ہوئیں کہ انگریز سرکار نے ان کے سسر اور شوہر کو قید میں ڈال دیا۔ قسمت کی گردش نے انہیں نرگس سے "نگو" بنا دیا اور مشقت میں لونڈیوں سے بدتر کہ سارے گھر کے کام بھی کرنے پڑے۔

"جب سے مصیبت کے دن آئے تھے' میں کبھی نہیں گھبرائی' لیکن آج خبر نہیں کیا بات تھی کہ میں جل محل کو یاد کرتی تھی اور یہ بھی خیال آتا تھا کہ میں شہنشاہ ہند کی پوتی ہوں اور یہ بھی خیال آتا تھا کہ میں اپنے باپ کی لاڈلی ہوں اور یہ بھی خیال آتا تھا کہ میں سترہ برس کی عمر تک شہزادی تھی اور آج ایک مفلس نادار نوکرانی ہوں۔ میرے ہاں سارے قلعے سے اچھے اور نفیس کپڑے تھے اور ہر چیز نہایت صفائی ستھرائی سے رکھی جاتی تھی اور یہ ہی میرا دن رات کا مشغلہ تھا' مگر آج برعکس ہے۔ گویا پچھلے زمانے کی کوئی چیز بھی باقی نہیں رہی' صرف میں باقی ہوں اور وہ بھی بدلی ہوئی اور ہر بات میں مٹی ہوئی۔"

1857ء میں باغی فوج نے مغل حکمرانوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سرکشی کا مظاہرہ کیا۔ قلعہ میں پناہ گزیں انگریز مرد' عورتوں اور بچوں کے سر عام قتل کا اہتمام کیا۔ (جس کا بدلہ بعد میں نہایت سفاکی سے لیا گیا۔) بچوں کے بلبلانے اور عورتوں کے گڑگڑانے پر سب ہی لوگ غمگین تھے' مگر باغیوں کو روکنا کسی کے بس میں بھی نہیں تھا۔

اس موقع پر شہزادی لالہ رخ کے استاد صاحب نے ہمت کی اور کہا۔ "صاحب عالم! یہ تو بڑی سفاکی کا کام ہے۔ عورتوں اور بچوں کا قتل کسی مذہب میں روا نہیں ہے اور اسلام نے تو اس کی سختی سے ممانعت فرمائی ہے۔"

جواب میں مرزا مغل صاحب نے باغی فوج کی سرکشی کا ذکر کیا کہ وہ بھی ان کا کوئی حکم نہیں مانتی اور اس قدر خود سر ہو چکی ہے کہ نصیحت کرنے والے کو بھی مقتل میں لے جا کھڑا کرے گی۔

صاحب عالم اور مولانا عین اللہ نے اپنے اپنے دلائل دیے۔ "صاحب عالم کی یہ مجبوری حق بجانب ہے' مگر اسلام حکم دیتا ہے کہ مظلوم کی حمایت کے لیے اپنی جان تک کی بھی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ دنیا چند روزہ ہے' چلیے میرے ساتھ چلیے! میں خود جا کر ان باغیوں کو نصیحت کروں گا۔"

مگر قبل اس کے کہ صاحب عالم کوئی جواب دیتے' ایک شخص نے دوڑ کر مولانا کی پیٹھ میں چھری کا ایسا وار کیا کہ گردے تک کٹ گئے اور مولانا اگلی سانس بھی نہ لے سکے اور الٹے پاؤں یہ کہتا ہوا بھاگ کہ....

"کافروں اور کافروں کے دوستوں کی یہ ہی سزا ہے۔"

سبحان اللہ.... پہلا خیال جو کوندے کی طرح لپکا وہ یہ ہی تھا کہ انتہا پسندی اور مرضی کی شریعت نافذ کرنے کا چلن نیا تو نہیں' کافی قدیم ہے۔

عجب مصیبتوں کی داستان شروع ہوئی' زمین آسمان نامہربان ہوئے' اپنے بے گانے ہوئے' مخبریوں اور جھوٹی گواہیوں نے کئی بے گناہ باپ اور بھائی' بیٹیوں اور بہنوں کے سامنے خون میں نہلا دیے۔ چڑھتے سورج کے پجاریوں نے نئی تاجداری میں حصہ

پانے کے لیے ضمیر کو موت کی نیند سلا دیا اور خود اپنی اگلی کئی نسلوں کے لیے آسائشیں حاصل کرلیں۔
1857ء نے 1947ء کی بنیاد رکھ دی۔

لالہ رخ بھی امان پانے کے لیے سفر میں تھیں کہ قافلے پر حملہ ہوگیا۔ مردوں کو قتل کر کے عورتوں سے زیور لوٹ لیا گیا۔ تن کے شاہی لباس تک اتروا لیے گئے۔ نہ شاہی خاندان کی عزت باقی رہی' نہ مال و متاع کام آسکا۔

تقدیر کی ماری لالہ رخ کے قافلے پر حملہ آوروں میں سے ایک ان کے استاد کا وہی قاتل تھا جو بھاگ نکلا تھا۔ لالہ رخ کو اس نے اپنے قبضے میں کرلیا' یہ کہتے ہوئے کہ میں بے اولاد ہوں اور یوں ماں بیٹی کو جدا کر کے دور دراز کے فاصلے اور مستقل تڑپ مسلط کردی گئی۔

دربدری' والدین سے جدائی' آسائشوں سے دوری' لالہ رخ کو کیسے کیسے دن دیکھنے پڑے۔

"ایک دن مجھ کو شدت کا بخار تھا اور اس کی تکلیف کے سبب مجھ سے اُپلے نہ تھاپے گئے۔ اس عورت کا خاوند گھر میں آیا اور مجھ کو پڑا ہوا دیکھا تو اس نے میرے ایک ٹھوکر ماری اور کہا۔

"دس بج گئے' تو اب تک پڑی سوتی ہے۔ یہ لال قلعہ نہیں ہے' گھوسی کا گھر ہے۔ اٹھ کر بیٹھ اور گوبر تھاپ۔"

بخار کی حالت میں انہوں نے سب کام کیے اور دل میں اس محل کو یاد کیا جہاں یہ شعر لکھا ہوا تھا۔

"اگر فردوس بر روئے زمیں است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است"

اب اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ کیا تم مرزا مغل کی بیٹی لالہ رخ ہو؟ تو میں صاف کہہ دوں گی کہ نہیں میں تو ایک غریب گھوسن ہوں' کیونکہ آدمی کی ذات وہی ہے کہ جس ذات کے کام کرتا ہو۔"

لذت' آسائش اور خودداری کا ادراک رکھتے ہوئے دستبرداری اختیار کرنا' کڑی آزمائش سے گزرنا ہے۔

"یہ دنیا ناگ پھنی کا پھول ہے
جو اس کو چاہے اس کی بڑی بھول ہے
دو سانس کی زندگی پر کیوں اتراتا ہے
یاد رکھ مرنے کا وقت سامنے چلا آتا ہے
غفلت میں کیوں سوتا ہے
اور وقت کی دولت کھوتا ہے
اٹھ باندھ کمر چل منزل کو
اور دیکھ خدا کی محفل کو
روٹی کا نوالہ سالن میں ڈوب کر گل جاتا ہے
دل بھی طمع میں گر کر شل ہوجاتا ہے
آگ کا شعلہ چولہے کے اندر بجھی گاتا ہے
دیکھو خود پرست انگارہ راکھ ہوجاتا ہے۔"

زبان و بیان پر عبور ہی کلام کو فصاحت عطا کرتا ہے یہ کلام جنگ آزادی کے دوران بے کسی کا شکار ہونے والی ایک عالم زادی سیدہ ذکیہ کا ہے۔

سنسنی خیز واقعات اور ڈرامائی خاصیت لیے سیدہ ذکیہ کی کہانی اپنی مثال آپ ہے۔ ایک عالم باپ سے بطور طالبہ کے علمی نکات اور فلسفے پر بحث ہو یا لوگوں کے ضمیر جھنجوڑنے والی تقریر' اپنی تاثیر میں آج بھی لاثانی ہے۔

سیدہ کے والد ایک بلند پایہ عالم تھے جو جنگ آزادی میں جاری ریشہ دوانیوں کی بھینٹ یوں چڑھے کہ انہیں ان کے گھر میں بیوی اور بیٹی کے سامنے تلوار کے وار کر کے دو ٹکڑے کردیا گیا۔

ذرا چشم تصور کی لگام تھامیے اور اس منظر میں داخل ہوجائیے' آپ کے دل پر جو گزرے' وہ آنسوؤں کے اظہار سے بڑھ کر ہے۔

"بعد میں ان کی والدہ کو بھی قتل کر کے انہیں اغوا کرلیا گیا۔ وہاں سے بچ کر نکلیں تو ایک فقیر کی کٹیا میں پناہ ملی جو روزانہ ان کے کھانے کا سامان کرتا تھا۔

ایک روز بحالت مجبوری فقیر نے اپنی جگہ صدا لگانے کے لیے انہیں بھیجا' تو عالمانہ فصاحت سے بھرپور انہوں نے صدا لگائی۔

"یہ دنیا ناگ پھنی کا پھول ہے۔"

صدا کے سنتے ہی لوگ پروانوں کی طرح اکٹھے ہوگئے اور جھولی بھردی۔۔۔ کسی نے کہا "سامنے والے مکان میں جاؤ! محرم کی مجلس ہورہی ہے۔" وہاں انہوں نے مجتہد صاحب کو دوران تقریر روکا اور خود بے مثال تقریر کی۔

"مجتہد صاحب کو معلوم ہو کہ حسین علیہ السلام اور ان کی اولاد اب بھی کربلا کی تکلیف میں مبتلا ہے۔ سیدوں پر آج بھی یزیدی مظالم ٹوٹ رہے ہیں۔ تم لوگ کیوں جھوٹی آہیں بھرتے ہو؟ اگر تم کربلا کے وقت موجود ہوتے تو اسی طرح آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بے خبر ہوتے اور معصوم اماموں کا زمانہ پاتے' تب بھی اسی طرح خود غرض نظر آتے۔ مجتہد صاحب! توبہ کرو اور لوگوں کو پیام دو جو آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعوا کرتے ہیں اور محبان آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سرداریاں کررہے ہیں کہ قیامت کے دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم تم سے ان جھوٹے وعدوں کی نسبت جواب طلب کریں گے۔"

شہنشاہ ہندوستان' مغلیہ خاندان کے آخری تاجدار' بہادر شاہ ظفر کو تین وقت کھانا نہیں ملا۔ بیسنی روٹی اور سرکے کی چٹنی پیش کی گئی۔ بادشاہ نے روٹی کھا کر تین وقت کے بعد پانی پیا اور خدا کا شکرانہ بھیجا۔"

یہ وہ قصہ ہے' جس میں عقل مند آدمی کے لیے عبرت کا بہت بڑا ذخیرہ ہے اور جس کے سننے سے انسان اپنے غرور و تکبر کو بھول جاتا ہے اور جب دماغ سے تکبر کی بو جاتی رہتی ہے تو آدمی اصل آدمی بن جاتا ہے۔

یاد رہے کہ ہندوستان کی وسعت آج کے بھارت' پاکستان اور بنگلہ دیش کے برابر تھی۔

کچھ احوال اس میں شہزادوں کا بھی درج ہے۔ یوں تو ساری کتاب ہی زوال کی دل سوز داستان ہے' مگر کچھ قصے اس میں عبرت اور نصیحت پکڑنے کے بھی ہیں کہ کس طرح جان دار کو ایذا پہنچانے اور دل دکھانے والے کا انجام ہوا۔۔۔ مثلاً!

"ایک شہزادے نے فقیر کی نصیحت پر برا مان کر اس کا گھونسلا پھوڑ دیا۔۔۔ جبکہ وہ پرندوں کو نہ ستانے کے ضمن میں سمجھا رہا تھا' تب ہی شہزادہ آخری دنوں میں' گلیوں میں گھسٹتا پھرا اور فقیر کی بددعا پوری ہوئی۔"

"بڑھاپے کی حالت میں مزدوری کرنے والے ایک بہرے شخص کو موٹر والے نے پیٹ دیا۔ جواب میں اس نے بھی چابک مار کر سر پھاڑ دیا۔ پولیس کے پاس پہنچنے پر پتا چلا کہ وہ تیموری شہزادہ ہے اور بوڑھا ہونے

کے باوجود خون میں حرارت باقی ہے۔

"میں بہرا ہوں، میں نے موٹر کی آواز نہیں سنی، جس جگہ عدالت کی کرسی ہے اسی مقام پر غدر سے پہلے میرے حکم سے بارہا بہت سے شریروں اور سرکشوں کو سزائیں دی گئی ہیں، میں نے بے شک بدلہ لیا۔"

مقدمے کا فیصلہ بوڑھے شہزادے کے حق میں ہوا اور جب مصنف نے ان سے مل کر حالات زندگی جاننا چاہے تو کہا۔

"کیا آپ وہ حالات سن سکتے ہیں؟ اور کیا آپ کو ان جھوٹی باتوں پر یقین آسکتا ہے؟ کیونکہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ جو بات گزر جائے خواہ وہ خوشی کی ہو یا تکلیف کی، جھوٹی ہے۔ اس کا بیان کرنا جھوٹ بولنا ہے۔ آنے والا زمانہ وہم ہے۔ گزرنے والا وقت جھوٹا ہے اور موجودہ گھڑی سچی ہے۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ جو وقت سامنے ہے، اس پر یقین کروں اور ہنسی خوشی اس کو گزاروں۔ نہ گزرے وقت کی یاد دل میں آنے دوں، نہ آنے والے زمانے کی فکر ذہن میں لاؤں۔ بس جو کچھ سمجھوں، اسی وقت کو سمجھوں، جو آنکھوں کو نظر آتا ہے اور جس میں موجودہ سانس کی آمدورفت ہو۔"

ان سے وابستہ الم ناک داستان یہ ہے کہ "بھگدڑ کے دوران ان کی نابینا والدہ ہمراہ تھیں۔ جواہرات لوٹنے کی خاطر، اسی دیس کے لوگوں نے لٹھ مار کر ان کی والدہ کو ہلاک کردیا اور ان دونوں کے تن کے کپڑے تک اتار لیے۔ ان کے دماغ کی چوٹ ہی بہرے پن کی وجہ بنی۔

اپنی ماں کی برہنہ لاش کو ریت میں چھپایا اور خود درخت کی اوٹ میں چھپے رہے، تاوقتیکہ ایک مہربان سوار کا گزر ہوا۔ اس کے دیے ہوئے رومال سے ستر پوشی کی اور اس کی خدمت کے لیے ساتھ ہو رہے۔"

ان شہزادوں نے بھیک بھی مانگی، محنت مزدوری بھی کی اور گھاس بھی کھودی، غرض ہر طرح کا پیشہ اختیار کیا، حتیٰ کہ جاروب کشی تک کو حصول رزق کا ذریعہ بنایا۔ ایک خانساماں شہزادے کا ذکر بھی ہے جو کتاب کے چونکا دینے والے قصوں میں سے ایک ہے۔

"قسمت بیگ بمبئی کے تاج محل ہوٹل میں خانساماں تھے اور طبعی نزاکت اور نفاست کی بنا پر خاصے مزاج دار تھے۔ بات چیت کرنے پر راز کھلا کہ وہ تیموری شہزادے ہیں۔"

"انسان کو اپنی موجودہ حیثیت دیکھنی چاہیے۔ آج چونکہ میں ایک خانساماں ہوں، اس لیے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں، میں ان لوگوں میں نہیں ہوں جو ماضی پر فخر کریں یا افسوس کریں اور میں ان لوگوں میں سے بھی نہیں ہوں جو مستقبل کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہتے ہیں۔"

حالات کی گردشوں نے ہر ایک کو مختلف تجربہ عطا کیا۔ کوئی حسرت میں ہی مبتلا رہا اور کوئی اپنے نصیب سے مطابقت اختیار کر گیا، لیکن بہر صورت یہ تاجدار ہندوستان کا خاندان تھا، کیسا عروج، کیسا زوال۔

شہزادہ محمود کی کسمپرسی کا حال لکھتے ہوئے مصنف کے قلم نے دردمندی کی انتہا کو چھو لیا.... حقیقت حال اور شان ماضی کا تجزیہ شاید خون جگر سے لکھا گیا ہو.... کہ وہ تاثیر میں آج بھی بے مثل ہے! اس کی تعریف اور تفصیل بیان کرنے سے میں قاصر ہوں۔

الغرض، زمانے کی گردش کسی بھی وقت کسی پر بھی مسلّط ہوسکتی ہے اور انجام کا خوف ہی بے لگام ہونے سے روک سکتا ہے۔ اگر عبرت پکڑنے اور نصیحت لینے کا ارادہ ہو تو۔

اس کتاب کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ جو مملکتِ خداداد پاکستان اور اس کے ساتھ وابستہ آزادی ہمیں نصیب ہے، اس کے حصول کی خاطر دہری قربانیاں دی گئی ہیں۔ ایک انگریزی قبضے کے وقت اور ایک تقسیم کے وقت، تو ہمیں بھی اس نعمت کی قدر ہر دم کرنی چاہیے، تاکہ یہ جاودانی رہے

خواب تو خواب ہوتے ہیں! دیکھنے میں کیا ہرج ہے،
گرچہ خطرات لاحق ہیں۔

باقی رہے نام اللہ کا!

خالد جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

بینش نورین ——— سرگودھا

کوئی حرفِ وفا نہ حرفِ سادہ
میں خاموشی کو سننا چاہتی ہوں
میں بچپن کے کسی لمحے میں رُک کر
کوئی جگنو پکڑنا چاہتی ہوں

راشدہ گلناز ——— لاہور

نہ یہ غم نیا، نہ ستم نیا، کہ تیری جفا کا گلہ کریں!
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب، یہ کسک تو دل میں کبھی کی ہے

فاخرہ ریاض ——— احمد پور شرقیہ

ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش تو ہے، پر کیا کیجیے
ہر راہ جو اُدھر کو جاتی ہے مقتل سے گزر کر جاتی ہے

معینزہ طور ——— اسلام آباد

دُنیا کی فکر کیا ہے زمانے کا خوف کیا
ہم کو تو خیال تمہارا تھا اور بس
لوگوں نے اسے میری محبت سمجھ لیا فراز
وہ شخص مجھے جان سے پیارا تھا اور بس

نور العین ——— خوشاب

پلٹ کے آئیں زمانے وہی محبت کے
کہ رنگ چلنے لگیں اور صبا ٹھہر جائے
کسی کا ساتھ ملے اور اس طرح امجد
کہ وقت چلتا رہے، رستہ ٹھہر جائے

صائمہ مسکان ——— بہاول پور

منیر اسی کو محبت کہا ہے لوگوں نے
کہ خون بن کے رگوں میں اُتر گیا کوئی

رضیہ خان ——— فیصل آباد

اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر!
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں، ہم نہیں ہوں گے

سدرہ چوہدری، مان ——— عبدالحکیم

یہ میری تلاش کا جرم ہے یہ میری وفا کا قصور ہے
جو دل کے جتنا قریب ہے وہ نظر سے اتنا ہی دور ہے

نادیہ اسلم ——— فورٹ عباس

یہ کس مقام پہ سوجھی ہو تنہائی
کہ اب تو ترکِ محبت کا حوصلہ ہی نہیں

نمرہ، اقرا ——— کراچی

اُڑتا ہوا غبار سرِ راہ دیکھ کر
انجام ہم نے عشق کا سوچا تو رو دیے

شگفتہ بشیر ——— نامعلوم شہر

یہ اور بات ہے کہ وفا تجھ سے نہ ہو سکی
تُو نے کیے تھے جو وہ وعدے غضب کے تھے

حجاب زہرہ ——— ملتان

کانٹے میری انا کے مجھے روکتے رہے
میں بن کے گلی سے تماشا گزر گیا
وہ کون شخص تھا جو حقارت کی آنکھ سے
دریا کو دیکھتا ہوا پیاسا گزر گیا

عقیلہ حنا ——— رینالہ خورد

خزاؤں میں ہوتا ہے امتحاں، وفاؤں کا فراز
جو شجر کو ہوں پیارے وہ پتے نہیں گرتے

سمیرا ذکریا ——— فیصل آباد

جستجو میں تیری پھرتا ہوں نجانے کب سے
آبلہ پا ہیں میرے ساتھ زمانے کب سے
نعمتیں ہیں نہ عذابوں کا تسلسل اب تو
مجھ سے رُخ پھیر لیا ہے خدا نے کب سے

انیقہ انا ——— چکوال

شوق میں اس کے مزہ، درد میں اس کے لذت
ناصحو! اس سے نہیں کوئی مفر کی صورت
رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت

مان جٹ ——— عبدالحکیم

جن کی صداقتوں پہ کوئی شک نہ کر سکے
تم بھی کتابِ دل کی انہی آیتوں میں ہو

نورین بٹ ———— ہری پور

عشق نشہ ہے نہ چادر جو اُتر بھی جائے
نہ تو اک سیلِ بلا ہے سو گزر بھی جائے
اب کے جس دشتِ تمنا میں قدم رکھا ہے
دل تو کیا چیز ہے امکاں ہے کہ سر بھی جائے

نعم رشید ———— ڈسکہ

میں دھوکا ہوں تُو دھوکا ہے
ترک و طلب ہر دو دھوکا ہے
تیری ہر مُسکان فریبی
میرا ہر آنسو دھوکا ہے

نورالعین ———— گھارو

خود سے روٹھوں تو کئی روز نہ خود سے بولوں
پھر کسی درد کی دیوار سے لگ کر رو لوں
تُو سمندر ہے تو پھر اپنی سخاوت بھی دکھا
کیا ضروری ہے کہ میں پیاس کا دامن کھولوں

صدف امتیاز ———— کہروڑ پکا

وہ جو آجاتے تھے آنکھوں کے ستارے لے کر
جانے کس دیس گئے خواب ہمارے لے کر
چھاؤں میں بیٹھنے والے ہی تو سب سے پہلے
پیڑ گرتا ہے تو آجاتے ہیں آرے لے کر

رقیہ ارشد ———— وزیر آباد

کل اُڑ رہے تھے ستارے ہوا کے ساتھ
اور میں اُداس بیٹھا تھا اپنے خدا کے ساتھ
یا تو قبولیت کا طریقہ سکھا مجھے
یا میرے دل کو باندھ دے اپنی رضا کے ساتھ

شبنم صدرالدین ———— صفدر آباد

بدلہ وفا کا دیں گے بڑی سادگی سے ہم
تم ہم سے روٹھ جاؤ گے اور زندگی سے ہم

ندا تاشیہ کشیر ازی ———— جڑانوالہ

جُرم آدم نے کیا اور نسلِ آدم کو سزا
کاٹتا ہوں زندگی بھر میں جو بویا نہیں
جانتا ہوں ایک ایسے شخص کو میں بھی منیر
غم سے پتھر ہو گیا لیکن کبھی رویا نہیں

طیبہ کریم بخش ———— مدین

جنہوں نے مجھ سے کہا تھا کسی سے دل نہ لگا
اُجڑ کر سوچ رہا ہوں وہ لوگ سچے تھے

سائرہ ناصر ———— کراچی

ہوتا نہیں ہے ختم قتیل آس کا سفر
پاؤں کٹے ہوئے ہیں مگر چل رہے ہیں لوگ

کنول شاہین قیصر ———— تلہ گنگ

تحفہ میری انا کا یہ اچھا دیا گیا
مجھ کو ہی میری ذات میں اُلجھا دیا گیا
نامعتبر رہے ہیں جو الفاظ دیر تک
پیغامِ آشنائی ان ہی میں دیا گیا

فاطمہ علی ———— ڈیفنس کراچی

اپنے دُشمن سے میں بے وجہ خفا تھا محسن
میرے قاتل تو میرے اپنے حواری نکلے

آمنہ اُجالا ———— ڈہرکی

یہ اِخلاص، خلوص، مہر و وفا سب جھوٹی سچی باتیں ہیں
ہر شخص خودی کی مستی میں بس اپنی خاطر جیتا ہے

مہوش ڈوگر ———— گوجرانوالہ

میں انتہائے عشق ہوں تو انتہائے حسن
دیکھے مجھے کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی
اَڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم
طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی

صائمہ عمران ———— لاہور

وہی محسوس کرتے ہیں خلش دردِ محبت کی
جو اپنے آپ سے بڑھ کر کسی سے پیار کرتے ہیں

فاطمہ طاہر ———— لاہور

پڑھنا ہے تو انسان کو پڑھنے کا ہنر سیکھ
ہر چہرے پہ لکھا ہے کتابوں سے زیادہ

منہر ———— ایبٹ آباد

میں قیمتی ہوں مگر وہ گماں نہیں رکھتا
جہاں پہ رکھنا ہو مجھ کو وہاں نہیں رکھتا

فاطمہ ———— کراچی

ہر روز سفر کرتی ہوں میں دیکھ کے اس کو
وہ شام کا تارہ مجھے بھٹکائے بہت ہے

سحرش ———— پشاور

بسا اوقات یوں ہوتا ہے جیسے ہم نہیں ہوتے
سبھی ہوتے ہیں پر اپنی کمی محسوس ہوتی ہے

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع۔ 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں۔
آپ کی عافیت، سلامتی اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔

کسووال سے یہ خط فوزیہ صادق نے لکھا ہے، کہتی ہیں
ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ "شعاع" کے ایک نظر جائزے کے بعد سب سے پہلے اپنے پسندیدہ سلسلے وار ناولز پڑھے۔ "میری صبح کا ستارہ" کہانی نے اک نیا موڑ لیا۔ اچھا لگا اور یقیناً "میرب کے ساتھ بہت برا ہونے والا ہے۔
"دیوار شب" عالیہ بخاری بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ شکر ہے معاذ اور جویا کو روبرو تو کیا، ورنہ بہت لمبی جدائی ہو گئی تھی دونوں کے درمیان۔ اور خیام کو بھی آخر یوسف کمال کی صورت میں اپنی شناخت ملنے والی ہے۔
"ستارہ شام" جنت کے بارے میں تہہ در تہہ چھپے راز سامنے آرہے ہیں اور سارے رشتے منظر عام پر آنے لگے ہیں۔
ناولٹ "درد گر آدمی" نے بہت رُلایا۔ ہمارے معاشرے میں سچ بولنے والوں کا شاید ایسا ہی انجام ہوتا ہے۔
مریم عزیز کی "صحرا میں خوشبو" حقیقت سے بہت دور فلمی کہانی لگی۔
فائزہ افتخار کا "مان جاؤ" پڑھتے ہوئے نان اسٹاپ ہنسی جاری رہی، ایسے ناول ضرور شامل ہونے چاہئیں، ضروری نہیں کہ ہر بار کوئی سنجیدہ ٹاپک ہی ہو۔ دادا اور دادی کے کردار بہت دلچسپ لگے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار رہے گا۔ دیکھتے ہیں سرفراز انکل اور ان کے بچے کیا گل کھلاتے ہیں۔
شہناز صدیق کے ناول "رہ نورد شوق" میں آئمہ کا طلسماتی حسن خواب ہی لگا۔ ناول کی کہانی بھی بہت حد تک فلمی تھی۔ افسانے اس بار بہت اچھے تھے، خاص طور پر فرحانہ ناز ملک کا "یہ رشتے" بہت اچھا تھا۔ آج کل کی نسل کے لیے سبق آموز کہانی تھی۔
سمیرا گل کا "آخری راستہ" بھی بہت اچھا لگا۔ باقی سلسلے بھی پورے "شعاع" کی طرح بہت اچھے تھے۔
ج : پیاری فوزیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے مشکور ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اپنے تبصرے کے ساتھ تشریف لاتی رہیں گی۔

حنا کاشف خان نے یہ خط ہمیں بستی بوہڑ ملتان سے لکھا ہے

میں شعاع کی کتنی پرانی قاری ہوں، اور یہ میرا شعاع میں نہ چھپنے والا کون سا خط ہے مجھے خود یاد نہیں، مگر ہمت نہ ہارتے ہوئے دوبارہ قلم سنبھال لیا ہے۔ اکتوبر کا شمارہ ہاتھ میں ہے۔ تھوڑی ریز روڈ سی ہیروئن کو سراہتے ہوئے رسالہ کھولا اور سیدھا "ستارہ شام" کی طرف بڑھے۔ ویلڈن آمنہ جی! کہانی کی گتھیاں اب صحیح طریقے سے کھل رہی ہیں۔ "جنت" کے بارے میں یقین نہیں آرہا کہ کوئی عورت اتنی ظالم ہو سکتی ہے۔ پلیز آپی! انیبا کو فیضان مل جائے اور ثمینہ ماوی سے کیا چاہتی ہیں، شاید آگے جا کر واضح ہو جائے۔ لبنیٰ طاہر کا "ملکیت" ہمارے معاشرے کی زندہ حقیقت، کاش سب ماؤں کی آنکھیں کھل جائیں اور

...ماں سے ساس تک کا سفر ختم کردیں۔ فائزہ افتخار بالکل نئے انداز میں آئیں، مکمل تبصرہ پوری کہانی کے بعد۔ مریم جی! آپ کا تو نام ہی رسالے کی جان ہے۔ مگر اس دفعہ نہ جانے کیوں آپ کی کہانی فلمی لگی اور اب اس دفعہ کے رسالے کی جان مکمل ناول "رہ نورد شوق" شہناز صدیق نے واقعی ــــ شروع سے آخر تک کہانی پر گرفت رکھی اور پورے ناول نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ اور اگر "دیوار شب" کے بارے میں کچھ نہ لکھا تو میرے خیال میں مجھ سا بدذوق کوئی نہ ہوگا، مگر ایک درخواست ہے۔ پلیز جویا اور معاذ کو اور سزا نہ دیں۔ ان کو ملوا دیں اور گیتی اس دفعہ کہیں نہیں تھی، ڈھونڈ کر لائیں اسے۔ باقی کامران جیلانی سے ملاقات اچھی رہی اور ان کی گیلو سی مسز بھی پسند آئیں۔

ج : حنا بہن! صفحات کی کمی کے باعث بہت سے خطوط شائع نہیں ہو پائے، مگر ہم اس بات کا آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ تمام خطوط ہم پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے ہمت نہ ہاری۔ اب تو آپ خوش ہیں نا، امید کرتے ہے کہ آئندہ بھی آپ اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کرتی رہیں گی۔

آصفہ صداقت، چشتیاں سے ہمیں لکھتی ہیں

سرورق پر نظر پڑتے ہی بے اختیار منہ سے "ہک ہا" نکلا۔ مہنگائی کے جن نے بے چاری ماڈلز کو بھی نہیں چھوڑا۔ ماتھے پر ٹیکہ سجانے کے بجائے کان کا بندا ہی لگا لیا اور اس اسٹائل سے دوپٹہ اوڑھا کہ پتا ہی نہ چلے۔ لیکن جناب ہم بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ دوسرے سلسلوں کو پھلانگتے ہوئے "ستارۂ شام" پر آ ٹھہرے۔ کہانی کے سارے کردار کھل کر سامنے آچکے ہیں۔ کون کس کا کیا لگتا ہے، شکر ہے یہ اسرار تو ختم ہوئے۔ لیکن لگتا ہے کہ ثمینہ کے انکشافات کے بعد ماوی تو اب 007 بن جائے گی، خیر آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ باقی سلسلے وار ناول "دیوار شب" اور "صبح کا ستارہ" خراماں خراماں اپنی منزل کی طرف گامزن ہیں۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ ہر افسانہ اپنے موضوع کے اعتبار سے انگوٹھی میں جڑے نگینے کی طرح فٹ۔ مگر سمیرا یونس کا "درد گر" سب پر بازی لے گیا اور اس کے ایک مکالمے میں تو پوری جان تھی۔

"بعض اوقات جب ہم اپنے کسی بہت ہی پیارے کو کسی بڑے غم سے آشنا نہیں کروانا چاہتے تو ہم اسے چھوٹا غم دے کر بڑے غم سے بچا لیتے ہیں۔"

ویل ڈن سمیرا۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ اب بات ذرا مریم جی کے ناولٹ "صحرا کی خوشبو" کی کہانی کا پلاٹ تو عمدہ تھا۔ منظر نگاری بہترین تھی، مگر مکالمے بعض دفعہ کسی انڈین مووی جیسے لگے۔ خاص طور پر عمر کی ماں شمع کے، لیکن کہانی زبردست تھی۔

ناول "رہ نورد شوق" موضوع کے اعتبار سے ہلکی پھلکی اور رومانٹک تھی، لگتا ہے بڑی کول شخصیت ہے شہناز صاحبہ کی۔ پوری کہانی میں رومانس ہی رومانس بھرا تھا۔ آئمہ کو اتنا حسین بنا دیا کہ مارے رشک کے کہنا پڑا کہ کاش ہم بھی آئمہ جتنے حسین ہوتے۔ خیر دفع کرو جی مٹی پاؤ۔ اتنا حسن بھی کیا کرنا کہ جو دیکھے پیچھے ہی پڑ جائے۔ اور جہاں تک بات ہے کہانی کے سیکنڈ ہیرو یار زئی۔ کاش اس جیسی رومانٹک حس ہمارے شوہر نامدار میں بھی ہوتی۔ شہناز صاحبہ نے اتنے پھول بچھائے کہ ہم تخیل کے گھوڑے دوڑانے پر مجبور ہو گئے۔ اس ناول کا سبق آموز کریکٹر اریزا تھی، جس نے دل کی خواہشات کو مقدم جانتے ہوئے بڑوں کی نافرمانی کی اور چار چوٹ کی مار کھائی۔ اب بات کرتے ہیں شعاع کی گل گلزار، دل کا قرار، روح بہار کہانی یعنی فائزہ افتخار کے ناول "مان جاؤ" کی۔ واہ فائزہ جی واہ میدان مار لیا۔ آ گئے تے چھا گئے والی بات ہو گئی، کیا کہانی لکھی ہے، کیا موضوع ہے، کیا منظر نگاری اور مکالمہ نگاری۔ واہ واہ اور پھر واہ واہ۔ کردار بھی بے مثال، سیلنگ فین تو ہم آپ کے تھے ہی اب تو پیڈسٹل فین، روم کولر اور اے سی تک ہو گئے۔ اس ناول کے چکر میں سارا دن واشنگ مشین، واشنگ مشین کھیلتے رہے۔ دراصل ہوا کچھ یوں کہ کہانی شروع کرنے سے پہلے ہم نے واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔ بجلی والا سارا ٹائم تو اس ناول میں کھپ گیا۔ بھئی ناول شروع کرنے کے بعد بھول گئے کہ کوئی اور کام بھی دیدہ دل فرش راہ کیے بیٹھا ہے۔ لائٹ بھی چلی گئی، تب بھی پتا نہیں چلا ہوش تو اس وقت آیا جب ناول ایک بار بھی نہیں دوبار پڑھ کر ختم کیا۔ لیکن اس کا سحر ایسا طاری تھا کہ بجلی والوں پر بھی غصہ نہیں آیا۔ اگرچہ ــ کپڑوں والا کام شام کو جا کر پورا ہوا۔ اور تو اور ناول کے اینڈ پر باقی آئندہ پڑھ کر بھی مزہ کرکرا نہیں ہوا۔ میرا خیال ہے اس سے زیادہ اس ناول کی

تعریف ممکن نہیں۔

ج : آصفہ بہن! شعاع کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔

عمارہ اپنی ای میل کے ساتھ اوکاڑہ سے شریک محفل ہیں، لکھتی ہیں۔

میرے ای میل کرنے کی وجہ فائزہ افتخار کا ناول "مان جاؤ" ہے۔ اس ناول نے جہاں مجھے بے تحاشا ہنسنے پر مجبور کیا وہاں میں ان کی پہلے سے بھی زیادہ فین ہو گئی۔ ویل ڈن فائزہ! یقیناً" کہانی آگے اور زیادہ دلچسپ ہو جائے گی۔ آمنہ ریاض نے اس بار ماوی کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی شدید جھٹکوں سے نوازا۔ یعنی ایک ہی قسط میں اتنے انکشافات۔ بہرحال کہانی اور دلچسپ ہو گئی ہے۔ "دیوار شب" میرا فیورٹ ناول ہے۔ مجھے زویا اور جویا پہ بہت پیار آتا ہے۔ عالیہ جی! جویا کی تکلیفیں اب ختم کردیں۔ بہت ہو گئی بے چاری کے ساتھ۔ شہناز صدیق کا ناول شروع تو بہت خوبصورت اور رومانٹک انداز میں ہوا مگر بعد میں ڈاکٹر عائش کی اچانک انٹری اور اتنی محبت.... اور خیر پھر بھی اچھا تھا۔ افسانے سارے اچھے تھے۔ ناولٹ میں مریم عزیز کے "صحرا میں خوشبو" اور "درد گر آدمی" سمیرا یونس نے تو صحیح معنوں میں رلا دیا۔ مستقل سلسلے سب ہی بہت زبردست تھے۔ مجموعی طور پر شعاع بہترین تھا۔

ج : عمارہ بہن! شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔ امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اپنے تبصرے کے ساتھ شرکت کرتی رہیں گی۔

انعم اور امبر، فیصل آباد سے شریک بزم ہیں، لکھتی ہیں

ماڈل بہت زبردست تھی، خاص کر آنکھوں کا میک اپ، نیل پالش ایئر رنگ، ٹیکا، لباس اور سب سے بڑھ کر اس کی پیاری سے دھیمی سی مسکراہٹ۔ حمد، نعت، پہلی شعاع اور شاعری کا انتخاب بہت پسند آیا۔ بند ھن میں فاطمہ، کامران جیلانی کی باتیں بہت اچھی لگیں۔ پلیز آمنہ جی! "ستارہ شام" کے صفحات بڑھا دیں۔ عالیہ جی! کہانی بوریت کا شکار ہو رہی ہے پلیز اسے اب ختم کردیں۔ زبردست اینڈ کے ساتھ۔ مریم جی واقعی آپ تو صحرا میں خوشبو بکھیر گئی ہیں۔ مان جاؤ فائزہ جی ویلکم! شکریہ، ہمارے لیے قسط وار تحریر لکھنے کا، پلیز اب کہیں غائب مت ہو لیے گا۔ (درخواست) سمیرا یونس! آپ کو حیدر کو مارنا نہیں چاہیے تھا۔ اب عشناء کیسے بچے گی۔ "صبح کا ستارہ" میں اچھا کیا جو احمد سے ماہی کی شادی کروادی۔ اس بار حرا قریشی کے "دل کا معاملہ" مجھے کچھ زیادہ متاثر نہیں کر سکا۔ باقی سب سلسلے زبردست ہیں۔ میں "شاعری سچ بولتی" میں اپنا انتخاب بھیج چکی ہوں کیا یہ چھپے گا؟

ج : انعم اور امبر! آپ کا انتخاب قابل اشاعت ہوا تو ضرور شائع ہوگا۔ مگر باری آنے پر، متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے۔

سونیا ربانی، قاضیاں محلہ بالا سے لکھتی ہیں

شعاع کے ٹائٹل پہ نظر پڑی تو پہلی نظر میں ہی اچھا لگا۔ وجہ بھئی ماڈل نے کالے رنگ کے اتنے خوب صورت کپڑے جو پہن رکھے تھے۔ انٹرویوبس ایسے ہی تھے۔ میں نے آصف رضا میر کے انٹرویو کا کب سے کہہ رکھا ہے۔ کچھ تو خیال کریں۔ ناول دونوں اچھے جا رہے ہیں۔ شکر ہے کہ عالیہ جی کو کچھ تو رحم آیا۔ جویا کے حال پہ۔ اور آمنہ ریاض نے بھی اب گاڑی کو پکی سڑک پہ ڈالا ہے۔ ثمینہ کے انکشافات کے بعد ماوی مان جائے گی۔ آگے پھر جانے ثمینہ کیا کرنے والی ہیں۔ عالیہ کے بعد اب آمنہ کی کہانی کا بھی انتظار رہتا ہے۔ مکمل ناول میں فائزہ کا نام دیکھ کے دل خوش ہو گیا اور آخر میں باقی آئندہ دیکھ کر دل بڑا خراب ہوا۔ اب انتظار ہے کہ دادی کب بتاتی ہیں کہ وہ پرانی لڑائی ہوئی کس بات پہ تھی۔ سب کردار بہت الگ سے لگے، مسکرانے پہ مجبور کرنے والے۔ شہناز صدیق کو ابھی پڑھا نہیں ہے۔ ناولٹ "صبح کا ستارہ" تو ختم ہونے کے قریب ہے اور احمد کا خود کو پیش کرنا بھی اچھا تھا۔ امید ہے کہ کہانی اچھے طریقے سے ختم ہوگی۔ "صحرا میں خوشبو" آدھا پڑھا ہے۔

افسانے سب ہی اچھے تھے۔ "ملکیت" سچ مچ ایسا ہی ہوتا ہے کہ کچھ مرد بھی ایسے ہی سوچتے ہیں کہ کل ہماری ماں بھی مار کھاتی تھی ______ تو پھر ہماری بیوی بھی کھائے۔ مگر شکر ہے کہ ابھی بھی کچھ مرد شازلی کی طرح سوچتے ہیں۔ اس کے دو لفظوں نے اس کی ماں کا دل صاف کر دیا۔ اچھا افسانہ تھا۔ "آخری راستہ" بھی ایک اچھی تحریر تھی۔ "خوشی کا موسم" اچھی کہانی تھی۔ "یہ رشتے" بھی ایک باکمال تحریر تھی۔ اللہ کے بنائے ہوئے

رشتے ہی سب کچھ ہوتے ہیں اور ان کے لیے تو اولاد کو ہر قربانی دے دینی چاہیے۔ تاکہ کوئی ایسا کام کرے کہ ان کو شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے۔ اور باقی مستقل سلسلے لاجواب تھے ہمیشہ کی طرح۔

ج: پیاری سونیا! اللہ تعالیٰ آپ کو صحت کاملہ عطا فرمائے اور ان تمام لوگوں کو بھی جو اس بخار کا شکار ہوئے ہیں۔ آپ کی فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے۔ تھوڑا انتظار کرلیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ام طیفور گوجرانوالہ سے شکوہ کناں ہیں

میں نے آپ کو اپنا ایک افسانہ "سزا" بھجوایا تھا اور اس کی بابت پوچھنے کے لیے دوبار خط لکھ چکی ہوں۔ مگر آپ نے میرے کسی خط کو قابل اشاعت تو کیا قابل توجہ بھی نہیں جانا۔ جس کا مجھے دلی دکھ ہے۔

ج: پیاری ام طیفور! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خطوط شائع نہ ہوسکے ۔ ہماری تمام مصنفین اور قارئین ہمارے لیے بے حد قابل احترام ہیں۔ ہم کسی کی دل آزاری کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ آپ کو جو تکلیف پہنچی ہے اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ افسانے کے لیے 021-32721666 پر رابطہ کرکے بھی پوچھا جاسکتا ہے۔

شہلا رجانہ، تحصیل و ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ سے شریک محفل ہیں

شعاع بہت بہت زبردست تھا۔ کہانیاں اس قدر اچھی لگیں کہ مجھے لگا یہ شمارہ "مقابلہ نمبر" ہے۔ رائٹرز نے ایک سے بڑھ کے ایک اسٹوری لکھی ہے۔ ویری ویل ڈن جناب! اب مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ میں "شہناز صدیق صاحبہ" کی تعریف کروں یا کہ "مریم عزیز یا سمیرا یونس" کی سب نے کیا کمال کیا ہے۔ حیدر کا کردار مدتوں یاد رہے گا۔ بے لوث محبت اور بولڈ انداز کی وجہ سے پلیز عالیہ جی! جویا اور معاذ کا ذکر ہر بار کیا کریں۔ اب ان کو ملوانے کی کوشش کریں۔ "ستارہ شام" نے جو نیا ٹرن لیا ہے بہت دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ حیران کن بھی لگا۔ اس دفعہ تو ہماری ڈرامہ رائٹر نے ہمیں کچھ ٹائم دے دیا بڑی بات ہے جی۔ فائزہ جی کا وہ ہی انداز بے حد گہرائی تک کردار کا جائزہ اور اسے لکھنا بہت اچھا لگا۔ مجھے لگتا ہے یہ اسٹوری بھی ٹاپ پر پہنچے گی۔ آنٹی میں نے پوچھنا تھا کہ آپ کے پرچوں میں کسی نو آموز شاعر کی شاعری بھی شائع ہوسکتی ہے؟

ج: پیاری شہلا! ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی غزل قابل اشاعت نہیں ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔ امید ہے کہ آئندہ بھی اپنی رائے سے ہمیں آگاہ کرتی رہیں گی۔

ساہیوال سے یہ ای میل ہمیں رابعہ نے کی ہے، لکھتی ہیں۔

اکتوبر کا ٹائٹل اچھا تھا۔ مجھے ماڈل کی جیولری بہت پسند آئی۔

اس بار ناولٹ بہت اچھے تھے۔ "درد گر" سمیرا یونس کا مجھے بہت پسند آیا۔ آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ افسانے یوں تو سارے اچھے تھے لیکن مجھے فرحانہ ناز ملک کے "رشتے" نے بہت متاثر کیا۔ ناول میں شہناز صدیق کی تحریر مجھے فلم زدہ سی لگی لیکن آئمہ کی بارڈ کے ساتھ ساری رات چھت پہ گزارنا اور گھر والوں کو پتا نہ چلنا۔ مجھے کچھ ہضم نہ ہوا۔ فائزہ جی کا ناول بہت اچھا تھا۔ مگر اس میں انہوں نے جو بدبو کے پھیلنے کو وضاحت سے لکھا ہے مجھے پڑھ کر ابکائی آگئی۔

ج: رابعہ! ہمیں ای میل کرنے کا شکریہ۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

سیرت امین، میاں چنوں سے لکھتی ہیں

عرصہ 10 سال سے شعاع پڑھ رہی ہوں، لیکن میرا یہ پہلا خط ہے۔ سمیرا یونس کا "درد گر آدمی ہوتا" اس ماہ کی بیسٹ تحریر تھی۔ واہ سمیرا جی! کمال کردیا۔ مریم عزیز کا "صحرا میں خوشبو" کچھ زیادہ ہی ڈرامائی تھا۔ پھر بھی اچھا لگا۔ افسانے سب ہی اچھے لگے لیکن "خوشی کا موسم" سب افسانوں میں بازی لے گیا۔ ناول میں فائزہ افتخار جی نے ہمیشہ کی طرح کمال کردیا۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ شہناز صدیق کا ناول "رہ نورد شوق" بس ٹھیک تھا۔ وہ ہی روایتی اختتام، دل کو نہیں چھوپایا۔ "دیوار شب" کی اسپیڈ بڑھادیں پلیز۔ "ستارہ شام" میں وہ ہی ہورہا ہے جو میں نے سوچا تھا۔ ماوی اور جلال کی شادی.... خیر ٹھیک ہے پھر بھی میری "صبح کا ستارہ" کافی دلچسپ ہوگیا ہے۔ باقی تمام سلسلے بہت خوب تھے اور ہاں کنیز نبوی کو بیٹی کی پیدائش پہ دل کی گہرائیوں سے مبارک باد، باقی ٹائٹل ٹھیک تھا۔

ج: پیاری سیرت! آپ نے ہمیں اتنی دیر سے خط کیوں لکھا؟ قارئین بہنوں کی تعریف و تنقید ہمارے لیے بہت قیمتی ہے۔ امید کرتے ہیں کہ آئندہ آپ باقاعدگی سے ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

رینالہ خورد سے سمیرا حیات نے ہمیں یہ خط بھیجا ہے، لکھتی ہیں

ٹائٹل بس ٹھیک ہی تھا۔ جیولری کا سوٹ کے ساتھ میچ کچھ خاص نہ تھا۔ پہلی بار "باقی آئندہ" پڑھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ جی ہاں! میں بات کررہی ہوں فائزہ افتخار کے "مان جاؤ" کی۔ بہت اداس کرنے والے موسم اور تکلیف دہ حالات میں بے ساختہ چہروں پر مسکراہٹ لانے اور دل کو خوش کردینے والی تحریر ہے۔ "رہ نورد شوق" شہناز صدیق کی اچھی کاوش ہے۔ اس ناول میں نام کافی منفرد استعمال کیے گئے ہیں۔ اب آتے ہیں "دیوار شب" کی طرف تو مجھے معاذ کا جذباتی ہونا بہت اچھا لگا۔ بس گزارش ہے کہ جویا کے حال پر بھی رحم فرمائیں۔

"ستارہ شام" بھی ٹھیک جارہا ہے۔ "صبح کا ستارہ" میں کاشف کو خوب سزا دیجیے گا۔ ناولٹ میں اس بار سمیرا یونس کا ناولٹ دل کو چھو گیا۔ افسانے بھی سارے زبردست تھے۔ تمام نئی رائٹرز بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ تمام پرانی رائٹرز سے التجا ہے کہ جہاں بھی رہیں شاد و آباد رہیں مگر پلیز قارئین کو یاد رکھیں۔ مستقل سلسلے بھی ہمیشہ کی طرح شان دار تھے۔

ج: پیاری سمیرا! امید ہے کہ آئندہ آپ تفصیلی تبصرے کے ساتھ شرکت کریں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے مشکور ہیں۔

مغیرہ سلیم، کراچی سے اپنی ای میل کے ساتھ تشریف لائی ہیں۔

اکتوبر کا سرورق بہترین تھا۔ حمد و نعت اور احادیث ہمیشہ کی طرح خوبصورت۔ کنیز نبوی کا یا ارحم الراحمین بہت پر اثر تھا، اللہ تعالیٰ ہمارے ہم وطنوں کی مشکلیں آسان فرمائے۔ آمین۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" ہر بار بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ افسانوں میں لبنیٰ طاہر، سمیرا گل، حمیرا قریشی کے افسانے اچھے تھے۔ مگر ملکیت بہترین تھا۔ فائزہ جی کا ناول پہ ابھی رائے محفوظ ہے۔ شہناز صدیق کا ناول مجھے پسند نہیں آیا۔ عالیہ کا ناول "دیوار شب" میں جویا اور معاذ کے بارے میں پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ لیکن زری پہ پہلے جتنا ترس آتا تھا اب اتنا ہی غصہ آتا ہے۔ بدتمیز کہیں کی۔ مستقل سلسلے سارے ہی اچھے تھے۔

ج: مغیرہ! ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرنے کا شکریہ۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

ثمینہ کوثر! 61 ریب فیصل آباد سے شریک محفل ہیں

اس ماہ کا شعاع جلد ہی مل گیا تھا اور جلد ہی پڑھ بھی لیا، کیونکہ ویلے جو ٹھہرے۔ سب سے پہلے ٹائٹل غور سے دیکھا بس ایویں سا لگا، بلکہ ہمیں تو ٹائٹل گرل کی بھنویں بھی ایسے لگیں جیسے بناوٹ میں خرابی تھی، شاید ہمیں ہی لگا ہو۔ (معذرت کے ساتھ) باقی سب ٹھیک تھا۔ خاص طور پر جو پھول تھا وائٹ سا بہت پیارا لگا۔ پوری دنیا میں ہمیں پھول ہی اچھے لگتے ہیں۔ اس کے بعد "ستارہ شام" پڑھا۔ آمنہ جی! آپ نے تو کمال کردیا۔ ایسے ایسے انکشافات ہم تو حیران ہی رہ گئے۔ پہلے تو سمجھ میں ہی نہ آیا، لیکن جب پہلے کچھ پڑا تو واہ واہ ہوگئی۔ پھر "دیوار شب" پڑھا اچھا لگا، لیکن تھوڑا ماٹھا جارہا ہے۔ "میری صبح کا ستارہ" اتنی جلدی کاشف کے بھاگ جانے کا یقین نہیں تھا۔ "رہ نورد شوق" شہناز صدیق نے بہت اچھا لکھا، لیکن انہوں نے ایک جگہ لکھا کہ "تمہیں اللہ نے بہت فرصت سے بنایا ہے آئمہ"

اس فقرے پر آکے میں ٹھہر گئی، کیونکہ آگے پڑھا ہی نہ گیا، کیا وہ یہ نہیں جانتیں کہ وہ مالک رب العزت "کن" فرمادے تو دنیا وجود میں آجائے۔ وہ ایک انسان فرصت سے بنائے گا؟ بہت افسوس کی بات ہے۔ میری پیاری مصنفین مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ بے شک آپ بہت محنت سے لکھتی ہیں آپ اپنا قیمتی وقت ضائع کرکے ہمارے لیے ٹائم نکالتی ہیں، ہمیں خوشی ہے، لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ ہمارے منہ سے نکلے چھوٹے چھوٹے ایسے کلمات رب سوہنے کی ناراضی کا باعث ہی نہ بن جائیں، امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گی۔

افسانے بھی سارے مزے کے تھے، نصیحتیں کرتے ہوئے اور کچھ رلانے اور ہنسانے والے، ناولٹ میں سب سے نمبرون "دردگر آدمی ہوتا" رہا، حیدر بن مغیث جیسی شخصیات مجھے بہت پسند ہیں، کچھ ماہ پہلے بھی ایک ناولٹ تھا۔ "ہم ہیں آوارہ" فارحہ ارشد نے لکھا تھا اس کا ہیرو عکرمہ رسول مجھے بہت پسند آیا تھا۔ غزلیں سب ہی اچھی تھیں، باقی سارا رسالا بہت اچھا تھا۔ کنیز نبوی کو ہماری طرف سے بہت بہت مبارک باد اور شفانبوی کو بہت سا پیار، اللہ انہیں صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔ میں نے آپ کو ایک چھوٹی سی کہانی بھجوائی تھی۔ (قصور وار کون) آپ مجھے بتادیں کہ وہ کیسی تھی؟

ج: پیاری ثمینہ! آپ نے غلطی کی نشان دہی کی آپ کا بے حد شکریہ، ہم خیال رکھیں گے کہ آئندہ ایسی غلطی نہ ہو۔ سلسلوں میں شرکت کے لیے اسی طرح لکھ سکتی ہیں جیسے آپ نے خط لکھا ہے۔ آپ کا افسانہ قصوروار کون۔ ابھی پڑھا نہیں گیا، تھوڑا انتظار کرلیں۔

کے ٹی ایس ہری پور سے اقراء ملک اپنی ای میل میں لکھتی ہیں

اکتوبر کا ٹائٹل تو نہیں البتہ پرچا بہت پسند آیا۔ سب سے پہلے اپنی پسندیدہ کہانی "ستارہ شام" پڑھی۔ جو مزید دلچسپ ہوگئی ہے۔ مکمل ناول میں فائزہ افتخار کا "مان جاؤ" کی اگلی قسط کا تو اب شدت سے انتظار ہے۔ رائٹرز کو ایسی ہلکی پھلکی کہانیاں لکھنے پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ شہناز صدیق کا ناول بہت پسند آیا۔ سائرہ عارف کا ناولٹ کافی سلو جارہا ہے۔ مریم عزیز اور سمیرا یونس کی کہانیاں بھی اچھی لگیں۔ افسانوں میں فرحانہ ناز ملک کا "یہ رشتے" بہترین تھا۔ اور لبنیٰ طاہر کے "ملکیت" کی تو کیا بات تھی۔

ج: پیاری اقراء! آپ کی ای میل شامل کی جارہی ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔ امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں گی۔

سیما انصار نے مظفر گڑھ سے ہمیں لکھا ہے

یہ شعاع میں میرا پہلا خط ہے۔ سب سے پہلے کنیز نبوی کو اپنے قدموں تلے جنت کی بہت مبارک باد قبول ہو۔ اللہ تعالیٰ شفا نبوی کو دینی اور دنیاوی دونوں نعمتوں سے نوازے۔ (آمین)

سرورق بہت اچھا لگا، اس کے بعد حمد اور نعت اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں سے دل و دماغ کو معطر کیا اور کنیز نبوی صاحبہ کی تحریر تو روح میں اتر گئی۔ عالیہ بخاری اور آمنہ ریاض کا انداز تحریر لاجواب ہے، لیکن "دیوار شب" بہت آہستہ چل رہا ہے۔ فائزہ افتخار کے "مان جاؤ" نے تو ہنسا ہنسا کر پیٹ میں درد کردیا۔ ویل ڈن فائزہ جی! اتنے ٹینشن زدہ دور میں اتنی اچھی ہلکی پھلکی تحریر پڑھنے کو ملی تو لگا جیسے سوکھے دھانوں پر پانی پڑ گیا ہو، اتنی اچھی تحریر کے لیے مبارک باد قبول ہو۔ شہناز صدیق کا ناول بھی لاجواب تھا۔ مریم عزیز کی "صحرا میں خوشبو" سارے دل و دماغ میں خوشبو بکھیر گئی۔ سمیرا یونس کے "دردگر" میں ملک کے سفاکوں کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔ لفظوں کا اتار چڑھاؤ بہت خوب صورت تھا۔ میں بھی سمیرا یونس کی ہم آواز ہوں، کیونکہ ملک سے محبت اور اس وطن سے بسنے والے سچے لوگوں سے محبت کے رشتے تو سب کے سانجھے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ "ملکیت، آخری راستہ، خوشی کے موسم، دل کا معاملہ، یہ رشتے، غزلیں، نظمیں، مسکراہٹیں غرض یہ کہ سب سلسلے دل موہ لینے والے ہیں، ان تمام سلسلوں نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا اور مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ آپ کا پرچہ بلاشبہ ہردلعزیز ہے۔

ج: پیاری سیما! آپ کا خط شامل اشاعت ہے، امید ہے کہ آئندہ بھی تبصرے کے ساتھ شرکت کرتی رہیں گی، شعاع کی پسندیدگی کے لیے بے حد شکریہ۔

یہ خط ہمیں ڈگری کالج گڈو سے شائستہ اکبر نے لکھا ہے

شعاع کا اکتوبر کا پرچہ اس بار اپنے ٹائم پہ ملا۔ حمد و نعت پڑھ کر پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی باتوں سے فیضیاب ہو کر سب سے پہلے مریم عزیز کے ناولٹ "صحرا میں خوشبو" کی طرف بڑھی۔ میں جو سوچتی ہوں کہ کوئی کہانی شروع کرتے ہوئے میں پہلے سے ہی نتیجہ اخذ کرلیتی ہوں اور میرے اندازے زیادہ تر درست نکلتے ہیں تو مریم عزیز کی کہانی کو بھی جیسا سوچا اینڈ بھی ویسا ہی نکلا، لیکن اس بار کہانی کے بیچ میں ہم بے وقوف ضرور بن گئے "عمر مرگیا تھا۔" اس جملے نے میرے حواس سلب کرلیے اور میں پلک جھپکائے بنا اس سطر کو دیکھتی رہی۔ یہ پڑھ کر بہت دکھ

ہوا، پھر جیسے ہی آگے بڑھے پوچھیں مت کہ کیا حال ہوا۔ واہ مریم عزیز۔

سمیرا یونس کی کہانی "دردگر آدمی" کے حیدر مغیث نے بے حد متاثر کیا۔ ان کا بس یہ قصور ہوتا ہے کہ وہ سچ پر قائم رہتے ہیں، حیدر کی خاموش محبت بہت پسند آئی، ویل ڈن سمیرا یونس! "رہ نورد شوق" شہناز صدیق کی کہانی بس ٹھیک ہی تھی، تھیم وہی پرانی تھی۔

فائزہ افتخار کا مزاح سے بھرپور ناول "مان جاؤ" بہت پسند آیا، بے چارے دادا، دادی کو تو بہت برے حال میں دکھایا گیا، لیکن "باقی آئندہ" دیکھ کر......

سلسلے وار ناول زبردست جارہے ہیں۔ افسانے بھی بہت بہترین تھے۔ کنیز نبوی آپ کا دعا کرنے کا انداز بہت پسند آیا اور آپ کو بہت بہت مبارک باد شفانبوی کی! اشعار اور باقی سلسلے بہت پسند آئے۔

ج: شائستہ بہن! ہمیں خط لکھنے کا بہت شکریہ، امید ہے کہ آئندہ بھی اپنی تعریف و تنقید سے نوازتی رہیں گی۔

حنا سلیم اعوان گاؤں آخون باندی ہری پور ہزارہ سے لکھتی ہیں

ٹائٹل بس سو سو تھا۔ سب سے پہلے کنیز نبوی کو پڑھا۔ آنکھیں بے اختیار چھلک پڑیں۔ خدا ہم سب کو اور ہمارے ملک کو امن و سلامتی عطا فرمائے۔ آمین

بندھن سلسلہ اچھا ہے۔ نت نئے جوڑوں سے متعلق معلومات حاصل ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے کے لیے علی ظفر، احسن خان ابرار الحق کو بھی یاد رکھیے گا۔ مجھے بہت انتظار رہے گا۔ "ستارہ شام" بے حد دلچسپ انداز میں رواں دواں ہے۔ پڑھنے کا مزا اور دوبالا ہو جائے جو صفحات بڑھ جائیں تو...... فائزہ اپیا کو ویلکم کہوں گی۔ کافی عرصے بعد ان کو شعاع میں دیکھ کر بہت اچھا لگا۔ کرداروں کی آپس کی نوک جھونک نے مزا دیا۔ "صحرا میں خوشبو" ویسے تو ٹھیک تھا مگر جہاں رومیعہ بال بنا رہی ہوتی ہے تو آئینے میں عمر کو دیکھتی ہے۔ یہ بالکل فلمی سین تھا۔ "میری صبح کا ستارہ" میں میری توقع کے عین مطابق ماہین کا نکاح احمد سے ہی ہوا۔ "رہ نورد شوق" شہناز صدیق نے زبردست لکھا، مگر آئمہ کا نام بالکل اچھا نہیں لگا۔ "دیوار شب" میرا موسٹ فیورٹ ناول ہے۔ یوسف کمال کا سر راہ خیام کو دیکھ کر ٹھٹک جانا

اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ ان کا آپس میں یقیناً کوئی گہرا تعلق ہے۔ افسانوں میں فرحانہ نے بہت سبق آموز لکھا۔ باقی تمام شعاع بھی ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ آپی! میں چند رائٹرز کو خط لکھنا چاہتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا اور آسیہ رزاقی کا تعلق ایبٹ آباد سے ہے؟ ان کی تحریروں "شادی احوال" سے مجھے کچھ ایسا ہی لگا ہے اور میری طرف سے آپ سب کو بڑی عید کی خوشیاں مبارک ہوں۔

ج: حنا بہن! شعاع کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ کی رائے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

ایمن تحریم، سرگودھا سے اپنے خط میں لکھتی ہیں

جس کہانی نے مجھے خط لکھنے پر دوبارہ اکسایا تو جی وہ ہے "دردگر آدمی ہوتا" سمیرا جی! کیا کہانی لکھی آپ نے دل چاہا کہ جاکر آپ کو خراج تحسین پیش کیا جائے۔ حیدر مغیث جیسے بہت سے سچے لوگ ہمارے ملک میں موت کا نشانہ بن چکے ہیں مگر ان کا کیا قصور جوان کے انتظار میں آس لگائے بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کا انتظار انتظار ہی رہ جاتا ہے۔ اپنے

ملک کی برائی کرنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر برائی اور دعا کے سوا انسان ملک کے لیے کر بھی کیا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ "رہ نورد شوق" بھی زبردست کہانی تھی۔ آئمہ کی باپ کی عزت کے لیے محبت کی قربانی دینا بہت اچھا لگا اور ماں باپ کو خوش کرنے کے بدلے خدا نے اسے ڈاکٹر عائش جیسے نفیس شخص کا ساتھ بخشا۔ "صحرا میں خوشبو" بہت ہی عمدہ کہانی تھی۔ عمر کا والدین کے پاس لوٹ آنا بہت اچھا تھا، چاہے دل سے نہ سہی۔ اور پھر رومیعہ کی محبت میں گرفتار ہو کر اس کے قدم بھی آخر پاکستان نے جکڑ لیے "صبح کا ستارہ" میں کچھ بہتری واقع ہوتی ہے۔ مزید کامیابی کی دعائیں منہ سے بے اختیار نکلیں۔ آپ سے ایک درخواست ہے کہ کسی کہانی میں یہ بیان کیا جائے کہ نوعمر لڑکیوں کے لیے کہانیاں پڑھنا کوئی برا کام نہیں۔ مثال کے طور پر کچھ والدین بچوں کو ڈائجسٹ پڑھنے سے روکتے ہیں تو پھر کچھ دنوں میں فرض کیا وہ ہی کہانی ڈرامے کی صورت میں ٹی وی پر آن ایر ہے تو والدین بمعہ فیملی ان کو دیکھ رہے ہوتے ہیں مجھے یہ بات بہت عجیب محسوس ہوتی ہے۔

سمیعہ مشتاق نے یہ خط ہمیں حافظ آباد سے لکھا ہے

جوبات خط لکھنے کی وجہ بنی وہ ہے فرحانہ ناز ملک کا "یہ رشتے" اور فائزہ افتخار کا "مان جاؤ" لیکن فائزہ جی سے کہنا ہے کہ اتنا زبردست لکھتے لکھتے آخر یہ باقی آئندہ کیوں؟ پڑھنے کا تسلسل ہی ٹوٹ گیا اور دل بھی بہت برا ہوا۔ "یہ رشتے" میں فرحانہ مرد کی طرف سے اٹھائے گئے مثبت فیصلہ کن قدم کو بہت خوب صورتی سے سامنے لائی ہیں۔ ورنہ دیکھنے میں تو یہی آتا ہے کہ مرد کچھ دن ایسی لڑکیوں کے ساتھ گزار کر پھر جلد ہی اکتا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ "صحرا میں خوشبو" مریم عزیز کا ناولٹ اچھا تھا لیکن اینڈ بہت ہی ڈرامائی۔ بھلا یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ ایک غیر مرد ایک لڑکی کو پہاڑی تک لے جا رہا ہے پھر وہ وہاں سے کود بھی جاتا ہے۔ مریم جی سے ایک بات کہنا چاہوں گی کہ آپ کے قارئین بہت باشعور ہیں۔ اس طرح کا اینڈ ہضم نہیں ہوتا اور پلیز جو ایک دفعہ مر جائے اس کو اسٹار پلس کی طرح دوبارہ زندہ نہ کیا جائے۔ مریم جی! آپ کی مہربانی پرانہ محسوس کیجیے گا کہ بہرحال ہمارے کمنٹس آپ کی تحریر میں پختگی لائیں گے۔ "راہ نورد شوق" بہت اچھا تھا لیکن

میں رائٹرز سے ایک بات کہنا چاہوں گی کہ مہربانی کریں اور نام سادہ سادہ لکھا کریں جیسے آسائش، عائش، بارز، اریزہ یقین جانیں بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ پورے ناول میں ہم ناموں کے ہجے ہی بار بار جوڑ کے پڑھتے رہتے ہیں کہ پتا نہیں یہاں زبر ہے یا زیر۔ باقی میری صبح کا ستارہ بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ کیا یہ کسی ٹی وی چینل پہ بھی دکھایا جا رہا ہے؟ اب آتے ہیں اس مہینے کی سب سے زبردست کہانی کی طرف اور وہ ہے "دردگر" اتنے خوب صورت لفظوں کا چناؤ، اتنی سادگی اور عشاء کے درد کو بیان کرنے کا اتنا خوب صورت انداز۔ ویل ڈن ویسے اس بات میں میں کوئی شبہ نہیں کہ "شعاع" میں حالات حاضرہ کو موضوع بنا کر سب سے زیادہ کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ "دیوارِ شب" بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔ اب نجانے کون سے رشتوں کی گتھلک کھلنے والی ہے۔ "اس ماہ کی مسکراہٹیں" میں سارے لطیفے پرانے تھے۔ "باتوں سے خوشبو آئے" "شعاع" کا ایک خوشبو بھرا سلسلہ ہے۔ "شاعری سچ بولتی ہے" میں سورٹھ سانذ آپ کا سارا انتخاب ہی بہت اچھا تھا۔ پہلے شعر کو نکال کر کیونکہ اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں اور میں آپ سے کہنا چاہوں گی کہ آپ کے نام کی وجہ سے پہلے مجھے بہت کنفیوژن تھی۔ میں آپ کو کسی اور مذہب کی پیروکار سمجھتی تھی لیکن آپ کے انتخاب کا پہلا شعر پڑھ کر یہ غلط فہمی دور ہو گئی۔ آپ پلیز شعاع کے ساتھ ساتھ میں اپنا تعارف ضرور کروائیں۔ آپ کے پسندیدہ اشعار واقعی پسندیدگی کے لائق تھے۔

"دکھتا کسی پہ کیوں" میں حرا قریشی نے بہت ہی خوب صورت اور قابل غور و عمل باتیں لکھیں۔ واقعی شعاع زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے پڑھتے ہیں۔

"آئینہ خانے میں" جو آپ بریکٹ میں تبصرے دیتے ہیں یا تنقید کرتے ہیں، وہ مجھے بہت پسند ہیں۔ "تاریخ کے جھروکوں سے" "شعاع کا جھومر" ہے۔ "موسم کے پکوان" کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ میں ہاسٹل میں رہتی ہوں۔ اب رہ گیا "خوب صورت بنئے" تو یقین جانیے سب سے پہلے میں پڑھتی ہی یہ صفحہ ہوں۔ کیونکہ میرا دل چاہتا ہے، ایک ہی دن میں خوب صورت بن جاؤں اور جو بھی دیکھے مبہوت ہو جائے، لیکن بس ایک ہی دن جوش چڑھتا ہے۔ شعاع کے ٹوٹکے آزما کر باقی سارا مہینہ پھر صابن سے منہ دھو کر فیئر اینڈ لولی لگانے پہ آجاتے ہیں۔ اور اب آخر میں آپ سے ایک فرمائش ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کی طرح شعاع میں بھی ابن انشاء کی شاعری شامل کیا کریں اور ایک دفعہ ان کا پورا تعارف بھی۔

ج: پیاری سمیعہ! آپ کا تفصیلی تبصرہ بہت اچھا لگا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اپنی رائے سے ہمیں نوازتی رہیں گی۔

✡

غزل ثوبان

آئینہ خانے میں

شدید علالت

ممتاز اداکارہ و ہدایت کارہ شمیم آراء سے کون واقف نہیں۔ انہوں نے فلمی صنعت میں جو مقام حاصل کیا۔ وہ بہت کم اداکاراؤں کو نصیب ہوتا ہے۔ لیکن ان کی لازوال کامیابیوں کو محض "نصیب" کے کھاتے میں ڈالنا درست نہیں کہ اس میں ان کی قسمت سے زیادہ ان کی شبانہ روز محنت کا عمل دخل ہے۔

ان کے ابتدائی دور کو یاد کرتے ہوئے معروف صحافی اور مبصر منیر حسین بیان کرتے ہیں۔

"فلم "مس 56" کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ ان دنوں منیر حسین صاحب فلموں کے تشہیری معاملات سے وابستہ تھے، چنانچہ وہ شوٹنگ پر اکثر موجود ہوتے تھے۔ وہ وہاں ریہرسل کے دوران ایک نو آموز اداکارہ کو جانفشانی سے مستقل محنت کرتے دیکھتے۔ ایک روز انہوں نے اس لڑکی سے اس کے کردار کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"اس فلم میں میرا کردار کوئی خاص نہیں، لیکن ایک دن میں اپنی محنت سے نہایت اعلیٰ مقام ضرور حاصل کروں گی۔"

وقت نے اس نو آموز اداکارہ کا دعوا سچ کر دکھایا اور دنیا نے اسے "شمیم آراء" کے نام سے سپر اسٹار کا درجہ دیا۔

فلمی صنعت کو بے شمار یادگار فلمیں دینے والی شمیم آراء ان دنوں "کوما" میں ہیں۔ وہ لندن کے ایک اسپتال میں زیر علاج ہیں۔ ان کے پرستاروں سے دعائے صحت کی اپیل ہے۔

چوری تو نہیں کی ہے

غلام علی کی گائی ہوئی یہ مشہور غزل تو آپ نے سنی ہی ہوگی۔

"ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے.....

ڈاکا تو نہیں ڈالا، چوری تو نہیں کی ہے۔"

لیکن جناب! کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ڈاکا بھی پڑ جاتا ہے اور کوئی ہنگامہ بھی نہیں ہوتا۔

ایک خبر کے مطابق ایک بھارتی چینل پر ہماری ہر دلعزیز ڈراما نگار حسینہ معین کی مقبول سیریل "دھوپ کنارے" کا چربہ "کچھ تو لوگ کہیں گے" کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ مذکورہ ڈرامے کے مصنف نے اس بات کا برملا اعتراف بھی کیا ہے کہ یہ ڈراما پاکستانی ڈرامے "دھوپ کنارے" کا چربہ ہے۔ گویا یہ "چوری" نہیں، علی الاعلان "ڈاکا" ڈالا گیا ہے۔

قدموں میں

معروف مزاحیہ اداکار عمر شریف اس وقت بلاشبہ

"کامیڈی کنگ" ہیں۔ وہ جتنے اچھے اداکار ہیں، اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔ ان کے ساتھ ایک طویل عرصے تک کام کرنے والے اسٹیج کے معروف ہدایت کار فرقان حیدر کے ذہن میں عمر شریف سے پہلی ملاقات ابھی تک تازہ ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"ایک دن صبح ہی صبح میرے گھر کی اطلاعی گھنٹی بجی۔ میں نے دیکھا تو عمر شریف تھے۔ میں نے انہیں شام کو اپنے دفتر آنے کا کہہ دیا۔ وہ دفتر آئے تو میرے ساتھ کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ اسکرپٹ بھی ساتھ لائے تھے۔ میں انہیں معین اختر کے پاس لے گیا۔ معین اس وقت تک خاصا نام کما چکے تھے اور اسٹیج ڈراموں میں ان کا طوطی بولتا تھا۔ عمر شریف احتراماً ان کے قدموں میں بیٹھ گئے۔ معین نے انہیں صوفے پر بیٹھنے کے لیے بے حد اصرار کیا، مگر وہ ان کے قدموں میں ہی بیٹھے رہے۔"

سچ ہے کہ ایک متکبر انسان کبھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ انکسار میں جو بلندی پنہاں ہے، اسے کوئی صاحبِ عقل ہی جان سکتا ہے۔

ایک اور تنازعہ

دنیائے کرکٹ کے تیز ترین باؤلر شعیب اختر غالباً تنازعات کھڑے کرنے میں بھی "تیز ترین" ہی ہیں، جب ہی تو ایک کے بعد ایک تنازعہ کھڑا کرتے رہتے ہیں۔ ان کا حالیہ تنازعہ زبانی نہیں، بلکہ تحریری صورت میں سامنے آیا ہے۔

"کنٹروورشلی یورز" کے عنوان سے شعیب اختر کی سوانح حیات منظرِ عام پر آئی ہے۔ شعیب نے اس "ایک" کتاب میں "کئی" لوگوں پر تنقید کی ہے۔ اس کتاب میں شعیب نے سابق کرکٹر وسیم اکرم پر الزام لگایا ہے کہ وسیم نے ان کا کیریئر ختم کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ ان کے اس باؤنسر نے وسیم اکرم کے حامیوں اور مخالفین میں گویا بیانات کی ایک "سیریز" کا آغاز کر دیا ہے۔ ان دنوں دونوں گروپ بیان بازی کے

ذریعے ایک دوسرے کو بولڈ کرنے کی کوششوں میں ہیں، مگر ان کوششوں میں وہ یہ بھول گئے کہ اس میچ کا نتیجہ جو بھی رہے "مین آف دی میچ" تو بہرحال شعیب اختر ہی رہیں گے نا۔

سو روپے

موقع شناسی ایک بہت بڑا فن ہے۔ کہتے ہیں کہ ایک کامیاب انسان وہی ہے، جو موقع سے فائدہ اٹھانا جانتا ہو۔ ہمارے ہاں موقع سے فائدہ اٹھانے والوں کی کمی نہیں، تاہم کچھ لوگ اس فن میں اس قدر انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں کہ بڑے بڑے فنکاروں کو بھی مات دے دیں۔

معروف اداکار شفقت چیمہ کو ایک فلم میں ببر شیر سے لڑنا تھا۔ شفقت چیمہ اپنے کرداروں پر خاصی محنت کرنے والے فنکار ہیں، چنانچہ وہ ایک معروف سرکس والوں کے پاس شیر سے لڑائی کی تربیت حاصل کرنے کے ارادے سے چلے گئے، تاکہ سین مکمل فنی تقاضوں کے ساتھ پکچرائز کرا سکیں۔ انہوں نے سرکس کے مالک سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ فوراً راضی ہو گیا اور انہیں ایک کمرے میں انتظار کرنے کا کہہ کر خود باہر چلا گیا۔ ابھی شفقت چیمہ کو وہاں بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ ان کے کانوں میں ایک اعلان گونجنے لگا۔

"سو، سو روپے..... سو، سو روپے..... آج رات ہمارے سرکس میں دیکھیے! معروف اداکار شفقت چیمہ کی خطرناک ببر شیر سے لڑائی..... صرف سو روپے میں۔"

یہ اعلان سنتے ہی شفقت چیمہ سرکس کے مالک کی "موقع شناسی" کے دل سے قائل ہو گئے۔

ارے جناب! وہ بے چارہ تو ایک معمولی سرکس کا مالک ہی تھا، یہاں تو بڑے بڑے بازی گر ہر لمحہ اپنی جیبیں بھرنے کے مواقع تلاشتے رہتے ہیں۔

یہ بیان کالمانہ

☆ ہماری پوری انتظامیہ کو کوئی ایسا کیڑا لگ گیا ہے، جو اسے اندر سے کھا رہا ہے اور یہ پرانی بات ہے کہ ڈاکٹر عبدالقدیر نے تنگ آ کر واپسی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہوں نے وزیراعظم بھٹو کو اطلاع دی کہ افسران کام نہیں کرنے دیتے۔ (غیر سیاسی باتیں۔ عبدالقادر حسن)

☆ مشرف کو امریکہ لایا ہی اس لیے تھا کہ پاکستان کو قربانی کا بکرا بنایا جا سکے جو مسلسل ذبح ہو تا رہے اور پھر جب مشرف کی ایکسپائری ڈیٹ آ گئی تو امریکہ نے این آر او کا بندوبست کیا تاکہ مشرف سے بھی "اچھے" لوگ لائے جا سکیں اور پھر ایسا ہی ہوا، اب قربانی بھی پہلے سے زیادہ ہے۔ (عبداللہ طارق سہیل)

☆ وزیر داخلہ رحمان ملک نے باجوڑ آپریشن کے بعد ڈرون حملے روکنے کی بات کی لیکن وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے اس مطالبے کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے ان حملوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جب تک وہ مطلوب افراد کو نشانہ نہیں بنا لیتے۔ ہم قومی اسمبلی میں اس پر احتجاج کریں گے پھر نظر انداز کر دیں گے۔"

❁

امتہ الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

اصحاب کہف

قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور پہاڑ والے ہماری عجائبات میں سے کچھ تعجب کی چیز تھے' وہ وقت قابل ذکر ہے جبکہ ان نوجوانوں نے اس غار میں جا کر پناہ لی پھر کہا کہ ہمارے پروردگار! ہم کو اپنے پاس سے رحمت کا سامان عطا فرمائیے اور ہمارے لیے (اس کام) میں درستی کا سامان مہیا کر دیجیے' سو ہم نے اس غار میں ان کے کانوں پر سالہا سال تک نیند کا پردہ ڈال دیا پھر ہم نے ان کو اٹھایا تاکہ ہم معلوم کرلیں کہ ان دونوں گروہ میں کون سا گروہ ان کی رہنے کی مدت سے زیادہ واقف تھا۔" (سورہ کہف)

ان آیات میں اصحاف کہف کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی قدرت اور سلطنت کے اعتبار سے اصحاب کہف کا معاملہ کوئی زیادہ قابل تعجب نہیں ہے' اس لیے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش' شب و روز کا اختلاف اور سورج' چاند اور ستاروں کا مسخر ہونا' یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت عظیمہ کا پتا دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جو چاہتے ہیں کرتے ہیں ان کو کوئی عاجز نہیں کر سکتا۔ (بے شک)

کہف اصل میں پہاڑ کے اندر بنی ہوئی غار کو کہتے ہیں' جس میں ان لوگوں نے پناہ لی تھی اور یہ رقیم ایلہ کے قریب ایک وادی ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رقیم سے مراد کتاب ہے۔ حضرت سعید فرماتے ہیں' رقیم پتھر کی وہ تختی ہے جس پر انہوں نے اصحاب کہف کے واقعات کو لکھ کر غار کے دروازے پر لٹکا دیا تھا۔ اس غار کے پہاڑ کا نام "بنجلوس" ہے اور غار کا نام "حیزم" ہے اور ان کے کتے کا نام "حمران" ہے۔

اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں کا واقعہ ذکر کرتے ہیں جو اپنے دین کو بچانے کی خاطر اپنی قوم سے بھاگ نکلے تھے اور ایک پہاڑ کے غار میں جا کر پناہ لے لی تھی تاکہ اپنی قوم سے روپوش ہو سکیں۔ غار میں داخل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت و لطف کو مانگتے ہوئے کہنے لگے۔ "اے ہمارے پروردگار! تو اپنے پاس سے ہم پر رحمت فرما کہ ہم اپنی قوم سے مخفی رہیں اور ہمارا مقدر اور انجام بھی اچھا بنا دے۔"

جیسا کہ حدیث میں ہے "آپ نے جو فیصلہ بھی ہمارے لیے کیا ہے اس کے انجام کو اچھا بنا۔" قرآن پاک میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"ہم ان کا واقعہ آپ سے ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں۔ وہ لوگ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے تھے اور ہم نے ان کی ہدایت میں اور ترقی کر دی تھی' اور ہم نے ان کے دل مضبوط کر دیے جبکہ وہ پختہ ہو کر کہنے لگے کہ ہمارا رب تو وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ ہم تو اسے چھوڑ کر کسی معبود کی عبادت نہ کریں گے کیونکہ اس صورت میں ہم نے یقیناً" بڑی ہی بے جا بات کہی۔ یہ جو ہماری قوم ہے انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اور معبود قرار دے رکھے ہیں یہ لوگ ان معبودوں پر کوئی کھلی دلیل کیوں نہیں لاتے تو اس شخص سے زیادہ کون غضب ڈھانے والا ہے جو اللہ پر جھوٹی تہمت لگائے اور جب تم ان لوگوں سے الگ ہو گئے ہو اور ان کے معبودوں سے بھی مگر اللہ سے تو تم غار میں چل کر پناہ لو تم پر تمہارا رب اپنی رحمت پھیلا دے گا اور تمہارے لیے تمہارے اس کام میں بھی کامیابی کا سامان درست کر دے گا۔" سورۃ الکہف)

یہ چند نوجوان تھے جو دین حق کو خوب قبول کرنے والے اور ان بوڑھوں سے زیادہ راہِ راست پر تھے جنہوں نے حد سے تجاوز کیا اور دینِ باطل میں مبتلا ہوئے۔

"حضرت مجاہد فرماتے ہیں' مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ بعض کے کانوں میں بالیاں تھیں' پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو ہدایت سے نوازا اور تقویٰ کی دولت عطا فرمائی چنانچہ وہ اپنے رب پر ایمان لائے یعنی انہوں نے خدا کی وحدانیت کا اقرار کیا اور اس بات کی گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ دین مسیحی پر تھے' لیکن بظاہر معلوم یہی ہوتا ہے کہ وہ لوگ ملت نصرانیہ سے پہلے تھے۔ کیونکہ اگر وہ دین نصرانیت پر ہوتے تو یہود کے علماء ان کے واقعات کو محفوظ کرنے کا اہتمام نہ کرتے۔

جب کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "قریش نے مدینہ میں یہود کے علماء کے پاس کچھ لوگوں کو چند ایسی باتیں معلوم کرنے کے لیے بھیجا جن کے ذریعے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا امتحان لے سکیں' چنانچہ انہوں نے کہا۔

"ان سے اصحاب کہف کا واقعہ' ذوالقرنین کا قصہ اور روح کی حقیقت پوچھو۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ باتیں اہل کتاب کی کتب میں محفوظ ہیں اور ان کا زمانہ دین عیسوی پر مقدم ہے۔" واللہ اعلم۔

بہت سے مفسرین نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ یہ لوگ (اصحاب کہف) روم کے شہزادے اور سردار تھے ایک دن وہ قوم کے کسی میلہ پر نکلے جو قوم سال میں ایک دن سب جمع ہوا کرتی تھی اور بتوں کی پوجا اور ان کے نام پر جانور ذبح کرتی تھی۔ اس قوم کا ایک ظالم و جابر بادشاہ تھا' جس کا نام "دقیانوس" تھا' جو لوگوں کو بت پرستی کا حکم اور اس کی ترغیب دیا کرتا تھا' چنانچہ جب لوگ اس میلہ میں نکلے تو نوجوانوں کا یہ گروہ بھی اپنی قوم اور آباء واجداد کے ساتھ نکلا۔ جب انہوں نے اپنی قوم کے عمل کو اپنی بصیرت کی آنکھوں سے دیکھا تو جان گئے کہ جو بت پرستی اور نذر و نیاز وغیرہ کے کام یہ قوم کر رہی ہے' اس کے لائق تو صرف وہ ذات ہے جو آسمانوں اور زمین کی خالق ہے۔

چنانچہ ہر ایک اپنی اس قوم سے خلاصی حاصل کرنے لگا اور ان سے کنارہ کشی اختیار کرنے لگا۔ ان میں سے ایک آیا اور ایک درخت کے سایہ کے نیچے بیٹھ گیا' پھر دوسرا آیا وہ بھی اس درخت کے نیچے بیٹھ گیا' پھر ایک اور آیا' پھر ایک اور آیا اور بیٹھتے گئے' لیکن ان میں سے کوئی بھی دوسرے کو نہیں جانتا تھا' بس ان کو اسی ذات نے اس جگہ جمع کر دیا تھا جس نے ان کے دلوں کو ایمان پر جمع کر دیا تھا۔

الغرض ہر شخص دوسرے سے اپنا دین و ایمان چھپانے لگا' اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بھی اس جیسا ہے۔ یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے یہ کہا۔

"اے قوم! خدا کی قسم! تمہیں تمہاری قوم سے صرف ایک ہی چیز نے الگ کیا ہے' اس لیے ہر ایک کو چاہیے کہ وہ اپنی حقیقت حال ظاہر کر دے۔"

چنانچہ ایک نوجوان نے کہا۔ "خدا کی قسم! میں تو اس لیے ان سے الگ ہوا کہ میں نے جب اپنی قوم کو دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جس راستہ پر ہے وہ باطل اور غلط ہے' صرف وہی ذات عبادت کی مستحق ہے جس کا کوئی شریک نہیں یعنی اللہ تعالیٰ ہی مستحق عبادت ہے۔ جو زمین و آسمان اور ان کے درمیان کی تمام مخلوقات کا خالق ہے۔"

پھر ایک اور نوجوان اٹھا اور اس نے کہا۔ "خدا کی قسم! میرا بھی یہی حال ہے۔"

حتیٰ کہ وہ سب ایک ہی بات پر متفق ہو گئے اور ایک ہاتھ کی طرح اور مخلص بھائیوں کی طرح ہو گئے۔ پھر انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے ایک عبادت

خانہ بنایا' اس سے ان کی قوم کو معلوم ہو گیا' چنانچہ اس قوم نے اپنے بادشاہ کو مخبری کر دی۔ بادشاہ نے ان کو حاضر کر کے پوچھا۔

"تمہارا معاملہ کیا ہے اور تم کس دین پر ہو؟"

انہوں نے ٹھیک ٹھیک جواب دیا اور اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دی۔

جب ان نوجوانوں نے اپنے بادشاہ کو توحید کی دعوت دی تو اس نے اس کا انکار کیا ان کو ڈرایا دھمکایا اور ان کے بدن سے زینت والا لباس اتار دینے کا حکم دیا کہ جب اپنا برا حال دیکھیں گے تو اپنے سابقہ دین میں واپس آجائیں گے۔ لیکن خدا کا ان پر فضل ہوا کہ انہوں نے اپنے دین کو اس فتنہ سے بچانے کی خاطر وہاں سے راہ فرار اختیار کی۔ وہ ایک غار کی طرف نکلے اور اس میں پناہ لے لی' قوم نے ان کو اپنے اندر نہ پایا' بادشاہ نے بھی ان کو خوب تلاش کروایا۔ لیکن کہا جاتا ہے کہ کسی کو بھی کامیابی حاصل نہ ہوئی' اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کو ان کی خبر بھلا دی۔

بعض کہتے ہیں کہ ان کی قوم نے ان کو پکڑنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس غار کے دروازے پر کھڑے ہوئے جس میں وہ داخل ہوئے تھے اور کہا۔

"جس سزا کا ہم ان سے قصد کرتے تھے وہ اس سے زیادہ ہے جو انہوں نے اپنی جانوں کے ساتھ کیا۔"

چنانچہ بادشاہ نے حکم دیا "غار کا دروازہ بند کر دیا جائے تاکہ یہ لوگ اپنی جگہ پر ہی ہلاک ہو جائیں۔"

چنانچہ ان کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا۔

لیکن یہ بات صحیح نہیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ سورج کی روشنی صبح و شام ان کے غار میں آتی ہے۔ فرمایا۔

بعض علماء کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو طویل نیند سلایا تو ان کی آنکھیں اس عرصہ میں بند نہیں ہوئیں تاکہ ان کو کوئی گزند نہ پہنچے اور ان کو تازہ ہوا لگتی رہے تاکہ ان کے اجسام تازہ رہیں۔ اسی لیے ارشاد فرمایا۔

"اے مخاطب' تو ان کو جاگتا ہوا خیال کرتا ہے حالانکہ وہ سوئے تھے۔"

بعض علماء فرماتے ہیں کہ سال میں دو مرتبہ ان کی کروٹ بدل دی جاتی تھیں۔ کیونکہ اگر ان کی کروٹیں نہ بدلی جاتیں تو زمین کی مٹی ان کو ختم کر دیتی۔

ان کا کتا غار کے دروازے پر گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ جیسے کتوں کی عادت ہوتی ہے' یہ اس کی طبیعت و فطرت ہے کہ وہ دروازے پر ایسے بیٹھا ہوتا ہے جیسے پہرہ دے رہا ہو کیونکہ فرشتے ایسے گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں کتا ہو یا تصویر۔۔۔ اصحاب کہف کی برکات سے وہ کتا بھی مستفیض ہوا' چنانچہ اس کتے کو بھی ان کے ساتھ نیند آگئی۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ ان میں سے کسی کا شکاری کتا تھا' بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ کے باورچی کا کتا تھا جو باورچی ان موحد نوجوانوں کے ساتھ شامل ہو گیا تھا اور ان کا ہم مذہب ہو گیا تھا۔ اس طرح اس کا کتا بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ واللہ اعلم۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسا ذی ہیبت و جلال بنا دیا تھا کہ جو بھی ان کو دیکھتا مرعوب ہو جاتا' تاکہ کوئی شخص ان کے قریب نہ جائے اور ان کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہنچے۔ حتیٰ کہ ان نوجوانوں نے اپنی مقررہ مدت پوری کی اور جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا وہ سوئے رہے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ "جس طرح ہم نے ان کو سلایا تھا اسی طرح ان کو اٹھایا کہ ان کے بدن صحیح و سالم تھے اور ان کے جسم کے بال اور آنکھیں سب کچھ ٹھیک تھا۔"

ان کی ظاہری حالت و ہیئت میں کوئی فرق نہیں آیا' حالانکہ تین سو نو سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ جب وہ بیدار ہوئے تو ایک دوسرے سے پوچھنے لگے۔

"تم کس قدر سوئے رہے؟"

بعضوں نے کہا۔ کہ "غالباً" ایک دن یا ایک دن سے بھی کچھ کم سوئے رہے ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ غار میں دن کے ابتدائی حصہ میں داخل ہوئے

تھے اور ان کی بیداری دن کے آخری حصہ میں ہوئی تھی' اسی لیے انہوں نے کہا کہ شاید ایک دن سے بھی کچھ کم عرصہ سوئے ہوں گے' گویا ان کو زیادہ سونے کے معاملہ میں ایک طرح کا تردد ہوا۔ پھر وہ اہم چیز کی طرف متوجہ ہوئے یعنی کھانے پینے کی احتیاج' کہنے لگے۔

"کسی کو اس شہر کی طرف بھیجو جہاں سے تم نکل کر آئے ہو اور اس کو چاندی کے یہ سکے دو تاکہ وہ پاکیزہ اور حلال کھانا خرید لائے۔"

اصل میں جب وہ اپنے گھروں سے نکلے تھے تو انہوں نے کچھ پیسے اپنے ساتھ لے لیے تھے' کچھ رقم تو صدقہ کر دی تھی اور کچھ ان کے پاس رہ گئی تھی۔ بہر حال انہوں نے کسی کو وہ پیسے دے کر بھیجا اور اس کو یہ بھی کہا۔

"آنے جانے اور خرید و فروخت کے وقت کسی کو بھی ہمارے ٹھکانے کی خبر نہ ہو' جس قدر ممکن ہو سارا معاملہ پردۂ اخفا میں رہے' کیونکہ اگر دقیانوس کے ساتھیوں کو تمہارے ٹھکانے کا پتا چل گیا تو وہ طرح طرح کا عذاب دے کر یا تو سابقہ دین میں لوٹا لیں گے یا تم مر جاؤ گے' اگر خدانخواستہ تم نے ان کی بات مان لی اور ان کے مذہب کو دوبارہ اختیار کر لیا تو تم نہ دنیا میں کامیاب ہو سکتے ہو اور نہ آخرت میں۔"

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

"یعنی ہم نے لوگوں کو ان پر مطلع کر دیا تاکہ وہ لوگ اس بات کا یقین کر لیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور یہ کہ قیامت میں کوئی شک نہیں۔"

بہت سے علماء نے یہ ذکر کیا ہے کہ اس زمانہ کے لوگوں کو مرنے کے بعد دوبارہ جی اٹھنے اور قیامت کے معاملہ میں شک پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت عکرمہؓ فرماتے ہیں ان کا ایک گروہ یہ کہتا تھا کہ ارواح کو تو دوبارہ زندہ کیا جائے گا مگر اجسام کو نہیں کیا جائے گا' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس پر حجت و دلالت اور نشانی کے طور پر اصحاب کہف کو دوبارہ زندہ کیا۔ علماء نے یہ بات ذکر کی ہے کہ جب خورد و نوش کے لیے ایک آدمی خریداری کے لیے

شہر جانے کا تو اسے باہر کی دنیا عجیب سی نظر آئی' ادھر اُدھر چلتے ہوئے شہر پہنچا۔ کہتے ہیں اس کا نام افسوس تھا' وہ سمجھتا تھا کہ ابھی زمانہ کچھ زیادہ نہیں گزرا' حالانکہ صدیاں بیت چکی تھیں اور کئی نسلیں گزر چکی تھیں۔ لوگوں میں تبدیلی آچکی تھی۔ وہ علاقے بھی بدل چکے تھے۔

جب وہ شہر پہنچا تو اس کو شہر کی وہ علامات نظر نہ آئیں جن کو وہ جانتا تھا' اور وہ شہر کے کسی آدمی کو بھی پہچان نہیں رہا تھا' دل میں حیران ہو کر کہنے لگا۔

"کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا ہوں یا کہیں مجھے جنون تو لاحق نہیں ہو گیا ہے۔"

پھر کہنے لگا۔ "مجھے یہاں سے جلدی نکل جانا چاہیے۔"

پھر ایک آدمی کے پاس گیا جو کھانے کی اشیاء بیچ رہا تھا' اس کو اس نے وہ پیسے دیے جو اس کے پاس تھے اور کہا کہ "مجھے اس کے عوض کھانا دے دو۔ جب اس نے ان پیسوں کو دیکھا تو اسے عجیب سے لگے' پھر اس نے وہ پیسے اپنے ہمسایہ کو دیے' کرتے کرتے وہاں کے لوگ ان سکوں کو دیکھنے لگے اور کہنے لگے۔

"ہو سکتا ہے کہ اس شخص کو خزانہ ملا ہے' چنانچہ انہوں نے اس کی حقیقت پوچھی کہ۔

"تمہیں یہ پیسے کہاں سے ملے' ہو سکتا ہے کہ یہ خزانہ ہو اور تم کون ہو؟"

وہ کہنے لگا "میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں' میرا زمانہ وہ ہے' جب یہاں دقیانوس بادشاہ حکومت کیا کرتا تھا۔"

لوگ اس کو دیوانہ سمجھ کر اپنے حاکم کے پاس لے گئے' جب اس حاکم نے اس سے حقیقت حال معلوم کی تو اس نے ساری حقیقت ان کو بتائی۔ جب ان لوگوں کو معلوم ہوا تو اس کے ہمراہ بادشاہ اور شہر کے سب لوگ اس غار کی طرف نکلے' جب وہ ان کو لے کر اس غار تک پہنچا تو ان سے کہا۔

"مجھے ذرا پہلے جانے دو تاکہ میں اپنے ساتھیوں کو بتا دوں" چنانچہ وہ غار میں داخل ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ لوگوں کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ آدمی غار میں کیسے گیا' اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں پر غار والوں کا حال مخفی رکھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ بھی اس کے ہمراہ غار میں داخل ہوئے تھے اور ان کو دیکھا اور ان کے بادشاہ نے غار والوں کو سلام بھی کیا اور ان سے معانقہ بھی کیا۔

ایک قول کے مطابق وہ بادشاہ مسلمان تھا' اس کا نام "تندوسیس" تھا۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ سے گفتگو کر کے ان کو بڑی انسیت محسوس ہوئی' پھر الوداعی سلام کہہ کر اپنی خواب گاہوں کی طرف واپس لوٹ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو وفات دے دی۔ واللہ عالم۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے "ان کے غار کا دروازہ بند کر دو اور ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔"

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ بات کہی تھی وہ اہل حکومت تھے' لیکن کیا وہ قابل تعریف ہیں یا نہیں؟ اس میں شک ہے۔ اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے فرمایا۔

"اللہ تعالیٰ یہود و نصاریٰ پر لعنت کرے کہ انہوں نے اپنے انبیاء اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔"

اس حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے ان کے کام پر وعید ذکر فرمائی۔

اس طرح کے موقعوں پر بہتر یہ ہے کہ علم کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی جائے' کیونکہ علم کے بغیر اس طرح کی باتوں میں غور و خوض کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ہاں البتہ جب ہمیں کوئی بات یقینی طور پر معلوم ہو تو وہ کہنی چاہیے ورنہ خاموش رہنا چاہیے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "وہ سات افراد تھے۔ ان کے سونے سے لے کر دوبارہ زندہ ہونے اور اہل زمانہ کے مطلع ہونے کے درمیان جو عرصہ اصحاب کہف کا غار میں گزرا' قمری سال کے مطابق تین سو نو سال کا تھا اور شمسی سال کے مطابق تین سو سال کا تھا"

عیدالاضحی کے پکوان

خالدہ جیلانی

ڈبل گوشتہ بریانی

اجزا :

گوشت	2 کلو
چاول	1 کلو
پیاز	1 پاؤ
دہی	آدھا پاؤ
ادرک لہسن پیسٹ	2 کھانے کے چمچے
بڑی الائچی	4 عدد
زردے کا رنگ	2 چٹکی
پسی سرخ مرچ	1 کھانے کا چمچہ
کالا زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
ہری مرچ	4 عدد
ہرا دھنیا	آدھی گٹھی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1 کپ

ترکیب :

گوشت دھو کر چھلنی میں رکھیں تاکہ اضافی پانی نکل جائے۔ لہسن ادرک پیسٹ اور نمک مرچ لگا کر بھی تقریباً پانچ منٹ تک چھلنی میں رہنے دیں تاکہ مسالے کا ذائقہ رہ جائے اور پانی نکل جائے۔ ایک دیگچی میں تیل گرم کریں اور پیاز سرخ کر لیں۔ گوشت ڈال کر رنگت تبدیل ہونے تک پکائیں پھر پیاز سمیت گوشت کو کسی پلیٹ میں نکال کر الگ رکھ دیں۔ دیگچی میں بچے ہوئے تیل میں دہی ڈال کر کچھ دیر پکنے دیں۔

چاولوں کو کالا زیرہ' الائچی اور نمک ڈال کر دو کنی ابال لیں پھر نتھار لیں۔

اب ایک الگ بڑی دیگچی میں چاول اور گوشت کی ایک ایک تہہ لگائیں اور ساتھ ہی دہی تیل والا آمیزے کی بھی تہہ لگائیں۔ زردے کا رنگ چھڑک کر بیس منٹ کے لیے دم پر لگا دیں۔ دم کے بعد لیموں کا

رس چھڑک دیں۔
سلاد اور رائتے کے ساتھ عید پر یہ مزے دار بریانی پیش کریں اور خوب داد حاصل کریں۔

مٹن تندوری

اجزا :

بکرے کی ران	1عدد
کچری پاؤڈر	4کھانے کے چمچے
لہسن ادرک پیسٹ	4کھانے کے چمچے
پسی سرخ مرچ	2کھانے کے چمچے
پسی سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
ہلدی	1چائے کا چمچہ
پسی ہوئی رائی	1چائے کا چمچہ
دہی	1پاؤ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1کپ

ترکیب :

گوشت کو اچھی طرح صاف کرکے اس پر کٹ لگالیں۔ تمام مسالا جات اچھی طرح مکس کرکے گوشت پر لگائیں اور تھوڑی دیر کے لیے رکھ دیں۔
ایک بڑی دیگچی میں تیل گرم کرکے ہلکی آنچ پر تقریباً" ایک گھنٹہ پکائیں' پھر انگیٹھی پر سینک لیں۔
پیاز' رائتے اور نان یا بن کے ساتھ گرم گرم مٹن تندوری تناول فرمائیں۔

حیدر آبادی پسندے

اجزا :

سالم گوشت	1کلو
دہی	آدھا پاؤ
لہسن ادرک پیسٹ	2کھانے کے چمچے
پسا گرم مسالا	2کھانے کے چمچے
پیاز	1پاؤ
سفید تل	2کھانے کے چمچے
دودھ	1پاؤ
الائچی پاؤڈر	1چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	1کپ

ترکیب :

گوشت کے بڑے بڑے چوڑے ٹکڑے کاٹ لیں اور اس پر کٹ لگا دیں۔ اچھی طرح دھو کر دہی میں نمک' گرم مسالا اور لہسن ادرک پیسٹ کے ساتھ اچھی طرح مکس کرکے آدھے گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔
دیگچی میں تیل گرم کرکے باریک کٹی ہوئی پیاز تل لیں۔ دہی سے پسندے نچوڑ کر تیل میں ڈال دیں۔ ساتھ ہی سفید تل اور دودھ بھی شامل کرکے ہلکی آنچ پر پکنے کے لیے چھوڑ دیں۔ (چاہیں تو ایک گلاس پانی بھی شامل کر سکتی ہیں) گوشت گل جائے اور مسالا تیل چھوڑ دے تو حسب ضرورت شوربا رکھ کر الائچی پاؤڈر چھڑک کر پانچ منٹ کے لیے دم لگا دیں۔
گرم گرم نان یا چاول کے ساتھ پیش کریں۔

گولا کباب

اجزا :

روکھا قیمہ	آدھا کلو
ادرک پیسٹ	1چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	1چائے کا چمچہ
سونف	آدھا چائے کا چمچہ
ثابت دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	1چائے کا چمچہ
پیاز	2عدد
کچری پاؤڈر	1چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	4کھانے کے چمچے

ترکیب :

روکھے قیمہ کو مشین میں باریک پیس لیں۔ پیاز براؤن کرکے پیس لیں۔ سونف' ثابت دھنیا اور زیرہ

کوٹ لیں۔ اب قیمے میں تمام مسالا جات شامل کرکے مکس کریں اور ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ قیمہ کو گولا کباب کی شکل میں بنا کر سیخ پر چڑھائیں اور کوئلوں پر سینک لیں۔ سنہرے ہونے لگیں تو برش یا کپڑے کی مدد سے تیل لگاتے جائیں۔
چٹنی' سلاد اور چپاتیوں کے ساتھ مزے سے تناول کریں۔

بیف تکہ

اجزا :

گوشت	1کلو
دہی	آدھا پاؤ
لہسن ادرک پیسٹ	2کھانے کے چمچے
پسا گرم مسالا	2کھانے کے چمچے
سرکہ	1چائے کا چمچہ
پسی سرخ مرچ	حسب ذائقہ
کچری پاؤڈر	2کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	4کھانے کے چمچے

ترکیب :

گوشت کو بوٹیوں کی صورت میں کاٹ لیں اور کانٹے کی مدد سے ہلکا ہلکا گود لیں۔ ایک برتن میں دہی کو اچھی طرح پھینٹ کر تمام مسالا جات ملائیں۔ اب بوٹیوں کو اس آمیزے میں ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور تین سے چار گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیں۔
بوٹیوں کو سیخوں میں پرو کر کوئلوں پر سینک لیں۔ سینکتے وقت کسی برش یا کپڑے سے بوٹیوں پر تیل لگاتے جائیں۔
اگر کوئلوں پر سینکنے کی سہولت نہ ہو تو ہلکے تیل میں فرائی کرلیں پھر کوئلے کا دھواں دے دیں۔
لچھے دار کٹی ہوئی پیاز اور گول کٹے ہوئے لیموں کے ٹکڑوں کے ساتھ پلیٹ میں سجا کر پیش کریں۔

فرائی پارچے

اجزا :

گوشت	1کلو
لہسن ادرک پیسٹ	2کھانے کے چمچے
ہری مرچ	4عدد
بیسن	1کپ
انڈے	2عدد
کارن فلور	2کھانے کے چمچے
میٹھا سوڈا	1چٹکی
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

گوشت کے پارچے بنالیں اور لہسن ادرک پیسٹ اور نمک مرچ ملا کر اتنی دیر پکائیں کہ گوشت گل جائے۔ تھوڑا سا پانی بھی شامل کرلیں۔ بیسن میں انڈے' کارن فلور (مکئی کا آٹا)' نمک' سوڈا ملا کر گاڑھا سا آمیزہ تیار کریں۔ فرائی پان میں تیل گرم کریں اور گوشت کے پارچے بیسن والے آمیزے میں ڈبو کر تل لیں۔
سنہری ہوجائیں تو اتار لیں۔
کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

چٹ پٹا مغز مسالا

اجزاء :

بکرے کا مغز	2عدد
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
پیاز	1عدد
ٹماٹر	4عدد
نمک	حسب ذائقہ
ہلدی پاؤڈر	آدھا چائے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	1چائے کا چمچہ
ادرک لہسن پیسٹ	1کھانے کا چمچہ
زیرہ پاؤڈر	1چائے کا چمچہ

لال مرچ پاؤڈر — 1 کھانے کا چمچہ
ہرا دھنیا — آدھی گٹھی
ہری مرچ — 5 عدد
نمک — حسبِ ذائقہ
تیل — آدھا کپ

ترکیب :
سب سے پہلے مغز کو اچھی طرح صاف کرلیں۔ تلی تلی رگوں کا جو جال سا بنا ہوتا ہے' وہ سب نکال دیں۔ اب برتن میں ایک کپ پانی ڈال کر ابالیں۔ اس میں مغز اور ہلدی ڈال کر ایک منٹ پکائیں۔ مغز کو پلیٹ میں نکال لیں اور پانی پھینک دیں۔ ہر مغز کو 2 حصوں میں کاٹ لیں۔ تیل گرم کرکے پیاز کو سرخ کر لیں۔ اس میں ٹماٹر' نمک' دھنیا پاؤڈر' ہلدی' لال مرچ' ادرک' لہسن پیسٹ اور زیرہ ڈال کر مسالا بھون لیں۔ جب مسالا اچھی طرح بھون جائے تو مغز اس پر رکھ کر اوپر ہرا دھنیا اور ہری مرچیں چھڑک کر ڈھک کر پانچ منٹ دم پر رکھیں۔ چمچہ بالکل نہ چلائیں مزے دار مغز مسالا تیار ہے۔ ڈش میں نکال کر نان کے ساتھ پیش کریں۔

شاہجہانی کٹاکٹ

اجزاء :
گردہ — 1 عدد
دل — 1 عدد
کلیجی — 1 کلو
بھیجا — 1 عدد
گوشت — 1 کلو
لال مرچ — 2 چائے کے چمچے
خشخاش — 4 کھانے کے چمچے
ٹماٹر — 1 پاؤ
پیاز — 2 عدد
ادرک' لہسن پیسٹ — 4 کھانے کے چمچے
ہری مرچ — 6 عدد
ہرا دھنیا — آدھی گٹھی
نمک — حسبِ ذائقہ
تیل — 1/2 کپ

ترکیب :
تیل گرم کرکے ادرک لہسن کا پیسٹ دل' گردہ اور گوشت چھوٹی چھوٹی بوٹیاں کرکے ڈال دیں۔ گوشت گلنے تک پکائیں۔ اس کے بعد اس میں پیاز اور کلیجی ڈالیں اور کلیجی گلنے تک پکائیں۔ جب ساری چیزیں گل جائیں تو بھیجا' لال مرچ پاؤڈر' نمک' پسی ہوئی خشخاش اور باریک کٹے ہوئے ٹماٹر ڈالیں ان تمام چیزوں کو توے پر ڈال کر کٹاکٹ کرلیں۔ جب تمام چیزیں یکجان ہو جائیں تو ہری مرچیں ڈال کر مزید کٹاکٹ کریں۔
آخر میں ہرا دھنیا اور ادرک سے سجا کر گرما گرم پیش کریں۔

کلیجی کے تکے

اجزا :
بکرے کی کلیجی — 1 عدد
ادرک — 1 چھوٹا ٹکڑا
لہسن — 1 پوتھی
پسی سرخ مرچ — حسب ضرورت
دہی — آدھا کپ
نمک — حسبِ ذائقہ

ترکیب :
کلیجی کو صاف پانی سے دو' تین مرتبہ دھولیں' پھر اس کی بوٹیاں بنالیں۔ دہی کو اچھی طرح پھینٹ لیں' پھر اس میں لہسن ادرک باریک پیس کر شامل کردیں۔ نمک اور پسی ہوئی سرخ مرچ بھی ملا دیں۔ کلیجی کی بوٹیاں دہی کے آمیزے میں ڈال کر خوب مکس کریں اور کئی گھنٹوں کے لیے چھوڑ دیں' پھر انہیں سیخوں پر لگا کر کوئلوں پر سینک لیں۔
لچھے دار پیاز اور املی کی چٹنی کے ساتھ پیش کریں۔

ادارہ

خوب صورت رہیے

گرمیاں رخصت ہو رہی ہیں اور جاڑوں کی آمد آمد ہے۔ بدلتی رُت کے ساتھ زندگی کے ڈھنگ بھی بدل جاتے ہیں۔ موسم کی تبدیلی سے جہاں روزمرہ کی روٹین پر اثر پڑتا ہے' وہیں یہ انسانی جلد پر بھی اثر انداز ہوتی ہے' موسم سرما چونکہ خشک ہوتا ہے' اس لیے جلد پر اس کا فوری اور زیادہ اثر ہوتا ہے۔

سردیوں کے ساتھ ہی بقر عید بھی قریب ہے۔ چھوٹی عید کی بہ نسبت بڑی عید پر خواتین کا بیشتر وقت کچن میں چولہے کے پاس گزرتا ہے۔ چولہے کی تپش' گرمی اور پسینے سے چہرے کی رنگت اور شادابی متاثر ہوتی ہے اور عموماً" دیکھا گیا ہے کہ خواتین مزے دار کھانے بنا بنا کر گھر والوں کو خوش کرنے کے چکر میں اپنی طرف سے بالکل غافل ہو جاتی ہیں' جبکہ یاد رکھیے! آپ کے گھر والے آپ کو سگھڑ اور سلیقہ مند ہونے کے علاوہ خوب صورت اور تر و تازہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں' اس لیے اپنے آپ کو ہرگز نظر انداز نہ کریں۔

اس ماہ شعاع کے بیوٹی پلان میں دی گئی ہدایتوں پر عمل کریں اور نمکین عید پر اپنی میٹھی میٹھی تعریفیں وصول کریں۔

جس طرح گرم موسم میں آپ خود کو دھوپ سے بچاتے ہیں' اسی طرح سردیوں میں بھی دھوپ سے بچنے کی کوشش کریں' کیونکہ سردیوں کی دھوپ رنگت کو کمہلا کر اس کی دلکشی ماند کردیتی ہے' جسے بحال کرنے میں کافی وقت لگ جاتا ہے۔

ماہرین کے مطابق سورج کی شعاعیں جلد پر براہ راست پڑنے سے خون کی نالیاں بڑی ہو جاتی ہیں' جس کی وجہ سے چہرے پر سرخ رنگ کے دانے نمودار ہونے لگتے ہیں' جو بہت تکلیف دہ ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے دھوپ میں نکلنے سے پہلے' چولہے کے پاس جانے سے پہلے اور موسم سرما کے جلدی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے کوئی نہ کوئی دوا بطور سن بلاک ضرور استعمال کریں۔ اس مقصد کے لیے آپ ایلوویرا یعنی گھیکوار کا رس چہرے پر مل لیں تو جلد کی 80 فیصد حفاظت ہو سکتی ہے۔ ایلوویرا کا رس چونکہ بے رنگ ہوتا ہے اس لیے اسے میک اپ کے بعد بھی چہرے پر لگایا جاسکتا ہے۔ سن بلاک کے طور پر آپ انگور کا رس بھی لگا سکتی۔ انگور کے رس کو انڈے کی زردی کے ساتھ ملا کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ جب جھاگ بیٹھ جائے تو چہرے پر لگائیں۔ 8 سے 10 منٹ تک لگا رہنے دیں' پھر کسی معیاری صابن سے منہ دھو لیں' چند دنوں میں آپ خود فرق محسوس کریں گی۔

بھاری میک اپ عموماً" شادی بیاہ کی تقریبات میں ہی مناسب لگتا ہے اور ہلکی پھلکی گھریلو دعوتوں میں ہلکا پھلکا میک اپ ہی اچھا رہتا ہے اور اگر آپ کسی دعوت

میں میزبان ہیں تو یقیناً" آپ کا میک اپ' لباس اور ہیئر اسٹائل ہلکا مگر دلکش ہونا چاہیے۔ اس عید پر ہم میک اپ کا انتخاب آپ پر چھوڑتے ہیں۔ اس مرتبہ ہم آپ کو بیوٹی ٹپس دیں گے جو جلد کی شادابی اور دلکشی میں آپ کو مدد دیں گی اور میک اپ یا کسی بھی کاسمیٹکس کے مضر اثرات سے محفوظ رکھنے میں معاون ثابت ہوں گی۔

بازار میں ملنے والی مختلف پروڈکٹس جلد اور حسن کی حفاظت اور صحت کے لیے مفید اجزاء مکمل طور پر فراہم کرنے سے قاصر ہوتی ہیں اور بعض خواتین اپنی جلد کی مناسبت سے کاسمیٹکس کا انتخاب نہیں کرپاتیں نتیجتاً" چہرے پر اس کے مضر اثرات رونما ہونے لگتے ہیں۔

جلد کی سو فیصد صفائی ستھرائی' شادابی اور تروتازگی کے لیے دودھ' سبزیاں اور پھل بہتر ہیں۔ انہیں نہ صرف کھائیں' بلکہ لگائیں بھی۔

لیموں کا رس جلد کی ٹوٹ پھوٹ سے بچاؤ اور گردوغبار کی صفائی کے لیے بہترین ہے۔ اس کا شربت بنا کر پینے سے خون کے فاسد مواد کا اخراج ہوتا ہے اور چہرے پر لگانے سے نہ صرف رنگت صاف ہوتی ہے بلکہ دانوں کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے اور دھبے بھی صاف ہوجاتے ہیں۔ البتہ اسے دھوپ میں لگانے سے پرہیز کریں۔

کھیرا اضافی چکنائی جذب کرتا ہے۔ اس کو چھیل کر اس کا گودا اور پانی چہرے پر لگائیں' خشک ہونے پر ٹھنڈے پانی سے دھوئیں۔ قتلے کاٹ کر آنکھوں پر رکھنے سے آنکھوں کی تھکن' سوجن اور جلن میں فائدہ ہوتا ہے۔

ٹماٹر بہترین کلینزر ہے۔ نارمل اور چکنی جلد کے لیے بے حد مفید ہے' وائٹ اور بلیک ہیڈز نکالنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ دن میں کسی بھی وقت ٹماٹر کاٹ کر ہلکے ہاتھوں سے چہرے پر رگڑیں' دو ہفتے میں بہترین نتیجہ مل جائے گا۔

کچے دودھ میں نمک ملالیں اور روئی کے پھاہے سے رات کو سوتے وقت مساج کریں۔ اس سے چہرے کا رواں بھی جھڑ جاتا ہے اور جلد نرم و ملائم بھی ہوجاتی ہے۔

گاجر کا رس چہرے کی شادابی میں اضافہ کرتا ہے اور کیل مہاسے بلکہ ایگزیما اور تمام جلدی امراض کے خاتمے میں بھی مفید ہے۔

تربوز کا رس بھی چہرے کے لیے بہترین ہے۔ کیلے کا گودا بھی وائٹ اور بلیک ہیڈز کو ختم کرتا ہے۔

یاد رکھیے! صحت مند جلد چہرے کی خوب صورتی اور توانائی کی عکاس ہوتی ہے' اس لیے اس کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ چلتے چلتے ایک بات اور بھی یاد رکھیے کہ چہرے کو اچھی طرح خشک کرنے کے بعد ہی ماسک لگائیں۔ اگر بلڈ پریشر نارمل ہو تو بھاپ بھی لی جاسکتی ہے کیونکہ بھاپ لینے سے چہرہ ماسک کا اثر زیادہ قبول کرتا ہے۔

ان چھوٹی چھوٹی تدابیر پر عمل کریں اور عید قرباں خوب انجوائے کریں۔

☆